گگن
بشریٰ رحم

آفاق آج سوچی سمجھی اسکیم کے تحت دفتر دیر سے آیا تھا بلکہ پچھلے ایک ہفتے سے اس نے
آنے کے اوقات میں حیرت انگیز تبدیلیاں کرلی تھیں۔ کبھی بہت جلدی' اور کبھی بہت دیر
... اچانک دفتر میں یوں داخل ہوتا جیسے چھاپہ مارنے کی غرض سے آیا ہو۔
سارا عملہ اُس کے اس رویّے پر حیران تھا کیونکہ سب جانتے تھے کہ آفاق وقت کی پابندی کا
سختی سے قائل تھا۔ دوسروں کو اس اصول پر لانے کے لیے وہ ہمیشہ دفتر کھلنے سے پندرہ بیس
منٹ پہلے آجاتا۔ کبھی سڑک پر ٹہلتا رہتا اور کبھی موٹر میں بیٹھ کر ضروری کاغذات دیکھتا رہتا۔
کبھی کبھی تو دفتر کی صفائی بھی ختم نہ ہوتی تھی کہ وہ آجاتا۔ جھاڑ پونچھ کرتا ہوا چپڑاسی تھر تھر
کانپنے لگتا کہ گھڑی کی سُوئی غلط ہو سکتی ہے مگر صاحب کے آنے کے وقت میں تبدیلی نہیں
ہو سکتی۔ جلدی آنے سے اس کا یہ مقصد بھی ہوتا کہ دیکھ لے کہ کون لوگ وقت پر آتے ہیں اور
کون دیر سے۔ آج تک اس کے دفتر کا کوئی بھی آدمی' چپڑاسی کے سوا کہ جس نے دفتر کھولنا ہوتا
تھا' کبھی اس سے پہلے نہ آسکا تھا اس لیے اس دفتر کی سب سے بڑی خوبی وقت پر ہر کام کرنا تھا۔
"عرشی مینشن" کے دوسرے فلور پر اس کا دفتر تھا جسے پانچ سال پہلے اس نے آکر سنبھالا تھا
جب اس کے والد بدرالدین ہارٹ اٹیک سے فوت ہوگئے تھے' اس وقت آفاق امریکہ میں ان
کے اسسٹنٹ کے طور پر سب آفس میں کام کرتا تھا۔ یہاں اس کے والد کے چمڑا صاف کرنے
اور رنگنے کے کارخانے تھے اور وہ مختلف ملکوں کو چمڑا اور چمڑے سے بننے والی اشیا ایکسپورٹ
کرتا تھا۔ آفاق کا ایک چھوٹا بھائی اسحٰق اور بہن ثوبیہ وہیں امریکہ میں پڑھتے تھے' اس لیے
ان کا وہاں رہنا ضروری ہوگیا تھا۔ آفاق نے فوراً" یہاں آکر سارا کاروبار سنبھال لیا۔ وہ
دیانت داری کے ساتھ انتھک کام کرنے کا مزاج لایا تھا اور جانتا تھا' اس کاہل قوم کا واحد علاج
اس سے کام لینا ہے۔ سو اُس نے اصول بنا لیا تھا کہ وہ خود محنت کرے گا' دیانت داری سے
کاروبار کو اپنا وقت دے گا اور عملہ بھی وہ رکھے گا جو اس کے اصول کو اپناتے ہوئے دیانتداری

سے اپنے فرائض انجام دے گا۔

ہاں' ایک اور بات بھی برابر ہو رہی تھی۔ وہ خواہ دیر سے آئے یا جلدی' اچانک کمرے میں داخل ہو یا گھنٹی بجا کر۔ فلک ناز کو صرف ایک ہی کام تھا۔ فوراً ریسیور اُٹھا کر کچھ کہتی اور پھر زیرِ لب تبسم کے ساتھ ریسیور رکھ دیتی۔

فلک ناز کو اس دفتر میں آئے صرف دو مہینے ہی ہوئے تھے' لیکن اس نے دفتر میں ایک طوفان مچا رکھا تھا۔ سارا عملہ اس کے سامنے بے بس تھا۔ جس کو جو دل میں آتا کہہ دیتی۔ جب جی چاہتا' کام میں گڑبڑ کر دیتی۔ ایک تو وہ اتنی بڑی کار میں دفتر آتی تھی کہ خواہ مخواہ سب پر اس کا رعب پڑ گیا تھا۔ دوسرے وہ ہر روز جدید فیشن کے ملبوسات پہن کر آتی جبکہ دوسری لڑکیاں اس کی نوکرانیاں معلوم ہوتیں۔

وہ بے چاریاں بھی کیا کرتیں۔ انہوں نے پورے مہینے کی تنخواہ میں سارا مہینہ چلانا ہوتا تھا اور فلک ناز ایک امیر باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ ایک ہزار روپے میں ایک جوڑا بنا لیتا اس کے لیے کون سی بڑی بات تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسے صورت بھی اچھی دی تھی۔ اس نے بزنس مینجمنٹ میں ایم اے کر رکھا تھا۔ فرفر انگریزی بولتی تھی۔ کافی چرب زبان تھی۔ ہنسی ہنسی میں بڑی سے بڑی بات کہہ جاتی تھی اور سب لوگ جانتے تھے کہ وہ بہت بڑی سفارش پر اس دفتر میں آئی ہے۔

حالانکہ آفاق بدرالدین بہت سخت گیر باس تھا۔ سفارش اور رشوت' یہ دو لفظ اس کی لغت میں نہیں تھے۔ محنتی تھا' محنتی لوگوں کو پسند کرتا تھا۔ گپ لگانا' ہنسی مذاق یا عشق بازی اسے پسند نہیں تھے اسی لیے وہ انٹرویو کے وقت چُن چُن کے ایسے لڑکیاں اور لڑکے رکھتا تھا جو بہت ضرورت مند ہوتے تھے اور پیٹ کی اس ضرورت کے آگے ہر "ضرورت" کو ہیچ سمجھتے تے اس لیے اس کے دفتر کا ماحول بہت صاف ستھرا تھا۔

اس سے پہلے دفتر میں تین لڑکیاں تھیں' ایک اسٹینو' دوسری ٹیلیفون کلرک اور تیسری مینجمنٹ آفیسر۔ فلک ناز چوتھی لڑکی تھی۔ ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ اس کے ذمے کون سا خصوصی شعبہ لگایا جائے گا مگر فی الحال تین مہینے کی اپرنٹس شپ پر کام کر رہی تھی اور ابھی اس کی ڈیوٹی یہ تھی کہ ہر مہینے دفتر کے ایک آدمی کے ساتھ مل کر کام کرے تاکہ اسے دفتری کام کی نوعیت کا اندازہ ہو سکے۔ دفتر میں بعض لوگوں کا خیال تھا شاید اسے کمپیوٹر پر دیا جائے یا ممکن ہے آفاق اسے اپنی پرائیویٹ سیکرٹری کے طور پر رکھ لے جس کا وہ قائل نہ

تھا۔ وہ کہتا تھا' سیکرٹری صرف نخرہ ہوتی ہے اس لیے اس کے کمرے میں کوئی نہیں بیٹھتا تھا۔ جب لڑکیوں کو کام سمجھانا ہوتا تو وہ اپنے کمرے سے باہر نکل آتا تھا۔ اس کا خیال تھا' عورت کاروبار کے پیچ و خم کو سمجھنے کے قابل نہیں ہوتی' نہ اس ضمن میں اس کی عقل پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے اور اگر ضرورت سے مجبور ہو کر عورت نوکری کے لیے نکلتی ہے تو اس سے اتنا ہی کام لیا جانا چاہیے جتنے کی وہ اہل ہے۔

مگر جس طرح اس نے بغیر ضرورت کے فلک ناز کو رکھ لیا تھا اور اس کے لیے میز کرسی اور فون کا بندوبست کر دیا تھا اور خود فلک ناز کے جو انداز تھے' اس سے سب کو یہی شک ہوتا تھا کہ ایک دن وہ باس کے کمرے میں بیٹھی نظر آئے گی۔

"فلک ناز کیا چاہتی ہے؟"

اس کی سمجھ ابھی تک کسی کو نہیں آئی تھی۔ وہ ہر ہفتے ایک نئے آدمی کی میز پر بیٹھتی مگر کام میں دلچسپی لینے کے علاوہ ہر بات میں دلچسپی لیتی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے اسے اس دفتر سے کوئی دلچسپی نہ تھی... تو پھر وہ یہاں کیا لینے آگئی تھی؟

یہاں تو وہ لوگ آتے تھے جنھیں زندگی کی گاڑی کھینچنا ہوتی تھی۔

یہ بات فون پر ایک دن آفاق نے سن لی تھی۔

فلک ناز کا خیال تھا کہ آفاق دفتر سے جا چکا ہے مگر وہ اپنے کمرے میں تھا۔

اس نے فون اٹھایا تو سنا۔ فلک ناز اپنی کسی سہیلی سے بات کر رہی تھی۔

"اری فلکی! اس اُلو کو پھنسایا ہے یا نہیں؟" اس کی سہیلی کہہ رہی تھی۔

"ابھی تو کوئی صورت نظر نہیں آئی۔"

"کیوں؟"

"بہت مغرور ہے کم بخت' اور مجھے اپنے کمرے میں بلاتا ہی نہیں۔"

"کمال ہے' کیا وہ تمہاری طرف دیکھتا بھی نہیں۔"

"ہاں۔ کبھی کبھی بس یونہی سرسری نظر سے دیکھتا ہے۔"

"واہ! کوئی تمہیں بھی نظرانداز کر سکتا ہے؟"

"ارے یہ ظلم تو ہو رہا ہے اور دن دہاڑے ہو رہا ہے۔"

"او ڈونٹ وری۔ ڈونٹ بی ڈس گسٹڈ۔ ایک نہ ایک دن تو تمہارے جال میں پھنس جائے گا۔ آج تک کون بچا ہے تم سے۔"

فلک ناز نے داد دینے کے انداز میں قہقہہ لگایا۔

"اچھا، باقی کل۔"

"او کے۔ بھولنا نہیں۔ رِنگ کرنا اور ہر روز کی تازہ رپورٹ دیا کرو۔"

"او، کے۔"

فون بند ہو گیا۔

"[illegible] تو یہ ارادے ہیں۔" آفاق نے ریسیور نیچے رکھ دیا۔

اس کے ارادوں کا آفاق کو کیا علم ہوتا۔ آفاق تو اس کے باپ کے دباؤ میں آگیا تھا۔ شیخ صدرالدین موٹروں کا کاروبار کرتے تھے۔ شہر میں ان کا طوطی بولتا تھا۔ پشتوں کے رئیس تھے اور فلک ناز ان کی اکلوتی بچی تھی۔

بیگم انھیں اتنی ماڈرن ملی تھی جو اَب بھی اپنی بیٹی کی بڑی بہن لگتی تھی۔ چھٹیاں سوئٹزرلینڈ میں گزارتی اور سردیوں کی شاپنگ کرنے کے لیے پیرس اور امریکہ میں یوں ہر سال جاتی جیسے گاؤں کے لوگ لاہور خرید و فروخت کے لیے آجاتے ہوں۔

بیٹی ضرورت سے زیادہ آزاد خیال تھی اور ماں، بیٹی کی آزادی کو جوانی کا حُسن کہتی تھی اس لیے شیخ صدرالدین کی گھر میں ایک نہ چلتی تھی۔

آفاق کو شیخ صدرالدین سے کوئی ضروری کام تھا اور اُس روز وہ انھیں ملنے ان کے گھر گیا تھا اس لیے بھی کہ شیخ صدرالدین اس کے والدین کے اچھے دوستوں میں سے تھے۔ وہ ان کا احترام کرتا تھا۔ پندرہ منٹ کی گفتگو کے بعد جب وہ باہر آیا تو شیخ صدرالدین بھی اس کے ساتھ ہی باہر آگئے۔ موٹر کے پاس کھڑے ہو کر انھوں نے چند باتیں کیں۔ سُوئے اتفاق سے اسی وقت فلک ناز تیار ہو کر کلب جارہی تھی۔ باہر نکلنے سے پہلے اس کی نظر آفاق پر پڑی۔

کتنا شاندار مرد تھا۔ اس سے پہلے اتنا وجیہہ آدمی اس نے نہیں دیکھا تھا۔ پھر اس نے فلک ناز کے ڈیڈی سے ہاتھ ملایا۔ اپنی گاڑی کا دروازہ کھولا۔ بڑے اسٹائل سے اسٹیرنگ گھمایا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ فلک ناز موٹر کی چابیاں گھماتی ہوئی باہر آگئی۔ آج اس کی سج دھج غضب کی تھی۔ کاش! وہ پہلے باہر نکل آئی ہوتی اور وہ اس پر ایک نظر ڈال ہی لیتا۔

مگر افسوس اب تو وہ باہر نکل گیا تھا۔

ہنستی ہوئی ڈیڈی کے پاس آئی اور بولی "یہ کون تھے ڈیڈی؟"

"یہ آفاق تھا، میرے دوست کا بیٹا۔"

"کیا کرتا ہے؟ یہاں کیوں آیا تھا؟" اس نے بڑی چابکدستی سے ان سوالات کے جواب حاصل کر لیے۔

حتیٰ کہ اس رات ڈائریکٹری میں سے آفاق کے گھر اور دفتر کا فون نمبر بھی تلاش کر لیا مگر پھر اس نے سوچا کہ اس طرح فون کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ وہ تو گھائل کرنے کے فن سے واقف تھی اور جانتی تھی کہ مرد کو کس طرح اپنا دیوانہ بناتے ہیں۔ خود فون کر کے پہل نہ کرنا چاہتی تھی۔

کوئی ترکیب سوچنے لگی۔

اور ترکیب فوراً ہی اس کے زرخیز ذہن میں آگئی۔

بس ڈیڈی کو منانے میں اتنے دن لگ گئے۔ ڈیڈی اس کی بات کو لطیفے کی طرح سنتے [illegible] لگا کر ٹال جاتے۔

آخر اسے ممی کو ہم خیال کرنا پڑا۔

ممی نے کہا "کیا ہرج ہے اگر وہ کچھ عرصہ ملازمت کر لے تو۔ گھر میں پڑی پڑی بور ہوتی ہے۔ اچھا ہے کسی کام تو لگے گی۔"

"مگر اس کو ملازمت کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

ڈیڈی بار بار پوچھتے۔

مگر ڈیڈی کی آج تک ممی کے آگے ایک نہ چلی تھی۔ اَب کیسے ممکن تھا کہ ممی ہار جاتیں۔ نہ صرف یہ کہ ڈیڈی کو اجازت دینا پڑی بلکہ انھیں وعدہ بھی کرنا پڑا کہ وہ آفاق کے پاس سفارش کے لیے خود جائیں گے اور اسے ہر قیمت پر فلک ناز کو اپنے دفتر میں رکھنا پڑے گا۔

مگر وہ جانتے تھے ان کی لڑکی کسی کام کی اہل نہیں ہے بلکہ ممکن تھا وہ آفاق کے لیے ایک مستقل سر درد ثابت ہو۔

اور یہ بات انھوں نے صاف صاف آفاق سے کہہ دی تھی اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کہا تھا جسے سن کر آفاق بہت متاثر ہوا تھا۔ ایک باپ کے منہ سے اتنی صاف گوئی کی اسے توقع نہ تھی۔ آفاق نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ فلک ناز کو کوئی گڑبڑ نہ کرنے دے گا بلکہ نتائج خاطر خواہ ثابت ہوں گے۔

اور شیخ صدرالدین اس کا شکریہ ادا کر کے چلے گئے تھے۔

دوسرے روز قاعدے کے مطابق فلک ناز نے اپنی عرضی ٹائپ کرا کے دفتر میں بھیج دی تھی اور ہفتے کے بعد اسے انٹرویو کے لیے بلاوا آگیا تھا۔

انٹرویو کے دن وہ پہلی بار آفاق کے سامنے جارہی تھی اس لیے ایک خاص انداز سے جانا چاہتی تھی۔ اس نے اپنی وارڈ روب کھولی اور کپڑوں کا انتخاب کرنے لگی۔ اس نے سوچا وہ جھالروں والی میکسی پہن کر جائے جو پچھلے سال ممی پیرس سے لائی تھیں۔ پھر اس نے سوچا نہیں' دفتر میں میکسی نہیں چلے گی۔ میکسی تو بعد میں کئی مرتبہ پہنی جاسکے گی۔

فلیپر سوٹ ٹھیک رہے گا۔ مگر جینز اور بلاؤز میں وہ شاندار نظر آئے گی لیکن کوئی ساڑھی کیوں نہ پہن لے۔ اس کے ساتھ جوڑا بھی لگانا پڑے گا اور لوگ کہتے تھے ساڑھی اور جوڑے میں وہ بوڑھی بڑی لگتی ہے اور وہ تو ابھی صرف تیئیس برس کی ہے۔ سو انٹرویو کے روز بہت معصوم اور بھولی بھالی نظر آنا چاہیے۔ اس نے آخر کار ایک نفیس سا پرنٹڈ سوٹ چنا۔ اس کا ہم رنگ دوپٹہ۔ بہت قرینے سے ایک چٹیا بنائی اور اس میں مصنوعی بال ملا لے ہلکا ہلکا میک اپ اس طرح کیا کہ چہرے کے پُرکشش حصے اور نمایاں ہوگئے۔ سر کو دوپٹے سے ڈھکے ہوئے وہ انٹرویو کے لیے داخل ہوئی۔ اس کے آنے سے پہلے آفاق نے اس کے لیے ہدایات جاری کردی تھیں اور اپنے مینیجر کو بلا کر کہا تھا اس لڑکی کے لیے میز کرسی کا بندوبست کردیا جائے اور اسے اپائنٹمنٹ لیٹر بھی ایشو کردیا جائے۔ سارا دن وہ میز کرسی پر بیٹھی ادھر سے بلاوا آنے کا انتظار کرتی رہی مگر اسے اندر نہیں بلایا گیا۔

تب اس نے دیکھا۔ ایک بچے کے قریب آفاق دفتر سے نکل کر جارہا ہے۔ وہ اس کے پیچھے لپکی اور بولی "سر' میں انٹرویو کے لیے آئی تھی۔"

آفاق نے مڑ کر اسے دیکھا اور بولا "آپ کو اپائنٹمنٹ لیٹر مل گیا ہے؟"

"جی سر!"

"تو بس' آپ کا انتخاب ہوچکا ہے۔ انٹرویو کی کیا ضرورت ہے۔ کل سے دفتر آجایئے۔"

کس قدر بور آدمی ہے۔ اس نے دل میں سوچا۔ اچھا ہوا وہ زیادہ بن ٹھن کر نہیں آئی تھی۔ ورنہ سب ضائع ہوجاتا۔

لڑکی خاصی معقول نظر آتی ہے۔ آفاق دل میں سوچتا جارہا تھا۔

بہرحال دیکھیں گے۔

اس نے زندگی کی سختیاں سہی تھیں۔ اس کا باپ بہت ذہین اور بااصول آدمی تھا۔ ایک معمولی آدمی سے غیر معمولی بنا تھا اور اس نے اپنے بیٹے کو بھی ایسی ہی تربیت دی تھی۔ اس کو بتایا تھا کہ انسان خود زندگی کی قدریں بناتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کو بنانے اور بگاڑنے کا ذمہ دار ہوتا

ہے لیکن جب وہ جوانی کے منہ زور گھوڑے پر سوار ہو تو باگیں اس جا بکدستی سے پکڑے کہ کبھی یہ گھوڑا نفس کے اشاروں پر نہ بدک سکے۔ یہیں سے زندگی کا مطلب سمجھ آتا ہے اور آدمی اپنے جانے کے بعد دنیا میں نہ ختم ہونے والی کہانیاں چھوڑ جاتا ہے۔ باپ دادا کی دولت پر اترانا اور نفس کا غلام ہوجانا کم تری کی نشانیاں ہیں۔ جو کچھ تمہارے باپ دادا نے اپنی محنت سے تمہارے لیے بنایا ہو' اس میں اپنی محنت کا بھی حصہ ڈالو تاکہ وراثت کے ساتھ ساتھ تمہاری اولاد کو محنت اور دیانت میں سے بھی حصہ ملے اور اس طرح تمہاری آئندہ نسلیں تباہی و بربادی سے بچ جائیں ورنہ تاریخ تو یہی کہتی ہے کہ دوسری یا تیسری نسل کی سج دھج یا کم سنی کی وجہ سے ہمیشہ باپ' دادا کا اثاثہ اور نیک نامیاں ختم ہوگئیں۔

آفاق کو باپ نے بہت سختی میں رکھا تھا۔ بگڑا ہوا رئیس زادہ نہیں بنایا تھا اس لیے وہ بڑا خوب صورت انسان بن گیا تھا اور خوب جانتا تھا کہ بگڑی ہوئی نسل کو کس طرح ٹھیک کیا جاتا ہے۔ کئی لوگ اپنے نوجوان لڑکوں کو کام سے رغبت دلانے کے لیے اس کا تعاون حاصل کرچکے تھے۔ بلکہ وہ انھیں اپنے دفتر میں رکھ کر ان کی تربیت کرتا تھا۔

اب ایک لڑکی اس کے سپرد کردی گئی تھی۔

بہرحال' اس کو دیکھنا تھا کہ وہ کہاں تک بگڑی ہوئی ہے۔

اس نے سرِدست فلک ناز کے ذمے کوئی خاص کام نہیں لگایا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ رئیس زادی کیا کرسکتی ہے؟ اس لیے اس نے تین مہینے کے لیے اسے ٹریننگ میں رکھ چھوڑا تھا تاکہ وہ دفتر میں ہونے والے ہر کام سے شناسائی پیدا کرلے۔ پھر کوئی ایک کام اس کے سپرد کیا جانا تھا۔ دفتر میں ٹیلیفون کا انٹرکام سسٹم تھا جس سے آفاق کو فوراً معلوم ہوجاتا تھا کہ کون سا فون ذاتی استعمال میں ہے اور کتنا وقت فون پر ضائع کیا جارہا ہے۔

فلک ناز خالباً" ان باتوں سے بے خبر تھی اس لیے وہ اکثر فون پر ذاتی قسم کے رابطے پیدا کرتی اور کئی کئی منٹ باتوں میں ضائع کرتی تھی۔ یوں بھی دن میں اس کے کئی فون آتے تھے۔

یوں تو آفاق کو دوسروں کی پرائیویٹ باتیں سننے کا شوق نہیں تھا' نہ اس کے پاس وقت ہوتا تھا مگر جب پہلے دن فلک ناز کی باتیں اس کے کان میں پڑیں تو اسے تجسس ہوا کہ معلوم کرے یہ لڑکی یہاں کیوں آئی ہے اور اس کے ارادے کیا ہیں۔

پھر جب بھی اسے موقع ملتا وہ فلک ناز کی باتیں سننے کی کوشش کرتا۔ وہ دن میں کئی بار لڑکوں اور لڑکیوں سے باتیں کیا کرتی' شام گزارنے اور پکچر دیکھنے کے پروگرام بنایا کرتی تھی۔ لڑکے

بڑے جذباتی انداز میں باتیں کرتے تھے اور ان کے پروگراموں میں شامل نہ ہونے پر اس کو سخت سست کہتے تھے مگر وہ ہمیشہ ہنس کر یہ کہتی کہ وہ ایک خاص مشن پر آئی ہے اس لیے اس کی عدم موجودگی کو برداشت کیا جائے۔

مگر اس کی ایک خاص سہیلی تھی پنکی' جس کے ساتھ وہ ہر قسم کی بات کرلیا کرتی تھی۔ وہ روزانہ تقریباً دو بار فون کیا کرتی تھی۔ اس کو دفتر کے بارے وہ ہر روز کی کارروائی بتایا کرتی تھی۔ ایک دن آفاق نے سنا' وہ اپنی سہیلی سے کہہ رہی تھی۔ "ابھی تک میرا کوئی حربہ کارگر نہیں ہوا پنکی' سخت بور ہوگئی ہوں۔"

"تو پھر چھٹی کردو یار۔" اس کی سہیلی نے کہا "تین حرف بھیجو اس پر اور آجاؤ۔ کوئی اور شکار تلاش کرو۔"

"آجاؤں؟ واہ! آج تک میں نے کبھی ہار مانی ہے' فلکی انکار کا لفظ سننے کی عادی نہیں' بس موقع ملنے کی دیر ہے۔ بچ کے نہ جانے دوں گی۔ میں نے تو اس کو پھنسانے کی قسم کھا رکھی ہے۔"

"کیا خبر شادی شدہ ہو؟"

"جی نہیں' میں نے سب معلومات لے لی ہیں۔ گلبرگ میں بالکل اکیلا رہتا ہے۔"

"تو پھر گھر پر چھاپہ مارو۔"

"نہیں۔ اس طرح میرا مشن خراب ہوجائے گا۔"

"تو پھر کیا کرو گی؟"

"یار میں شادی کو فضول شے جانتی ہوں لیکن اگر اس سے شادی بھی کرنی پڑی تو کرلوں گی اور شادی کے بعد اتنے جوتے لگاؤں گی کہ ہاتھ جوڑتا پھرے گا۔"

"WISH YOU A GREAT SUCCESS"

اس کی سہیلی نے ہنس کر کہا۔

"میں اسے اپنے عشق میں گرفتار کرکے چھوڑوں گی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

"اچھا GOD BLESS YOU"

"مجھے بتاتی رہنا۔"

"ضرور بتاؤں گی۔"

"فون بند ہوگیا۔"

دوسرے دن آفاق نے فلک ناز کو اپنے کمرے میں بلا بھیجا۔

کیا کیا امیدیں لے کر وہ مچلتی لچکتی وہاں پہنچی۔

اس نے بڑے غور سے اس کا سراپا دیکھا اور پھر اسے کرسی پر بیٹھ جانے کو کہا۔

وہ مسکراتی ہوئی ادا سے کرسی پر بیٹھ گئی۔

اس نے بڑے شائستہ لہجے میں اس کا حال پوچھا اور پھر بولا "میرے دفتر میں آپ کا دل لگ گیا ہوگا؟"

"جی... جی..." اس نے ذرا ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

"اگر کبھی کوئی پرابلم ہو تو مجھے بتائیں۔"

"جی... اچھا... اچھا..." خوشی کے مارے اس کا دل دھڑکنے لگا "سر! ابھی تو کوئی ایسی بات نہیں۔ یہ اتنا اچھا دفتر ہے اور کام کرنے کا طریقہ اتنا پریکٹیکل ہے کہ میرا تو ویسے بھی دل لگ گیا ہے۔"

"ہوں۔" آفاق سنجیدہ ہوگیا۔ "اب آپ جاسکتی ہیں۔"

وہ گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔ آفاق کی طرف دیکھا۔ وہ ذرا دیر پہلے والی نرمی اس کے چہرے پر نہ تھی۔ کھردرے چہرے کے ساتھ وہ کاغذات دیکھ رہا تھا۔

فلک ناز کو اس کا یہ انداز بہت برا لگا۔

بہرحال اسے کمرے سے باہر آنا تھا۔

باہر آئی تو ہر نظر سوال بنی ہوئی تھی۔ تب اسے خیال آیا۔ آج کوئی بہت انہونی بات ہوگئی ہے۔

کرسی پر بیٹھتے ہی وہ ہواؤں میں اُڑنے لگی۔ جب اس کی سانس متوازن ہوئی تو اس نے پنکی کا نمبر ملایا۔

"پنکی' برف پگھلنی شروع ہوگئی ہے۔"

"اچھا' مبارک ہو۔ مگر یہ ہوا کیسے؟"

"بس! سمجھ لو تمہاری فلکی کی حدت کوئی نظرانداز نہیں کرسکتا۔"

"میں مانتی ہوں۔"

"تو اب پتھر اپنی جگہ سے ہلنا شروع ہوا ہے۔"

"جلدی سے سب کچھ بتاؤ' کیا باتیں ہوئیں۔ وغیرہ وغیرہ۔"

"وغیرہ وغیرہ کی بچی' یہ سب دفتر میں فون پر نہیں بتایا جا سکتا۔ شام کو گھر آ کر بتاؤں گی۔"

آفاق نے فون پر ساری بات سنی۔

پھر اس کے بعد وہ ہفتے میں ایک بار اسے دفتر میں بلاتا اور یونہی سرسری سی بات کر کے باہر بھیج دیتا' یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ فون پر کیا کہتی ہے۔

باہر آتے ہی وہ اپنی سہیلی کو مبالغہ آمیزیاتیں بتایا کرتی۔

اتنی باتیں معلوم کرنے کے باوجود ابھی تک آفاق کو یہ علم نہیں ہو سکا تھا کہ جب وہ کمرے میں داخل ہوتا ہے تو وہ ریسیور اُٹھا کر اپنی سہیلی سے کیا کہتی ہے؟ وہ ایک بار سننا چاہتا تھا۔

اس کام کے لیے اس نے اپنے ایک دوست فاروق کا انتخاب کیا۔ دوسرے روز وہ علی الصبح فاروق کو لے کر دفتر پہنچا۔ جب چپڑاسی صفائی کر کے جا چکا' تو آفاق' فاروق کو لے کر اپنے کمرے میں گیا۔ اسے ضروری ہدایات دیں اور ٹیپ ریکارڈر کے بارے میں سمجھا دیا جو اکثر اس کی میز کی دراز میں پڑا رہتا تھا کہ صبح سے شام تک جتنی کالیں دفتر سے باہر جائیں' انھیں ٹیپ کیا جائے خصوصاً فلک ناز کی ہر بات ریکارڈ کی جائے۔

فاروق کو اپنے کمرے میں بٹھا کر نہ معلوم آفاق کس وقت باہر نکل گیا تھا کہ چپڑاسی کو بھی علم نہیں ہو سکا تھا۔ ویسے اس کی عدم موجودگی میں کوئی اس کے کمرے میں جاتا ہی نہیں تھا اس لیے فاروق مزے سے فون کان سے لگائے بیٹھا رہا۔

اس روز آفاق تقریباً ایک بجے دفتر میں داخل ہوا جب کہ لنچ ٹائم ہوا چاہتا تھا۔ فلک ناز نے حسبِ عادت ریسیور اُٹھا لیا... کچھ کہا اور مسکرا کر رکھ دیا۔

آفاق اس کے قریب سے اس طرح گزر گیا جیسے اس نے کچھ نہ دیکھا اور نہ محسوس کیا۔

آفاق جونہی اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ فاروق کھڑا ہو گیا۔

"بڑی سخت ڈیوٹی لگ گئے تھے یار! آج تو اس کرسی پر بیٹھے بیٹھے اکڑ گیا ہوں۔"

"مجبوری تھی۔" آفاق اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"چائے پیو گے؟" ساتھ ہی اس نے گھنٹی بجا کر چپڑاسی کو بلایا اور چائے کا کہہ دیا۔

"معرکہ سر کیا یا نہیں؟"

"کر لیا۔" فاروق بولا۔

"ٹیپ سناؤ۔"

"یار بڑی تیز لڑکی ہے۔ صبح سے لے کر اب تک اس نے بیسیوں لڑکوں کو فون کیا ہے اور

لڑکوں فون اس کے نام آ چکے ہیں۔ ہر لڑکے سے اس نے بڑی بے تجابانہ باتیں کی ہیں۔ اپنے حسن پر اسے بڑا ناز ہے اور نئے نئے لوگوں کو پھنسانا اس کا محبوب مشغلہ۔ میں تو یہی سمجھ سکا ہوں۔"

"سمجھا تو میں بھی بہت کچھ ہوں مگر ابھی سمجھانے کا وقت نہیں آیا۔"

چپڑاسی چائے لے کر آ گیا۔ پیالیاں میز پر لگا کر چائے بنانے لگا۔

آفاق نے ہاتھ کے اشارے سے اسے جانے کے لیے کہا اور خود چائے بنانے لگا۔

فاروق نے اُٹھ کر ٹیپ لگا دی۔

مختلف آوازیں گونجنے لگیں۔

اور پھر سب سے آخر میں ایک عجیب فقرہ سنائی دیا:

"HERE COMES THE SNOB

اس فقرے کو سن کر دونوں کھلکھلا کر ہنس دیے۔

"اچھا تو جب میں کمرے میں داخل ہوتا ہوں تو محترمہ اس طرح میرا سواگت کرتی ہیں۔"

"جی ہاں! جونہی تم اندر داخل ہوتے ہو' وہ اپنی سہیلی کو خبردار کرتی ہے اور صرف اتنا کہتی ہے اور فون بند کر دیتی ہے۔"

"ویسے اچھا نام رکھا ہے اس نے تمہارا۔" فاروق نے کہا۔

"جی ہاں۔" آفاق گہری سوچ میں تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"شیخ صدرالدین کو جانتے ہو؟"

"ہاں' بڑا بھلا مانس آدمی ہے۔"

"میں بھی انہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ایک باپ کی التجا میرے کانوں میں اکثر گونجا کرتی ہے۔"

"ہاں' اولاد توقع کے خلاف ہو تو والدین پژمردہ ہی نظر آتے ہیں۔"

"بہر حال' کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔"

"کیا کرو گے؟"

"تم دیکھتے جاؤ۔"

فلک ناز کو دفتر میں کام کرتے ہوئے چھ ماہ ہو گئے تھے اور اس کے طور طریقے وہی تھے اب تو وہ دفتر میں کافی بَن ٹھن کر آنے لگی تھی جیسے دانستہ آفاق کو جلانا چاہتی ہو۔ کبھی کبھی بھی ہوتا کہ وہ دفتر دیر سے آتی یا دفتر ختم ہونے سے پہلے چلی جاتی تھی اور اپنے دل میں تھی شاید آفاق کو ان باتوں کا پتہ نہیں چل رہا۔ شاید وہ چاہتی تھی کہ یہ باتیں آفاق کے میں آئیں اور وہ کسی بہانے سے اسے بلائے تو بات کرنے کا موقع مل جائے۔

ایک روز آفاق نے اسے اپنے کمرے میں بلا ہی لیا۔ اس روز وہ سرخ رنگ کی بھڑکیلی پہن کر آئی تھی۔ خوب میک اپ کر رکھا تھا۔ ہر ایک کی نظر اس پر پڑ رہی تھی۔ کمرے خوشبوئیں پھیلی ہوئی تھیں۔

جب آفاق نے فون پر اسے آنے کو کہا تھا۔

تو وہ ایک شانِ دلربائی سے اٹھی اور مٹکتی جھولتی اس کے کمرے کی طرف چلی۔ "سر نے مجھے بلایا تھا۔"

"جی ہاں۔" اس نے سر اٹھائے بغیر کہا۔ وہ فائل پر کچھ لکھ رہا تھا۔

"سر کیا بات ہے؟"

"فلک ناز' آپ کو معلوم ہے۔ یہ ایک کاروباری دفتر ہے۔" اس نے پھر سر اٹھائے!

"یہ کلب نہیں ہے۔"

"جی... جی..." فلک ناز بوکھلا گئی۔

"جب دفتر آنا ہو تو دفتری اصول و ضوابط کا احترام کرنا چاہیے۔"

"جی..... میں... آپ کا مطلب...."

"تم میرا مطلب اچھی طرح سمجھ رہی ہو۔ آئندہ خیال رکھنا۔ اب جا سکتی ہو۔"

بوکھلائی ہوئی وہ باہر آ گئی۔

اونہہ..... کمینہ.... اس نے دل میں گالی دی۔ نظر تک اُٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ اگر ادھی سے دیکھتا نہیں تو اسے علم کیسے ہوا کہ آج میں کیا پہن کر آئی ہوں۔ سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو۔ اگر استعفیٰ نہ دے دیا تو....

مجھے کیا ضرورت ہے۔ پتھر سے سر پھوڑنے کی CONCIET کہیں کا۔

اوپر سے بَنا کتنا ہے۔

سارا وقت وہ اندر ہی اندر کھَولتی رہی اور سوچتی رہی' اس کو یہ نوکری چھوڑ دینی چاہیے۔ کیا رکھا ہے اس نوکری میں۔ وہی لگی بندھی روٹین' وہی کام' وہی دفتر کا پھیکا ماحول۔ اگر آفاق اس کے قابو میں آجاتا تو بات بھی تھی۔ جو مشن لے کر وہ یہاں آئی تھی' وہ ناکام ہو گیا تھا اور کوئی امید پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔

ہاں' صرف اسے ڈیڈی سے ڈر لگ رہا تھا کیونکہ اس نے ملازمت کرتے وقت ان سے وعدہ کیا تھا کہ ان کی اجازت کے بغیر چھوڑے گی نہیں' تو اب چھوڑنے کے لیے ان کی اجازت لینی ہے گی۔ کوئی بہانہ کرنا پڑے گا۔ کوئی بہت بڑا چکّر چلانا پڑے گا۔ کیونکہ انھوں نے کہہ دیا تھا وہ ان کی اجازت کے بغیر کام چھوڑ کر گھر آکر بیٹھ گئی تو وہ سمجھیں گے کہ کوئی بہت بڑا نقصان کے آئی ہے اور وہ نہیں چاہتے اس کے ہاتھوں ان کے دوست کے بیٹے کی فرم کو نقصان پہنچے۔

سوچ کر تو وہ یہ آئی تھی کہ ان کے دوست کے بیٹے سمیت اس ساری فرم کو وہ اپنی ملکیت بنا لے گی مگر اب اس کی اَنا کا سوال جاگ اٹھا تھا۔ آفاق اس کے ڈھب کا آدمی نہیں تھا اور اپنے TALENT کو ضائع کرنا اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

گھر جا کر بھی وہ سارا وقت یہی سوچتی رہی کہ یہاں سے کیسے نکلا جائے۔ بہرحال اسے اپنے زرخیز ذہن سے قوی امید تھی کہ کوئی نہ کوئی حل ضرور نکال لے گی۔

دوسرے دن وہ بڑی بددلی سے تیار ہو کر دفتر گئی۔ توبہ' آج دفتر جانا کس قدر مصیبت لگ رہا تھا۔ پتہ نہیں کس طرح اس نے یہ جھنجھٹ پال لیا۔ غلامی تو اس نے کبھی پسند نہیں کی تھی۔ اسے تو حکومت کرنا اچھا لگتا تھا۔ حکم چلانا' بات کو منوانا۔ مگر وہ اب کسی کی ملازم تھی۔ نوکری کر رہی تھی۔ چھی چھی۔ آج تو اس سے کار بھی اچھی طرح نہیں چلائی جا رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا استعفیٰ لکھ کر لے جائے اور آفاق کے منہ پر دے مارے۔ پھر آفاق کو پتہ چلے کہ وہ کوئی گری پڑی لڑکی نہ تھی۔

دفتر میں بھی اس نے کسی سے حسبِ عادت ہنسی مذاق نہیں کیا۔ نہ ہی دفتر سے باہر فو کر کے اپنا گپ بازی کا نشہ پورا کیا۔

بار بار گھڑی دیکھتی کہ وقت پورا ہو تو وہ گھر جائے۔

خدا خدا کر کے دفتر کا وقت پورا ہوا تو وہ اپنی چیزیں سمیٹنے لگی۔ آفاق کچھ دیر پہلے دفتر۔ اٹھ کر چلا گیا۔ آج مہینے کی بائیس تاریخ تھی اور وہ سوچنے لگی' آئندہ ایک ہفتے میں وہ چھوڑنے کی ترکیب سوچ لینی چاہیے تاکہ نیا مہینہ آنے سے پہلے ہی استعفیٰ دے سکے۔

ابھی وہ جانے کے لیے اٹھی نہ تھی کہ دفتر کا چپڑاسی اس کے قریب آیا اور نہایت ادب۔ ایک بند سفید لفافہ اس کی طرف بڑھا کر بولا۔ "یہ بڑے صاحب نے آپ کے لیے دیا تھا۔"

لفافہ... بڑے صاحب... وہ کچھ گھبرا گئی اور گھبراہٹ میں لفافہ اس کے ہاتھ سے جھپٹ پرس میں رکھ لیا۔

کیا ہو گا اس لفافے میں۔ اس کا دل دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ کیا خبر آفاق نے اپنے رویے معافی مانگی ہو۔ کل وہ بدتمیزی سے بولا تھا۔ ممکن ہے اسے بھی خوف ہو کہ میں چھوڑ کر جاؤں گی۔ جانے خط میں کیا لکھا ہو گا ظالم نے۔

وہ جلد جلد سیڑھیاں اترنے لگی۔ چپڑاسی نے بھی کتنی رازداری سے لفافہ اسے لا کر دیا کہ کوئی دیکھ نہ لے۔

اس کا دل چاہا۔ وہ جلدی سے لفافہ چاک کر کے دیکھ لے مگر جب وہ نیچے کار کے پاس آئی نیچے دفتر کے بہت سے لوگ کھڑے تھے اس لیے اس نے اپنی اس خواہش کو دبا دیا اور کا سٹارٹ کر دی۔ اسی وقت دفتر کی ایک لڑکی فاخرہ نے اسے آواز دے کر کہا۔ ذرا اسے راستے میں ڈراپ کر دے۔ اسے کہیں ضروری جانا ہے۔

لوگوں کو ڈراپ کرنا اس کا حسین مشغلہ تھا بلکہ وہ خود ایسی آفر دیا کرتی تھی مگر آج اسے فاخرہ کا لفٹ مانگنا ذرا بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

بہرحال مروّت کے مارے اسے بٹھانا پڑا۔ راستے بھر وہ اس کی کوئی بات بھی غور سے نہ سن سکی۔ اگر یہ کم بخت اس وقت موٹر میں نہ آ کر بیٹھ گئی ہوتی تو وہ گاڑی کسی سنسان سی سڑک روک کر لفافہ چاک کر کے دیکھ لیتی۔ مگر اب تو گھر جا کر ہی دیکھنا نصیب ہو گا۔ اس کے اتر جا کے بعد صرف چند فرلانگ کا فاصلہ رہ جائے گا۔

سو گھر جاتے ہی وہ اپنے کمرے کی طرف دوڑی۔ جلدی سے پرس کھولا۔ اس میں سے لفا

چاک کیا۔ خط نکالا۔ اوہ' ٹائپ کیا ہوا ایک لمبا کاغذ تھا۔ پڑھا تو مارے غصے کے اس کا سر چکرانے لگا۔

وہ تو TERMINATION LETTER تھا۔

آفاق نے بڑی سخت زبان میں لکھا ہوا تھا۔ کیونکہ وہ کبھی وقت پر دفتر نہیں آئی۔ دفتر کے اصولوں کا احترام نہیں کرتی۔ اپنا کام دلجمعی سے نہیں کرتی اس لیے اسے دفتر میں نہیں رکھا جا سکتا۔ وہ کل سے دفتر نہ آئے۔ ویسے پورے مہینے کی تنخواہ اسے گھر بھیج دی جائے گی۔

"کمینہ' اُلو کا پٹھا۔" نفرت اور غصے سے اس نے اپنے ہونٹ کاٹ لیے۔ اس کی یہ مجال کہ مجھے دفتر سے نکال دے۔ ایسا مزہ چکھاؤں گی۔ ایسا مزہ چکھاؤں گی۔ ایسا مزہ چکھاؤں گی۔

مگر کیسا مزہ چکھاؤ گی... اور کیسے؟

کتنا اچھا ہوتا اگر آج خود ہی اپنا استعفیٰ پیش کر دیا ہوتا۔ کاش' اس نے ایسا ہی کیا ہوتا۔ ڈیڈی کا خیال نہ کیا ہوتا۔ اسی طرح اس کے منہ پر جوتا مارا ہوتا مگر افسوس' صد افسوس' انتقام لینے کا ایک اچھا موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ لیکن میں' اسے بخشوں گی نہیں۔ دیکھنا تو ایسا بدلہ لوں گی اس بے عزتی کا ساری زندگی سر پر ہاتھ رکھ کے رویا کرے گا۔

دیکھنا تو سہی۔

مارے غصے کے وہ کمرے میں دیوانہ وار ٹہل رہی تھی۔

اس نے خط کو اٹھا کر دوسری مرتبہ پڑھا۔ پھر تیسری مرتبہ پڑھا۔

ایسی ہتک آمیز زبان' میں اس کی زر خرید تو نہیں ہوں۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے۔ اس نے غصے سے خط کے پرزے پرزے کر دیے اور پھر ان پرزوں کو اپنے جوتوں سے خوب روندا۔

میرے جوتے کو بھی تمہاری پرواہ نہیں۔ کمینے انسان' تم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو۔ دیکھنا تو سہی۔ میں تمہارا کیا حشر کروں گی!

"مگر کیسے؟" یہاں آ کر اس کا غصہ دو چند ہو جاتا۔ ایک تو بیچ میں خواہ مخواہ ڈیڈی آ جاتے تھے ورنہ اپنے پورے گینگ کو لے کر وہ دفتر پر دھاوا بول سکتی تھی' دفتر کی اینٹ سے اینٹ بجوا سکتی تھی۔ تباہ کروا سکتی تھی۔ آگ لگوا سکتی تھی۔ اس کا جلوس نکلوا سکتی تھی۔

پھر وہی ڈیڈی۔

اب تو کوئی ایسا راستہ اختیار کرنا چاہیے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ ڈیڈی کو بھی خبر نہ ہو اور اس اُلو کے پٹھے کو چٹنی کا دودھ بھی یاد آ جائے۔ اچھا' صبح جا کر پہلے

نوی سے مشورہ کرے گی۔ نوی نے اس لڑکی کو اغوا کرالیا تھا جس نے ایک بار فلک ناز کو کلب میں برا بھلا کہا تھا۔ ہاں وہ جانتی تھی کہ لوگوں کو کس طرح خریدا جا سکتا ہے۔

تمام رات وہ اسی آگ میں جلتی رہی۔ کھانا بھی نہ کھا سکی اور نہ ڈرائنگ روم میں جا کر کسی سے آنکھ ملا سکی۔ کیا خبر اس کے خطرناک موڈ سے لوگ عجیب و غریب قسم کے اندازے لگانے کی کوشش کرتے اور خصوصاً" ڈیڈی کو تو بالکل معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ اسے دفتر سے نکال دیا گیا ہے ورنہ پھر کوئی منصوبہ کامیاب نہیں ہو سکے گا۔

ایک ہفتے تک وہ اپنے ذہن میں منصوبے باندھتی رہی۔ مگر صبح اٹھ کر وہ حسبِ معمول گھر سے نکل جاتی اور شام کو گھر آجاتی۔ گھر میں بھی کسی سے کوئی خاص بات نہیں کرتی تھی۔ دن رات وہ ایک عجیب سی آگ میں جل رہی تھی۔ وہ جتنی شدت سے کوئی خطرناک منصوبہ بناتی' اتنی ہی ناکامی سے وہ فیل ہو جاتا اور پھر نئے سرے سے سوچنا شروع کر دیتی۔

اتوار کے روز ڈیڈی اس کے کمرے میں آئے اور بولے "فلکی بیٹا! آج کل تم نظر نہیں آتی ہو نہ ہی گپ لگاتی ہو۔ کیا دفتر میں کام زیادہ ہوتا ہے؟"

"نہیں تو ڈیڈی۔" وہ اپنے دل کا چور چھپاتے ہوئے بولی "دراصل میری صحت کچھ ٹھیک نہیں ہے اور میں..."

"ارے' تو مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ چلو' تمہیں ڈاکٹر سلطان کے ہاں لے چلوں اور چیک اپ کرا دوں۔"

"نہیں ڈیڈی۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ مسلسل کام کرنے سے میرے سر میں مسلسل درد رہنے لگا ہے۔"

"تو کچھ دن کی چھٹی کر لو۔"

توبہ ہے۔ اس نے دل میں کہا۔ بات ہی نہیں بن رہی۔

"اچھا سنو۔" ڈیڈی بولے "میں ایک ضروری کام سے تمہارے کمرے میں آیا تھا۔ وہ ہے نا اپنا آفاق؟" بڑی سادگی سے بولے۔

"جی۔" فلک ناز کو ایسا محسوس ہوا جیسے ابھی ایک بم دھماکے کے ساتھ پھٹے گا۔ جانے ڈیڈی کیا کہیں گے اور اس اُلو کے پٹھے کا کیا ہو گا۔

"جی۔" ڈیڈی رک گئے تھے اور الجھن ہو رہی تھی۔ کہہ کیوں نہیں ڈالتے۔

"آفاق ہے نا آفاق۔"

"جی... جی..." اس نے تلخی سے کہا۔

"بیٹی۔" وہ اور نرم ہو گئے۔ "اس نے تمہارے لیے پرپوزل بھیجا ہے۔"

"ڈیڈی.....؟" فلک ناز اتنے زور سے چیخی کہ ڈیڈی اپنی جگہ پر اچھل پڑے۔

"کیا ہوا بیٹی! میں نے کوئی بہت بری بات کہہ دی ہے؟"

"ڈیڈی... ڈیڈی..." فلک ناز کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا اور گھبرا کر وہ بستر پر بیٹھ گئی۔

"بیٹی! یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارے مشورے کے بغیر تمہاری زندگی کا فیصلہ کروں۔ تمہیں سب اختیار ہے۔ ویسے تو آفاق اچھا لڑکا ہے لیکن اگر تمہیں کسی وجہ سے پسند نہیں تو میں تمہیں کبھی مجبور نہیں کروں گا۔ میں اپنی لائبریری میں جا رہا ہوں۔ اگر تمہیں یہ رشتہ منظور ہو تو وہاں آجانا۔ آفاق کل شام جواب لینے آئے گا۔ اگر تمہیں منظور نہیں ہے تو آرام کرو۔ گھبراؤ نہیں۔ میں اسے صاف صاف کہہ دوں گا۔"

یہ کہہ کر ڈیڈی باہر چلے گئے۔

"خدایا۔" فلک ناز کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آرہا تھا۔ یہ کیسے عجیب و غریب واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ کہاں تو اتنی بے اعتنائی کہ دفتر میں آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ پھر بغیر کسی بڑی غلطی یا نوٹس کے دفتر سے نکال دیا اور اب شادی پر تُلا ہوا ہے۔ کتنا عجیب انسان ہے۔ آدمی ہے یا معمہ۔ خواہ مخواہ الجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

ہاں فلک ناز! یہ موقع ہے انتقام لینے کا۔ قدرت نے خود ہی موقع فراہم کر دیا ہے۔ صاف صاف جواب دے دے۔ کہہ دے کہ تیرے جیسے فضول اور بے حس آدمی سے میں شادی نہیں کر سکتی۔ تیرے ساتھ شادی کرنے سے بہتر ہے میں خود زہر کا پیالہ اپنے منہ سے لگا لوں۔ تیرے جیسے بگلا بھگت آدمی کے ساتھ رہنے سے بہتر ہے میں زندگی بھر کنواری رہوں۔ ہاں ہاں اس کے منہ پر تھوک دے جا کر۔ خود ہی جواب دے دے۔ فون کر دے۔ اگر خود نہیں جا سکتی تو ڈیڈی کو بیچ میں کیوں ڈالتی ہے۔

ٹھیک ہے' وہ اٹھ بیٹھی۔ یہی موقع ہے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کا۔ انتہائی ہتک آمیز لہجے میں جواب دینا چاہیے۔

"ضرور..... ضرور..... یہی موقع ہے' یہی موقع ہے....."

وہ پھر دیوانہ وار کمرے میں ٹہلنے لگی۔

ہاں تو اس نے میرا رشتہ مانگا ہے۔ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ مجھ سے شادی... ہونہہ....

کیا کیا..... کہیں وہ سچ مچ تو مجھ سے محبت نہیں کرنے لگا۔ اس کے دل سے ایک آواز آئی۔

بعض لوگوں کی محبت کا انداز ہی ایسا ہوتا ہے۔ بظاہر بے نیاز بنے رہتے ہیں' اجنبیوں کی طرح ملتے ہیں اور اپنے آپ میں رہتے ہیں مگر اندر ہی اندر پگھل جاتے ہیں۔

اسے کئی فلمی کہانیاں یاد آنے لگیں۔

بھلا بغیر تعلق کے کوئی رشتہ مانگ سکتا ہے۔ اس نے مجھے اچھی طرح دیکھا ہے۔ مجھے جانتا ہے اور سنجیدگی کے ساتھ اس نے رشتہ مانگا ہے۔ وہ بھی ڈیڈی سے۔ اگر مجھے براہِ راست کہہ دیتا تو میں اسے مذاق سمجھتی۔ کم از کم لڑکی کے باپ سے کوئی مذاق نہیں کر سکتا۔

تو فلک ناز! دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔

اندر سے تو وہ بھی مر مٹا ہے۔ اوپر سے تن رہا ہے۔ شاید دفتر کی وہ اجنبیت زیادہ دن برداشت کرنا اس کے بس میں نہ ہو۔ اسی خاطر اس نے مجھے دفتر سے نکال دیا اور بڑے ڈرامائی انداز میں نکالا تاکہ بعد میں مجھے اپنا لے۔

اور فوراً ہی رشتہ بھی مانگ لیا۔

ہاں... ہاں عقل مانتی ہے۔

پر وہ یہ سب باتیں مجھ سے بھی تو کہہ سکتا تھا۔

بے وقوف اگر وہ اس قابل ہوتا تو دفتر میں یوں اجنبی نہ بنا رہتا۔ بعض مرد اوپر سے بڑے طرّم خاں بنے رہتے ہیں مگر اندر سے بودے ہوتے ہیں۔ ذرا سی بات کہنے کا بھی ان میں حوصلہ نہیں ہوتا۔

ہاں ٹھیک ہے۔

مسکرا کر وہ کھڑی ہو گئی۔

تھوڑی ہی دیر میں اس کے سارے خیالات پلٹا کھا گئے تھے۔ کچھ دیر پہلے وہ آفاق سے انتقام لینے کے منصوبے بنا رہی تھی اور اب اس نے اس کی ساری جفائیں ایک دَم فراموش کر دی تھیں۔ اس کی بیگانگت اور سرد مہری کو بھول گئی تھی۔ اس کی کج ادائی میں محبت کی ہر ادا نظر آ رہی تھی اس لیے اس نے اسے دل سے معاف کر دیا۔

بزدل ہے کم بخت۔ عاشق بزدل ہوتے ہیں۔ اب اس کو اور کیا تڑپانا۔

ہاں تڑپانے کا وقت تو شادی کے بعد آئے گا۔ دیکھنا تو سہی۔

گن گن کر بدلے لوں گی۔ تلوے نہ چٹوائے تو میرا نام فلکی نہیں۔

بس اب بازی میرے ہاتھ میں رہے گی۔

لیکن اف... یہ کیا... دس بج گئے۔ ڈیڈی تو سو بھی گئے ہوں گے اگر ان کو آج اپنا عندیہ نہ بتایا تو وہ کل انکار کر دیں گے۔ غضب خدا کا۔ غضب ہو جائے گا۔

جلدی جلدی اس نے اپنا جوتا ڈھونڈا۔ بال سنوارے اور دوڑتی ہوئی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ ہانپتی کانپتی دَھم سے اندر پہنچی تو دیکھا ڈیڈی اطمینان سے ایزی چیئر پر بیٹھے کتاب پڑھ رہے تھے اور پائپ پی رہے تھے۔

"کیوں۔ کیا ہوا فلکی؟"

انھوں نے مڑ کر ہراساں سی فلکی کو دیکھا اور ملائمت سے پوچھا۔

"وہ ڈیڈی.... وہ۔"

"کیا ہو...؟"

"وہ... میں بتانے آئی تھی۔"

"کیا بتانے آئی تھیں۔"

"وہ جو آپ پوچھ رہے تھے۔"

"کیا پوچھ رہا تھا میں۔"

"اُفوہ' ڈیڈی' آپ کا حافظہ کتنا کمزور ہے۔"

"تو بیٹی! تم ہی یاد دلا دو۔"

"ابھی ابھی آپ... وہ.... میری بات کر رہے تھے۔"

"وہ ڈیڈی' آفاق۔"

"آفاق...؟"

"جی آفاق والی بات۔"

"آفاق والی بات.....؟ اچھا...." ڈیڈی قہقہہ لگا کر ہنسے "اچھا اچھا میں تو بھول ہی گیا تھا۔ اگر تمہیں آفاق پسند نہیں تو کوئی بات نہیں۔ اتنی خوف زدہ کیوں ہو؟"

"نہیں ڈیڈی۔ آپ سمجھتے کیوں نہیں؟" اور وہ سچ مچ رونے لگی ایسی بھی کیا بات ہے۔ خود ہی انھوں نے کہا۔ اگر تمہیں منظور ہو تو اسٹڈی میں آ جانا اور اب.... وہ لاکھ نئے زمانے کی روشن خیال اور صاف گو لڑکی سہی مگر پھر بھی کیسے ایک دَم سے کہہ دے کہ اسے آفاق کے

ساتھ شادی ہر قیمت پر منظور ہے۔

وہ روئے جا رہی تھی۔

ڈیڈی اٹھ کر اس کے قریب آگئے اور بولے۔ "صاف صاف کہو تمہیں کیا پریشانی ہے؟"

"پریشانی...؟" اسے ایک دم غصہ آگیا۔

"پریشانی کیا ہونی تھی۔ آپ نے کہا تھا۔ آفاق نے پروپوزل دیا ہے تو میں بتانے آئی تھی۔ مجھے منظور ہے' منظور ہے۔" وہ چیخی.... اور پھر رونے لگی۔

"اوہو تو اس میں رونے کی کیا بات ہے؟ میں تو بھول ہی گیا تھا۔" ڈیڈی اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

"اچھا اچھا... میں سمجھا۔ میرا خیال غلط نکلا۔ میں سوچ رہا تھا شاید تمہیں یہ رشتہ منظور نہیں۔ تو پھر ٹھیک ہے۔"

ڈیڈی اپنا پائپ سلگانے لگے۔

توبہ ہے جو کبھی ڈیڈی مکمل بات کر جائیں۔ ہمیشہ بات توڑ موڑ کے کریں گے۔ "تو ٹھیک ہے۔"

"اب تم جاؤ آرام کرو اور سنو اب دفتر جانا بند کردو۔"

اونہہ۔ اس نے کندھے اچکائے اور جلدی سے باہر آگئی۔ کمرے میں آکر اس نے اطمینان کی سانس لی۔ کچھ دیر تو حالات کی تبدیلی پر حیرت زدہ سی رہی اور پھر جلد ہی نئے خوابوں میں کھو گئی۔

صبح ہوئی پھر شام ہوگئی۔

اور اس طرح ایک ہفتہ گزر گیا۔

ایک ہفتہ اس طرح سکون اور رسان سے گزر گیا۔ جیسے گھر میں کچھ ہوا ہی نہیں۔ ہر روز وہ اس خیال سے اٹھتی کہ آج ضرور کچھ ہنگامہ ہوگا۔ لوگ آئیں گے۔ کچھ تو ہوگا۔ شام تک انتظار میں بیٹھی رہتی اور کچھ بھی نہ ہوتا۔ ایک بات اس کے کان میں ڈال کے جیسے گھر والے بھول گئے تھے۔ وہ تجسس کے نیزے پر لٹکی ہوئی تھی۔ آخر کیا فیصلہ ہوا؟ ڈیڈی تو سدا کے بھلکڑ ہیں۔ اگر بھول گئے ہوں۔ پر اتنی بڑی باتیں کوئی اس طرح تو نہیں بھولا کرتا۔ کیا خبر آفاق کا خیال ہی بدل گیا ہو۔ وہ جواب لینے نہ آیا ہو اور اب ڈیڈی مارے شرم کے اسے نہ بتا رہے ہوں۔

اف اللہ۔ کس قدر بے باک اور دلیر تھی وہ اور اب کیسی بزدل بنی جا رہی تھی۔ اتنی سی بات وہ فون کر کے آفاق سے پوچھ سکتی تھی مگر اس کا مزاج پیش نظر رکھتے ہوئے وہ ڈرتی تھی کہ جانے کب اسے کون سی بات بری لگے۔ یوں اس نے کبھی کسی کی پرواہ تھوڑی کی تھی۔ پر آفاق کو تو اس نے جیتنا تھا اور جیتے بغیر وہ اپنا مقصد حل نہیں کر سکتی تھی۔

ممی بھی اپنے آپ میں مگن رہتی تھیں۔ صبح کو کافی پارٹیاں اور شام کو کلب۔ ممی کو تو ویسے بھی اس سے بات کرنے کی فرصت نہ ملا کرتی تھی مگر اب تو انھیں اس اہم معاملے میں ذرا دلچسپی لینی چاہیے تھی۔ ایسی بھی کیا بے نیازی....؟

ایک ہفتہ گزر گیا تھا۔

اور کسی نے اسے نہیں بتایا تھا کہ بات کہاں تک پہنچی ہے اور اس قدر خاموشی کیوں طاری ہے۔ اس روز وہ غصے میں بھری بیٹھی تھی۔ جونہی ممی تیار ہو کر باہر آئیں' لپک کر انھیں پکڑ لیا اور بولی "مم' کبھی تو گھر بھی بیٹھا کریں۔"

"اے' آج تجھے کیا ہوا ہے اور گھر بیٹھ کر میں کیا کروں۔ تمہارے باپ کو تو اپنے کاروبار سے ہی فرصت کہاں ہے؟"

"اور میں جو ہوں۔ کئی دنوں سے دفتر نہیں جا رہی۔ گھر بیٹھی بیٹھی بور ہو گئی ہوں۔"

"تیری بورسٹ بھی چند دنوں میں دور ہو جائے گی۔"

"ممی پلیز... کچھ تو بتائیں نا؟ مجھے تو کچھ بھی پتہ نہیں۔" وہ ممی کی گردن میں جھول گئی۔

"لے۔ مجھے اور دیر کرا رہی ہے۔ تیری بات اس آفاق سے طے ہو گئی ہے۔"

"سچ ممی...."

"ہاں۔ ہفتہ ہوا اور وہ تو بڑی جلدی شادی کی تاریخ مانگ رہا تھا۔ کیا تمہارے ڈیڈی نے نہیں بتایا۔"

"نہیں۔"

"بڑے غبطی ہیں۔ خود ہی تو مجھے بتا رہے تھے کہ آفاق پندرہ دن کے اندر اندر شادی کرنا چاہتا ہے۔"

"تو مجھے کیوں نہیں بتایا۔" مارے خوشی کے فلک ناز ٹھمکنے لگی۔

"اب جو بتا دیا ہے۔ اس وقت تو جانے دے۔ صبح مجھے اپنی چیزوں کی لسٹ بنا کر دے دینا۔"

"ممی.. ممی...." وہ اس کے پیچھے دوڑی۔ "یہ تو بتا دیں پلیز کہ کونسی تاریخ طے ہوئی ہے؟"

"تیرے ڈیڈی کو پتہ ہوگا۔" انہوں نے اپنا پلّو چھڑایا۔

لیکن اب اسے ڈیڈی سے بات کرنے کی اتنی تمنا بھی نہ تھی۔ اصل بات اسے معلوم ہو گئی تھی۔

اور اتنی بڑی بات کسی نے اسے بتانی مناسب بھی نہیں سمجھی۔ واہ' انھیں کیا پتہ کہ اس کے لیے اس خبر میں کیا ہے۔ وہ کیسے دنیا کو بتائے۔ بار بار دل چاہ رہا تھا کہ فون اٹھائے اور آفاق سے بات کرے۔

"مگر کیوں؟"

جس طرح آفاق سب کچھ اپنے پروگرام کے مطابق کرکے اسے تنگ کر رہا ہے' اسی طرح اسے بھی تنگ کرنا چاہیے۔ بے نیاز بن جانا چاہیے جیسا کہ اسے بھی کچھ خبر نہیں کہ کیا ہو رہا ہے اور کون کر رہا ہے۔ وہ یہ خبر اپنے پورے گینگ کو سنانا چاہتی تھی۔ خصوصاً" پنکی کو اور کس قدر حیران ہوں گے وہ لوگ کہ آخر میں نے میدان مار ہی لیا نا؟

"بڑا بنتا تھا میرے آگے شہزادہ گلفام....

ابھی وہ فون کرنے جا رہی تھی کہ سامنے سے ڈیڈی آتے نظر آئے۔

"او' ڈیڈی۔" وہ ان کے گلے میں جھول گئی۔ "بڑے خراب ہیں آپ۔"

"کیوں بیٹی؟"

"بس مجھے کچھ بتاتے نہیں' خود ہی سب کچھ کیے جاتے ہیں۔"

"لو اور سنو...."

"دیکھو' میں دعوتی رقعوں کے نمونے لایا ہوں۔ تم سے پسند کروانے۔"

"ہائے اللہ' ڈیڈی..."

اس نے جھپٹ کر لفافے پکڑ لیے اور باری باری کارڈ نکال کر دیکھنے لگی۔

"یہ ذرا اِدھر بیٹھ جاؤ اور اطمینان سے میری بات سنو۔"

"آفاق بہت جلد شادی کی تاریخ مانگ رہا تھا اس لیے میں نے اسے یکم جنوری کی تاریخ دے دی ہے۔ ٹھیک ہے نا؟"

"ونڈر فل ڈیڈی۔ فرسٹ کو تو میری برتھ ڈے ہوا کرتی ہے۔"

"بس اسی دن میں تمھیں زندگی کا بڑا تحفہ دینا چاہتا ہوں۔"

فلک ناز شرما گئی۔

"کارڈ پسند کرلو۔ تین روز میں چھپ جائیں گے۔ باقی دس دن ہیں۔ جہاں جہاں بھجوانے ہوں۔ میرے اسٹینو کو بُلا کر بھجوا دینا اور ان دس دنوں میں جو چیزیں بنوا سکتی ہو' بنوا لو۔ باقی پھر لے جانا۔ بیٹی' اس گھر میں جو کچھ ہے۔ تمھارا ہی ہے۔"

خوشی سے فلک ناز کا انگ انگ ناچ اٹھا۔

فون اٹھایا اور یہ دھماکہ خیز خبر سارے گینگ کو سنادی۔ مبارک باد کا شور مچ گیا۔ طے پایا کہ سب لوگ رات کو اس کے ہاں دھاوا بولیں گے اور اسے اچانک بندوبست کرنا پڑے گا۔ تو یہ وہ اتنی خوش تھی کہ دونوں جہاں لٹا سکتی تھی اور رات کو اپنی کچھ سہیلیوں کے ساتھ یہ بھی طے کرنا تھا کہ کل سے جو شاپنگ کرنے کی مہم شروع ہوگی۔ اس میں کون کون حصہ لے گا۔

رات بھر فلکی کو نیند نہیں آئی۔ اس قدر ہیجان تھا جذبات میں کہ توبہ۔ اس نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اس طرح وہ "انا" فانا" شادی کے لیے رضامند ہو جائے گی۔ وہ تو کہتی تھی' عورت کو تیس سال تک لائف انجوائے کرنی چاہیے اور پھر کوئی بے وقوف سا آدمی دیکھ کر شادی کرلینی چاہیے۔

اور اب' گئی تھی وہ آفاق کو دیوانہ بنانے اور خود پاگل بن گئی۔ کیا واقعی وہ آفاق سے محبت کرنے لگی تھی۔

ہائے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے دل پکڑ لیا۔ کم بخت کہہ رہا تھا "ہاں!"

مگر یہ ہوا کیسے؟ وہ تو گھائل کرنے کی قائل تھی۔ کئیوں کو کر چکی تھی اور کئیوں کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ کتنے لڑکے اور امیرزادے اس کے پیچھے دیوانے تھے۔ کتنوں کے ساتھ وہ محبت کا کھیل رچا چکی تھی۔ محبت سوائے بے وقوفی کے کچھ نہیں' اس کا فلسفہ تھا۔ مرد تو بے وقوف ہوتا ہے۔ اس کو اچھی طرح بے وقوف بنا کر اپنا مطلب نکالنا چاہیے۔ پاگل ہوتی ہیں وہ لڑکیاں جو اُن پر جان لٹاتی ہیں۔ اپنے آپ کو تباہ کرلیتی ہیں۔ آخر انھیں کیوں نہ تباہ کیا جائے۔

ہمیشہ اپنے حواسوں میں رہنا چاہیے۔ اسے کئی لڑکے اچھے لگے تھے مگر چند روز کی دوستی کے بعد اس نے انھیں ٹھکرا دیا تھا۔ اس میں ٹھکرانے کا حوصلہ تھا۔ اس میں غرور تھا۔ تکبّر تھا۔ اس کے پاس جوانی تھی اور اللہ نے اس کی جوانی کو ہر فالتو نعمت سے مالا مال کیا تھا۔ پھر کیوں وہ اپنی جوانی کو داؤ پر لگاتی بلکہ اب تک وہ دوسروں کو اپنی جوانی پر نثار کرتی آئی تھی۔

اور آج...

کتنے عجیب طوفان اس کے دل میں اٹھ رہے تھے۔ آگ تھی' حدّت تھی۔ دل ماہی بے آب ہو رہا تھا۔ وہ دشمن جاں ایک پل تصوّر سے اوجھل نہیں ہوتا تھا۔ اس سے ملنے کی تڑپ بڑھ رہی تھی۔ اس کا قرب حاصل کرنے کو دل بے تاب تھا۔ اس سے ملنا' اس سے باتیں کرنا۔ اس سے پیار کرنا۔ انوکھی انوکھی خواہشیں دل میں جاگ رہی تھیں۔ اچھا تو اسے محبت کہتے ہیں۔ اگر یہ محبت ہے تو واقعی محبت بڑی پیاری اور انمول شے ہے اور کتنی بدنصیب تھی۔ اس جذبے کا مذاق اڑاتی رہی۔ اچھا تو اس لیے لوگ کہتے ہیں' محبت کی نہیں جاتی' ہو جاتی ہے اور محبت انسان کو بالکل بے اختیار بنا دیتی ہے۔

واہ' محبت تو بڑی شاندار شے ہے۔

اور دنیا بھر کی کتابیں اس کی تعریف میں بھری پڑی ہیں۔ تو یہ کوئی فضول شے نہ تھی۔

آج محبت میں تڑپنا' سسکنا اور سلگنا اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ بار بار دل چاہتا' وہ آفاق کو فون کرے' اس کے جذبات معلوم کرے۔ وہ بھی تو اسی کے بارے میں سوچ رہا ہوگا۔

کتنا دل چاہ رہا تھا' یہ پوچھے کہ وہ اس کے تیرِ نگاہ کا گھائل کب ہوا۔ پہلے پہل کب اس کا دل سرنگوں ہوا اور اس نے اپنے دل سے کب ہار مانی۔

ایک ستم کیش جفا جُو محبوب سے ملنا اور اس کی قلبی واردات کے بارے میں جاننا زندگی کا کتنا خوبصورت مرحلہ ہے۔

اور وہ جلد از جلد اس مرحلے سے گزرنا چاہتی تھی۔

اس نے سوچا۔ رات سونے سے پہلے اسے ضرور فون کرے گی۔ پھر کیا ہوا۔ یہی کہے گا نا کہ کیسی بے باک لڑکی ہے۔ تو کہنے دو۔ اپنے منگیتر کو فون کرنا کوئی معیوب بات نہیں ہے۔

کھانا کھانے کے دوران بھی وہ دل ہی دل میں سوچتی رہی کہ کیا بات کرے گی اور کیسی بات کرے گی۔ پہلے اسے تنگ کرے گی۔ کیا خبر وہ اس کی آواز پہچان ہی لے۔

پتہ نہیں ممی اور ڈیڈی کیا باتیں کر رہے تھے۔ اس نے سنا ضرور مگر جب آفاق کا نام اس کے کان میں پڑا تو وہ چونک اٹھی۔

"ڈیڈی۔" بے اختیار بولی۔ "آپ کیا کہہ رہے تھے؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"ابھی شاید۔" وہ جھجکی۔ "کوئی آفاق کی بات کر رہے تھے۔"

"ہاں' تمہاری ممی کہہ رہی تھی کہ مہندی وغیرہ کی رسم ملے کر لیتے مگر میں اسے بتا رہا تھا کہ

آفاق ان رسم و رواج کا قائل نہیں اس نے تو سیدھی سادی شادی کے بارے میں کہا ہے۔"

"ممی' آپ خود بات کر لیں نا؟" وہ ماں سے مخاطب ہوئی۔

"یہ کیا بات کرے گی وہ تو یہاں نہیں ہے۔ امریکہ گیا ہوا ہے۔"

"امریکہ...." چمچ فلکی کے ہاتھ سے گر گیا۔

"یعنی امریکہ اور چار دن بعد یہاں۔" ڈیڈی زور سے ہنسے۔

"ہاں بھئی مجھے بتا کر گیا ہے۔ اس کی ماں ابھی تک واشنگٹن میں ہے۔ شادی کے بارے میں اس سے مشورہ لینا تھا اور شاید اسے ساتھ ہی لے آئے کیونکہ یہاں اس کا کوئی عزیز نہیں ہے۔"

"خداوندا!" سخت بور ہو کر فلکی میز سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ کتنے عجیب و غریب واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ ایک طرف شادی کی جلدی۔ دوسری طرف عین وقت پر امریکہ سدھار گیا اور اگر وقت پر وہاں سے نہ آسکا اور اگر اس کی ماں نے یہ شادی منظور نہ کی تو....."

افوہ۔ قیامت ہی تو آجائے گی۔"

توبہ۔ کس قدر اُلو کا پٹھا ہے۔ اس کا خون پھر کھولنے لگا۔ ہر بات کا رومانس ہی ختم کر کے رکھ دیتا ہے۔ آج وہ کتنی باتیں اس سے کرنا چاہتی تھی اور وہ اسے ایک نئی اُلجھن میں گرفتار کر کے چل دیا۔ خدا جانے کیسا آدمی ہے؟

اور میرا کیا حشر ہوگا۔ اس کی کوئی بات ڈھنگ کی نہیں۔ خدا کرے کہ ذہنی طور پر ٹھیک ہو۔ میں نے بھی سوچے سمجھے بغیر یہ جوا کھیل لیا۔

افوہ!

اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ طرح طرح کے وہم ستا رہے تھے۔ یعنی... سوچو تو ذرا۔ چار دن شادی میں رہ گئے اور حضور امریکہ سدھار گئے! اور ڈیڈی کو دیکھو۔ ڈیڈی کو اس کی کوئی بات بھی عجیب یا بری نہیں لگتی۔ پتہ نہیں ڈیڈی کو اس نے کیا گھول کر پلا دیا ہے۔

تو اپنے دل سے کیوں نہیں پوچھتی۔ تجھے تو اس نے کچھ بھی گھول کر نہیں پلایا مگر تو اس کے پیچھے کیسی دیوانی ہو رہی ہے۔

دیوانی سی دیوانی.... توبہ ہے...

ایک بار میرے ہاتھ آلے۔ اس کا وہ حشر کروں گی..... وہ حشر کروں گی..... وہ حشر کروں گی!

گھر میں شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ کارڈ تقسیم ہو گئے۔ کھانوں کی فہرستیں بن گئیں۔ ہر روز گھر میں منتظمین کی ایک ٹولی آتی جسے ڈیڈی سارے انتظام کے متعلق ہدایات دیتے۔ سارے گھر میں نئے پینٹ ہو گئے۔ ایسے جیسے اس کوٹھی کی شادی ہو اور اسے دلہن کی طرح سجایا جا رہا ہو اور تو اور ممی بھی اپنے سارے مشغلے چھوڑ کر شادی کے انتظامات میں لگی رہتیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ ان کی ساری سہیلیاں صبح کو آن دھمکتیں اور ایک کافی پارٹی کی سی کیفیت ہو جاتی۔ بہرحال یہ سب بھی اچھا لگتا۔

ممی کو اس کے ساتھ ساتھ اپنے کپڑوں کی بھی بہت فکر تھی۔ اس طرح لگتا جیسے ہر ایک چیز ممی اپنے لیے بھی بنوانا چاہتی ہوں۔ انھوں نے تو باقاعدہ زیورات بھی خریدے مگر چونکہ ڈیڈی نے کبھی ان کے معاملے میں دخل نہیں دیا تھا بلکہ چوں چرا کرنے کی ہمت نہیں تھی اس لیے کچھ نہیں کہتے تھے۔ بس ہنستے رہتے تھے۔ شاپنگ کے لیے فلک ناز کو دس دن ملے تھے اور ان دس دنوں میں بھی فلک ناز نے سینکڑوں چیزیں خریدلی تھیں اور ہزاروں روپیہ پھونک ڈالا تھا۔ یوں تو اس گھر میں جو کچھ تھا' فلک ناز کا تھا۔ ممی نے پہلے سے بھی بے شمار کپڑا اور زیور اس کے لیے بنوایا ہوا تھا مگر اب وہ جدید طرز کی ہر شے خریدنا چاہتی تھی اور بے دریغ روپیہ خرچ کر کے اس نے بے شمار دیدہ زیب اور فیشن ایبل ملبوسات سلوائے تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ میچ کرتے ہوئے زیورات بنوائے تھے۔ جوتے اور پرس بھی اتنے ہی زیادہ تھے۔ گھر کی ہر ایک چیز کا آرڈر ڈیڈی نے پہلے ہی دے دیا تھا۔

کون سی نعمت تھی جو اسے نہیں مل رہی تھی۔

اس کا زیادہ وقت اپنے شاہانہ جوڑے کی ڈیزائننگ میں لگا تھا۔ وہ ساری دنیا سے انوکھا' نرالا جوڑا پہننا چاہتی تھی۔ ایسا نہ ہوا اور ویسا نہ ہو۔ اپنی ساری سہیلیوں کے ساتھ گھوم گھوم کر اس نے بہت مہنگا اور خوب صورت کخواب پسند کیا تھا۔ دوپٹے اور قمیص پر ہزاروں کا کام کروا

تھا۔ ہم رنگ جوتی پر سونے کے گھنگرو لگوائے تھے اور ویسے ہی گھنگرو اس کے پرس پر بھی لگ رہے تھے۔ اس روز اس نے جو زیورات کا سیٹ پہننا تھا وہ سچے یاقوت سے بنوایا تھا۔ صرف سیٹ کی قیمت پانچ لاکھ روپے تھی۔ غرارہ سوٹ پر ایک لاکھ روپے خرچ ہوئے تھے۔ سب سہیلیاں کہتی تھیں اس نے شہزادیوں جیسا لباس بنوایا ہے۔ اسے پہن کر وہ واقعی ملکہ لگے گی...

مگر وہ نہ جانتی تھیں کہ فلک کے دل میں کیا ہے۔

فلک کی اندرونی کیفیت عجیب و غریب تھی۔ وہ چاہتی تھی پہلی رات وہ دنیا کی حسین ترین عورت کی صورت میں اس کے سامنے پیش ہو۔ اتنی شاندار' اتنی دلکش اتنی بلند اور اتنی دل میں اتر جانے والی لگے کہ سامنا ہوتے ہی آفاق بھسم ہو جائے۔ جل جائے۔ اس کے قدموں پر آگرے۔

پہلے سجدے کے بعد وہ اسے اٹھنے کی مہلت نہ دے گی۔

اس کی نظر میں عورت کا ظاہری حسن ہی دنیا کی سب سے بڑی حقیقت تھی۔ اس حقیقت کو کئی بار منوا بھی چکی تھی۔ وہ جانتی تھی حسین عورت کے آگے مرد بالکل پالتو جانور کی طرح دُم ہلانے لگتا ہے۔

وہ چاہتی تھی آفاق کے گلے میں اپنے حُسن کی زنجیر ڈال دے۔ اس طرح کہ اس کے اشارے کے بغیر وہ جنبش بھی نہ کر سکے۔

وہ مرد کو غلام کرنے والا مزاج لائی تھی اسی لیے وہ پہلے پہل شادی کی قائل نہ تھی۔ وہ کہتی تھی شادی کا پھندا جلدی اپنی گردن میں نہیں ڈالنا چاہیے لیکن اگر شادی ہو جائے تو مرد کی تمام تر دنیا صرف ایک عورت کے گرد گھومنی چاہیے... ہاں... ایک اور بات بھی وہ کہتی تھی کہ حسین عورت کو اس آزاد دنیا میں آزادانہ رہنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ خوب صورت مجسمہ اس لیے ہوتا ہے کہ اسے پوجا جائے' چاہا جائے' دیوانہ وار دیکھا جائے۔ خوب صورت عورت سرکس میں پڑی ہوئی اس حسین گڑیا کی مانند ہے جسے ہر راہ گیر دلچسپی سے دیکھتا ہے بلکہ اس کے لیے ذرا دیر کھڑا بھی ہو جاتا ہے۔ یہی حسن کا خراج ہے اور حسن کو ہمیشہ خراج ملنا چاہیے۔ مرد کو اس معاملے میں تنگ نظر نہیں ہونا چاہیے خود تو یہ لوگ دنیا جہان کی آزادیاں مانگ لیتے ہیں مگر عورت کو پنجرے میں قید کر کے رکھتے ہیں۔ پنجروں سے اسے نفرت تھی۔ وہ اطلس یا کخواب کے ہوں یا لوہے کے۔

البتہ مرد کے لیے وہ ایک زنجیر کی ضرور قائل تھی۔

اتنی شاندار تیاری کے باوجود' بیش قیمت کپڑوں اور ہوش رُبا گہنوں کے باوجود اس کا مضطرب سا تھا۔ نہ جانے یہ کیسا اضطراب تھا!

اسے اپنے بارے میں کوئی احساسِ کمتری بھی نہ تھا۔

یوں بھی وہ مَردوں کے بارے میں بہت کچھ جانتی تھی۔ حجاب کا اس کی تربیت میں کوئی د نہیں تھا۔ ہر کام بے حجابانہ کرتی تھی۔

بڑی خود اعتماد تھی اور ڈیڈی کی دولت اس کا دوہرا اعتماد تھا۔ اگر کوئی عورت بیک وق دولت اور حسن کی دولت سے مالا مال ہو تو اسے گھبرانا نہیں چاہیے۔ حالات ہمیشہ اس کا سا دیتے ہیں۔

مگر کبھی کبھی وہ گھبرا جاتی۔ پتہ نہیں آفاق کیسا ہوگا۔ ابھی تک تو امریکہ سے نہیں آیا تھا۔ روز وہ اس آس پر بیدار ہوتی کہ کوئی اسے آفاق کے آنے کی اِطّلاع دے گا مگر سارے گ والے کیسے مطمئن تھے جیسے انھیں یقین ہو کہ آفاق ضرور آئے گا اور ان کے یقین پر کبھی کبھی بھی مطمئن ہو جاتی اگر انھیں فکر نہیں تو مجھے کیوں ہو۔

اور پھر دل کو جانے کچھ کچھ ہونے لگتا۔ پتہ نہیں کیسی گھبراہٹ طاری ہو جاتی۔ کچھ سمجھ آتی۔

پھر وہ تصوّر کرتی کہ وہ دلہن بنی بیٹھی ہے۔ اس تصوّر کے ساتھ اور بھی کئی تصوّر ز ہو جاتے۔ وہ تصوّر میں ہمیشہ آفاق کو دوزانو دیکھتی۔ آفاق جُھکا ہوا کیسا اچھا لگے گا۔ اسے ا حسن پر غرور تھا اور ظاہری حسن کے سوا اس کے پاس آفاق کو دینے کے لیے کوئی تحفہ نہ تھ یہی اس کی کل کائنات تھی اور اسی پر وہ داؤ لگائے بیٹھی تھی۔ تاہم اسے بازی جیتنے کی پور پوری امید تھی کیونکہ ہار کی وہ قائل نہ تھی۔ آج تک اس نے جو چاہا تھا پایا تھا اور جو کہا تھ تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے مغرور اور اکڑفوں آفاق خود بخود اس کی طرف مائل ہو گیا تھا اور ا قدموں میں جھکنے کی خاطر اور قریب آ رہا تھا۔

شادی کے روز ان کے گھر میں بہت رش تھا۔ ایک تو ڈیڈی اور ممی کے ہی بے شمار دوست احباب تھے۔ اس پر فلکی کا حلقۂ احباب بھی کم نہ تھا۔ پھر سبھوں کو اس کا شوہر دیکھنے کا شوق تھ ایک خلقت ٹوٹی پڑتی تھی اور اتنا اعلیٰ بندوبست تھا کہ بھیڑ کے باوجود کوئی بدانتظامی نہیں ہو ر تھی۔

مشروبات اور چہلیں جاری تھیں۔ کاریں بھری ہوئی آ رہی تھیں اور خالی ہو کر پارک ہی تھیں۔ پولیس کے آدمی ٹریفک کنٹرول کر رہے تھے۔

روشنیوں کی نہریں نکل رہی تھیں۔ شامیانے جگمگا رہے تھے۔

کپڑوں اور زیوروں کی چمک دمک سے آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ اتنی سردی کے باوجود ردی کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔

اسی وقت پچھلے دروازے سے فلک ناز گھر کے اندر داخل ہوئی۔ وہ بیوٹی سیلون سے آ رہی ں۔ وہ دوپہر دو بجے سے وہاں گئی ہوئی تھی۔ وہاں اسے تیار ہونا تھا اور آج صاف صاف اس نے سنگھار کرنے والی خاتون سے کہہ دیا تھا کہ سب محاورے اس کے آگے ماند ہو جانے ہیں۔ وہ جسے کہتے ہیں حسن کو چار چاند لگنا۔

آج چار کی بجائے آٹھ لگنے کا دن ہے۔

ساری سہیلیاں جمگھٹا کیے کھڑی تھیں اور ساتھ ساتھ رائے زنی بھی کرتی جاتیں۔ چار گھنٹے ں اس کا میک اپ مکمل ہوا۔ گہنے پہن کر وہ ایسی لگنے لگی جیسے جنّت کی پَری ہو۔ کوئی اپسرا ہو۔ ں آسمانی مخلوق ہو۔ نگاہ اس پر ٹھہرتی نہ تھی۔ اس نے اپنا سراپا شیشے میں دیکھا تو لجا کر گئی۔

اس نے کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ وہ اتنا روپ رکھتی ہے۔ اس کے ترکش میں سبھی تیر تھے۔ ے آفاق کے دل پر ترس آنے لگا جسے آج رات ان تیروں کا نشانہ بننا تھا۔ وہ اس کے بسمل نے کا تماشہ دیکھنے کے لیے بالکل تیار تھی۔

مدّھم مدّھم قدم اٹھاتی وہ اپنے لباسِ فاخرہ کو سنبھالتی' لمبی ہیل کی نوک پر وزن ڈالتی' سنبھلتی ے شاہانہ انداز کے ساتھ اپنی موٹر میں جا کر بیٹھ گئی تھی۔

جب گھر پہنچی تو گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ شکر ہے ابھی بارات نہیں آئی تھی۔

وہ پچھلے دروازے سے اوپر سیڑھیاں چڑھ گئی۔

آج اس کی سب سہیلیوں نے اوپر والی منزل میں ایک ایسے کمرے کا انتخاب کیا تھا جس میں ہ نیچے کا سارا نظارہ ہو سکے۔

جب وہ اوپر اپنے کمرے میں پہنچی تو باقی ماندہ سہیلیوں نے اسے گھیر لیا۔

اف اللہ'

اف خدایا کا شور مچ گیا۔

آج اس پر نظر نہ ٹکتی تھی اور ہر ایک اس کے لاثانی حسن کی تعریف کر رہا تھا۔

"ہائے اللہ' فلکی' تو آج کتنی پیاری لگ رہی ہے۔ آئینے میں اپنی شکل دیکھی ہے؟"

"اری آج تو تو اس کو مار ڈالے گی۔"

"بیچارا' ہمیں اس پر ترس آرہا ہے۔ آج کے بعد کہاں گردن اٹھا سکے گا۔"

"مجھے تو اس کی خوش قسمتی پر رشک آرہا ہے۔"

"واقعی' جو ہماری فلکی کا دولہا ہے' بڑا خوش قسمت ہے۔"

"فلکی! آج کی رات اس کی خطائیں بخش دینا۔"

کسی نے ایک آنکھ بند کر کے کہا تو سارا کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھا۔

بڑے سے دیوان پر گاؤ تکیہ لگائے فلکی اپنی ڈھیر ساری سہیلیوں کے ساتھ بالکل شہزادی بیٹھی تھی۔

گلناری رنگ کے جھم جھم کرتے غرارے سوٹ کے ساتھ یاقوت کا بھاری سیٹ عجب بہار دے رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا۔ انگاروں میں شعلہ سا لپک رہا ہو۔

خوب صورت بالوں کا اونچا سا جوڑا بنا کے اس کے درمیان اس نے منا سا تاج لگا رکھا تھا۔ سفید سفید ہیروں کے درمیان ایک بڑا سا یاقوت جگمگا رہا تھا۔ اسی طرح کی ایک نازک سی اس کی ناک میں تھی۔

وہ سچ مچ کی شہزادی لگ رہی تھی۔

"ہائے فلکی' تجھے تو کسی ملک کی شہزادی ہونا چاہیے تھا۔"

"پگلی! عورت کو صرف دل کی ملکہ ہونا چاہیے۔"

"دل کی ملکہ تو یہ آج بن ہی جائے گی۔"

"خوب کس کے رکھنا صاحب بہادر کو' اچھا!"

جانے کیسی کیسی ہدایات لڑکیاں اسے دے رہی تھیں۔

اتنے میں بینڈ کی پُرسوز اور دلکش آواز گونجی۔

بارات آگئی۔ بارات آگئی۔ لڑکیاں بے اختیار ہو کر نیچے اور جھروکوں کی طرف دوڑیں۔

"آ فلکی' تو بھی دیکھ لے۔" کسی نے کہا۔

مگر فلکی سے اٹھا نہ گیا۔

پروگرام تو یہی تھا کہ وہ بارات کے آنے سے آخر تک سارے ہنگامے کا نظارہ اپنی آنکھ سے کرے گی مگر اب اس سے اٹھا نہیں جا رہا تھا۔ دو تین دفعہ اس کی سہیلیوں نے بلایا مگر وہ

سے مس نہ ہوئی۔ پھر وہ سب نیچے لنک لنک کر دیکھنے میں مگن ہو گئیں۔

ایسی بات نہیں کہ اسے شرم آرہی تھی۔

نہ جانے کیا ہوا۔ بینڈ کی آواز سن کر اس کا دل دھڑکنے لگا تھا۔

اس نے اس سے پہلے بھی کئی شادیوں پر بینڈ کی دھنیں سنی تھیں مگر اس کا یہ حال کبھی نہ ہوا تھا۔

نہ جانے موسیقی کی یہ کونسی قسم تھی۔

کتنے اونچے سروں پر باجا بج رہا تھا۔

اس کی ہر آواز اور ہر دھمک سیدھی دل پر لگ رہی تھی۔ بینڈ یا شہنائی کا تعلق دل سے ہے۔ اسے آج احساس ہوا۔

شادی کے یہ باجے اسے مختلف احساسات بخشنے لگے۔

خوشی بھی' جوش بھی' جذبہ بھی اور سوز بھی۔

جتنی پُرمسرت اور ہنگامہ خیز اس کی لَے تھی' اتنا ہی دل میں میٹھا میٹھا درد جگا رہی تھی۔

یہ درد کس بات کی علامت ہے؟

وصل کی۔ نئی زندگی کی۔ والدین سے بچھڑنے کی یا ایک نئی ڈگر پر چلنے کی۔

پہلے بینڈ کی آواز اسے EXCITED کر دیتی تھی۔ مگر اب بینڈ کی آواز جیسے دل کے ساتھ ہم آہنگ ہو گئی تھی۔

کبھی وہ نغمہ لگتی۔

کبھی وہ پکار لگتی۔

ہاں ہر لَے جیسے صاف لفظوں میں کہتی:

گوری' تیرا سانوریا تجھے بلا رہا ہے۔

گوری آ۔

گوری آ کر اس کی بانہوں میں سما جا۔

مگر ہر پکار پر جانے کیوں آنسو نکلے چلے آتے تھے۔

دل تار تار بن کر بکھر رہا تھا۔

سانوریا بازو پھیلائے کھڑا تھا۔

مگر گوری نیر نیر' رو رہی تھی۔

کیا یہ ممی اور ڈیڈی سے بچھڑنے کا دکھ ہے؟
نہیں تو!
وہ تو یہیں ہوں گے' قریب ہی۔
کیا وہ اپنی شادی پر اداس ہے۔ غمگین ہے؟
نہیں تو!
پھر اس بے نام اداسی کی وجہ کیا ہے؟
بینڈ کی آواز اس کے احساس کو جیسے نیزے مار مار کر جگا رہی تھی اور وہ بت بنی دیوان پر بیٹھی تھی۔
چاہتی تھی۔ اٹھ کر دیکھے۔ ایک نظر اس سٹیج کو بھی دیکھے جس کے ساتھ بے شمار سپنے وابستہ ہوئے جا رہے تھے۔
مگر اس سے اٹھا نہیں گیا۔
پھر ایک دم بینڈ اپنی آخری دھن بجا کر خاموش ہو گیا۔
مبارک سلامت کا شور اٹھا۔
اس کی ایک سہیلی نے مڑ کر دیکھا اور بولی "فلکی اگر اب اٹھ کر نہیں آئے گی تو پچھتائے گی۔ خدا کی قسم! دیکھنے والا نظارہ ہے۔"
اف' کتنی خوب صورت کار ہے۔ کیسے فنکارانہ انداز سے سجائی گئی ہے۔
اور دیکھو تو' آفاق کتنا ڈیشنگ لگ رہا ہے۔
جلد آ' پلیز جلدی جلدی۔
آفاق کا نام سن کر جیسے اس کے دل میں ٹھنڈ پڑ گئی۔
شکر ہے وہ آ گیا۔ صبح ہی اس کے آنے کی اطلاع ملی تھی اور اس نے اطمینان کی لمبی سانس لی تھی۔
اور اب یکایک اسے دیکھنے کو دل چاہنے لگا۔
وہ اپنے لمبے سانس کو سنبھالتی جب جھروکے تک پہنچی تو آفاق نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ شاید اسے بڑے اعزاز کے ساتھ اندر لے جایا گیا تھا اور باقی مہمانوں کے گلے میں ہار ڈال کر ان کا استقبال کیا جا رہا تھا۔
لے اب آئی ہے جب آفاق اندر چلا گیا ہے۔

سہیلی نے کہا۔
مگر جھروکے میں اس کے لیے جگہ بنا دی۔
وہ مسکرا مسکرا کر سب مہمانوں کو دیکھنے لگی۔ مہمان بھی بہت زیادہ تھے۔ تقریباً" پانچ سو کاریں تھیں اور سب بڑے کروفر کے ساتھ آئے تھے۔ اس نے دل میں فخر محسوس کیا۔ اس کا آفاق کوئی معمولی آدمی نہ تھا اور مرتبے میں ڈیڈی سے کسی طرح بھی کم نہ تھا۔
نکاح کا شور مچا تو وہ جلدی سے آ کر اپنے دیوان پر بیٹھ گئی۔
سہیلیوں نے اس کے گرد گھیرا ڈال دیا۔
کچھ لوگ فارم اور رجسٹر اٹھائے اوپر آئے اور پھر سب کچھ روایتی انداز میں ہو گیا۔ اس نے کچھ زیادہ شرمانے لجانے کی ضرورت نہ سمجھی بلکہ دستخط کرنے کے بعد جیسے وہ ہلکی پھلکی ہو گئی۔
تو یہ اس ایک لمحے کے لیے وہ کتنے کرب سے گزری تھی۔
جانے شادی ہو یا نہ ہو۔
جانے آفاق بدل جائے۔
خدا جانے وہ نوٹ کرنہ آئے۔
پتہ نہیں اس نے مذاق کیا ہو۔
سو یہ مذاق نہیں تھا۔ زندگی کی سب سے بڑی حقیقت تھی۔ اب وہ مسز آفاق تھی۔ آفاق اس کا تھا۔ اس کا حق تھا اور دنیا کی کوئی طاقت آفاق کو اس سے نہیں چھین سکتی تھی۔
نکاح کے بعد جب چھوہارے تقسیم ہوئے۔
تو شادی کا ہنگامہ عروج پر پہنچ گیا۔
فلکی کی سہیلیاں بار بار نیچے جا کر اس کے لیے نئی نئی چیزیں لا رہی تھیں۔
اب وہ بھی چمک رہی تھی' خوب بول رہی تھی۔
اری مت بول' سارا روپ بکھر جائے گا۔
بس اب اسی کے ساتھ جا کر بولنا۔
آج رات اس نے تجھے سونے تو نہیں دینا۔
تھوڑا سا آرام کر لے۔
ایسی ہی پھلجھڑیوں میں کھانے کا وقت ہو گیا۔
آج کی ضیافت اتنی شاندار تھی کہ ہر زبان پر واہ واہ تھی۔ کھانے والے خیمے سے اشتہا انگیز

اور لذیذ قسم کی خوشبوئیں آ رہی تھیں۔ شیخ صدرالدین نے دل کھول کر بیٹی کی شادی پر پیسہ لُٹایا ہے۔ ہر شخص یہی کہہ رہا تھا۔

کھانے کے بعد لوگ ٹولیوں میں بکھر گئے اور اپنے اپنے مطلب کی گفتگو میں مگن ہو گئے۔ اوپر سے یہ نظارہ بہت بھلا لگ رہا تھا۔ کوئی ٹولی وہاں کھڑی قہقہے لگا رہی ہے۔ کوئی یہاں محوِ گفتگو ہے۔ کہیں عورتیں موضوعِ سخن ہیں۔ کسی ٹولی میں عورتیں ہی مرکزِ نظر ہیں۔ کہیں صرف عورتوں کا گروپ مَردوں کے بخیے اُدھیڑ رہا ہے۔ گنگا جمنی قہقہے اور ملی جلی صورتیں ایک سماں باندھ رہی تھیں۔

آج ایسا لگتا تھا۔ آسمان سے خوشیاں اور رنگ زمین پر اتر آئے ہیں اور زمین اپنے کینوں پر اِترا رہی ہے۔

فلکی کے دل میں عجیب کھلبلی مچ رہی تھی۔ یہ سارا ہنگامہ اسی کی وجہ سے تھا۔ یہ خوشیاں وہ تقسیم کر رہی تھی اور ان خوشیوں کے پیچھے کون تھا۔

آفاق؟

آفاق کے لیے اس نے ایک مستقل قدم اٹھایا اور اتنے لوگوں میں خوشیاں اور خوشبوئیں تقسیم کیں۔

"اری ادھر دیکھو۔"

"ادھر گلاب کے پھولوں والی روش پر۔" کوئی سہیلی چہکی۔

"کہاں؟"

فلکی نے اپنی مدھ بھری آنکھیں اوپر اٹھائیں۔

"وہ سامنے جہاں روشنیوں کا فوارہ بنا ہوا ہے۔ بن کیوں رہی ہے' وہاں تیرا چاند جو کھڑا ہے۔"

اوہ...

آخر فلکی نے ڈھونڈ ہی لیا۔

وہاں کچھ لوگوں کے ساتھ آفاق کھڑا ہوا تھا۔

اس کا دل دھڑک اٹھا۔

مگر وہ اپنی نظریں وہاں سے نہ ہٹا سکی۔

آج آفاق کی سج دھج نرالی تھی۔

وہ تو سمجھ رہی تھی کہ اس نے کوئی جدید طرز کا امریکی سوٹ پہنا ہوگا۔ ننگے سر ہوگا۔ کلائی پر چمکتی گھڑی ہوگی اور کوئی امپورٹڈ سگریٹ منہ میں دبائے' اِدھر اُدھر دیکھ رہا ہوگا۔

لیکن وہ تو اس کے خیال کے بالکل برعکس نکلا۔

اس نے سیاہ اچکن اور سفید شلوار پہنی ہوئی تھی۔ اچکن کے گلے پر تھوڑا تھوڑا تلے کا کام تھا۔ پاؤں میں سلیم شاہی جُوتی تھی اور سر پر پگڑی۔ پگڑی کے اوپر اس نے اپنا پھولوں والا سہرا یوں لپیٹ رکھا تھا جیسے کہ سر پر پھولوں کی کوئی گٹھڑی اُٹھا رکھی ہو۔

شاید اس نے سہرا اتارنا مناسب نہ سمجھا ہو اور اس طرح سر پر لپیٹ لیا ہو۔ واہ' بالکل روایتی دولہا بنا ہوا تھا۔ اتنے تعلیم یافتہ اور فیشن ایبل آدمی سے اسے اس سوانگ کی توقع نہ تھی۔ اس نے دل میں سوچا وہ آج اس سے یہ ضرور پوچھے گی کہ یہ لباس اس نے اپنی مرضی سے چنا تھا یا اپنی امی کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے پہن لیا تھا۔

بہرحال ایک بات کا اسے اعتراف کرنا پڑا۔

اس لباس میں بھی وہ بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔

بالکل مغل شہزادہ لگ رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے سراپا بہت اچھا دیا تھا اور اس کے لباس میں قرینہ اور دبدبہ تھا۔

اس کو دل میں ذرا سا حسد محسوس ہوا۔

وہ چاہتی تھی۔ آج آفاق ذرا بھی اچھا نہ لگے۔ بس وہی قیامت لگ رہی ہو۔ اس کے سامنے آفاق کا چراغ بالکل نہ جلے۔

جو آدمی خود اتنا اسمارٹ اور خوب صورت ہو' وہ بھلا بیوی سے کیا امپریس ہوگا۔

خیر' اس نے وہیں کھڑے کھڑے سوچا۔

اچھا تو لگ رہا ہے مگر اس کا اپنا کیا مقابلہ۔ وہ خود حسن کا مکمل شاہکار تھی۔ بھلا اس کے سامنے کون ٹھہر سکا ہے۔

آج مقابلے کی رات تھی اور یہ جاننا تھا' کون کس کو مٹائے گا۔ دونوں اپنے اپنے ترکش لیے ہوئے تھے۔

کوئی بات نہیں۔ فلکی بالکل نہیں گھبرا رہی تھی۔ اس کا پلّہ بھاری تھا۔ آج اس کے ساتھ عشوہ غمزہ کی پوری فوج تھی۔ پھر اسے کوئی احساسِ کمتری بھی نہیں تھا۔ وہ مطمئن ہو گئی۔

"جب حشر کا وقت آئے گا اس وقت دیکھا جائے گا۔"

آفاق کافی دور کھڑا تھا۔ وہ اس کا چہرہ نہ دیکھ سکتی تھی۔ اس کے چہرے پر کیسے تاثرات ہیں۔ وہ آج کیا محسوس کر رہا ہے۔ ویسے دور سے تو وہ کافی خوش نظر آ رہا تھا۔ بڑے مزے سے اپنے دوستوں کے ساتھ گپیں لگا رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد میزبانوں میں سے کوئی اگر اسے کوئی کھانے کی شے' پھل یا پان پیش کرتا تو وہ جھک کر شکریہ ادا کرتا اور تھوڑی سی چیز اٹھا لیتا۔ آج وہ سب کی نظروں کا محور تھا۔ مہمان خصوصی تھا۔ بارات کا دولہا تھا۔ آسمان کا چاند تھا۔

جانے وہ اس بات پر اِترا رہا ہے یا نہیں۔

فلکی بڑی بے چین تھی یہ معلوم کرنے کے لیے۔

"بس کر' کیا اس کو نظر لگانے کا ارادہ ہے۔"

پیچھے سے پنکی نے ایک دھپ ماری تو وہ چونک اٹھی۔

"دیکھ رہی ہو۔ کافی دیر سے بس اسی کو آنکھوں میں پی رہی ہو۔"

فلکی کچھ شرمندہ سی ہو کر مسکرائی اور جھروکے سے ہٹ گئی۔

"آج کی رات جی بھر کے دید کے جام پینا اور پلانا۔" پنکی شوخ ہونے لگی۔

"کم بخت! بکواس بند کر' میں تو ایسے ہی دیکھ رہی تھی۔"

"ہاں ایسے ہی' ذرا اپنا چہرہ دیکھو۔ شوق کی آگ میں جل رہا ہے۔ بے وقوف۔"

"یہی عالم رہا تو کہیں آج معاملہ الٹ نہ ہو جائے۔"

فلکی نے قدِ آدم آئینے کے آگے کھڑے ہو کر اپنا چہرہ دیکھا۔

واقعی عجیب رنگ تھا اس پر۔

"معاملہ الٹ ہونے سے کیا مطلب ہے؟" مڑ کر اس نے پنکی سے پوچھا۔ "بھئی وہ جو کہتے ہیں نا۔ عشق اوّل دَرولِ معشوق پیدا می شود"

"کہیں ایسا نہ ہو کہ آج رات وہ معشوق بن جائے اور تم عاشق!"

"اونہہ....."

فلکی نے غرور سے ٹھنک کر کہا۔

"ایسی امید تو کبھی نہ رکھنا۔ اب اتنی گئی گزری بھی نہیں ہوں۔ اور تم جانتی ہو۔"

"کل صبح پوچھیں گے۔" پنکی نے شرارت سے کہا "ہے وہ بھی برابر کی چوٹ۔"

"اچھا اب جلدی سے کھانا کھالو کیونکہ نیچے آرسی مصحف کے لیے بلایا جا رہا ہے اور جانے کے لیے تو تم بھی بے چین ہو گی۔"

"مجھے بھوک بالکل نہیں ہے پنکی۔"

"ہاں' ہر لڑکی پہلی رات یہی کہتی ہے مجھے بھوک نہیں۔ شوقِ وصال میں بھوک اُڑ جاتی ہے۔ مگر پیٹ میں کچھ نہ ہو... تو شبِ وصال ڈولنے لگتی ہے۔"

"کمینی۔"

اس نے پنکی کو گالی دی۔

"ذرا سا کچھ کھالے۔"

بیرے کھانے کے طشت اٹھائے اوپر آ گئے تھے۔ اس نے فلکی کے آگے سارا کھانا لگا دیا تھا۔

گرم گرم کھانے سے بڑی اچھی بھاپ نکل رہی تھی۔ مگر پھر بھی فلکی کا کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

بالکل نوالہ حلق سے نیچے نہیں اتر رہا تھا۔

پتہ نہیں کیوں۔

"کچھ کھالو ایسا نہ ہو نقاہت کے مارے گر جاؤ۔"

اسے یاد آیا۔ اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ شام کو بھی بس ایک پیالی چائے کی پی تھی۔ نقاہت تو بالکل محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ البتہ EXCITEMENT بہت تھی اور اسی وجہ سے بھوک کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔

پنکی کے مجبور کرنے پر اس نے تھوڑا سا روسٹ لے لیا۔ مگر پہلا نوالہ ہی حلق سے نیچے نہ اترا۔ پانی کے گھونٹ سے نگلنا پڑا۔ پھر اس نے صرف فرنی پر اکتفا کیا۔

اور فرنی کی ایک پلیٹ کھالی۔

باقی سب سہیلیوں نے جو اس کے ساتھ اوپر بیٹھی تھیں' خوب ڈٹ کر کھایا تھوڑی دیر بعد آواز آئی کہ دولہن کو نیچے بلایا جا رہا ہے۔

فلکی کا دل دھڑکنے لگا۔

حالانکہ وہ سمجھتی تھی کہ وہ بالکل نروس ہونے والی نہیں ہے۔

اب اس سٹنگر کا سامنا ہو گا۔

"نہ جانے پہلا وار کس طرف سے ہو اور کیسا ہو؟"

سہیلیاں اسے ٹھیک طرح سے بنا سنوار کر نیچے لے کر چلیں۔

وہ خود ہی بڑے وقار سے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی اس شامیانے کی طرف چلی جو اس کے لیے بنایا گیا تھا۔

دولہن آگئی۔

دولہن آگئی۔

اک شور مچ گیا۔

اور ہر کوئی اسے دیکھنے کے لیے خیمے کی جانب دوڑا۔ تھوڑی دیر تک خوب ہنگامہ رہا۔ ہر کوئی یوں دولہن کو دیکھنے آرہا تھا جیسے اس نے نیا جنم لیا ہو۔

جس نے بھی دیکھا سراہا۔

ہر زبان نے یہی کہا

"ماشاءاللہ دولہن تو چودھویں کا چاند لگ رہی ہے۔"

اس کی ممی پھولی نہیں سماتی تھی جب سب کہتے تھے کہ فلکی تو بالکل اپنی ممی کی جوانی کی تصویر ہے۔

اور یہی فقرہ مسز صدرالدین ہر مرد اور ہر عورت کے منہ سے بار بار سننا چاہتی تھیں۔ اس واسطے سب کو گھیر گھار کر لاتیں اور دولہن کو دکھاتیں۔

تھوڑی دیر بعد دولہا کے نام کا اعلان ہوا۔

اور پھر بڑے وقار سے جھومتا ہوا وہ آیا اور صوفے پر دولہن کے قریب بیٹھ گیا۔ ایک خوب صورت سی مہک فلکی کی ناک میں پہنچی۔

یہ خوشبو آج ہر خوشبو پر بھاری تھی۔ جانے کونسی پرفیوم اس نے لگا رکھی تھی۔ اس کے بھاری بھرکم وجود کے قرب سے فلکی لرزنے لگی۔

پتہ نہیں آج کی رات کس طرح گزرے۔

ایسا لگتا تھا کہ اس کے ہزار ارادے کے پاؤں اکھڑ رہے ہیں۔

مگر اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ نروس ہو رہی ہے۔

آرسی مصحف کے وقت اتنا ہجوم تھا کہ اسے آفاق کی شکل ٹھیک سے نظر نہیں آئی۔

پھر کسی ستم ظریف نے کہا:

ہٹاؤ یہ شیشے کا چکر' ایسے ہی دولہا دولہن کو ایک دوسرے کا منہ دیکھ لینے دو۔

پھر فوٹو گرافرز آگئے۔

اور آس پاس فلیش آنکھیں چمکنے لگیں۔

ادھر دیکھیے۔

پلیز ادھر دیکھیے۔

یوں بیٹھئے۔

ان کو بلائیے۔

آپ آیئے۔

بس ایسے لگتا ہر کوئی تصویر کھنچنے میں مگن ہے اور باقی سب دولہن کے ساتھ بیٹھ کر تصویر کھنچوانے کو ہی اعزاز سمجھ رہے ہیں۔

اس تصویر کشی سے وہ تنگ آگئی تھی۔

اور بار بار اِدھر اُدھر رخ کرنے سے انھوں نے ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔

وہ جب بھنکیوں سے آفاق کی طرف دیکھتی' وہ مسکرا رہا ہوتا۔

اس کے چہرے کی مسکراہٹ اتنی دلکش تھی کہ وہ اس میں کھو جاتی۔

کیا آفاق آج رات اتنا ہی خوش ہے جتنا کہ دکھائی دے رہا ہے۔ وہ بار بار اپنے دل سے پوچھتی۔

پھر رخصتی کا وقت بھی ہو گیا۔

"شکر ہے۔ اس نے اپنے دل میں کہا۔ لوگ خواہ مخواہ وقت ضائع کر رہے ہیں۔ ان کو احساس ہی نہیں کہ دولہا دولہن کے لیے یہ رات کتنی اہم ہے۔

رخصتی کا سین اس کو ہمیشہ ڈرامہ لگا کرتا تھا۔ اب کسی کو رونا نہ بھی آرہا ہو تو وہ روئے۔ اندر سے لڑکیاں کتنی خوش ہوتی ہیں۔ سبھوں کے دل میں شادی کا شوق ہوتا ہے۔ دن گن گن کر کاٹتی ہیں مگر رخصتی کے وقت جب ساری دنیا اکٹھی ہوتی ہے تو رو کر ذرا سا ڈرامہ لگا دیتی ہیں۔

وہ اسی لمحے سے ڈرتی تھی۔

ویسے اس کو اپنی ممی پر پورا پورا یقین تھا کیونکہ وہ خود روایات سے منحرف تھیں اس لیے ایسا سین پیدا ہی نہ ہونے دیں گی۔

اسے آفاق کی ممی دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ سوئے اتفاق رخصتی کے وقت وہ خود ہی قریب

آگئیں۔ اسے بازو سے پکڑ کر اُٹھایا اور بولیں "چلو بیٹی! اب اپنے گھر چلو!"

ہزار ضبط کے باوجود اس کی نگاہ اٹھ گئی۔

بہت شاندار عورت تھی۔

بھاری بھرکم جسم۔ سفید' بے داغ رنگت۔ مغلیہ دَور کے نقوش۔ آنکھیں بڑی بڑی اور صاف۔

پلین سوٹ کے اوپر انھوں نے کشمیری شال لپیٹی ہوئی تھی۔ ان کے چہرے پر بڑا دبدبہ اور سوز تھا۔

واہ' ایسی شاندار ماں تو اس نے کبھی دیکھی ہی نہ تھی۔ اس نے آج تک جو مائیں دیکھی تھیں۔ وہ ممیاں تھیں۔ شام کو روزانہ کلب میں آتی تھیں۔ سلیولیس بلاؤز پہنتی تھیں۔ سگریٹ ادا سے پیتی تھیں۔

صبح کو کافی پارٹیاں اٹینڈ کرتی تھیں۔ شام کو برج کھیلا کرتی تھیں جن کے بنگلے کُولے اور شانے کبھی عمر کی چغلی نہ کھاتے تھے۔ شوہر کو یار کہہ کر مخاطب کیا کرتی تھیں اور شوہر کے دوستوں کے شانوں پر ہاتھ مار مار کر باتیں کیا کرتی تھیں۔ وہ بچّوں کے علاوہ دنیا کے ہر موضوع پر بول سکتی تھیں۔ بچّے انھوں نے سائیڈ بزنس کے طور پر گورنس یا آیا کے ساتھ رکھ چھوڑے ہوتے۔ کم بچّے اور زیادہ ملازمین جن کا اسٹیٹس سمبل تھا۔ رات کو پارٹیوں میں رقص بھی کرتی تھیں۔ دل چاہے تو پی لیتی تھیں مگر باورچی خانے اور کھانا پکانے سے انھیں بُھن آتی تھی۔

کھانے سے زیادہ انھیں اپنے ناخن عزیز تھے۔

جو زیادہ تر ڈائٹ کنٹرول کرتی تھیں اور اپنے فگر کی حفاظت اپنے بچّے سے زیادہ کرتی تھیں۔

جن کے شوہر ان کے غلام تھے۔ بڑی بڑی موٹروں اور ایرانی قالینوں کی مانند ان کے آگے بچھے رہتے تھے۔

ہاں' ان ماؤں کی ایک خوبی فلکی کو بہت زیادہ پسند تھی کہ وہ بہت ہی BROAD MINDED تھیں یعنی وسیع النظر' وسیع القلب۔ بچّوں کو تمام تر آزادی انھوں نے دے رکھی تھی۔ وہ کہتی تھیں' ان بے چاروں کو بھی لائف انجوائے کرنے کا پورا پورا حق ملنا چاہیے۔ دوست بنانے' پارٹیوں میں جانے اور دل پسند کام کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔

اور اسی لیے فلکی اپنی ممی کو بہت پسند کرتی تھی۔ ممی نے اس کی زندگی میں کبھی دخل نہیں تھا اور نہ پسند کرتی تھیں وہ ان کی زندگی کے معاملوں میں دخل انداز ہو۔

پر آفاق کی ممی تو بالکل ہی مختلف نظر آئی۔ ایک دم سے ماں لگی۔ ایسی ماں جس کا کہانیوں ں ذکر ہوتا ہے۔

ذرا سی دیر کو اس کے دل میں عجیب سا جذبہ اُبھرا۔ پھر اسے آفاق کی ماں سے حسد سا محسوس ہوا۔

مگر اس نے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلّی دے لی کہ اس نے کہاں پاکستان میں رہنا ہے۔ وہیں مریلہ چلی جائے گی اور پھر وہ سارے آفاق کی بلا شرکتِ غیرے مالک بن جائے گی۔

ایک طرف سے بازو ممی نے پکڑ رکھا تھا اور دوسری طرف سے آفاق کی امی نے۔ وہ موٹر ے قریب آگئی۔

پتہ نہیں کس کی کیڈلک تھی مگر پھولوں اور تار لڑیوں سے جکڑی ہوئی تھی۔

اور بھی سب لوگ قریب آگئے۔

سی نے آفاق کا بازو پکڑ کر اس کے ساتھ کھڑا کر دیا۔

اس کا دل دھڑ دھڑ بولنے لگا۔

وہ ذرا سے گھونگھٹ کی اوٹ سے باقاعدہ آفاق کو دیکھ رہی تھی۔

بڑا خوب صورت لگ رہا تھا وہ اور ایک دلکش مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر مسلسل ناچ رہی تھی۔ آنکھوں میں شرارت سی تھی۔

ایسے لگتا تھا جیسے آفاق آج بہت خوش ہے۔ اس کے کھمڑے پر چاند ستارے دیکھ کر فلکی نے من میں سچ مچ شہنائیاں بجنے لگیں۔

اسے یکایک آفاق پر پیار آنے لگا۔

اس سے پیار کرنے کو دل چاہنے لگا۔

ایک لمحے میں اسے یوں محسوس ہوا۔ وہ دونوں جہاں اس پر سے وار کر پھینک سکتی ہے۔

ی نے دروازہ کھولا۔ وہ پیچھے بیٹھ گئی۔ پھر اس کے قریب بالکل قریب آفاق کو بٹھا دیا گیا۔

دوسری طرف اس کی امی آکر بیٹھ گئی۔

وہ درمیان میں تھی۔

ایک طرف آفاق کی امی' ایک طرف آفاق۔

کب کس نے کیا کیا۔ کتنے پھول موٹر پر سے نچھاور ہوئے اور کتنے سکے وار کر پھینکے گ
اس نے کچھ نہیں دیکھا۔

وہ صرف آفاق کے اس خوب صورت، بھرے بھرے چمک دار ہاتھ کو دیکھ رہی تھی سامنے اس کے زانو پر پڑا تھا۔ اس میں ایک سنہری سفید انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔ دوسرے ہا سے وہ سگریٹ پی رہا تھا۔

کس قدر قریب تھا اس کا ہاتھ۔

اس کا دل چاہا چھو کر اس کے ہاتھ کو دیکھے مگر اسے پھر آفاق کی امی پر غصہ آنے لگا۔

بھلا کیا تک تھی انھیں ساتھ بٹھانے کی۔

اگر وہ تنہا ہوتے تو کیا وہ آفاق کے ہاتھ کو چھونے کی جرأت کر لیتی؟

شاید۔

اس نے دل میں سوچا۔

مگر نہیں۔ آفاق اور طرح کا آدمی ہے جو حرکت خود اسے کرنا چاہیے تھی، شاید اس کی ت اپنی دولہن سے نہ رکھتا ہو۔

اچھا ہوا کہ اس کی ممی ساتھ آکر بیٹھ گئیں۔ ورنہ شاید وہ کوئی اوچھی حرکت کر ہی بیٹھ ایکسائیٹمنٹ میں آدمی اندھا ہو جاتا ہے۔

بس ذرا صبر۔۔۔!

وہ اپنے آپ سے کہنے لگی۔ فاصلہ سمٹ کر تھوڑا ہو گیا ہے۔ ذرا سی دیر میں دنیا بدل جائے وہ ہو گی اور اس کا آفاق۔

گھر آ گیا تھا۔

لوگ اسے موٹر سے نیچے اتار رہے تھے۔

یہاں پر اس نے نظر جھکالی اور باقاعدہ دولہن بنی اپنی ساس کے ساتھ قدم قدم چلنے لگی۔

یہاں بھی بڑا عالی شان بندوبست تھا۔

ایک بڑے ہال میں اس کے لیے تخت بچھا دیا گیا تھا۔ وہاں اسے بٹھا دیا گیا۔

سب لوگ دولہن کی پیشوائی اور پھر راہنمائی کو دوڑے۔

جب ذرا ہنگامہ تھما تو اس نے گھڑی پر وقت دیکھا۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔
تھکاوٹ محسوس کر رہی تھی۔

پتہ نہیں کب اس کو چھٹکارا ملے۔

مگر شکر ہے مہمانوں سے اس کی جلد گلو خلاصی کرادی گئی۔

ایک خاتون اسے اس کے بیڈ روم میں لے آئی۔

واہ!

یہ خواب گاہ تو بالکل خوابی دنیا کا نقشہ پیش کر رہی تھی۔

پھول اور روشنیاں ایک ساتھ لہرا رہے تھے۔

پھولوں کی مسہری میں سفید چمک دار بستر نئی کہانیوں کی دعوت دے رہا تھا۔ ایک طرف ہلکی ہلکی موسیقی بج رہی تھی۔

سامنے قدِ آدم آئینہ تھا۔ سرخ رنگ کے حریری پردے ماحول کو دو آتشہ کر رہے تھے۔ ہیٹر کی حدت نے سخت سردی میں کمرے کو گرم کر دیا تھا۔ اس کمرے میں آتے ہی اس کی ساری تھکاوٹ دور ہو گئی۔

ایک خاتون اس کا ضروری سامان ڈریسنگ روم میں چھوڑ گئی تھی۔ جاتے جاتے اس نے کچھ ات بھی کیے جنھیں اس نے غیر ضروری سمجھا۔ وہ کھڑی سوچ رہی تھی کہ اب کیا کرنا چاہیے۔

ابھی وہ کچھ فیصلہ نہ کر پائی تھی کہ اس کی ساس اندر آگئی۔

وہ واقعی بڑی شاندار عورت تھی۔ اس کے چہرے پر شفقت کے ساتھ ساتھ بڑا دبدبہ تھا۔

نہ جانے انھیں دیکھ کر فلکی کا دل کیوں لرزنے لگ جاتا۔

گھبرا کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

اس نے فلکی کی پیشانی چومی اور ایک ہیرے کی انگوٹھی اس کے ہاتھ میں ڈال کر بولیں:

"میں صبح تک نہیں رک سکتی۔ میری دعا ہے، تم لوگ خوش رہو۔ آفاق سے کہنا تمھیں امریکہ لے کر آئے۔ وہاں بہت لوگ تمھارے منتظر ہیں۔ تم آؤ گی تو میں ایک شاندار ضیافت کا بندوبست کروں گی۔"

پھر انھوں نے دو چار ادھر اُدھر کی باتیں کیں اور باہر نکل گئیں۔

اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ان سے کوئی بات کرے۔ وہ کوئی ایسی شرمیلی بھی نہ تھی مگر ان کا رعب دار چہرہ دیکھ کر ہی زبان گنگ ہو گئی تھی۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی وہ کیوں جا رہی ہیں۔ صبح ولیمہ ہے اور وہ دعوتِ ولیمہ میں کیوں شریک نہیں ہو سکتیں آخر ایسی کونسی مجبوری ہے۔

مگر پوچھ نہ سکی۔

پر لاشعور میں کہیں خوشی کی جھنکار بھی تھی۔ ایسی ماں اگر گھر میں رہ گئی تو اس کا چراغ نہ
سکے گا۔ اچھا ہے ان کو دور ہی رہنا چاہیے۔ اس کو ویسے بھی ساس کا وجود اچھا نہ لگتا تھا۔
کرتی تھی کہ... وہ کسی ایسے آدمی سے شادی کرے گی جس کی ماں مرچکی ہو۔ آفاق کا تو م
ہی جداگانہ تھا جس میں اس نے سب کچھ قبول کرلیا تھا لیکن اب اسے خوش ہو رہی تھی کہ
کانٹا خود بخود ہٹ گیا۔

اتنی بڑی کوٹھی میں' اتنے عالی شان گھر میں وہ تنہا اپنی من مانیاں کرے گی اور امریکہ جا
سے پہلے ہی آفاق کو اس طرح اپنی مٹھی میں کرلے گی کہ وہ اس کی موجودگی میں ماں کی طر
نظر اٹھانے کی جرأت نہ کرسکے گا۔

آفاق کا خیال آتے ہی وہ کھڑی ہوگئی۔

اٹھ کر آئینے کے آگے گئی۔ تھوڑا سا میک اپ ٹھیک کیا۔ بال سنوارے' زیورات ٹھیک
کیے۔ ایک بھرپور انگڑائی لی اور آخر چھپر کھٹ پر بیٹھ گئی۔

اسے کس طرح بیٹھنا چاہیے۔ وہ کوئی بہت ہی خوب صورت اور توبہ شکن پوز سوچنے لگی۔
بالآخر اس نے اپنے آپ کو ٹھیک طرح سے سجایا۔ غرارے کو اچھی طرح اردگرد پھیلایا۔
دوپٹے کو سر پر ترتیب دے کر اپنے آس پاس پھیلا لیا۔ ذرا سا برائے نام گھونگھٹ نکالا اور پلنگ
کے کٹہرے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

ہاں یہ پوز واقعی اچھا تھا۔

شاید اس نے کسی فلم میں دیکھا تھا یا ویسے ہی اس کے ذہن میں آگیا تھا۔ اس کا چہرا
دروازے کی طرف تھا۔

باہر جب کسی کے قدموں کی آواز آتی۔ اس کا دل دھڑک اٹھتا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔
اس وقت رات کے بارہ بج رہے تھے۔

توبہ ابھی تک اس گھر میں کسی کو نیند نہیں آرہی۔ سارے مہمان دفع ہوں گے تو آفاق اندر
آئے گا۔ آدھی رات تو گزر گئی اور پچھلی رات تو پوری باتوں میں گزر جائے گی۔

دل ہی دل میں بیٹھی لوگوں کو کوس رہی تھی کہ دروازے کے بالکل قریب سے قدموں کی
چاپ ابھری۔

اس مرتبہ اس کا دل بڑے عجیب انداز میں دھڑکا۔

اس نے ادا سے گردن کو خم دیا اور اپنی لمبی پلکوں کو جھکا لیا۔

کوئی اندر آیا تھا۔

اس نے ذرا بھی دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ اپنی بے نیازی وہ آفاق پر واضح کرنا چاہتی تھی
اور پھر آج پہل کرنا' گھونگھٹ اٹھانا اور اس کو اوپر دیکھنے پر مجبور کرنا تو آفاق کے فرائض تھے۔
وہ کیوں خود بخود دیکھے۔ اس نے تقریباً آنکھیں موند لیں۔

کوئی بالکل قریب آگیا تھا۔

شدتِ جذبات سے اس کا چہرہ سرخ ہوگیا اور ہاتھ لرزنے لگے۔

اب... اب... اب

بھابی!

ایک باریک سی آواز نے اسے چونکا دیا۔

اس کی بے خودی اس طرح ٹوٹی جیسے کانچ کا پورا سیٹ میز سے گر کر ریزہ ریزہ ہوگیا ہو۔

حیران ہو کر اس نے نظر اٹھائی۔ وہاں آفاق کی کوئی کزن کھڑی تھی۔

اس کے چہرے پر خندۂ استہزا تھا۔

فلکی شرمندہ ہوگئی۔

اپنی طنزیہ مسکراہٹ کو خوش دلی میں بدلتے ہوئے وہ بولی:

"بھابی میں آپ سے یہ کہنے آئی تھی' آفاق بھیا اپنی امی کو چھوڑنے ایئرپورٹ گئے ہیں۔ ذرا
دیر سے آئیں گے۔ آپ اتنی دیر آرام کریں..... اچھا میں چلتی ہوں۔"

وہ اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر چلی گئی تھی اور فلکی ہکا بکا کمرے میں رہ گئی تھی۔

یہ کیا ہوا؟

کیا ہوا بھلا؟

کوئی اس طرح بھی کرتا ہے۔ آج کی رات سے اہم کوئی کام ہوسکتا ہے کیا؟ گھر میں بے شمار
ڈرائیور ہیں۔ رشتے دار ہیں۔ کوئی بھی ان کی امی کو چھوڑنے جاسکتا تھا۔

آفاق نے ایسی حرکت کیوں کی؟

کیا وہ مجھے یہ بتانا چاہتا ہے کہ میری اس کی نظر میں اب بھی کوئی وقعت نہیں' تو میں اس کو
مزہ چکھا دوں گی۔

کمینہ۔ کم بخت۔

سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو۔ کیا میں نکاح کے دو بول سے ڈر جاؤں گی۔

میں ابھی اٹھ کر اپنے ڈیڈی کے گھر چلی جاؤں گی۔ پھر زندگی بھر اس کا منہ نہیں دیکھوں گی مجھے کسی کی پرواہ نہیں ہے۔

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور پھر غصے کے عالم میں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ٹہلنے لگی اس کا دوپٹہ فرش پر گر گیا اور اسے ہوش نہ رہا۔

کیا وہ اپنی ماں کو مجھ سے زیادہ عزیز جانتا ہے۔ ایسی تیسی اس کی ماں کی' بڑھیا کو مزا دوں گی۔ کچھ ہو گی تو اپنے گھر ہو گی۔ آج کے بعد اس گھر میں قدم رکھ کے دیکھے تو سہی۔ ذلیل۔

ہاں' مگر بڑھیا کا اس میں کیا قصور۔ اگر آفاق چاہتا تو اس کو ٹال سکتا تھا۔ معافی مانگ تھا۔ معذرت کر سکتا تھا اور اگر بہت ضروری تھا تو مجھے بھی ساتھ لے جاتا۔

کم از کم مجھ سے کہہ کر ہی جاتا۔ اندر آتا۔ اجازت لیتا۔

کوئی اس طرح چند لمحوں کی بیاہی دولہن کو چھوڑ کر جاتا ہے۔ وہ تو ہے ہی کریک۔ پاگل احمق۔

ایسی بے عزتی کروں گی آج کہ اسے پتہ چل جائے گا۔ فلک ناز کس شے کا نام ہے۔

کبھی مٹھیاں بھینچتی' کبھی کھولتی' کبھی کمڑی ہو جاتی' کبھی بیٹھ جاتی۔ کبھی آئینے کے آگے کھڑی ہو جاتی اور نوچ نوچ کر زیور اُتارنے لگتی۔ اس قدر غصہ تھا کہ بار بار ٹھنڈا پانی پی رہی تھی اتنی سخت سردی کے باوجود ماتھے پر پسینہ آ رہا تھا۔

کمرے میں لگا ہوا کلاک ٹک ٹک بج رہا تھا' جیسے اس کی بے بسی کا مذاق اڑا رہا ہو۔

فلکی....

فلکی....

فلکی... فلکی....

بے وقوف لڑکی!

اس کا دل چاہا کہ پکڑ کر اس کلاک کو توڑ دے۔ ہر شے کو تہہ و بالا کر دے۔ گھر میں کسی نے اس کی بات نہیں ٹالی تھی۔ اس نے جو چاہا وہ پایا تھا اور آج ہر شے اس کا مذاق اڑا تھی۔

اس کا دل چاہ رہا تھا' دیواروں میں سر دے مارے۔

یہ سارا خوب صورت کمرہ جلا دے۔

کافی دیر تک غصہ کر کے' جل کُڑھ کے' وہ تھکی ہاری صوفے پر بیٹھ گئی۔

کلاک ایک بجا رہا تھا۔

جانے آفاق کس وقت آئے گا۔

بہرحال' اب تو جو ہونا تھا ہو گیا۔

غصہ کرنے سے کیا فائدہ؟ غصہ کرنے سے کوئی مسئلہ حل نہ ہو گا۔ ممکن ہے حالات اور بگڑ جائیں۔

یہ بھی ہو سکتا ہے آفاق کو کوئی مجبوری ہو' یہ لوگ بڑے روایتی سے لگتے ہیں۔ ہماری طرح ایڈوانس نہیں ہیں۔ اوپر سے بہت بنتے ہیں مگر اندر سے وہی دقیانوسی قسم کے لوگ ہیں ممکن ہے ماں کے آگے بول نہ سکا ہو۔ جانا ہی پڑ گیا ہو۔

ہو سکتا ہے واپس آ کر وہ خود معذرت کرے۔ آخر میں نے اس کا کیا بگاڑا ہے جو وہ مجھ سے بدلہ لے رہا ہے۔ دولہن سے ملنے کی جلدی تو ہر ایک کو ہوتی ہے۔

ممکن ہے اس کی ماں کوئی بڑی زبردست عورت ہو۔ زبردست ہی ہے تو ولیمہ چھوڑ کر جا رہی ہے اور بیٹے کی پہلی رات ہی خراب کر دی ہے۔ اچھا ہے وہ بلا چلی گئی۔ ایسی ماں کو یہاں نہیں رہنا چاہیے۔ یہاں رہ کر اور نہ جانے کتنے کام خراب کرتی۔ خدا کرے اب وہ اسے جہاز پر سوار کرا دے۔ کہیں ایسا نہ ہو' ساتھ ہی لے آئے۔ خدانخواستہ اگر میری بھی اس کے آگے نہ چلی تو کیا ہو گا؟ خیر میری تو اس کے ساتھ کبھی بن ہی نہیں سکتی۔ اس کا مجھے یقین ہے...

سخت نیند آ رہی تھی۔

بلکہ غصہ کر کر کے وہ ہلکان ہو چکی تھی۔

کھڑی ہو گئی۔ غسل خانے میں جا کر منہ دھویا۔

واپس آ کر دوبارہ تیار نہ ہوتی تو اس کا مشن ناکام ہو جاتا۔ اب تازہ دم ہو کر وہ پہلے سے بھی زیادہ اچھی لگ رہی تھی۔

آئینہ دیکھا تو جی باغ باغ ہو گیا۔

دوبارہ آ کر چیئر کھٹ پر بیٹھی۔ وقت دیکھا تو دو بج رہے تھے۔

نہ جانے کس وقت جہاز اُڑا تھا۔ دو گھنٹے میں تو اسے آ جانا چاہیے تھا۔

خیر' اب آتا ہی ہو گا۔ اچھا ہے وہ وقت پر سنبھل گئی۔

پہلے تو بولوں گی ہی نہیں۔ سو بار منت کرے گا۔ پاؤں چھوئے گا۔ قسمیں کھائے گا۔ کیا کچھ

کچھ نہ منواؤں گی۔ تب کہیں جا کر بولوں گی۔ آہٹ نہ بھی ہوتی تو اس کا دل دھڑک اٹھتا۔ گھر پر سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ پتہ نہیں گھر میں کون کون تھا۔ اس کی بلا سے۔

بس وہ دشمنِ جاں آ جائے تو وہ سب کچھ بھول جائے۔

ٹک... ٹک....

اس کے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ گھڑی بج رہی تھی اور دونوں کی آواز وہ صاف سن رہی تھی۔

کوئی رسالہ بھی سامنے نہیں تھا جو وہ پڑھ لیتی۔ یونہی نیم دراز ہو گئی۔ سوچتے سوچتے جانے کب پلکوں میں نیند اُتر آئی۔

کئی راتوں کی جاگی تھی۔ تھکاوٹ تھی اور پھر جوانی کی نیند۔ غصہ، گلہ سب طاق پر دھرا گیا۔

آفاق جب اس کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ اس طرح سو رہی تھی، جیسے ہزار تیاتیں اس کے پہلو میں جاگ رہی ہوں۔

حسن خوابیدہ ہو اور سہاگ رات کے جلوے ہوں تو آدمی دل پر کب قابو رکھ سکتا ہے؟

واقعی اسے اپنے حسن پر جتنا بھی ناز ہوتا کم تھا۔

آفاق نے ایک پاؤں پلنگ پر رکھا اور اس پر جھک گیا۔

تڑپ کر فلکی جاگ اٹھی۔

اوہ....

اوہ....

اس کے سارے پروگرام دھرے کے دھرے رہ گئے۔ افسوس کیسے برے وقت میں اس کی آنکھ لگ گئی۔ پر شکر ہے جلدی آنکھ کھل بھی گئی۔ ورنہ پتہ نہیں کیا ہو جاتا۔

چونک کر وہ اُٹھ بیٹھی اور قرینے سے اپنے آپ کو سمیٹ کر ایک طرف ہو کر بیٹھ گئی۔

لیکن اس نے منہ اس طرح پھیر لیا جیسے ناراض ہو۔

آفاق بھی سیدھا کھڑا ہو گیا۔

اس نے اپنی اچکن اتار کر دور صوفے پر پھینکی۔ ایک گلاس پانی کا پیا۔ پھر اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

فلکی کا دل بیچ بیچ دھڑکنے لگا۔

آخر وہ گھڑی آ ہی پہنچی تھی۔

جب اس کا رُواں رُواں ہمہ تن گوش ہو گیا تو وہ اپنی گمبھیر مگر چاق و چوبند آواز میں بولا "محترمہ! آپ یہ سمجھتی ہیں کہ مرد بے وقوف ہوتا ہے یا اس کو بے وقوف بنایا جا سکتا ہے۔"

فلکی نے حیران ہو کر سر اٹھایا۔

"آپ کا خیال ہے حسن بہت بڑی طاقت ہے اور مرد کو زیر کر لیتی ہے۔"

اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔

"آپ کا خیال ہے کہ سیکس مرد کی بہت بڑی کمزوری ہے۔ اسی واسطے عورت اس کو اپنی انگلیوں پر نچا سکتی ہے۔"

وہ لرز گئی۔

"تو محترمہ، آج کی رات میں آپ کو صرف یہ بتاؤں گا کہ مرد کے بارے میں آپ کا ہر فلسفہ اور ہر خیال بالکل غلط ہے۔ آپ کے نظریات ایک گمراہ کن ماحول کے پیدا کردہ ہیں۔ آپ ایک بھٹکی ہوئی لڑکی ہیں۔ مرد کیا شے ہے؟ آپ آج تک جان ہی نہیں سکیں۔ اب میرے نکاح میں آنے کے بعد آپ کو پہلی مرتبہ اندازہ ہو گا کہ مرد کیا ہوتا ہے؟

اور مجھے امید ہے، مزید حماقتیں کرنے کی بجائے آپ زندگی میں سیکھنے کی کوشش کریں گی۔ اسی میں آپ کی اور آپ کے حسن کی بہتری ہو گی۔"

ابھی وہ اس کی سب باتیں سمجھنے کی اور پھر کوئی نئی چال چلنے کا سوچ رہی تھی کہ آفاق نے اپنا لہجہ بدل لیا۔

بڑی سختی سے بولا:

"اٹھ کر کپڑے بدل لیجئے۔ مجھے اس طرح بنی سنوری مصنوعی عورتیں اچھی نہیں لگتیں۔ زیور اور سنگھار عورت کا ہتھیار ہوتا ہے۔ عورت کو ہتھیار سے اس وقت مسلح ہونا چاہیے جب وہ جنگ کے ارادے سے میدان میں اترتی ہو۔ اگر وہ بہترین رفیق بن کر رہنا چاہتی ہو تو اس کی سادگی اور شرافت ہی اس کے سب سے اچھے ہتھیار ہوتے ہیں۔

کپڑے بدل کر منہ ہاتھ دھو کر سو جائیے"

وہ جانے کے لیے مڑا۔

پھر رُکا اور اس کی جانب منہ کر کے بولا "مجھے معلوم ہے اس رات کی آپ کے لیے کوئی اہمیت نہ ہو گی۔ شادی کی پہلی رات ان لڑکیوں کے لیے انتہائی اہم رات ہوتی ہے جنھوں نے

اپنے نسوانیت کے جوہر کو کانچ کی طرح سنبھال کر رکھا ہوتا ہے۔ جو لڑکیاں عصمت کے تصور کو فرسودہ سمجھ کر اس کے ساتھ کھیلتی ہیں' وہ سماگ راتوں کی اہل نہیں ہوتیں..."

شرم سے وہ اس طرح پانی پانی ہوئی کہ خود اپنا سراپنے گھٹنوں سے جا لگا۔

میں آپ کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں۔" اس کی آواز ہلکی ہوگئی "اور ان لوگوں کو بھی جانتا ہوں جن سے آپ کے مراسم تھے۔

اور پھر آپ لائف ENJOY کرنے کے لیے مجھ سے شادی کرنا چاہتی تھیں۔ شوہر تو آپ کو ہرگز نہیں چاہیے تھا اور عاشق بھی آپ کے شہر میں بہتیرے ہیں' تو یہ مشقِ ستم میرے ساتھ ہی کیوں کی؟

لیجئے بسم اللہ کیجئے..... میں حاضر ہوں' ویسے میں وہ نہیں جو آپ نے سمجھا تھا اور نہ وہ بنوں گا جو آپ بنانا چاہتی ہیں.....

اور ہاں۔ میری طرف سے اس رات کا تحفہ یہی وارننگ ہے کہ آج ہی سے نیک عورت بننے کی ریہرسل شروع کردیجئے۔

شب بخیر۔"

وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر کے لیے فلکی کا ذہن اور جسم سُن ہوگیا۔ جیسے نہ تو سوچ سکتی ہے نہ سُن سکتی ہے اور نہ ہی ہل جُل سکتی ہے۔ وہ جہاں بیٹھی تھی' وہیں پر برف ہوگئی۔ سارے اعضا اس طرح جُڑ گئے کہ اسے احساس ہی نہ رہا کہ وہ گوشت پوست کی عورت ہے۔ آفاق نے وہاں سے ایک تکیہ اٹھایا اور باہر نکل گیا۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے نا کہ جب کسی انسان پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹتے ہیں تو وہ تھوڑی دیر کے لیے اندھا' بہرا اور گونگا ہوجاتا ہے۔ وہ اپنی حیرت پر خود آپ مرجانا چاہتا ہے۔ کبھی کبھی شرمندگی اس حد تک ہوتی ہے کہ چلّو بھر پانی ہی کافی لگتا ہے۔ کبھی کبھی اپنی عزتِ نفس اس طرح مجروح ہوتی ہے کہ آدمی سوچتا رہ جاتا ہے۔ کیا اس سے پہلے اس کی عزتِ نفس تھی! یا وہ ہمیشہ سے ہی اس طرح ذلیل کروانا جانتا ہے۔

فلکی کی بھی آج حیرتوں اور وارداتوں کی رات تھی۔ حیرت تو اسے قدم قدم پر ہو رہی تھی مگر یہ آخری واقعہ واقعی اس کی زندگی کا پہلا دل خراش واقعہ تھا۔

وہ۔ کہ آسمان پر اُڑ رہی تھی۔ زندگی اس نے پھولوں میں اور قوس قزح میں بسر کی تھی۔ جو چاہا تھا' وہ پایا تھا۔ من مانی کرنا اس کا شیوہ تھا۔ کبھی ڈیڈی نے آنکھ دکھائی نہ ممی نے گھورا۔ سونے چاندی کے پالنے میں جھولتی جھولتی وہ جوان ہوگئی تھی۔

اور پھر جوانی بھی کیسی شاندار تھی۔

جس نے دیکھا دل پیش کیا۔

دلوں کو ٹھکرانا اس کا شغل تھا۔

جذبوں کا مذاق اُڑانا اس کی عادت تھی۔ کمزوریوں سے کھیلنا اس کی سرشت میں تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ مَردوں کو ایک بے وقوف مخلوق سمجھتی تھی۔ وہ یہی جانتی تھی کہ عورت اور جسم' مرد کی کمزوری ہوتے ہیں اور اس کمزوری کا سہارا لے کر ان کو جس حد تک

چاہو موڑ دو۔ توڑ دو اور جھکا دو۔

بھلا مرد کی زندگی کا اس کے سوا مقصد ہی کیا ہے کہ وہ ہمیشہ عورت کے تلوے چاٹتا رہے۔ وہ بھی خوب صورت عورت کے... خوب صورت عورت تو صرف چاہے جانے کے لیے' پُوجا کروانے کے لیے ہوتی ہے۔ اس نے چُن چُن کر ان عورتوں کی کہانیاں پڑھی تھیں جنھوں نے اپنے حسن کی آگ سے ملک اور شہر تباہ کیے تھے۔ "کلوپیٹرا" پکچر اس نے کئی بار دیکھی تھی۔ آخر میں تو سیلیاں اسی کو کلوپیٹرا کہنے لگ گئی تھیں۔

اور وہ سوچا کرتی تھی اگر عورت معاشی طور پر مضبوط ہو تو اسے کبھی مرد کی غلامی نہیں کرنی پڑتی۔ مرد کو یہی زعم ہے نا کہ وہ عورت کا کفیل ہے تو اس کے ڈیڈی کی ساری جائداد اس کے نام تھی۔ وہ ایک معقول ماہانہ آمدنی کی مالک تھی۔ زیور' کپڑے کا کوئی شمار نہ تھا۔

اس کے دل میں کوئی حسرت نہ تھی۔

مچلنے سے پہلے اسے ہر چیز مل جایا کرتی تھی۔

ہاں غصّہ اس کی فطرت میں بہت تھا۔

اگر کوئی شے نہ ملتی تو جی بھر کے غصّہ کرتی۔ توڑ پھوڑ کرتی اور بعض اوقات اتنا غصّہ آتا کہ کوئی شے حاصل کر کے اسے تباہ کر دیتی۔

جب ہر خواہش پوری ہو رہی ہو تو بے بات غصّہ کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ہاں اگر آفاق اس کی طرف مائل نہ ہوتا تو وہ جانے کیا کر بیٹھتی۔ شعلے کا وہ طوفان کس کس کو لے ڈوبتا۔

مگر آفاق نے تو باقاعدہ اسے پسند کرنے کا ڈھونگ رچا کے اسے بے وقوف بنایا تھا۔

خود اپنے ہی نشانے سے وہ گھائل ہو گئی تھی۔ خود اپنے ترکش کا تیر اس کی کنپٹی میں آ لگا تھا۔ خود اپنے اندازوں نے اسے رُسوا کر دیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار سب کچھ غلط ہو گیا تھا۔ ایسے میں وہ جتنا بھی غصّہ کرتی کم تھا۔

آج تو اسے اس پورے گھر کو تہہ و بالا کر دینا چاہیے تھا۔ چھت کو دھماکے سے اُڑا دیتی۔ ڈریسنگ ٹیبل کا آئینہ چُور چُور کر دیتی۔ سارے زیوروں کو مٹھی میں لے کر ریزہ ریزہ کر دیتی۔ عروسی جوڑے کو تار تار کر دیتی۔

مسہری کے پھول نوچ لیتی۔

چلّا چلّا کر سارا گھر سر پر اٹھا لیتی۔

ہر بات کی اس سے توقع تھی۔ ہر غیر متوقع حرکت وہ کر سکتی تھی۔ مگر... جب وہ حیرت کے

اژدہا کے جبڑے سے باہر نکلی تو رنج اور دکھ کے مہیب بادلوں نے اسے گھیر لیا۔

اُفوہ۔ یہ کیا ہو گیا!

اور اس کے ساتھ۔

اس قدر پھوٹ پھوٹ کے وہ روئی کہ الاماں۔

شاید آفاق بھی اسے اس عالم میں دیکھ لیتا تو اسے اس پر ترس آ جاتا۔

آخر کو ایک کمزور عورت ہی تھی نا؟

بستر کے اوپر اوندھے منہ گر کر وہ تباہ کُن انداز میں روئی ہے۔

بستر کی ہر شکن سے لپٹ لپٹ کر اس نے اپنی سسکیاں وبائی ہیں۔ کاجل بھرے آنسو سفید چادر پر سیاہ دھبّے لگاتے رہے۔ اوہ کھلی ادھ کھلی کلیاں اس کے چہرے سے لپٹ لپٹ گئیں۔ کبھی تکیوں میں منہ چھپا کر' کبھی تکیوں کو بازو بنا کر وہ جس قدر رو سکتی تھی' روئی۔

بعض اوقات رونے کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا اور پھر جب دل میں مختلف قسم کے جذبات اکٹھے ہو جائیں' یہ سمجھ نہ آئے کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ غصّہ کرنا چاہیے یا گلہ۔ اچھا ہوا یا بُرا۔ تقدیر کا لکھا تھا یا اپنا کیا۔

اپنے اعمالوں کی سزا تھی یا آزمائش۔ ہم اس سزا کے اہل تھے یا نہیں۔ فریاد کرنی چاہیے یا صبر۔

جب ان باتوں کی سمجھ نہیں آتی تو انسان رو پڑتا ہے۔

آنسو آدمی کی بے بسی کی آخری نشانی ہیں۔

جب انسان ہتھیار ڈالتا ہے اور قدرت کے آگے دَم مارنے کی ہمت نہیں رکھتا۔

اپنے جذبوں کی آہ و فغاں نہیں سن سکتا۔

تو پھر جی بھر کے روتا ہے۔

لوگ کہتے ہیں رونا بزدلی ہے۔

تو پھر بہادری کیا ہے؟

ٹھاٹھیں مارتے ہوئے باغی جذبوں کے تیز و تند طوفان کو کس طرح روکا جا سکتا ہے۔

جب آدمی دوسرے کو ختم نہیں کر سکتا۔

اپنے سینے میں چُھرا نہیں گھونپ سکتا۔

تو کیا کرے...؟

پھر رونا ہی اچھا ہوتا ہے۔

ایسے میں رونے سے بڑی تسکین ہوتی ہے۔

ساری زندگی منفی منفی خواہشات پر مچلنے والی اور چھوٹے موٹے آنسوؤں سے رونے والی فلکی کو آج پتہ چلا کہ آنسو کیا ہوتے ہیں۔

دل کی تکلیف کیا ہوتی ہے۔

چوٹ کیسے لگتی ہے۔

درد کیسے اٹھتا ہے۔

تنہائی کا کرب کیا بلا ہے۔

بے بسی کس پرندے کا نام ہے۔

اور حالات کے آگے دولت' مرتبہ' اقتدار' حُسن سب غلام بن جاتے ہیں۔ ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ سب سے سخت جان شے ہے انسان۔ جو ہر قسم کے حالات سے گزرتا ہے۔

جانے اتنے آنسو کہاں سے آگئے تھے۔ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

زیوروں کا کیا ہوا...؟

ساری دوپہر سنگھار پر خرچ کردی تھی۔

جوڑے کا کیا حشر ہوا؟

وہ جس پُل صراط پر تھی۔ وہاں صرف آنسو تھے۔

پچھتاوے کے تھے یا رنج کے۔

آنسو ایک محیط بے کراں بنتے جارہے تھے۔

اور وہ ان میں ڈوبتی جارہی تھی۔

پھر آدمی آنسوؤں سے بھی تھک جاتا ہے۔

اپنے آپ سے تھک جاتا ہے۔

جانے کب اس کی سسکیاں دھیمی ہوتی گئیں۔ جانے کب نیند اسے تھپکیاں دینے لگی۔ اسے جُھولا جھلانے لگی۔

آدمی پاگل ہے۔

فریب مانگتا ہے۔

اور پھر نیند کا کیا ہے۔ جتنی معصوم ہے اتنی ہی ظالم بھی ہے۔ سُولی پر بھی آجاتی ہے۔ کانٹوں

پر بھی آجاتی ہے۔

ہر جگہ اپنی زبردست حقیقت کو منواتی ہے۔

صبح کے چار بجے ہوں گے۔

جب وہ اُلٹی پڑی' ویسے ہی سسکتی ہوئی نیند میں ڈوب گئی۔

کتنی اچھی ہے نیند۔

ذرا سی دیر کو ہر شے پر پردے ڈال دیتی ہے۔ زخم چھپا دیتی ہے۔

درد سے بیگانہ کردیتی ہے۔

ایک نئے جہان میں لے جاتی ہے جہاں شور و شر نہیں ہوتا۔

رُسوائیاں اور عذاب نہیں ہوتے۔

آدمی کھو جاتا ہے۔

گم ہوجاتا ہے۔

اپنے آپ سے بیگانہ ہوجاتا ہے۔

صبح جب اس کی نیند کھلی تو پہلی نظر کلاک پر پڑ گئی۔ دن کے دس بج رہے تھے۔ افوہ۔ وہ اتنی دیر تک سوتی رہی۔ پھر اس کی نظر اپنے پلنگ پر، اپنے زیوروں پر گئی جو پلنگ پر جابجا بکھرے پڑے تھے۔ پھر اس نے حیرت سے اپنے گلناری جوڑے کو دیکھا جو اس نے ابھی تک زیب تن کیا ہوا تھا۔

اور اسے ایک دَم یاد آگیا کہ رات تو اس کی سہاگ رات تھی۔

اور وہ بیت گئی...

کس طرح بیتی۔

ایک ایک بات اسے یاد آنے لگی۔

اس نے کروٹ لینی چاہی تو مڑا نہ گیا۔ اسی طرح سوتے سوتے جیسے وہ اکڑ گئی تھی۔ بازو چہرے کے نیچے تھا اور رخسار دُکھ رہا تھا۔

ہاں وہ کنگن ساری رات رخسار کو چبھتا رہا اور اسے احساس تک نہ ہوا۔

اب سارے احساس ایک ایک کرکے جاگ رہے تھے۔

اپنا چہرہ شیشے میں دیکھنے کو دل چاہا۔ دیکھے تو اس کے چہرے پر کیا بیتی...؟

جھٹکا دے کر اُٹھی....

پاؤں پلنگ کے نیچے لٹکائے۔

تو پھر ٹھٹھک کر رہ گئی۔

دوبارہ آنکھیں مَل کر دیکھا۔

واقعی سامنے صوفے پر آفاق بیٹھا تھا۔

صاف ستھرا۔ دُھلا دھلایا۔ ابھی اس نے ڈریسنگ گاؤن پہنا ہوا تھا۔ ویسے شیو وغیرہ کرلی تھی۔ منہ میں پائپ دبا ہوا تھا اور انگریزی کا اخبار سامنے رکھے محویت سے پڑھ رہا تھا۔ اسے

ہی فلک کا خون کھولنے لگا۔ رات اس نے کتنی بداخلاقی کا ثبوت دیا تھا اور اب کتنا مہذب بن کر بیٹھا ہے۔ اس کا دل چاہا وہ اس کی صورت پر تھوک دے اور اپنے گھر چلی جائے۔ ہاں، پ کیا مجبوری تھی۔ جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔

وہ ایک دَم غصے سے کھڑی ہو گئی۔ آفاق نے سر اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ مگر ایسے جیسے سری نظر سے دیکھتے ہیں۔

پھر وہ پائپ منہ سے نکال کر بولا

"صبح بخیر محترمہ!"

فلک نے جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

اس نے دوبارہ پائپ منہ میں ڈال لیا اور اخبار پڑھنے لگا۔

فلک جب اپنے من من کے قدم اُٹھا کر چلنے لگی۔

تو کوئی زیور لٹک کر اس کے پاؤں پر آگرا۔ کہیں سے پھول گر گیا۔ کہیں پہ دوپٹہ الجھا۔

کہیں غرارہ پھنسا...

یا اللہ....

آج کوئی بات اپنے اختیار میں نہیں ہے۔ اس نے دل میں سوچا۔

سب کچھ جھٹک کر...

وہ جلدی سے ڈریسنگ روم میں آگئی۔

ان کپڑوں سے اسے وحشت ہو رہی تھی۔

ڈریسنگ روم میں آئی تو وہاں اس کی گلابی رنگ کی خوب صورت اور بیش قیمت نائٹی لٹک رہی تھی۔

وائے قسمت اس کو پہننا نصیب ہی نہ ہوا۔

کیسے کیسے تصور اس نے اس کے ساتھ وابستہ کرلیے تھے۔

اس کا دل چاہا وہ نائٹی کو آگ لگا دے۔

مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔

بھاری جوڑا اتار کر وہ نائٹی پہن لی۔

کتنی ہلکی پھلکی اور ملائم تھی۔

پھر وہ غسل خانے میں چلی گئی۔

آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ آنکھیں رو رو کر بے تحاشا سوج گئی تھیں۔ جہاں کنگن چبھ تھا۔ وہاں عجیب بھونڈا سا نشان بن گیا تھا۔ جیسے کسی نے چٹکی کاٹی ہو۔

وہ ہاتھوں سے مل مل کے وہ نشان مٹانے لگی مگر جسم کا نشان تو اتنی جلدی نہیں مٹتا نا؟

ٹھنڈے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے آنکھوں پر مارے تو قدرے سکون ملا۔

اس کا غسل خانے سے باہر نکلنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

اس نے سوچا وہ نہالے۔ نہانے سے کچھ طبیعت بھی ہلکی ہو جائے گی۔ یہ جو سر میں گ ہے' نکل جائے گی اور کچھ وقت غسل خانے میں ہی کٹ جائے گا۔

یہ ٹھیک ہے۔

جلدی سے اس نے شاور کھولا۔ ٹھنڈا اور گرم پانی مکس کیا اور پھر اس کی پھواروں کے بیٹھ گئی۔ نرم نرم چھینٹے کتنے اچھے لگ رہے تھے۔ پانی جب اس کے گالوں کو چھیڑتا تو اسے بھی رونا آتا۔

اس کا دل چاہتا وہ جلدی سے ممی کے پاس جائے۔ ان کے سینے سے لگ کر روئے اور ا بتائے کہ اس کے ساتھ کیا ظلم ہوا ہے۔

پھر دل چاہتا اپنی سہیلیوں کے پاس جائے۔ چیخ چیخ کر روئے اور کہے کہ آج ان کی فلکی ا گئی۔

آسمان سے زمین پر آ رہی۔

ایک کمینے انسان نے اس کو پاؤں تلے روند ڈالا۔

توبہ' کتنا دل چاہ رہا تھا گھر جانے کو۔ یہ گھر اور اس کی ہر شے زہر لگ رہی تھی۔

باہر وہ منحوس بیٹھا ہوا تھا۔

اس کی طرف دیکھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

کسی عورت کی اس سے بڑی اور کیا توہین ہو سکتی ہے۔

اس کے بعد تو وہ ایک پل بھی اس کے ساتھ نہیں رہے گی۔

کافی دیر تک وہ نہاتی رہی اور اپنے دل کی جلن پانی سے مٹاتی رہی۔

باہر نکل کر اسے سمجھ نہیں آئی وہ کون سے کپڑے پہنے' باقی کپڑے ابھی صندوقوں می تھے۔ اس واسطے اس نے وہی نائٹی پہن لی اور اوپر موٹا ڈریسنگ گاؤن پہن لیا۔ نہ جانے ا آفاق سے ڈر کیوں لگ رہا تھا۔

اپنے بالوں کو تولیے سے سکھایا اور پھر بیڈروم میں آ گئی۔

آفاق کے آگے ایک ٹرالی لگی تھی اور ساتھ ایک باوردی بیرا کھڑا تھا۔ وہ چپ چاپ ڈریسنگ ٹیبل کے آگے کھڑی ہو گئی۔ تھوڑی سی کولڈ کریم چہرے پر لگائی اور پھر چاندی کے دستے والی کنگھی اٹھا کر اپنے بال سلجھانے لگی۔

"بیگم صاحب کے لیے ناشتہ لاؤ۔"

آفاق نے بیرے کو آرڈر دیا جسے اس نے بھی سنا۔

مگر مڑ کر نہیں دیکھا۔ اس کا ذرا بھی چائے پینے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ بس ممی کے پاس جانے کو دل کر رہا تھا۔

وہ خواہ مخواہ آفاق کے ساتھ بولنا نہیں چاہتی تھی۔

کنگھی کرنے کے بعد اس نے مڑ کر دیکھا۔ آفاق چائے پی رہا تھا اور اس کے بستر کی طرف دیکھ رہا تھا۔

بستر دیکھ کر اسے پھر رونا آ گیا۔

سارے زیور اس بستر پر بکھرے ہوئے تھے۔

وہ کلیاں جنھوں نے اس کے ہوش رُبا بدن کا نظارہ کرنا تھا' سہمی ہوئی تھیں۔

اور بستر کی غیر محسوس سی شکنیں آفاق کی بے حسی کا ماتم کر رہی تھیں۔

"میرا خیال ہے بیرے کے آنے سے پیشتر آپ اپنے قیمتی زیورات بستر سے اُٹھا لیں۔"

آفاق نے سپاٹ سے لہجے میں کہا۔

وہ یہ حکم ماننا نہیں چاہتی تھی۔

مگر اسے ماننا پڑا۔

آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آئی اور سارے زیور جمع کر لیے۔ اس کے ساتھ ساتھ سارے پھولوں کو بستر سے نیچے گرا دیا۔ رضائی کی تہہ لگائی اور بستر پر کور بچھا دیا۔

پتہ نہیں اس نے ایسا کیوں کیا....؟

کیا آفاق کے خوف سے....

نہیں....

اس کے من میں چور تھا۔

اسے ایسے لگ رہا تھا یہ بستر ہر آنے جانے والے کو رات کی کہانی سنا رہا ہے۔

اور رات کی کہانی میں اس کی سراسر سبکی تھی۔

اس لیے اس نے بستر کو چھپا دیا۔

زیور لا کر ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں رکھ دیے۔

اتنے میں بیرا ایک اور ٹرالی لیے اندر آیا۔

"بیگم صاحبہ کو چائے بنا کر دو۔"

آفاق نے پھر حکم دیا۔

بیرے نے میکانکی انداز میں چائے بنائی اور اٹھا کر اسے پیش کی۔ آفاق کے سامنے ہی دوسرا صوفہ پڑا تھا اور اس کو مجبوراً اس پر بیٹھ جانا پڑا۔ بیرا چائے آفر کر رہا تھا۔ اس کو معلوم تھا اس وقت انکار نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی پیالی پکڑ لی اور چائے سِپ کرنے لگی۔

بیرا فرشتے کی طرح سر پر کھڑا رہا۔

چائے ختم کرتے ہی اس نے باقاعدہ باقی چیزیں بڑھانا شروع کر دیں۔ دل تو نہیں چاہ رہا تھا مگر اس نے ایک فرائی انڈہ لے لیا اور ٹوسٹ کے ساتھ کھانے لگی۔

اس صورتِ حال پر اسے سخت غصہ آنے لگا۔

کس قدر مصنوعی ہوتے ہیں ایسے آدمی۔ اس نے سوچا۔

جان بوجھ کر بیرے کو یہاں کھڑا کر لیا ہے تاکہ مزید بات چیت نہ کرنی پڑے اور میں بھی کچھ کھا لوں۔

اونہہ......

آخر تو انکار کیوں نہیں کر دیتی فلکی۔

کسی نے اس کے دل میں کہا۔

پتہ نہیں کیا مجبوری ہے۔

اس نے خود ہی جواب دیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس صورتِ حال سے کس طرح نمٹا جائے۔

بہرحال وہ نوالے زہر مار کرتی رہی۔

نظر اٹھا کر جو دیکھا تو پونے گیارہ بج رہے تھے۔

واہ یہ اچھا ناشتے کا وقت تھا...؟

خیر اپنے گھر میں تو وہ ہمیشہ دس گیارہ بجے ہی اٹھا کرتی تھی مگر ان کے گھر میں بھی ابھی تک کسی کے جاگ جانے کی آوازیں نہیں آ رہی تھیں۔

پتہ نہیں آفاق کس وقت سے اٹھا ہوا تھا۔

جانے کہاں سویا تھا۔

اور پھر اُٹھ کر اس کمرے میں کیوں آیا تھا...؟

ہے کچھ چکر باز سا آدمی۔

اب بھی اخبار سامنے رکھے یوں ناشتہ کر رہا تھا جیسے اس کمرے میں اخبار کے علاوہ کوئی اہم چیز نہیں ہے۔

اللہ رے بے نیازی....

جی چاہ رہا ہے ایسا تھپڑ رسید کروں کہ چھٹی کا دودھ یاد آئے۔

وہ بیٹھی کھول رہی تھی کہ ایک دم باہر شور اُٹھا۔

پھر غول کا غول اندر آ گیا۔

اوہو۔ یہ تو سب اس کی سہیلیاں تھیں۔

اور سب سے آخر میں ممی بھی آ گئیں۔

ممی کو دیکھ کر وہ کھڑی ہو گئی۔ اس کا دل بھر آیا۔ زندگی میں پہلی بار اس کا دل چاہا' وہ ممی کے گلے لگ کر خوب روئے۔

اور پھر اس نے ایسا ہی کیا۔

دوڑ کر ممی کے سینے سے لگ گئی اور رونا شروع کر دیا۔

ماں بیٹی کے گلے مل کر رونے کو وہ ہمیشہ ڈرامہ کہتی تھی مگر آج اسے پہلی بار احساس ہوا۔ ماں کس لیے ہوتی ہے کیوں اس کے سینے سے لگ کر رونے کو دل چاہتا ہے اور اس طرح رو کر کیسی تسکین ملتی ہے.....

وہ گلے لگی رو رہی تھی اور ممی اس کے گیلے بالوں پر ہاتھ پھیرتی جا رہی تھیں۔

ساری سہیلیاں ٹک ٹک کبھی آفاق کو۔ کبھی فلکی اور کبھی سارے کمرے کو دیکھ رہی تھیں۔

پھر بستر پر آ کر ان کی نظریں رک جاتیں۔ بہت خواب آگیں اور دلکش مسہری تھی۔

فلکی کا رونا سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"بس اب بند کرو رونا دھونا اور ممی کو بٹھاؤ۔"

آفاق کھڑا ہو گیا اور بازو سے پکڑ کر فلکی کو یوں الگ کیا جیسے وہ اس بازو پر ہر حق رکھتا ہو۔ فلکی کا دل چاہا۔ جھٹکے سے بازو چھڑا لے مگر پھر اسے اپنی رات والی سُبکی کا خیال آ گیا۔ چپکے سے الگ ہو گئی۔

"بھلا رونے کی کیا تک ہے چاند۔"

ممی اپنی ساڑھی سنبھالتی ہوئی صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"اکلوتی بچی ہے۔ پہلی بار الگ ہوئی ہے۔ آخر کوئی خیال آ ہی جاتا ہے۔"

آفاق نے خوش دلی سے کہا۔

"رخصتی کے وقت تو آپ نے اسے رونے نہیں دیا۔ اب آپ کو دیکھتے ہی ذرا ایکسائیٹڈ ہو گئی ہے۔"

آفاق نے اتنی خوب صورتی سے یہ جملے کہے کہ سب کو یقین آ گیا۔ ایک سوائے فلکی کے جو اندر ہی اندر غصّے سے بل کھا رہی تھی۔

"بھئی آپ لوگ بیٹھیں۔ اس طرح میرے سر پر کیوں سوار ہیں؟" آفاق نے فلکی کی سہیلیوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہم آپ کے سر پر تو سوار نہیں ہیں۔ غالباً آپ کی نظر بھی کمزور ہے۔" پنکی نے جواب دیا۔

"تھی تو نہیں مگر شاید ایک رات میں ہو گئی ہے۔"

اس پر سب نے قہقہہ لگایا۔

"آنی یہ سب فلکی کی سہیلیاں ہیں۔ بھئی تعارف کراؤ نا اپنی سہیلیوں کا۔" ممی نے فلکی کی طرف دیکھ کر کہا۔

فلکی ابھی تک اپنی آنکھیں خشک کر رہی تھی۔

سب لڑکیاں اِدھر اُدھر بیٹھ گئیں۔

"اس کو آج کہاں اتنا ہوش۔" یہ کہہ کر پنکی نے خود ہی تعارف کرانا شروع کر دیا۔

"میرا نام پنکی ہے۔"

"ٹھیک نام ہے۔" آفاق نے اس کے گلابی چہرے پر بے باک نگاہیں جماتے ہوئے اسے ٹوک دیا۔ اس سے پنکی بلش کر گئی مگر بولتی رہی "یہ چوچو ہے' یہ نکی ہے' یہ اسماء ہے' یہ فوقیہ ہے اور یہ چندا ہے۔"

"ہم سب فلکی کی سہیلیاں ہیں۔"

"ظاہر ہے۔" آفاق شرارت سے بولا "سہیلیاں ہی شادی کے دوسرے دن یوں دھاوا بول سکتی ہیں۔"

"آنی۔ یہ بڑی آفت ہیں۔ صبح نو بجے سے آ کر بیٹھی ہوئی ہیں۔ انھیں تم سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔ بہ مشکل گیارہ بجے تک روکا۔ میرا اپنا دل بے بی کے لیے بے چین ہو رہا تھا مگر میں آپ لوگوں کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتی تھی۔"

"آپ کا آنا تو گویا ہمارے لیے عید ہے ممی۔ ویسے آپ بڑے اچھے وقت پر آئیں۔ فلکی بھی ابھی اٹھی تھی اور اب میں اس کو ناشتہ کرا رہا تھا۔"

"ہائے اتنی دیر میں اٹھی فلکی؟" ایک سہیلی نے مصنوعی حیرت سے کہا۔

"جی ہاں۔ ساری رات جاگ کر کوئی علی الصبح اٹھ سکتا ہے؟" آفاق نے جواب دیا۔

"شریر کہیں کا....." ممی نے ادا سے مسکرا کر اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"سچ سچ بتائیں ممی' فلکی آپ پر جائے گی یا نہیں۔ مجھے خطرہ ہے کچھ عرصہ بعد یہ آپ کی ماں لگنے لگے۔"

"نان سینس۔" ہنستے ہنستے ممی دوہری ہو گئیں۔

"خوب باتیں بناتے ہو۔"

فلکی جی ہی جی میں کڑھنے لگی۔

"خدا کی قسم میں نے تو آپ کو دیکھ کر فلکی سے شادی کر لی ہے۔ عورت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ سدا بہار ہو۔ میں ذرا بے تکلفانہ انداز میں باتیں کرتا ہوں۔"

"سنی تمھاری کوئی بات مجھے بری نہیں لگتی۔" ممی نے ہنس کر کہا۔

اتنے میں بیرا چائے اور لوازمات لے آیا تھا۔ وہ چائے اور مٹھائی سب کو پیش کرنے لگا تھا۔ ممی نے مٹھائی کھانے سے صاف انکار کر دیا مگر ہاں' ایک پھیکی اور کڑوی سی چائے کی پیالی لے لی۔

"خواتین تم ڈائٹ نہیں کرتی ہو؟"

آفاق نے مٹھائی ان کی طرف بڑھائی۔

"پہلے انھیں دیجیے۔" چوچو نے فلکی کی طرف اشارہ کیا۔

"ان کے تو ہم زر خرید غلام ہیں۔" یہ کہہ کر آفاق نے سر کو جھکایا اور مٹھائی کا ایک پیس

اٹھا کر فلکی کے منہ کی طرف بڑھایا۔ ہر چند کہ فلکی چاہتی تھی اس کا ہاتھ جھٹک دے۔ وہ کر سکی۔ اس کی سہیلیاں اس پر رشک کر رہی تھیں۔ ماں نثار ہو رہی تھی۔ کسی کو کچھ علم تھا کہ اس پر کیا بیت رہی ہے۔

عافیت اسی میں تھی۔ وہ مٹھائی کھالے۔

اس نے جب ذرا سا منہ کھولا تو آفاق بولا "یوں نہیں' مسکرا کر۔" اور واقعی فلکی کو آگئی۔

"یہ ہوئی نا بات..."

ساری سہیلیاں زور سے ہنس پڑیں۔

"اچھا تو معاملہ یہاں تک پہنچ چکا ہے۔"

"جی نہیں اس سے بھی آگے..."

ممی نے سوچا کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے اٹھ کر باہر چلی جائیں۔

اس لیے وہ بہانہ بنا کر چلی گئیں۔

بعد میں سب کو خوب خوب باتیں کرنے کا موقع مل گیا۔

"اری یہ تیرے گال پر چٹکی کس نے کاٹی؟"

فلکی نے منہ جھکا لیا۔

شاید وہ اپنے آنسو چھپانا چاہتی تھی۔

"اور دیکھو آنکھیں کس قدر سوجی ہوئی ہیں۔ کیا ساری رات جاگی ہو؟" فلکی کچھ نہیں بو

"دولہا بھائی' آپ بتائیں؟" اسماء نے پوچھا۔

"بھئی' میں کیا جانوں جس کی کلائی میں اس نے دانت گاڑے ہوں گے' اسی نے رخسار چٹکی لی ہوگی۔"

"اُوئی توبہ..."

اور سب بے تحاشا ہنسنے لگیں۔

فلکی نے اپنا سر گھٹنوں میں رکھ لیا۔

وہ اپنے چہرے کے تاثرات چھپانا چاہتی تھی۔ مبادا کوئی آنسو نکل آئے۔

"اری تو شرما رہی ہے؟" چٹکی نے اس کا سر اُٹھایا۔

"توبہ' رات تو اسے ذرا بھی شرم نہیں آرہی تھی۔ اب نہ جانے آپ کے سامنے کیے

بن رہی ہے؟ کیوں فلکی! بتا دوں ان کو رات والی ساری باتیں..."

"پلیز پلیز..." سب نے شور مچا دیا۔ "ضرور بتائیں۔"

فلکی نے پھر گھٹنوں پر سر رکھ لیا۔

"جی ہاں۔ ایک شرط پر بتاؤں گا۔"

فلکی کا دل دھڑک اٹھا۔

"منظور' منظور..." سب یک زبان بول اٹھیں۔

آپ یوں کریں۔ اس وقت فلکی کو تنہا چھوڑ دیں۔ یہ بے چاری ساری رات کی جاگی ہوئی ہے۔ رات کو ولیمہ ہے۔ پھر جاگنا پڑے گا۔ اس وقت دو تین گھنٹے سو جائے۔ دوسری ملاقات میں آپ کو سب کچھ بتا دیا جائے گا۔"

"اچھا..."

وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں۔

"یو لو فلکی' جائیں؟"

فلکی نے کچھ نہیں کہا۔ صرف اٹھ کر بستر تک گئی اور اوندھے منہ لیٹ گئی۔ سب نے اس کو اشارہ سمجھا اور آفاق سے دوسری ملاقات کا وعدہ لے کر باہر نکل گئیں۔

ممی اندر آگئیں۔

"فلکی کو کیا ہوا ہے؟"

"ممی یہ ذرا تھکی ہوئی ہے۔" آفاق نے رک کر کہا "دو تین گھنٹے سونا چاہتی ہے۔"

"اچھا میں بھی چلتی ہوں۔ ان لڑکیوں کو ان کے گھروں میں چھوڑنا ہے۔ شام کو پھر ملاقات ہوگی۔"

"جی ضرور چلنے میں آپ کو موٹر تک چھوڑ آؤں۔" آفاق ساتھ ہو لیا۔

راستہ بھر وہ ممی کی شان میں قصیدے پڑھتا گیا۔ ان کی چال کی تعریف۔ جوتی کا قصیدہ' ساڑھی کی ستائش۔ غرض ہر بات کی اس انداز میں تعریف کی کہ ممی کو سچ مچ اپنی بیٹی کے نصیبے پر رشک آنے لگا۔

رات کو ولیمہ تھا۔ ولیمے کے لیے بھی اس نے بطورِ خاص اپنا غرارہ اور جال والا دوپٹہ ڈیزائن کیا تھا۔ سبز رنگ کا ٹشو ممی امریکہ سے لائی تھیں' جس پر اس نے گلابی پھولوں والا کامدانی کا کام ڈیزائن کیا تھا۔ ویسا ہی کام دوپٹے پر تھا۔ زمرد کا بھاری سیٹ بنوایا تھا۔ اسی طرح کی ہائی ہیل کی جوتی بنوائی تھی۔ اسی کپڑے کا پرس تھا۔ اپنے خیال میں دوسرے دن اس کا پری بننے کا ارادہ تھا۔ ویسے بھی لوگ کہتے تھے' سبز رنگ اس پر بہت کھلتا ہے۔ حالانکہ سبز رنگ بہت کم لوگوں پر جچتا ہے مگر فلکی اس میں واقعی سبز پری نظر آتی تھی کیونکہ جب سبز رنگ کا عکس اس کی آنکھوں میں پڑتا تھا تو چمک دار براؤن آنکھیں خودبخود سبزی مائل نظر آنے لگتی تھیں اور اس کے چہرے پر رنگ ہی رنگ بکھر جاتے تھے۔

وہ شام کو خودبخود تیار ہوئی حالانکہ اس کا ارادہ بیوٹی سیلون جانے کا تھا اور اس نے پہلے سے ٹائم بھی لے رکھا تھا۔

مگر اب اس کا ہر ارادہ بدل گیا تھا۔

دوپہر کو جب اس کی ممی چلی گئی تھیں تو وہ دوبارہ جی بھر کے روئی تھی۔ آفاق' ممی کو چھوڑنے گیا تو پھر اندر نہیں آیا تھا۔ ویسے بھی اس گھر کے ملازم اتنے مہذب تھے کہ اجازت کے بغیر کمروں میں نہیں آتے تھے اس لیے وہ تنہا پڑی روتی رہی اور پھر سو گئی تھی۔

تقریباً" تین بجے اس کی آنکھ کھلی۔

غسل خانے میں جا کر منہ دھویا اور کپڑے بدل لیے۔ اس وقت تک رات کے لباس میں رہنا اسے اچھا نہ لگا۔

تین گھنٹے سونے سے اس کی طبیعت کافی پُرسکون ہو گئی تھی۔ ابھی وہ بیٹھی سوچ ہی رہی تھی کہ بیرا آگیا اور بولا "صاحب کھانے کی میز پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"تو ابھی آفاق نے بھی کھانا نہیں کھایا؟"

اس کا دل دھڑک اٹھا۔ کیا خبر وہ زود پشیماں بھی اسی کے انتظار میں بیٹھا ہو۔

پہلے اس کا دل چاہا انکار کر دے اور کہہ دے میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔ پھر اسے محسوس ہوا ویرے سے یہ کتنا کچھ ٹھیک نہیں لگے گا۔ وہ کیا سمجھے گا کہ پہلی رات ہی کھٹ پٹ ہو گئی ہے اور پھر کچھ بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔

"اچھا۔" کہہ کر وہ کھڑی ہو گئی۔

پتہ نہیں ڈرائنگ روم کس طرف تھا۔

بہرحال ڈھونڈ لینا کون سا مشکل تھا۔

سر پر دوپٹہ اوڑھ کر وہ باہر نکل گئی۔ اب اسے آفاق سے ڈر لگنے لگا تھا۔ سہمی سہمی چاروں طرف دیکھنے لگی۔ بیرا ایک طرف کو مڑ گیا تھا۔ وہ بھی اُدھر کو چلی۔ بہت بڑا لاؤنج بنا ہوا تھا جس میں ٹی۔وی کیسٹ ریکارڈ اور فون پڑا تھا۔ تین صوفہ سیٹ پڑے تھے۔ شاید یہاں بیٹھ کر سب ٹی وی دیکھتے تھے۔ دو دروازے باہر نکلتے تھے۔

اندازے سے ایک طرف کو مڑی۔ اس کا اندازہ صحیح نکلا۔ یہ راستہ ڈرائنگ اور ڈائننگ روم کو جاتا تھا۔

بہت خوب صورت اور عالی شان ڈرائنگ روم تھا۔ غالباً" کل اسے یہیں لا کر بٹھایا گیا تھا مگر کسے دیکھنے کی فرصت تھی۔

بہت قیمتی قالین تھے اور ان پر دیدہ زیب پھول بنے ہوئے تھے۔ شاید ایرانی تھے۔ صوفے بھی بہت آرام دہ اور سادہ شکلوں کے تھے۔ ڈرائنگ روم کی ایک ایک شے نفاست اور سادگی کا نمونہ تھی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ سب چیزیں بہت قیمتی ہیں مگر ان سے نمائش یا تصنّع کی بُو نہیں آتی تھی۔ نہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ مکینوں نے اپنا آپ دکھانے کے لیے سارا زور صرف ڈرائنگ روم پر ہی لگا دیا ہے۔ جیسے کہ ان کا ڈرائنگ روم تھا' زمانے بھر کی چیزیں ان کے ڈرائنگ میں تھیں۔ ممی ہر سال باہر جاتی تھیں اور اتنے ڈیکوریشن پیس اور اَلا بَلا لاتی تھیں اور پھر چاہتی تھیں کہ سارے کے سارے ہی ڈرائنگ روم میں سجا دیے جائیں اور جب کوئی ڈرائنگ روم میں آتا تو وہ اپنی خریدی ہوئی غیر ملکی چیزیں اُٹھا اُٹھا کر انھیں دِکھاتیں اور بتاتیں کہ کس ملک سے انہوں نے کیا اور کتنے میں خریدا تھا۔ اس طرح وہ سب سے داد وصول کیا کرتیں۔

یہی حال ان کے ڈائننگ روم کا بھی تھا۔

اسے اپنا ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم عجائب خانہ معلوم ہوتے تھے۔ جہاں ملک ملک کی

لائی ہوئی چیزیں جگہ نہ ہونے کے باوجود رکھی جاتی تھیں اور ممی فلکی سے زیادہ ان چ
خیال رکھتی تھیں۔ آج اسے احساس ہوا سادگی و پُرکاری کیا شے ہوتی ہیں۔ اتنے نفیس
آفاق کے ڈرائنگ روم میں تھے کہ ذرا بھی طبیعت پر بوجھل یا گراں نہیں گزرتے تھے'
ممی ہر چھ ماہ کے بعد پردے بدل دیتی تھیں اور پھر ہمیشہ یہ دیکھا کرتیں کہ آج کل شہر میں
سے قیمتی کپڑا کون سا چل رہا ہے۔ سچ کرے نہ کرے' موسموں سے مطابقت کرے نہ کر
وہی کپڑا خرید لایا کرتی تھیں۔ بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا پردے سروں پر چڑھ
آرہے ہیں۔

اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی وہ کھانے کے کمرے کی طرف بڑھی۔

کھانے کا کمرہ اور ڈرائنگ روم مشترک تھے۔ اسے دور سے نظر آگیا کہ آفاق میز کے
سرے پر بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا ہے۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی گئی اور میز کے دوسرے سرے پر بیٹھ گئی۔ آفاق کے با
سامنے۔

آفاق نے نظر اُٹھا کر دیکھا اور پھر زور سے ہنس پڑا۔

"بھئی اتنے زیادہ فاصلوں کی ضرورت نہیں ہے۔ آیئے ذرا میرے قریب بیٹھئے۔ اور نیم
نوکروں کا ہی خیال کیجئے۔ وہ کیا کہیں گے کہ یہ کیسے دولہا دولہن ہیں...؟"

اس کی بات سن کر فلکی کو غصہ بھی آیا اور رونا بھی۔

"آجایئے' آجایئے.... یہاں۔"

اس نے اپنے ساتھ والی کرسی پر اشارہ کیا۔

"ہمیں پاس بیٹھنے کا اعزاز بخشئے۔"

"فلکی مجبوراً" اٹھ کر آگئی اور ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"ویسے میں اتنا پلپلا نہیں ہوں کہ ساتھ بیٹھتے ہی پگھل جاؤں گا۔" اس نے فلکی کے بیٹھتے
کہا۔ "آپ کو اور لوگوں کا تجربہ ہے۔"

کم بخت۔ ذلیل۔ فلکی کو اپنا وہی پیدائشی غصہ آنے لگا۔ اس کا دل چاہا فوراً" اُٹھ کر کمرہ
سے باہر نکل جائے مگر دو بیرے طشت اُٹھائے قریب آگئے تھے۔

وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔

نہ جانے اس اُلو کے پٹھے کے آگے اتنی مجبور کیوں ہو جاتی ہے۔ اس نے دل میں سوچا۔

بیرے نے پہلے طشت اس کی طرف بڑھایا۔ اس میں بکرے کا روسٹ تھا۔

اس نے چمچی کی مدد سے ذرا سا گوشت نکالا اور اپنی پلیٹ میں رکھ لیا۔ پھر دوسرے بیرے نے
طشت آگے بڑھایا۔ اس میں بہت ہی خوشبودار پُلاؤ تھا۔ اس نے ایک چمچ پُلاؤ نکال لیا۔

اسی طرح طشت آتے رہے اور وہ بس ذرا ذرا سا کچھ لیتی رہی۔ تھوڑی دیر پہلے اسے واقعی
بھوک لگ رہی تھی اور اب ساری بھوک نہ جانے کہاں فنا ہو گئی تھی۔

جب بیرے اِدھر اُدھر ہوئے تو آفاق بولا "کیا خیال ہے؟ کھانا کھائیں یا نہیں۔ آپ اسی
طرح سوچ میں مگن بیٹھی رہیں تو میں بھوکا مرجاؤں گا کیونکہ میں اور بہت سی باتیں برداشت
کرسکتا ہوں مگر بھوک ہرگز برداشت نہیں کرسکتا۔"

اس نے غصے بھری آنکھوں سے آفاق کی طرف دیکھا۔

"مجھے نہیں کھایئے کھانا کھایئے۔"

فلکی کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور دو آنسو بے اختیار لڑھک کر اس کے رخساروں تک
آئے اور پھر چاولوں کی پلیٹ میں آگرے۔

سامنے بیرا آرہا تھا۔

فلکی نے جلدی سے ہاتھوں سے اپنے رخسار صاف کیے اور ایک چمچ چاولوں کا بھر کے منہ
میں رکھ لیا۔ واہ کبھی اپنے ہی آنسو پینے بھی اور کھانے بھی پڑتے ہیں۔

گلا پھول رہا تھا۔ رونے کو دل چاہ رہا تھا۔ نوالہ اندر جانے کی بجائے باہر آرہا تھا اور یہ ظالم
اصرار کررہا تھا کھانے پر۔

"بارہ بجے سے آپ کا انتظار کررہا ہوں۔ آپ اٹھیں تو کھانا کھائیں۔" آفاق نے بھی پہلا
لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"اور اب کہیں آپ نے کھانے کی اجازت مرحمت فرمائی ہے۔"

دونوں بیرے اِدھر اُدھر کھڑے تھے۔

فلکی نے نظر نہیں اٹھائی بس چپ چاپ کھاتی رہی۔

بیروں کی موجودگی میں آفاق ہنس ہنس کر اس سے باتیں کرنے لگا۔

پھر اسے رات کی دعوت کے متعلق بتانے لگا "سات بجے سے مہمان آنا شروع ہو جائیں
گے۔ آپ کو چھ بجے بالکل تیار ہونا چاہیے تاکہ ہم خود مہمانوں کا استقبال کرسکیں۔ ویسے بھی
ممی کزنز وغیرہ آجائیں گی۔ وہ آکر سارے گھر کو سنبھال لیں گی۔ بہرحال آپ تو اس گھر کی مالکہ

ہیں اس لیے آج ہی سے ساری ذمے داریاں اٹھانے کے لیے تیار ہو جایئے۔"

فلکی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ کھانا کھاتی رہی اور کھانے کے دوران ڈر روم کا جائزہ بھی لیتی رہی۔ اس کمرے میں بہت ہی اعلیٰ قسم کا فرنیچر تھا۔ آبنوس کی سیاہ ڈا ٹیبل کے گرد بارہ نفیس' اونچے کٹہرے والی اور آرام دہ کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ تب محسوس ہوا کہ کھانے کے کمرے میں بھی آرام دہ کرسیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ورنہ لوگ نئے سے نیا ڈیزائن بنوانا چاہتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے' کھانا کھاتے وقت آرام ملتا ہے یا نہیں۔

دل ہی دل میں وہ آفاق کی ہر بات کو' ہر چیز کو سراہ رہی تھی مگر بظاہر جو رویّہ اس نے کے ساتھ رکھا ہوا تھا' وہ اسے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔

ابھی وہ لوگ میز پر بیٹھے تھے کہ کچھ رشتے دار آ گئے۔ آفاق ان کے ساتھ ہی ڈرائنگ میں آ گیا۔ ساتھ ہی فلکی کو بھی آنا پڑا۔ نئی دولہن کا حال سب ہی شوق سے پوچھ رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے چار بج گئے۔ آفاق کی کزن نے فلکی سے کہا "بھابی' اب آپ چل کر تیار شروع کر دیں۔ سردیوں کی شام جلد ڈھل جاتی ہے۔ ابھی مہمان آنا شروع ہو جائیں گے۔"

فلکی اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

اُف' ذرا بھی تیار ہونے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔

مگر یہ سارا ڈرامہ اس کو کرنا تھا۔ کم از کم آج رات کے لیے اور کتنا جبر کر رہی تھی وہ آپ پر۔ خود اپنے پر اسے حیرت ہو رہی تھی۔ اتنا صبر اور حوصلہ اس میں کہاں سے آ گیا تھا۔

اور کتنی عجیب بات ہے۔ رات سے اب تک اس نے آفاق کے ساتھ ایک بات بھی کی تھی' نہ ہی اس کا دل چاہا تھا کچھ پوچھنے کو۔

اس کی شکل دیکھتے ہی اسے غصّہ آ جاتا۔

اور پھر وہ کونسا اس کے جواب کا متمنّائی تھا۔

محفل میں اتنے سلیقے سے باتیں کرتا کہ کسی کو احساس ہی نہ ہوتا کہ فلکی حصّہ نہیں لے یا اس کا موڈ خراب ہے۔ پھر نئی دولہن کی خاموشی کو لوگ حیا ہی سمجھتے رہتے ہیں۔ اس کی ح سے یہی اندازہ لگاتے ہیں کہ نئے جہان کی نئی باتیں اور نئے تجربے اسے پریشان کیے دے ر ہیں۔ رفتہ رفتہ ٹھیک ہو جائے گی۔

فلکی نے ایک بھرپور انگڑائی لی۔

اور پھر قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے سراپا کا جائزہ لیا۔

اپنا چہرہ غور سے دیکھا۔

صبح سے اس نے میک اپ نہیں کیا تھا۔

پھر بھی اس کا رُوٹھا رُوٹھا اور تنا تنا چہرہ بڑا اچھا لگ رہا تھا۔

غلافی آنکھیں سُوج کر اور بھی نمایاں اور سرخ ہو گئی تھیں۔

ہونٹ کیسے سرخ تھے۔

ظالم نے کس شے کی قدر کی؟

اسے پھر رونا آنے لگا تھا۔

باہر قدموں کی چاپ سن کر وہ ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔

وہی سبز سوٹ نکالا۔

منہ ہاتھ دھویا اور کپڑے بدل کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ گئی۔

اس نے سوچا۔ وہ خود تیار ہو جائے گی۔

رات والا جُوڑا لگا کر ہی سو گئی تھی۔ مسک گیا تھا۔ اس نے اسی کو ٹھیک کر لیا۔

بلاشبہ اسے دو گھنٹے تیار ہونے میں لگے۔

بڑی خوب صورتی سے اس نے اپنا میک اپ کیا۔ میک اپ کرنے میں تو وہ پہلے بھی طاق تھی۔

آنکھوں پر سبز آئی شیڈ لگایا۔

زمرد کا جڑاؤ سیٹ پہنا۔ ویسی ہی چھوٹی سی نتھ لگائی اور جب اوا سے دوپٹہ اوڑھا تو پھر اپنی صورت دیکھ کر اسے رونا آ گیا۔

کتنی تو سندر ہے وہ۔ کیا یہ روپ ٹھکرائے جانے کے قابل ہے۔

ابھی وہ سوچ رہی تھی کہ آفاق اپنی دو تین کزنز کو لے کر اندر آ گیا۔

"آخاہ۔"

"بھابی کتنی سندر ہیں۔" اس کی کزن نے جھوم کر کہا۔

"خدا کی قسم بھیا! آپ بڑے خوش نصیب ہیں۔ دیکھیں تو فلکی بھابی حسن کا مکمل شاہکار ہیں!"

"خوش قسمت میں ہوں یا یہ؟"

آفاق نے فلکی کی طرف انگلی سے اشارہ کیا ہے۔

"بلاشبہ یہ بھی خوش نصیب ہیں۔" وہ بولی۔

"میں کیا کسی سے کم ہوں؟" ایسا سجیلا، گبھرو، خوبرو ڈھونڈ کے تو لاؤ اس شہر سے۔"

فلکی آئینے کے آگے سے ہٹ گئی اور اب وہ آئینے کے سامنے آگیا تھا۔

"جی، وہ تو مانا۔" اس کی کزن بولی۔

"مجھے تو بھابی میں بھی کوئی کمی نظر نہیں آتی۔"

"ان میں صرف خوشبو کی کمی ہے۔"

یہ کہہ کر آفاق نے کلون کی بوتل اٹھائی اور بے تحاشا فلکی پر چھڑک دی۔ اس کے کپڑوں پر، چہرے پر، وہ بے چاری پرے ہٹتی گئی۔ چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپاتی گئی مگر وہ چھڑکتا گیا۔

اس کو شرارت کے موڈ میں دیکھ کر اس کی کزن باہر بھاگ گئی۔

آفاق نے اسپرے کی بوتل رکھ دی اور اپنا چہرہ اس کے بہت قریب لے گیا اتنا کہ اس کے ہونٹ فلکی کے رخساروں تک پہنچ گئے۔ سرگوشی میں بولا "خوشبو چھڑکنے سے کبھی چہرہ داغ دار نہیں ہوتا۔" پھر ایک دم سیدھا کھڑا ہو گیا اور بولا "مہمان آپ کے منتظر ہیں۔ قتل کے سب منصوبے مکمل ہو گئے ہوں تو باہر تشریف لے چلئے۔ آپ کو تو گھائل کرنے کی عادت ہے۔ کچھ آج گھائل ہوں گے اور کچھ بسمل پرانے اپنے تڑپنے کا تماشا دیکھنے آئیں گے۔"

فلکی کا دل چاہا، وہ اس کے منہ پر تھپڑ مار دے مگر اس نے جلدی سے اس کا بازو پکڑا اور اسے باہر گھسیٹ لایا۔

اُف، کتنا سخت اور مضبوط تھا اس کا بازو۔

فلکی کو اپنے کمزور ہونے کا احساس شدت سے ہونے لگا۔

وہ اسے گھسیٹتا ہوا یونہی باہر لے گیا۔

باہر واقعی بہت مہمان آچکے تھے۔

فلکی نے کمال ضبط سے آنکھوں میں آئے آنسو اور دل میں آیا ہوا غصہ پیا اور چہرے کو بشاش بنانے کی کوشش کرنے لگی۔

اس کش مکش میں اس کا چہرہ کچھ اور سرخ ہو گیا" آنکھوں میں بھی سرخی آگئی، ہونٹ کانپنے لگے اور ایک سہما ہوا سوز اس کے چہرے پر آکر ٹھہر گیا جس کی وجہ سے وہ ایک معصوم اور کھوئی کھوئی سی لڑکی دکھائی دینے لگی۔

جس نے بھی دیکھا، اسی نے سراہا۔

"واہ، کتنی خوب صورت جوڑی ہے۔"

"اللہ نظرِ بد سے بچائے۔"

"بھئی، کتنی پیاری دولہن ہے۔"

"اللہ نے سوچ سمجھ کے جوڑی بنائی ہے۔"

ہر جگہ بس انہی کے چرچے تھے۔

"بھئی، یہ کیا بے انصافی ہے۔" ایک جگہ آفاق نے ٹھہر کر کہا۔

"شادی کے دن لوگ صرف دولہن کی تعریف کیا کرتے ہیں مگر آپ ایسے ستم ظریف ہیں کہ دونوں کی تعریفیں کیے جا رہے ہیں۔"

ایک قہقہہ اُمنڈ پڑا۔

"ہم کیا کریں جناب! آپ دونوں نہلے پہ دہلا ہیں۔ آج دونوں کی چھب دیکھی نہیں جاتی۔"

"خیر، میرا لحاظ نہ کیجئے۔ میری دولہن کو حسد ہوتا ہے۔ جب آپ میری تعریف کرتے ہیں، وہ لتی ہیں حسین ہونے کا حق صرف عورت کو ہے۔"

"کیوں فلک؟" اس نے جھک کر فلکی کی آنکھوں میں دیکھا۔ سب لوگ زور سے ہنس پڑے فلکی صرف دھیرے سے مسکرا دی۔

اس وقت مسکرانا ہی ٹھیک تھا ورنہ وہ جانتی تھی کہ وہ کم بخت کیا کہہ رہا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے؟

"شریر...." کئی عورتوں نے اسے ٹھوکا دیا۔

"بھئی، ہم تو یہی کہیں گے، اللہ نے کیا خوب جوڑی ملائی ہے۔" ایک آنٹی نے وارفتگی سے کہا۔

"آنٹی، جوڑی ملانا کوئی ایسی بات نہیں، دل ملنے چاہئیں۔"

"ایک کا دل مشرق میں ہو اور دوسرے کا مغرب میں، تو یہ خوب صورت چہرے بھلا فریم میں لگانے کے کام آئیں گے؟"

"کیا مطلب ہے تمہارا، ایک دن شادی کو ہوا اور یہ باتیں کر رہے ہو؟" دوسری عورت نے پلٹ کر پوچھا۔

"بھئی، آنٹی سے پوچھ لیں آپ۔ ان کی جوڑی بھی سنا ہے بہت اچھی تھی مگر یہ بھی کہتی ہیں کہ انکل نے ان کے حسن کی قدر نہ جانی۔"

"دیکھو' دیکھو..." آنٹی بوکھلائی "اب یہ شریر اُلٹا میرے گریبان میں ہاتھ ڈال رہا ہے۔ بتاتی ہوں تمہارے انکل کو۔"

"ارے نہیں آنٹی' میں تو مذاق کر رہا تھا۔"

سارے پنڈال میں چکر لگا کر آفاق اور فلکی نے سب مہمانوں کو خوش آمدید کہا۔

سخت سردی تھی اور فلکی ویسے ہی اس کے بازو میں ٹھنڈی ہوئی جا رہی تھی۔ آفاق محسوس کر کے کہا "اگر آپ تھک گئی ہوں تو وہاں شہ نشین پہ آپ کو بٹھا دوں؟ وہاں ہیٹر ہوئے ہیں اور لوگ وہیں آپ کے پاس آجائیں گے۔"

اس نے صرف اثبات میں سر ہلا دیا۔

آفاق نے لے جا کر اسے اس جگہ پر بٹھا دیا' جو خاص دولہا دولہن کی نشست تھی۔

وہاں واقعی حدت تھی۔ ہیٹر لگے ہوئے تھے۔

وہ سکون سے بیٹھ گئی۔

شکر ہے اس ظالم کے شکنجے سے نجات ملی۔ اگر اس نے محبت سے پکڑا ہوتا تو اور بات تھی لے کے اس کا بازو توڑ دیا۔ اس پر کیسی زہریلی باتیں کرتا ہے۔ لوگ تو اسے بڑا خوش اخلاق ہنس مکھ سمجھ رہے ہیں مگر میں خوب جانتی ہوں کس قدر زہریلا ہے وہ۔

تھوڑی دیر بعد اس کی سہیلیاں آگئیں۔ ایک سے ایک بن سنور کے آئی تھی۔

آفاق انھیں اس کے پاس لے گیا اور پھر فلکی کے بالکل نزدیک چہرہ کر کے بولا "کتنی پیاری سہیلی کیوں نہ ہو' اسے راز کی بات کبھی نہیں بتانی چاہیے عورت پیٹ کی ہلکی ہے۔"

"CHEATING CHEATING" چیٹنگ... چیٹنگ..."

لڑکیاں پیچھے سے اس کا کوٹ کھینچ کر اسے پیچھے کرنے لگیں۔

"آپ فلکی کو سکھا رہے ہیں۔"

وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"بھئی' میں کیوں سکھانے لگا۔ وہ تو خود سیکھی سکھائی میرے پاس آئی ہے۔" یہ کہہ کر وہ گیا۔ فلکی تلملا کر رہ گئی۔ ایک دن میں اتنے کچوکے؟ کوئی کہاں تک اپنے آپ کو سنبھالے۔

اتنے میں ممی بھی آگئیں۔ خوب سینے سے لگا کر پیار کیا۔ چوما اور ساتھ ہی بیٹھ گئیں۔

پھر بہت سے کیمرے آگئے۔ آفاق بھی آگیا۔ ہر تصویر میں آفاق نے ممی کو وہیں بٹھا

لیا۔

"آپ کے بغیر میں ایک تصویر بھی نہیں کھنچواؤں گا۔" وہ بولا۔

پھر فلکی کی سہیلیوں کے ساتھ پوز بنا بنا کر' ہاتھ پکڑ پکڑ کر بے شمار تصویریں کھنچوائیں۔

اب کھانے کا وقت ہو گیا تو سب لوگ ادھر چلے گئے۔ صرف سہیلیاں رہ گئیں۔

شک بھری نظر سے اسے دیکھ کر بولیں "واقعی فلکی' تیری چوائس لاجواب ہے' کس قدر ہینڈسم اور شاندار آدمی ہے۔ اسے تو جو لڑکی دیکھے' اس سے پیار کرنے لگے۔"

فلکی کو دل میں حسد کی ایک چبھن محسوس ہوئی۔

"چلو' تم سب بھی کھانا کھالو۔" آفاق آگیا۔

لیکن پنکی وہیں بیٹھی رہی۔ بولی "میں فلکی کے ساتھ کھانا کھاؤں گی۔"

وہ باقی لڑکیوں کے ساتھ چل پڑا۔ ایک کی کمر میں ادھر سے ہاتھ ڈالا اور دوسری کو اُدھر سے لیا۔

اسے اس طرح جاتے ہوئے فلکی نے بھی دیکھا۔ اسے بہت برا لگا۔

اب میرا اس سے کوئی تعلق نہیں تو مجھے حسد کیوں محسوس ہوتا ہے۔ بلا سے جو کرتا ہے کرتا۔ میں نے جو کرنا ہے' وہ کروں گی۔"

اسے چوچو کا فقرہ یاد آگیا۔

"اسے تو جو بھی لڑکی دیکھے گی' پیار کرے گی۔"

"اونہہ"

"کہاں کھو گئی ہو؟" پنکی بولی۔

"اب تک تمہاری تھکاوٹ نہیں اتری؟"

اس نے شرما کر سر جھکا لیا۔

"فلکی' تجھے تو اس نے ایک رات میں بدل دیا ہے۔"

"اچھا۔"

"تو تو وہ پہلے والی منہ پھٹ اور نڈر فلکی نہیں لگتی۔ خاموش بیٹھی ہوئی اتنی پیاری لگتی ہے۔ بات میں شرماتی ہے۔ بیٹھی بیٹھی کھو جاتی ہے جیسے اب بھی سپنے دیکھ رہی ہو۔ تیری تو اس نے کایا پلٹ دی ہے مگر تجھے پتہ ہے اس طرح تو کتنی گریس فل لگتی ہے۔ ہائے مجھے تجھ پر رشک آرہا ہے۔"

فلکی کا دل چاہا۔ ایک دم پنکی کے سینے سے لگ جائے اور چلا چلا کر اسے بتائے کہ ج
سمجھا ہے' غلط ہے۔ جو اس پر بیت رہی ہے وہ نظر نہیں آ رہی جو وہ کہنا چاہتی ہے'
موقع نہیں مل رہا۔ ایک دن اور ایک رات میں اس کی کایا پلٹ گئی ہے۔ اگر یہ سب
نہ کیا تو اس کا کلیجہ پھٹ جائے گا۔ شق ہو جائے گا۔

اس نے فلکی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ خود اس کے ہاتھ ایک دم ٹھنڈے ہو گئے اور اسی وقت
آفاق کا فقرہ یاد آگیا "کتنی بھی قریبی دوست ہو' اس کو دل کا راز نہ دینا۔"

ٹھیک ہی تو کہا تھا اس نے۔ ابھی یہ بات سب سہیلیوں میں مشہور ہو جائے گی اور
اس کی ہنسی اُڑائے گی۔

ممکن ہے کوئی آفاق کو بھی اُڑانے کی کوشش کرے کیونکہ چوچو جس نظر سے آفاق
رہی تھی' وہ اسے پہلے ہی بری لگ رہی تھی۔

اس نے ایک لمبی سانس چھوڑی اور پشت پر سر ٹکا دیا۔

"تم تو بالکل ٹھنڈی ہو رہی ہو فلکی کیا ہوا؟" پنکی نے تشویش سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔۔" وہ ایک دَم چونک گئی "تھک گئی ہوں۔ بہت زیادہ تھک گئی ہوں۔ آر
چاہتی ہوں۔"

"سویٹ...." پنکی نے اس کے رخسار تھپتھپائے۔

"آج اپنے گھر جا کر خوب آرام کرنا۔ کیا آفاق بھی تمہارے ساتھ جائے گا؟"

"پتہ نہیں۔" اس نے دھیرے سے کہا۔

"ہاں! اگر وہ ساتھ گیا تو پھر تم کر چکیں آرام۔" اس نے ایک آنکھ میچ کر کہا۔

دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

اتنے میں بیرے ان کے لیے کھانا لے آئے... دونوں نے وہیں بیٹھ کر کھانا کھایا اور
حسبِ عادت ساری محفل کے بارے میں رائے زنی کرتی رہی۔ اس کی چرب زبانی نے فلـ
زیادہ بولنے کا موقع نہیں دیا۔

پھر ممی آگئیں۔ ممی کے ساتھ حسبِ معمول آفاق بھی ٹپک پڑا۔

محفل برخاست ہونے والی تھی۔ وہ لوگ خاص خاص مہمانوں کو خدا حافظ کہنے لگے۔

پھر ممی اسے اندر لے آئیں۔

اور بولیں "اپنے کپڑے وغیرہ ساتھ کے لیے رکھ لو۔ آج رات تم اور آفاق وہاں

ـہ"

نتی عجیب بات ہے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ آفاق ساتھ نہ جائے حالانکہ لڑکیاں ایک
ـے دولہا کو ساتھ لے کے جانا چاہتی ہیں مگر وہ اپنی ممی سے دل کھول کر باتیں کرنا چاہتی
ـہ اپنی ذہنی اور جسمانی تھکن اتارنا چاہتی تھی۔

مگر رواجوں کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔

رات کے گیارہ بجے وہ لوگ "فلک بوس" پہنچ گئے کیونکہ یہ گھر ڈیڈی نے فلکی کے لیے بنوایا
اس لیے اس کا نام انھوں نے فلک بوس ہی رکھا تھا گو یہ اتنا اونچا محل نہیں تھا مگر کسی محل
ـم بھی نہیں تھا۔

فلکی اپنے کمرے میں آکر بہت خوش ہوئی۔

ـیے اس پر سے دنیا جہاں کا بوجھ اُتر گیا ہو۔ "واہ' اپنا گھر بھی کیا چیز ہوتا ہے۔"

ـمی خوشی کے مارے اِدھر اُدھر چہک رہی تھیں۔

آفاق اس کے پیچھے کمرے میں آگیا۔

ـتو یہ جناب کا کمرہ ہے۔"

ـس نے کمرے کا جائزہ لے کر کہا۔

اس کا اپنا ڈبل بیڈ پڑا تھا جس پر ممی نے بالکل نیا ریشمی بیڈ کور ڈال دیا تھا اور خوب پھولوں
الڑیاں لٹکا دی تھیں۔

اِدھر اُدھر فلکی کی مختلف پوز کی رنگین تصویریں پڑی تھیں۔

ل۔ وی تھا' کیسٹ ریکارڈر' رسالے' الابلا۔

"اچھا' تو یہ وہ کمرہ ہے جس نے آپ کا مزاج خراب کرنے میں تعاون کیا۔"

فلکی کچھ نہیں بولی۔ وارڈروب کھول کر اپنے رات کے کپڑے ڈھونڈنے لگی۔ ایک نائٹ
ـے اسے پسند آگیا۔ اس نے نکال لیا۔ چپ کر کے باتھ روم میں چلی گئی۔ وہ کرسی پر بیٹھا
ساـلے دیکھتا رہا۔ اتنے میں ممی آگئیں۔ ہاتھ میں کافی کا پیالہ تھا۔

"پیو گے؟"

"ضرور پیوں گا۔ آپ نے نہیں پیوں گا؟ اور پھر آج کی رات؟"

ممی کھلکھلا کر ہنس دیں۔

"اُفوہ! اگر تم ایسی باتیں کرتے رہے تو میرا وزن یقیناً بڑھ جائے گا۔"

"ممی! آپ کا وزن کبھی بڑھ ہی نہیں سکتا۔ آپ بڑی متوازن خاتون ہیں اور غ وزن آپ سے گھبراتا ہے۔" گو ممی کو آفاق کی باتیں سمجھ میں نہیں آئی تھی مگر انھوں ضروری سمجھا۔

اتنے میں فلکی کپڑے بدل کر باہر نکل آئی۔

"ارے فلکو' تو نے پرانا نائٹ سوٹ کیوں پہن لیا؟"

"مجھے پرانی چیزیں اچھی لگتی ہیں۔" اس نے بے اختیار کہا۔

"نیا تو صرف میں ہوں ممی' مگر امید ہے کہ رفتہ رفتہ میں بھی اچھا لگنے لگ جاؤں گا۔"

"نہیں' اس کا یہ مطلب نہیں تھا۔" ممی جلدی سے بولیں۔ "شاید تھک گئی ہے۔"

"کافی پیو گی؟"

"نہیں ممی' مجھے نیند آ رہی ہے۔"

"اچھا تو سو جاؤ۔"

"ممی کھڑی ہو گئیں۔

"شب بخیر بچو۔"

"شب بخیر۔" آفاق نے خوش دلی سے کہا۔

پھر اس نے اپنے کپڑے خود نکالے اور بدلنے کے لیے باتھ روم میں چلا گیا۔ باہر نکلا صوفے پر آلتی پالتی مارے رسالہ دیکھنے میں محو تھی۔

آفاق نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر بولا "یہ ڈبل بیڈ کی عجیب مصیبت ہے۔ اگر کوئی تم چاہے تو کیا کرے؟"

فلکی کو ایک دَم وہی پرانا غصہ آگیا۔ بغیر کچھ کہے اٹھ کر باہر نکل گئی۔

وہ اطمینان سے پلنگ پر دراز ہو گیا اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ تقریباً آدھا گھنٹہ گزر گیا تھ پھر باہر سے بولنے کی آوازیں آئیں۔

پردہ ہلا اور ممی' فلکی کو تھامے ہوئے اندر لائیں۔

آفاق اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کیا ہوا ممی؟"

"کچھ نہیں۔" انھوں نے ہنس کر کہا "ابھی بچی ہے۔ رفتہ رفتہ سمجھ جائے گی۔"

"کسے۔ مجھے یا آپ کو؟"

"ارے نہیں۔ حالات کو۔"

"چلو جاؤ' سو جاؤ۔"

مگر وہ روئے گئی اور کہے گئی "ممی پلیز۔ میں آپ کے پاس سوؤں گی' آپ کے کمرے میں سوؤں گی' میں یہاں نہیں سوؤں گی۔"

آفاق کھڑا ہو گیا۔

"خدا کے لیے اس طرح نہ رو فلکی۔ تمہاری ممی سمجھیں گی میں ڈریکولا ہوں اور رات کو تمہاری گردن پر منہ رکھ کے تمہارا خون پی جاتا ہوں۔"

ممی نے بے اختیار قہقہہ لگایا۔

"شریر۔ ذرا دیکھو تو۔ ایسا آدمی کبھی بور ہونے دیتا ہے؟"

"ممی' آپ فکر نہ کریں۔ جائیں جب دوسرا آدمی ماں کی محبت کا شریک بن جاتا ہے تو لڑکیاں اسی طرح رویا کرتی ہیں۔ آخر تو اپنے گھر جانا ہی ہوتا ہے۔"

مگر فلکی زور زور سے روئے گئی۔

"میں یہاں نہیں سوؤں گی۔"

"دیکھو فلکی! میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔" وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ "ممی کو اس طرح پریشان نہ کرو کہ وہ غلط فہمی کا شکار ہو جائیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ تمہیں بالکل تنگ نہیں کروں گا۔"

ممی کا منہ ایک دَم سرخ ہو گیا۔

"اچھی بچی بن جاؤ۔ لو اپنا تکیہ اور ادھر منہ کر کے سو جاؤ۔"

اپنی تمام تر جدیدیت اور انگریزیت کے باوجود ممی اس کی صاف گوئی پر پسینہ پسینہ ہو گئیں اور ساری بات ان کی سمجھ میں آگئی اور انھیں پتہ تھا کہ فلکی چونکہ بہت لاڈلی ہے اس لیے ایسے پرابلم ضرور پیدا ہوں گے۔

"اچھا تو میں چلتی ہوں۔"

"پلیز ممی!" آفاق سراپا معذرت بن گیا۔ "مجھے معلوم نہیں تھا۔ یہ آپ کو یوں تنگ کرے گی۔ سوری ممی۔"

"کوئی بات نہیں۔" وہ اس موضوع پر زیادہ بات نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ وہ ان کے ساتھ آیا۔

"اب اسے مت آنے دینا۔"

"جی۔" وہ نیاز مندی سے بولا اور ممی ہنستی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ آفاق نے آگر دروازے کی کنڈی لگائی۔

دیکھا تو فلکی بستر پر چڑھ کر بیٹھی ہوئی تھی اور خوب منہ پھولا ہوا تھا۔

وہ بھی آکر بستر پر بیٹھ گیا۔ اپنے تکیے اٹھائے اور پائنتی کی طرف رکھ دیے اور بولا "میں ادھر کرلیتا ہوں۔ آپ سر ادھر کرلیں تو ٹکرانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

فلکی کا غصہ اپنے عروج پر پہنچ گیا۔

"تم انتہائی کمینے انسان ہو۔" وہ بولی۔

اس کا خیال تھا' آفاق پھر اُٹھے گا۔ پلٹ کر کچھ کہے گا مگر اس نے بڑے سکون سے سگریٹ نکالی' جلائی اور منہ میں رکھ لی پھر دراز ہوتے ہوئے بولا "اپنے باپ کی چھت کے نیچے بیٹھ کر آپ ایسا کہہ سکتی ہیں؟"

"میں تمہارے ساتھ بات کرنا بھی اپنی توہین سمجھتی ہوں۔"

"ویسے آپ بات نہ کیجیے تو بہتر ہے کیونکہ زندگی میں پہلی بات جو آپ نے میرے ساتھ کی ہے' وہ اتنی خوب صورت ہے کہ میں اس کے بعد ضرورت نہیں سمجھتا کہ آپ بولیں۔"

"جہاں آپ کو اور کچھ نہیں آتا وہاں بولنے کا سلیقہ کہاں سکھایا گیا ہوگا؟"

مکّار' جعل ساز۔

سارا دن میری ماں سے کیسے چمٹا رہتا ہے اور کس کس طرح ان کی خوشامدیں کرتا ہے مارے غصے کے اس نے رضائی اٹھائی' تکیہ اٹھایا اور جا کر صوفے پر دراز ہوگئی۔

آفاق نے حق بھائی اور اپنی رضائی میں گھس گیا۔

رات کو اسے یوں محسوس ہوا جیسے فلکی دوبارہ چنگ پر آگئی تھی۔

ہاں' نازوں کی پالی بھلا۔ صوفے پر کہاں رات بسر کرسکے گی۔ اس نے دل میں سوچا تھا۔

صبح جانے کو نسا وقت تھا۔ ممی چائے کی پیالی تھامے اس کے کمرے میں آئیں۔

"آفی! کب تک سوتے رہو گے بیٹا!"

وہ جلدی سے اٹھ بیٹھا۔

"آداب ممی!"

"جیتے رہو۔"

"چائے پیو گے؟"

"ضرور۔"

"ارے نو بج گئے۔" وہ گھڑی دیکھ کر بولا۔

"اسی لیے تو میں تمہیں جگانے آئی تھی۔ لوگ تم سے ملنے آرہے ہیں اور تم ابھی تک سو رہے ہو۔"

آفاق نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ سامنے صوفے پر فلکی بیٹھی ایک رسالہ دیکھ رہی تھی۔

"میں کیا کرتا ممی! آپ کی بیٹی نے ساری رات مجھے جگائے رکھا۔" فلکی کو ایک دم غصہ آگیا۔

"آپ کو رو کر دکھاتی ہے اور مجھے ساری رات سونے نہیں دیتی۔"

"سب بکواس ہے ممی۔" فلکی نے رسالہ دور پھینک دیا اور کھڑی ہوگئی۔

ممی کو اس کا رویہ اچھا نہیں لگا۔

"دیکھ لیں ممی! یہ اسی طرح میرے ساتھ بولتی ہے۔ ذرا اس کو سمجھائیں شوہر کے ساتھ کیسے بولتے ہیں؟"

"تم میرے ساتھ آؤ فلکی!" ممی نے اسے بازو پکڑا۔

"ارے جانے دیں۔" آفاق ایک دم کھڑا ہوگیا اور اُٹھ کر اس نے فلکی کو ممی کے ہاتھ سے چھڑایا اور اپنے بازوؤں میں لے لیا۔

"میں تو یونہی مذاق کر رہا تھا۔"

فلکی رونے لگی۔

"یہ تو بہت پیاری ہے ممی! بس یونہی ذرا غصہ زیادہ کرتی ہے چونکہ مجھے غصے میں پیاری لگتی ہے۔ اس واسطے میں اسے چھیڑتا ہوں۔ آپ جایئے پلیز' میں اسے ٹھیک کرلوں گا۔"

ممی باہر نکل گئیں۔

فلکی کسمسانے لگی۔

"چھوڑ دو مجھے۔ جھوٹے' مکّار' فریبی۔"

آفاق نے چھوڑ دیا۔

"مجھے کچھ آپ کو پکڑنے کا شوق بھی نہیں ہے۔ ایک بات بتا دوں۔ ماں باپ کا دل بہت نازک ہوتا ہے۔ لڑکیاں جب انھیں اتنی جلدی اپنے ازدواجی جھگڑے بتانے لگتی ہیں تو ان کا

بڑھاپا بے سکون ہو جاتا ہے اور بعض اوقات وہ یہ صدمہ سہ بھی نہیں سکتے۔ اپنے جھگڑے نمٹانے کی ہمت ہونی چاہیے۔"

یہ کہہ کر وہ خود تو غسل خانے میں چلا گیا اور فلکی کو پھر ایک جلتی آگ میں چھوڑ گیا۔

کیا وہ ممی کو بتائے یا نہ بتائے۔

وہ یہی سوچتی رہی۔ اس کے سامنے تو وہ کچھ بتا بھی نہیں سکے گی۔

ممی آگئیں' بولیں "تم تیار ہو جاؤ فلکی۔ تمہاری خالہ جان آگئی ہیں۔ تمہیں معلوم ہے' نے آج دوپہر کچھ لوگوں کو تمہارے اور آفاق کے اعزاز میں کھانے پر بُلایا ہے۔"

"اچھا ممی!" فلکی اُٹھ کر اپنی ساڑھی اِستری کرنے لگی۔

"آفاق سے بھی کہہ دینا۔"

مگر جب آفاق غسل خانے سے باہر آیا تو اس نے کچھ بھی نہیں کہا۔ ساڑھی اِستری کر رہی۔ وہ پھر اپنے بستر میں گھس گیا۔

تھوڑی دیر بعد ممی پھر آگئیں۔

"ارے آفاق تم تیار نہیں ہوئے؟"

"جی۔" اس نے رضائی منہ سے پرے ہٹائی۔

"بھئی سسرال میں آکر چھٹی منانے دیں۔ میں تو سارا دن سونے کا ارادہ کرکے آیا تھا۔

"بیٹے! کچھ لوگ تم سے ملنے آئے ہیں۔ تیار ہو جاؤ۔"

"ممی' اب تو میں پسند کرلیا گیا ہوں۔ تیار ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو سارا ڈریسنگ گاؤن پہننے کے موڈ میں ہوں اور پھر بننے سنورنے کی ان کو ضرورت ہے جنہیں خو اعتماد نہ ہو۔"

"اچھا تو یونہی آجاؤ۔"

"ڈرائنگ روم میں آجاؤ۔ وہیں ناشتہ کرا دوں گی۔"

آفاق نے چپل پہنے۔ ڈریسنگ گاؤن پہنا اور باہر جانے لگا۔

فلکی نے مڑ کر دیکھا۔

اس کا دل ذرا بھی نہیں چاہ رہا تھا کہ آفاق اس طرح باہر جائے۔ وہاں اس کی کزنز بھی آ ہوں گی۔ اسے کتنی سبکی محسوس ہوگی۔

مگر وہ اسے کیوں روکے؟ وہ اس کا لگتا کیا ہے؟ ایسے ہی خواہ مخواہ وہ جل کر رہ گئی۔

وہ ساری دوپہر کافی مصروف گزری۔

فلکی کی سہیلیاں بھی آگئی تھیں۔ سب ہی اسے تنگ کر رہی تھیں کہ اس نے کپڑے کیوں نہیں بدلے۔

"بابا' دو دن اس قدر بن ٹھن کر رہنا پڑا ہے کہ اپنے آپ سے گھن آنے لگی تھی۔ اب تو میں یوں ہی رہوں گا۔ جس کا دل چاہے پسند کرے' جس کا دل چاہے برا مانے۔"

اس نے خاص طور پر فلکی کی طرف دیکھ کر کہا۔

فلکی نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"دولہا بھائی! جوتا تو آپ اتارتے نہیں۔ ہم کیسے چھپائیں۔ ویسے ہی جوتی چھپائی دے دیں۔" فلکی کی ایک کزن نے کہا۔

"بھئی' مجھے تو فلک نے کہا تھا' جوتے کو ہرگز ہاتھ نہ لگانے دینا اور میری بہنوں کو یونہی ٹرخا دینا۔"

فلکی نے برا سا منہ بنایا اور باہر نکل گئی۔

"دیکھا جاتے جاتے مجھے اشارہ کر گئی ہے۔"

"ہم نہیں مانیں گے۔ ہم نہیں مانیں گے۔"

سب لڑکیاں اس کے سر ہو گئیں۔ پانچ اس کی کزنز تھیں اور پانچ اس کی سہیلیاں ساتھ مل گئیں۔

"اُف توبہ' دس لڑکیاں پوری اور میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں۔"

"ہم آپ کی تلاشی لیں گے۔"

ساری کی ساری چمٹ گئیں۔ کسی جیب میں کچھ نہ تھا۔

وہ دوڑی کمرے میں گئیں جو سوٹ لٹک رہا تھا' وہ دیکھا۔ وہ بھی خالی تھا۔

"کمال ہے۔ اتنے امیر آدمی کی جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں۔"

"بھئی' سب پیسے فلکی نے نکال لیے ہیں۔ کہہ رہی تھی ان چڑیلوں کو کچھ مت دینا۔"

وہ ساری کی ساری فلکی کو گھسیٹ کر لے آئیں۔

کیوں جی' تم نے کہا تھا؟"

"دیکھو فلک' ایسا نہ کرو۔ ایک سو روپیہ مجھے اُدھار دے دو۔ میں ان سب کو دس دس روپ اے دوں۔"

"میرے پاس تو ایک پیسہ نہیں ہے۔" فلکی نے ناک چڑھا کر کہا۔

"دیکھا اپنی سہیلی کا حال؟"

"مگر ہم دس دس روپے نہیں لیں گے۔ دس روپے تو لوگ آج کل بھنگن کو نہیں دیتے واہ۔"

"بھئی فلکی نے تو یہی کہا تھا کہ دس دس روپے سے زیادہ نہ دینا ان کو۔"

"کیوں فلکی؟" سب اس کے پیچھے پڑ گئیں۔ اس نے ممی کے پاس جا کر جان بچائی۔ اور ممی فیصلہ کرنے کو آن پہنچیں۔

"بھئی' ان کا نیگ ان کو دے دو۔"

"کیا دوں ممی آخر آپ ہی بتائیں۔ مجھے کیا بلا ہے ان سے۔"

"بھئی' ان کو ایک ایک سو روپیہ دے دو۔" ممی نے فیصلہ کر دیا۔

"ایک ایک سو آنٹی پلیز دیکھیں نا؟ ایک سو میں تو آج کل ایک جوڑا بھی نہیں بنتا۔"

"غریب کی تو ایک سو میں شادی ہو جاتی ہے۔"

"مگر ہم غریب نہیں ہیں نا؟" پنکی نے بڑھ کر کہا تو آفاق بولا "ہاں یہ بات آپ نے سچ کہی۔ اس خوشی میں وہ لے دیتا ہوں۔" وہ اندر گیا اور نوٹوں کی گڈی اٹھا لایا۔

"ہائے' یہ کہاں تھی؟"

"ہم نے تو بہت تلاشی لی تھی۔"

"کہاں رکھی تھی؟"

"حضور والا! یہ میں نے اپنے سرہانے کے تلے رکھی تھی کیونکہ مجھے معلوم تھا آپ وہاں سے نہ اٹھا سکیں گی۔"

"واہ۔" سب حیران رہ گئیں کہ انھیں پہلے خیال کیوں نہ آیا۔

پھر آفاق نے ایک ایک ہزار روپیہ سب لڑکیوں کو دے دیا۔ خوشی کے مارے ان کی چیخیں نکل گئیں۔

ممی نے بہت کہا۔ یہ بہت زیادہ ہے۔ پوری دس لڑکیاں ہیں اور تم نے پورا دس ہزار روپیہ برباد کر دیا۔

وہ بولا "فلکی کی خاطر تو میں اس سے زیادہ بھی دے سکتا ہوں۔ میری فلکی ان سب سے مہنگی ہے۔ یہ تو اس کی سہیلیاں ہیں۔"

فلکی نے ان سنی کر دی۔

پھر کھانے کا وقت ہو گیا۔

کھانے کے بعد وہ لیٹنے کے بجائے تاش لے کر بیٹھ گیا۔ سب لوگ جا چکے تھے۔ صرف فلکی کی سہیلیاں ہی رہ گئی تھیں۔

فلکی اُٹھ کر بیڈ روم میں چلی گئی۔

"جاؤ آفاق' تم بھی آرام کرو۔" ممی نے کہا۔

"ارے نہیں ممی۔ فلکی کو آرام کرنے دیں۔ ہم نے رات کو ایک ڈنر پر جانا ہے اور اس نے کہا تھا مجھے تھوڑا سا سونے دینا۔"

ممی خاموش ہو گئیں۔

پنکی وغیرہ بھی تاش میں شامل ہو گئیں۔

"میں اور ممی پارٹنر بنیں گے۔"

"جی نہیں۔ بزرگ نہیں کھیلیں گے۔" چوچو جانتی تھی کہ ممی بہت اچھی کھلاڑی ہیں۔

"شرم کرو۔ ممی کو بزرگ کہہ رہی ہو۔ میرے ساتھ بیٹھی ہوئی میری ہم عمر لگ رہی ہیں۔ کوئی دیکھے تو جانے کیا سمجھے؟" آفاق بولا۔

"نان سنس۔" ممی نے مسکرا کر کہا۔

"ممی! میں آپ کو اپنی ساس نہیں سمجھتا۔ صاف کہہ دوں۔" آفاق نے ذرا بلند آواز سے کہا' تاکہ کمرے میں لیٹی ہوئی فلکی سن لے "میں تو آپ کو نیم دلہن نیم مادر سمجھتا ہوں۔"

"کمینہ' بے شرم۔" ممی ہنستے ہنستے بے حال ہو گئیں۔ "خدا کی قسم جب سے آیا ہے' ہنسا ہنسا کر مجھے نڈھال کر دیا ہے۔"

"اللہ' آفاق بھائی! یہ نیم دلہن نیم مادر کیا ہوتا ہے؟" پنکی نے مچل کر پوچھا۔

"واہ! میری انگریز بانو' اس کا مطلب ہی نہیں آتا۔"

"پلیز بتا دیں نا؟"

"میں بتاتی ہوں۔" اسماء نے سوچتے ہوئے کہا۔

"مجھے بھی پتہ ہے۔" چوچو نے دخل اندازی کی۔

"کیا بھلا؟"

"بھئی بس ہے ایسا ہی چکر۔"

"چندا بولی' اس کا مطلب ہے

MOTHER-CUM-BELOVED

ہا... ہا.... سب لڑکیاں زور زور سے ہنسنے لگیں۔ اسی طرح کھیل تماشے میں شام تما ہو گئی۔

آفاق نے ممی سے جانے کی اجازت لے لی تھی اور کہا تھا۔ وہ لوگ پھر کبھی کچھ دن آ رہیں گے کیونکہ اس طرف ان کے کھانے شروع ہو گئے تھے۔ ممی نے اجازت دے دی تھی۔

وہ جب کمرے میں آیا تو فلکی عجیب اُدھیڑبن میں بیٹھی ہوئی تھی۔ نہ اس نے سامان پیک کا تھا اور نہ جانے کی تیاری کی تھی۔

اصل میں وہ جانا ہی نہ چاہتی تھی۔

وہ اپنے گھر رہنا چاہتی تھی۔ اپنی ماں کو اپنا درد دل سنانا چاہتی تھی۔

سکون چاہتی تھی۔

کوئی فیصلہ کرنا چاہتی تھی۔

اور یہ کم بخت ہر وقت اس کے اعصاب پر سوار رہتا تھا۔

"چلئے بیگم صاحبہ! اب گھر چلیں۔"

وہ خاموش بیٹھی رہی۔

"اٹھئے محترمہ!" وہ زور سے بولا۔

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں آپ کے ساتھ ہرگز نہیں جاؤں گی۔"

"آپ کو اچھی طرح پتہ ہے کہ آپ میرے ساتھ جائیں گی اور میں اپنا فیصلہ کبھی نہیں با کرتا۔"

فلکی نے لرز کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا لہجہ لوہے کی طرح سرد تھا اور چہرہ لوہے کی طر سخت۔

فلکی سر سے لے کر پاؤں تک کانپ گئی۔ جانے اس کے لہجے میں کیا تھا مگر وہ بظاہر یوں بیٹھی ہی جیسے ٹس سے مَس نہ ہو گی۔ وہ بھی تنا تنا سا پائپ پیتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ کھڑا ہو گیا۔

"مجھے دیر ہو رہی ہے اور رات ایک دعوت میں جانا ہے۔"

بیٹھے بیٹھے فلکی کا سر چکرانے لگا۔

یہ اس کی شادی کی تیسری رات تھی اور تیسرا لخراش واقعہ تھا۔

اسے رونا آ گیا۔

پتہ نہیں اب کیا ہو گیا تھا۔ بات بات پر آنسو نکل آتے تھے۔

نکلتے ہوئے آنسوؤں کو اس نے بالکل چھپانے کی کوشش نہیں کی۔

آفاق غصے سے مشتعل ہو رہا تھا۔ رک کر بولا۔

"عورت کا پرانا ہتھیار نہ آزماؤ۔ میں آنسوؤں کو فریب سمجھتا ہوں۔ یہ عورت کا آخری داؤ ہوتا ہے۔ تماشا مت بنو۔ میں ڈیڈی اور ممی سے رخصت لے کر آتا ہوں۔"

وہ باہر نکل گیا۔

میں کیا کروں۔ خدا وندا کیا کروں۔

فلکی جھر جھر رونے لگی۔ اس آدمی کے سامنے آخر میں اتنی مجبور کیوں ہو گئی ہوں۔ میں آزاد پنچھی تھی اور اس نیلے گگن میں یہاں سے وہاں اُڑتی پھر رہی تھی آخر میں نے پنجرے میں خود ہونا کیوں قبول کیا جبکہ میرا خیال تھا میرے لیے نہ کوئی پنجرہ ہے' نہ زنجیر۔ صرف نکاح کے دو بول عورت کو اس قدر مجبور بنا دیتے ہیں اور آدمی اتنا بڑا حاکم اعلیٰ بن جاتا ہے کہ اس کی مرضی و آرزو کا کچھ خیال بھی نہیں کرتا۔ اگر یہ شادی ہے تو لعنت ہے اس پر...

لعنت تو اس پر تو ہمیشہ سے بھیجتی تھی۔ پھر خود ہی اس لعنت کو تو نے گلے کا ہار بنا لیا۔ اب یہ

ہار پھندا بن رہا ہے اور اس پھندے سے تو نکل جانا چاہتی ہے ورنہ...
ورنہ کیا ہو گا؟

آفاق باہر نکلا تو سامنے ڈیڈی نظر آئے۔ وہ اس کی طرف آ رہے تھے۔ ان کے ساتھ ممی تھیں۔

"تیار ہو گئے بیٹا؟" ممی نے محبت سے کہا۔

"ممی۔ پلیز آپ ذرا بیٹھ جائیں۔ میں آپ سے ایک ضروری بات کہنا چاہتا ہوں۔"

"ضرور کہو۔" ممی بیٹھیں تو ان کے ساتھ ڈیڈی بھی خود بخود بیٹھ گئے۔

"ممی' آپ جیسی ذہین اور عقل مند خاتون سے کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ آپ نے ایک زمانہ دیکھا ہے پھر بھی چونکہ آپ ایک ماں ہیں اس لیے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔"

"ارے جلدی سے کہو۔" ممی ہنس کر بولیں "میں تمہاری کسی بات کا برا نہیں مانوں گی۔ مجھے فلکی سے زیادہ عزیز ہو۔"

"شکریہ ممی!" آفاق کے چہرے پر سنجیدگی گہری ہو گئی۔

"ممی' آپ تو جانتی ہیں فلکی آپ کی اکلوتی اولاد ہے اور زندگی کا تمام تر پیار آپ نے اس دے دیا۔ آپ کی چاہت کے آگے ہر چاہت اسے حقیر معلوم ہوتی ہے۔ آپ میرا مطلب رہی ہوں گی..."

"ذرا ضدی اور خود سر بھی ہے۔ اس کے باوجود میں اسے پسند کرتا ہوں۔ اس کا دل ا میرے گھر میں نہیں لگتا۔ وہ دو دو ڈکر یہاں آنا چاہتی ہے' ویسے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں آپ بھی میرے والدین جیسے ہیں لیکن اگر اس نے یوں ہی آنا جانا لگائے رکھا تو میرا گھر کبھی بس سکے گا۔ اتنا بڑا گھر ویران ہو جائے گا اور آپ جانتی ہیں میری امی امریکہ میں ہیں اور گ بسانے کے لیے میں نے شادی کی ہے۔"

"ہاں ہاں' میں سمجھ رہی ہوں۔" ممی بولیں "میں اسے بھی سمجھا دوں گی۔"

"نہیں۔" آفاق بولا۔

"یہ سمجھانے والی غلطی نہ کیجئے گا۔ بس اتنی مہربانی کیجئے کہ خود ہی ذرا اس سے دو ہو جائیں.... میرا مطلب ہے عارضی طور پر محبت میں کمی کر دیں یا مصنوعی بے رخی اختیار کریں جس سے اسے احساس ہو جائے کہ اب وہ پرائے گھر کی ہو گئی۔"

ممی نے کچھ نہ کہا تو آفاق جلدی سے بولا:

اس تھوڑے دنوں کے لیے' ممی' یہاں سال چھ مہینے کے لیے اس کے بعد تو اس کا دل وہاں جائے گا اور آپ کو بھی اطمینان ہو جائے گا۔"

آفاق کا مطلب ہے اب فلکی کے ساتھ بے جا لاڈ پیار نہ کرو اور اس کے ناز بھی کم اٹھاؤ وہ اپنی ذمہ داریاں خود محسوس کر سکے۔" ڈیڈی نے پہلی مرتبہ دخل اندازی کی۔

"میں سمجھ رہی ہوں۔" ممی افسردگی سے بولیں "ٹھیک ہے۔"

"ممی پلیز۔" آفاق کھڑا ہو گیا۔

ممی اور ڈیڈی بھی کھڑے ہو گئے۔

آفاق نے بڑھ کر ممی کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور بڑی لجاجت سے بولا:

"ممی میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں اور ہمیشہ رہوں گا۔ آپ کے تعاون کے بغیر میری ازدواجی زندگی کبھی خوش گوار نہیں ہو سکتی اور میں آپ کے سر کی قسم کھاتا ہوں فلکی کو ایک مثالی عورت بنا کے رکھوں گا۔"

ممی مسکرا دیں۔

اس کے ہاتھ کو بوسہ دے کر بولیں:

"مجھے تم پر بھروسہ ہے کیونکہ تم خود ایک آئیڈیل مرد ہو۔"

"شکریہ ممی۔"

آفاق نے جھک کر ان کا شکریہ ادا کیا اور پھر ڈیڈی کے ساتھ باہر نکل گیا۔

باہر موٹر کے پاس کھڑے ہو کر وہ پندرہ بیس منٹ تک سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے۔

ممی اپنا میک اپ درست کرنے ڈریسنگ روم میں چلی گئی تھیں۔ فلکی اٹھ کے غسل خانے میں چلی گئی۔

منہ ہاتھ دھویا۔ چہرے کو ٹھیک کیا اور قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنا میک اپ سنوارنے لگی۔

جب موٹر میں بیٹھ کر آفاق نے ہارن دیا تو ممی اس کے دروازے میں آ نمودار ہوئیں۔ بولیں:

"فلکی چندا جلدی سے باہر آ جاؤ۔ آفاق موٹر میں بیٹھا تمہارا انتظار کر رہا ہے اور مجھے بھی دیر ہو رہی ہے۔ میں نے ابھی کلب ایک پارٹی میں جانا ہے۔"

یہ کہہ کر ممی دروازے سے باہر نکل گئیں۔

ایک نوکر آیا اور اس کا سامان اٹھا کر لے گیا۔

اس نے بے دلی سے اپنا پرس اٹھایا اور باہر نکل آئی۔

آفاق موٹر میں بیٹھ چکا تھا اور ڈیڈی موٹر کے پاس کھڑے مسکرا رہے تھے۔ ممی دوسرا دروازہ کھولے کھڑی تھیں۔

جیسے سب یہ چاہتے تھے کہ وہ موٹر میں بیٹھ کر دفع ہو جائے۔

ایک دَم اسے غصہ آگیا۔

ممی نے بڑھ کر اس کی پیشانی چُومی۔ وہ غصہ پیتی ہوئی موٹر میں بیٹھ گئی۔ ڈیڈی نے ہا
ممی نے دعا دی۔

اس نے کسی کی طرف نہیں دیکھا۔ آنکھوں کے کٹورے آنسوؤں سے بھرے تھے
چھلکانا نہیں چاہتی تھی۔

موٹر چل پڑی۔

نہ ممی نے سینے سے لگایا۔

نہ ڈیڈی نے سر پر ہاتھ پھیرا۔

واہ' کتنے عجیب ہیں میرے ممی اور ڈیڈی....؟

خیر' ڈیڈی تو ہمیشہ کے ہی بزدل ہیں۔

مگر ممی....

یہ کیسی ماں ہیں۔ انہیں پتہ نہیں چلتا کہ بیٹی کا دل رو رہا ہے۔ یہ کیسی ماں ہیں کہ جانتیں بیٹی کے چہرے پر نور نہیں اُداسیاں ہیں۔ یہ کیسی ماں ہیں۔ بیٹی کے تڑپتے ہوئے دھڑکن نہیں سن سکتیں۔

ممی۔ تم نے مجھے جنم کیوں دیا؟ جب تمہیں کلب اور پارٹیاں مجھ سے زیادہ عزیز تھیں
ممی اور ڈیڈی نظروں سے اوجھل ہو گئے تو اس کے سارے آنسو چھلک پڑے جیسے گ
پتیوں سے بارش کے بعد شبنم چھلک پڑتی ہے۔

آفاق کنکھیوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

اس نے اپنے آنسو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کو چھپانے کا کیا فائدہ تھا؟

کم از کم دل کا غصہ اور غم تو نکل جاتا تھا۔

کبھی کبھی وہ رومال سے اپنا چہرہ صاف کر لیتی۔

شہر بازاروں اور سڑکوں پر سے گزری چلی جا رہی تھی۔

آفاق کرخت چہرہ بنائے اس طرح بیٹھا تھا جیسے فلکی پھانسی کی سزا پانے والی مجرمہ ہو اور وہ مقتل کی طرف لے جا رہا ہو۔

ایک اس کے دل میں آفاق کی جانب سے گہری نفرت کا طوفان اٹھا۔ ایسی نفرت جس کے مذموم ارادے اور مسموم آندھیاں ہوتی ہیں...

اُف....!

وہ کتنی شدید نفرت کرتی تھی آفاق سے۔

اس نفرت کو اس نے محبت کیوں سمجھا؟ کیا آفاق محبت کیے جانے کے قابل تھا؟

ہرگز نہیں۔

اس کا رؤاں رؤاں پکارا۔

نہیں.... نہیں....

اس شخص کے چہرے پر تھوک دو۔

اس کے ظاہر اور باطن میں فرق ہے۔

اس کے قول اور فعل میں تضاد ہے۔

یہ مکار آدمی ہے۔

اس کا دل سیاہ ہے۔

اس کی نگاہ متعصب ہے۔

وہ احساسِ کمتری کا مارا ہوا ہے۔

اُف....

میں نے اس کے ساتھ محبت کیوں کی؟ نحس تھا وہ لمحہ' جب میں نے یہ سوچا کہ میں اسے قابل ہوں۔ کیا کوئی صحیح الدّماغ اور خوب صورت لڑکی ایسے شخص کو چاہ سکتی ہے؟

ہرگز نہیں...

یہ بھول مجھ سے کیونکر ہوئی...؟

کیا میں ناتجربہ کار تھی یا بیوقوف تھی۔

دونوں باتیں نہیں تھیں۔

شاید قدرت نے میرے کسی غرور کا بدلہ مجھے دیا۔ ٹھیک ہے۔ اپنی جلد بازی کی سزا مجھے ملنا

تھی۔ مل گئی۔

اب میں اپنی عجلت اور جذباتیت کی تلافی کروں گی۔

میں زیادہ دن تک یہ بیہودگی برداشت نہ کر سکوں گی۔ مجھے جلد ہی کوئی فیصلہ کرنا ہوگا۔

یہ ضرور ہے کہ ایک نکاح کی مجبوری ہے جس کی وجہ سے یہ مجھے اپنی انگلیوں پر نچا رہا۔

لیکن ایک وقت ایسا آئے گا جب میں اسے اپنی انگلیوں پر نچاؤں گی' مگر کیسے؟

وہ خود ہی اپنے دل سے پوچھتی۔

یہ سب کیسے ہوگا؟

وہ اپنی بے حد نفرت کا اظہار کرنا چاہتی تھی۔ وہ آفاق کو بتانا چاہتی تھی کہ اس کی نظر میں آفاق کی کوئی وقعت نہیں۔ وہ آفاق سے دامن چھڑا کر اسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ اس نہیں کہ فلکی اسے قبول کرلے۔

وہ اپنی نفرت کا بھرپور جوتا اس کے منہ پر مارنا چاہتی تھی۔

مگر کیسے....؟

جونہی اسے غصہ آتا' اس کی عقل کام کرنا بند کردیتی۔

بہرحال شہر میں اس کے بے شمار دوست تھے۔ لاتعداد عاشق تھے۔ سہیلیاں تھیں' آ کسی نہ کسی سے مدد لے سکتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اسے ان لڑکوں کا خیال آگیا جو مرتے تھے اور اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتے تھے۔ دو چار لڑکے تو بہت امیر والدین کے تھے اور اس کی ہر شرط ماننے کو تیار تھے مگر اس نے ان کے ساتھ صرف دوستی رکھی۔ پھرنا' تفریح کرنا' فلمیں دیکھنا۔ بس شادی کو تو وہ فضول سی شے سمجھتی تھی۔

بوبی تو اسے خاص طور سے یاد آیا۔ اس کا سچا عاشق تھا۔ وہ جو بھی کہہ دیتی' اس کو پورا کرنا اپنا ایمان سمجھتا تھا۔ اس کا اصل نام محبوب احمد تھا مگر سب دوست اسے بوبی تھے۔ امیر والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ دو بار باپ نے امریکہ بھیجا تھا۔ وہ ہر چھ ماہ کے بعد آجاتا اور فلکی کے قدموں پر سر رکھ کے رونے لگتا۔ کہتا فلکی' تیرے بغیر تو میں جنت میں نہیں رہ سکوں گا۔

اور وہ بڑے زور سے قہقہہ لگاتی۔

بہت ہی خوب صورت اونچا لمبا اور پیارا سا لڑکا تھا مگر فلکی کو وہ شوہر کے روپ میں نہیں لگتا تھا۔ وہ کہتی تھی' دوستی رکھوں گی۔ پیار بھی کروں گی مگر تم سے شادی نہیں کروں

سب نے اس کا نام مجنوں رکھ چھوڑا تھا۔

ایک بار فلکی نے مذاق میں اس سے کہہ دیا تھا کہ اپنی گردن کی رگ کاٹ کے خون سے میرا لکھو تو اس کم بخت نے گردن کی رگ بلیڈ سے کاٹ لی تھی۔ وہ تو شکر ہوا جس ریستوران میں بیٹھے تھے وہاں سے ڈاکٹر کی دکان نزدیک تھی۔ جلدی سے سب وہاں لے گئے ورنہ جس طرح کا خون بہہ رہا تھا بچنے کی امید نہ رہتی۔

فلکی نے جب سنا تو اُلٹا اس کو ڈانٹا کہ مجھے بدنام کرتے ہو۔ سب دوستوں نے مل کر معاملہ رفع دفع کیا۔

بہت سوں نے اسے مشورہ دیا کہ بوبی کے ساتھ شادی کر ہی لے مگر ایسے کمزور دل عاشق سے اسے بڑی گھن آتی تھی۔ آج موٹر میں بیٹھی وہ سوچ رہی تھی۔

واقعی بوبی اچھا لڑکا تھا۔

کاش اس نے اسے نہ ٹھکرایا ہوتا

اسے سچ مچ بوبی کی بددعا لگ گئی۔

کیونکہ وہ اس کی شادی میں شامل نہیں ہوا تھا۔ سنا تھا تین دن سے اس نے بھوک ہڑتال کی تھی۔ شیو بڑھا رکھی تھی اور وہسکی پی پی کر روتا تھا جو بھی اسے بوبی کے بارے میں بتاتا وہ سے ڈانٹ دیتی۔

مگر اب اسے بوبی بے طرح یاد آرہا تھا۔

واقعی کسی کا دل توڑنا بری بات ہے پھر بوبی ایسے معصوم اور پیارے آدمی کا۔

کاش وہ بوبی سے مل کر اس سے معافی مانگ سکتی۔ کاش وہ بوبی کو اپنا سکتی۔

کاش آفاق سے اس کا پیچھا چھوٹ سکتا۔

اس نے بیٹھے بیٹھے دل میں فیصلہ کرلیا کہ وہ افاق سے طلاق لے کر بوبی سے شادی کرلے گی۔

اب بوبی سے بہتر کوئی آدمی نہیں لگ رہا تھا۔ بوبی جو اس کے خوب صورت پاؤں پر سر رکھ کر رویا کرتا تھا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر چوم لیتا تھا۔ اس کی ایک تصویر اپنی اندر والی جیب میں رکھا کرتا تھا۔ ایک اپنے بٹوے میں لگاتا تھا۔ اس کے بغیر فلم نہیں دیکھا کرتا تھا۔ ہمیشہ اسے "میری جان" کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔

اس کے مقابلے میں آفاق کیا تھا۔

ایک سخت اور کھردرا مرد۔۔۔؟

دنیا دیکھ رکھی تھی اس نے۔ اپنی وجاہت اور دولت پر اتنا اِتراتا تھا۔ اپنے آپ کو سمجھتا تھا۔ کسی کی عزتِ نفس اس کی نظر میں کچھ بھی نہ تھی...

ذلیل آدمی...

اس نے غصّے سے بَل کھاتے ہوئے دل ہی دل میں اسے گالی دی۔

طلاق نہ لی تو میرا نام فلکی نہیں۔

ممکن ہے یہ طلاق دینے پر راضی نہ ہو۔

مگر کیسے راضی نہ ہو گا جب وہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے گی تو پھر راضی ہونا پڑے گا۔

ممکن ہے ڈیڈی ممی اسے باز رکھیں۔

مگر کیوں باز رکھیں۔ وہ صاف صاف بتا دے گی۔ ایک ایک بات کہہ دے گی۔ پہلا سے لے کر اب تک... اور ایسے آدمی کی بیوی بن کر کوئی عورت نہیں رہ سکتی... جو. جس نے... جس نے... ہاں جو اسے بیوی بنا کر نہ رکھ سکتا ہو۔ بیوی تو بیوی ہوتی ہے نا؟ا اپنے حقوق ملنے چاہئیں۔ وہ شرع و شریعت کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔

زیادہ تر اس نے انگریزی کے ناول پڑھ رکھے تھے پھر بھی جانتی تھی کہ اپنے حقوق مہ بیوی کو حق ہے اور اس ایک بنیاد پر وہ علیحدگی اختیار کر سکتی ہے۔

یہ سوچ کر اس نے اطمینان کا سانس لی۔

اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی فیصلہ کر لیا کہ وہ صبح بوبی کو فون کرے گی کہ عنقریب کی ہو جائے گی بلکہ اس گھر سے نکل کر بوبی کے پاس ہی چلی جائے گی۔ ایک بار نکل گئ اسے کوئی لائے گا بھی نہیں۔ بالکل ایسا ہی کرنا ہو گا۔

اور یہی اس شخص سے انتقام ہو گا۔

ایسا سوچتے سوچتے اس کے آنسو خودبخود رک گئے۔ چہرے کا تناؤ کم ہو گیا اور جیسے اس اطمینان کا طویل سانس لیا۔

جونہی اس کے ہوش و حواس بجا ہوئے' اس نے اردگرد دیکھا۔ موٹر اب آفاق کے "رازداں" جس کا نام تھا' میں داخل ہو رہی تھی۔ باوردی دربان گیٹ کھول رہا تھا۔

گیٹ کھولنے کے بعد اس نے سیلوٹ کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ زن کر کے موٹر پورچ میں گئی۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے آپ کسی مناسب فیصلے پر پہنچ گئی ہیں آخر؟"

آفاق نے گاڑی بند کرتے ہوئے کہا۔

ابھی اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ بولا۔

"میاں بیوی کا رشتہ جوڑنا تو آسان ہے مگر توڑنا بہت مشکل ہے اس لیے میرا خیال ہے سارا زور نبھانے پر لگائیے۔ ایسا نہ ہو لوگ آپ کا تماشا دیکھیں۔"

"یہ کیوں نہیں کہتے کہ تمھیں خود تماشا بننے سے ڈر لگتا ہے۔"

فلکی نے نفرت اور غصّے سے جواب دیا۔

اتنے میں دربان قریب آ چکا تھا۔ اس نے فلکی کا دروازہ کھول دیا۔ فلکی اور آفاق اکٹھے گاڑی سے باہر نکلے۔

آفاق نے آگے بڑھ کر ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولا۔ ابھی انھوں نے اندر قدم رکھا تھا کہ ایک اور موٹر کے ہارن کی آواز آئی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو آفاق کا ایک عزیز دوست اور اس کے بیوی بچے آئے تھے۔

"آیئے' آیئے۔" آفاق نے بازو پھیلا دیے۔

"یا حضرت' کہاں تھے اتنے دنوں۔"

"بھئی کل ہی یورپ سے آیا ہوں۔ پتا چلا تمھاری شادی ہو گئی ہے۔ سوچا مبارک باد دے آؤں کیونکہ ایک ہفتے بعد میں عرب جا رہا ہوں۔"

"کیسی ہیں آپ بھابی...؟"

آفاق نے اس کی بیوی سے خوش دلی سے کہا۔

"اللہ کا احسان ہے۔ آپ سنائیں کیسی گزر رہی ہے۔ شادی مبارک ہو۔"

"بھابی سے ہمارا تعارف تو کراؤ۔"

"بیٹھیے تو سہی۔ یہ میری دلہن ہے اور اپنا تعارف آپ ہے۔ دیکھ تو رہے ہیں آپ!"

سب لوگ قہقہہ لگا کر ہنسے۔

"واقعی بہت خوب صورت ہیں۔ کہاں سے مل گئیں؟" بھابی نے بیٹھ کر ہنستے ہوئے کہا۔

"بس خود ہی آن ٹکرائیں۔ ان کی شامت ان کو لے آئی۔ ورنہ آپ جانتی ہیں میں کتنا معصوم اور سیدھا سادا ہوں۔"

اس پر پھر سب نے قہقہہ لگایا۔

فلکی صرف مصنوعی انداز میں مسکراتی رہی۔ وہ جانتی تھی یہ کم بخت چرب زبان شوبزنس خوب جانتا ہے۔

"فلکی' اُٹھو بھئی' چائے وائے منگواؤ۔ یہ تمہارے مہمان ہیں اور تمہارے گھ ہیں۔"

آفاق نے اتنی محبت سے کہا جیسے اس کی زبان کڑواہٹ سے بالکل آشنا نہ ہو۔

فلکی اٹھ کر باہر گئی۔ چائے کا آرڈر دے کر پھر آکر بیٹھ گئی۔

مہمان خاتون اس سے باتیں کرنے لگی۔ ظاہر ہے اسے بھی خوش دلی کا مظاہرہ کرنا تھا۔ چائے آگئی تو وہ اٹھ کر سب کو بنا کر دینے لگی۔

جب اس نے آفاق کو پیالی پکڑائی تو بڑے والہانہ انداز میں مسکرا کر بولا۔ "شیرینی صرف تمہارے لبوں کی پیتا ہوں۔ امید ہے تم نے چینی نہیں ڈالی ہوگی۔"

فلکی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"شاباش! یہی اچھی بیویوں کی نشانی ہے۔"

"یار! تم ذرا بھی نہیں بدلے۔ ویسے کے ویسے ہو جیسا دو سال پہلے چھوڑ گیا تھا۔"

"میں کیوں بدلتا۔ کیا میری زبردستی کی شادی ہوئی ہے۔ بھئی یہ محبت کی شادی ہے او شادی کے بعد لڑکیوں کو بدلنا پڑتا ہے جن کو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی ان کو زمانہ سکھاتا ہے

"ہاں' یہ تو ٹھیک ہے۔"

بھابی نے ہاں میں ہاں ملائی۔

اور پھر سب لوگ ازدواجی زندگی کے شیب و فراز کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔

فلکی لاتعلقی سے بیٹھی رہی۔ اسے اس موضوع سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور پھر اسے آفاق ہر حرکت مصنوعی لگ رہی تھی۔ اندر سے وہ کس قدر بھونڈا' بداخلاق اور بدتمیز تھا مگر ا آپ کو غلافوں میں لپیٹ کر پیش کر رہا تھا۔

فلکی کو اس کے مہمانوں سے بھی گھن آرہی تھی۔ اب ایسی محفلوں سے وہ گھبراتی تھی۔ چاہتی تھی یہ لوگ فوراً اٹھ کر چلے جائیں۔

ممی کے ہاں تو اس شخص نے شور مچایا ہوا تھا کہ ڈنر پر جانا ہے اور یہاں سب کچھ بھول تھا۔

اس وقت غالباً آٹھ بج رہے تھے۔ فلکی نے دوبارہ اپنی گھڑی دیکھی' تو آفاق اس کی طرف

دیکھ کر بولا۔

"فلک تم تیار ہو جاؤ' ہم نے آٹھ بجے ایک ڈنر پر جانا تھا۔ کوئی بات نہیں۔ میں ان لوگوں کو فون کر دیتا ہوں کہ ہم ساڑھے آٹھ بجے تک پہنچ جائیں گے اور رضوان اور بھابی بھی ہمارے ساتھ ہی جائیں گے۔"

"نہیں یار' تم لوگ پہنچ جاؤ۔ ہم اب جاتے ہیں۔"

"تکلف والی جگہ نہیں۔ میرا بڑا پیارا دوست ہے۔ وہاں ذرا گپ شپ رہے گی اور لوگ بھی تمہیں مل لیں گے۔"

رضوان نے زیادہ انکار کرنا مناسب نہ سمجھا۔

آفاق نے فلکی کی طرف دیکھا۔ اسی طرح بیٹھی ہوئی تھی۔

"جاؤ فلک' پندرہ منٹ میں تیار ہو کر آؤ اور اگر تیار نہ ہونا چاہو تو یونہی چلی آؤ۔ اب تمہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں نے تو تمہیں اپنا ہی لیا ہے۔"

سب ہنسنے لگے۔

ویسے اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا تیار ہونے کو۔

مگر اس کا آخری فقرہ سن کر جل اُٹھی اور خاموشی سے اٹھ کر ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔

اپنا سب سے بھاری جوڑا نکالا۔ خوب اچھی طرح میک اپ کیا۔ سارے زیور پہنے۔ یوں بن سنور کر کھڑی ہو گئی جیسے خطرناک ارادے سے نکلی ہو اور بننے ٹھننے میں اس نے پورا ایک گھنٹہ لگا دیا۔

آفاق چلاتا ہوا اندر آرہا تھا۔

"فلک کہیں سو تو نہیں گئیں؟"

جونہی اندر آیا۔ اس کی چھب دیکھ کر حیران رہ گیا۔

پھر بولا۔

جلدی سے آؤ۔ وہ لوگ موٹر میں بیٹھے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ پہلے ہی کافی دیر ہو گئی ہے۔"

فلکی نے شال اور پرس اُٹھایا اور اس کے پیچھے لپکی۔

رضوان اور مسز رضوان بمع بچوں کے اپنی کار میں بیٹھ چکے تھے۔

آفاق نے اپنی کار کا دروازہ کھولا۔ وہ بیٹھ گئی۔

سٹیئرنگ سنبھالتے ہی آفاق بولا۔

"دیکھا' میں نے آپ کو کس طرح تیار کروایا ہے' کیونکہ سب لوگ نئی نویلی دلہن کے روپ میں دیکھنے کے متمنی ہوتے ہیں۔ بہرحال مشکور ہوں کہ ضد میں آکر سہی' آپ اچھا بناؤ سنگھار کیا اور میری لاج رکھ لی۔

فلکی نے اپنی خوب صورت آنکھوں سے لمحہ بھر کے لیے اس کو گھورا۔ پھر اپنا نچلا کاٹ لیا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ کار گیٹ سے باہر نکل آئی تھی۔ اس نے تو آفاق کو کے لیے یہ سب کیا تھا مگر یہ سب اس کی خوشی اور فخر کا موجب بن گیا تھا۔

آخر وہ ہر بار اس شخص سے شکست کیوں کھا جاتی ہے۔ وہ دل ہی دل میں کڑھنے لگی۔ دوست کے گھر پہنچ کر بھی آفاق ایسی ذو معنی باتیں کر کے محفل کا دولہا بنا رہا اور فلکی منہ لگائے بیٹھی رہی۔ تب میزبان خاتون نے فلکی سے کہا:

"آپ بھی بولیں۔ آپ بھی کچھ کہیں۔ دیکھیں تو آفاق کس طرح زبان چلا رہا ہے۔ آپ نے زبان نہ کھولی تو یہ آپ کو کبھی بولنے نہ دے گا۔"

"ارے ان کو نہ بلوایئے گا۔ یہ بہت بد زبان ہیں۔ جب بولتی ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ کر چڑھ کر بول رہا ہے۔"

ع خوشی گفتگو ہے بدزبانی ہے زباں ان کی

گو لوگ ان باتوں کو مذاق سمجھ رہے تھے مگر وہ جانتی تھی آفاق کس انداز سے اس پر طنز ہے۔

"اور پھر یہ محفل میں گولہ باری نہیں کرتیں۔ تنہائی میں۔ موقع دیکھ کر ایک بم چھوڑتی اور پھر مرنے اور تڑپنے کا مزہ دیکھتی ہیں۔"

ساری محفل زعفران زار ہو رہی تھی۔

اس نے بڑھ کر فلکی کا بازو تھام لیا۔

"فلک' یہ سب ہمیں لڑانا چاہتے ہیں اور ہم نے قسم کھائی ہے کہ زندگی بھر نہیں لڑیں گے۔ ایک منٹ کے لیے میرے ساتھ باہر آؤ۔ تمہیں ایک چیز دکھاؤں۔"

پوری محفل میں سے گھسیٹ کر وہ اسے باہر لے گیا۔ کسی نے کچھ سمجھا' کسی نے کچھ... باہر جا کر وہ بولا۔

"اپنے چہرے سے نفرت کی یہ لکیریں تو مٹاؤ جو میک اپ کے باوجود چھپ نہیں رہیں۔ لوگ

سمجھے تو کچھ نہیں کہیں گے۔ تمہی پر ہر الزام آئے گا۔"

پھر اس کو گھسیٹ کر اندر لے آیا۔ بولا۔

"میں نے فلک کو چاند کہا ہے۔

"خدا کی قسم اس کے سامنے وہ بالکل پھیکا لگ رہا تھا بلکہ روہانسا لگ رہا تھا۔ ہے نا فلک...؟"

وہ زبردستی مسکرا دی۔

"ایسے نہ مسکرایا کرو۔ میرے سب دوست بدنیت ہیں۔"

اس پر محفل میں اتنا زبردست قہقہہ پڑا کہ در و دیوار ہل گئے۔

آفاق کی باتوں سے سبھی محظوظ ہو رہے تھے۔ سوائے فلکی کے۔ اسے تو ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ کسی شکنجے میں کسی جا رہی ہے۔

رفتہ رفتہ سب دوست رخصت ہونے لگے۔ وقت دیکھا تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔

آفاق ایک صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔

صرف دو تین مہمان رہ گئے تھے۔ جب اس نے اپنے دوست کو بلا کر کہا۔

"یار آغا' کافی پلواؤ گرم گرم۔"

"کافی تو پلوا دیتا ہوں۔ مگر بھابی سے پوچھ لو۔ وہ بہت تھکی ہوئی معلوم ہو رہی ہیں۔"

"اگر وہ تھکی ہوئی ہیں تو انھیں کافی ضرور پلواؤ۔"

"میرا خیال ہے آپ لوگوں کو اب گھر جانا چاہیے۔" مسز آغا بولیں۔

"واہ' یہ اچھی مہمان نوازی ہے۔ گھر بلا کر مشورہ دیا جاتا ہے۔"

مسز آغا ہنس کر بولیں "بھئی آفاق' ہم جانتے ہیں کہ نئی نئی شادی میں دولہا دلہن تخلیہ زیادہ مانگتے ہیں۔"

"بس رہنے دیں بھابی۔" آفاق انگڑائی لے کر بولا۔ "ہمارے لیے خلوت اور جلوت دونوں برابر ہیں۔ بس ہماری پری رُو سامنے ہو۔ یہ بیٹھی ہے تو دنیا قائم ہے۔ اٹھ کر چلی جائے تو قیامت آجائے گی۔ آؤ ڈارلنگ' میرے پاس آکر بیٹھو۔" اس نے اٹھ کر فلکی کا بازو پکڑا اور صوفے پر اپنے ساتھ بٹھا لیا اور پھر اپنا ہاتھ اس کی کمر میں ڈال دیا۔

فلکی کو اس کے ساتھ بیٹھنا اور اس کا یوں لپٹانا بہت ہی عجیب لگا۔ اس کا مضبوط ہاتھ اسے پسلیوں پر محسوس ہو رہا تھا۔ فلکی کے اندر جیسے طوفان سا آگیا۔

مسز آغا اٹھ کر کافی بنانے چلی گئیں۔

"یہ تمہارا دل اتنی زور سے کیوں دھڑک رہا ہے جیسے ابھی پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا" آفاق نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ اس کا دل اور زور سے دھڑکنے لگا۔

"اس دل میں صرف غصّہ ہی غصّہ ہے یا پیار بھی ہے۔" وہ پھر بولا۔ "ویسے سنا ہے' مغرو[ر] لوگوں کے دل میں پیار نہیں ہوتا۔ میں سوچتا ہوں جس دل میں پیار اور انسانیت نہیں ہوتی۔ و[ہ] دھڑکتا کیوں ہے؟ کہیں ایسا نہ ہو یہ متعدّی مرض میرے دل کو لگ جائے۔ زرا دور ہی رہوں ت[و] بہتر ہے۔"

آفاق نے جلدی سے اپنا بازو چھڑا لیا۔

"یار! کیا رازونیاز کر رہے ہو۔" آغا کافی کی پیالی اٹھائے آگیا۔

"کچھ محفل کا خیال کرو۔"

"لو جی کرلیا محفل کا خیال۔" وہ ذرا پرے ہٹ کر بیٹھ گیا۔ فلکی کو مخاطب کر کے بولا۔

"جانِ من! برا نہ ماننا۔ دو دلوں کو یہ دنیا ملنے ہی نہیں دیتی۔"

"ہاں' یہ سب ہنی مون کے چونچلے ہیں۔" آغا بولا۔

"چھوڑو یار! ہمیں تو یوں محسوس ہوتا ہے ہمیشہ سے شادی شدہ ہیں۔"

"یہ تو بڑی خوش قسمتی ہے۔" مسز آغا بھی آگئیں۔ "انڈرسٹینڈنگ کی انتہا ہے۔ چند دنو[ں] میں ہی۔ واہ واہ...."

آفاق ایک دَم کھڑا ہو گیا اور کافی کی خالی پیالی تپائی پر رکھ دی۔

"ایک بج گیا ہے۔ باقی کی رات یہ خاتون مجھے جگائے گی۔"

اس پر سب ہنسنے لگے۔

فلکی کو ہنسی نہیں آئی۔ اس نے خالی پیالی ایک طرف رکھ دی اور خود بھی کھڑی ہو گئی۔ اپنی شال اٹھا کر کندھوں پر ڈالی۔ پرس ہاتھ میں لیا اور سب کو خدا حافظ کہہ کر آفاق کے ساتھ باہر نکل آئی۔

باہر بَلا کی سردی تھی۔ خصوصاً" جب وہ اتنے گرم کمرے سے باہر نکلی تو ایک دَم تھرّا گئی۔

جلدی سے دروازہ کھول کر کار میں بیٹھ گئی۔

آفاق نے بیٹھتے ہی ہیٹر آن کر دیا۔ موٹر گرم ہونے لگی لیکن آفاق کے قرب ہی سے اسے گھِن آنے لگی تھی۔ اس سردی سے زیادہ اس کا تھرّا دینے والا رویّہ تھا کہ اس کا دل منوں برف تلے دبا جا رہا تھا۔ اب گھر جانا ہوگا۔ اس کے ساتھ یہ رات بسر کرنا ہوگی۔ اسی گھر میں رہنا ہوگا

اور ہر ہتک آمیز بات برداشت کرنا ہوگی۔

کاش وہ اس چلتی گاڑی سے کُود جائے اور رات کے یخ بستہ اندھیرے میں کہیں کھو جائے۔

اس سناٹے میں کہیں گم ہو جائے اور صبح تک اس کا کوئی نشان بھی نہ ملے۔

کاش ایسا ہو۔

مگر ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ آفاق ایک کڑوی سچائی بن کر اس کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔

اور وہ سوچ رہی تھی۔ کیا شوہر ایسے ہوتے ہیں۔ اتنے سرد مہر' کٹھور اور کڑوے۔

کیا یہ راتیں ایسی ہیں کہ طعنے دے کر برباد کی جائیں۔

کیا ہر دلہن نہیں چاہتی کہ اپنے دولہا کے معطّر بازوؤں میں تمام رات سپنے دیکھے۔

اتنا بے درد کوئی انسان نہیں ہو سکتا۔

آفاق۔ کوئی عجیب قسم کا آدمی تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اس کا منہ نوچ لے مگر اس کے منہ لگنا بھی اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ بیہودہ انسان ہے جانے کیا کہہ دے۔

گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل۔ عجیب مخمصے میں وہ گرفتار ہو چکی تھی۔ گھر آگیا۔ دونوں اُتر کر اندر چلے گئے۔

اس بیڈ روم سے فلکی کو وحشت ہو رہی تھی۔

وہ چاہتی تھی کسی اور کمرے میں جا کر سوئے مگر اور کمرے میں جاتے ہوئے بھی اسے ڈر لگ رہا تھا۔

بہرحال اس نے جلدی سے ایک فیصلہ کیا۔ تیز تیز قدم اٹھاتی اپنے کمرے کی طرف دوڑی۔

اندر جا کر جلدی سے کنڈی لگا لی۔

بس یہی ایک بات اس کے ذہن میں آئی تھی۔ وہ آفاق کو جتانا چاہتی تھی کہ وہ اسے کیا سمجھتی ہے۔ اسے اس کی پرواہ نہیں ہے۔ وہ اس کے بغیر بھی رہ سکتی ہے۔

یا پھر اس کی فضول بَک بَک نہ سننا چاہتی تھی۔

کوئی تو بات تھی کہ اس نے ایسا کیا۔

جب کافی دیر بعد باہر کوئی چاپ نہیں سنائی دی نہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا نہ کسی نے اسے بلایا' تو وہ اپنے اس اقدام پر پچھتانے لگی۔ کیا خبر آج رات آفاق اس کے کمرے میں سونا چاہتا ہو۔ کیا خبر وہ خود تلافی کی کوئی صورت پیدا کرنا چاہتا ہو۔

اور اب اس کے رویّے سے چڑ جائے۔

مگر وہ کیا تلافی کی صورت پیدا کرے گا۔ اس کو کیا پڑی ہے۔ بات بات میں تو وہ اس تذلیل کر رہا تھا۔

وہ اٹھ کر ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔ جا کر کپڑے بدلے۔ زیور اتارے اور اپنی نائٹی پہن بیڈ روم میں آگئی۔

بستر لگایا۔

اور اس پر دراز ہو گئی۔

گھر کاٹنا گھرا ہونا جا رہا تھا۔

اور رفتہ رفتہ اس سناٹے سے اسے ڈر آنے لگا تھا۔

خواہ مخواہ بے وقوفی کی۔ چلو ایک تکرار اور ہو جاتی۔ پھر کوئی بدمزگی ہو جاتی۔ اس سے فرق پڑتا۔ وہ اندر تو آجاتا۔ اس تنہا گھر سے' تنہا کمرے سے اسے ڈر لگ رہا تھا۔

ہو سکتا ہے باہر اور لوگ بھی ہوں مگر جب اس نے سوچ لیا کہ وہ تنہا ہے تو نفسیاتی طور پر شے سے ڈر لگنے لگا۔

کبھی ایسے محسوس ہوتا باہر کوئی دبے پاؤں چل رہا ہے۔ وہ کان لگا کر سننے لگتی۔ کبھی ایسے کوئی غیر محسوس طریقے پر کمرے میں گھس آیا ہے۔ کبھی یوں احساس ہوتا کوئی بہت اسے گھو رہا ہے۔ بالکل نیا گھر تھا۔ کینوں کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ پتہ نہیں آفاق کہاں تھا۔ گھر پر ہی تھا یا غصّہ کھا کر گھر سے باہر نکل گیا تھا۔ اس کے آنے کے بعد کوئی آواز نہیں آئی تھی۔ تب اسے اپنی جلد بازی پر غصّہ آنے لگا۔ اس نے یہ بے وقوفی کیوں کی۔

شاید لاشعوری طور پر وہ چاہتی تھی کہ آفاق آئے۔ اس کا دروازہ کھٹکھٹائے لجاجت سے پیش آئے اور وہ دروازہ کھول دے۔ مگر وہ ایسا نہیں تھا۔

وہ ان مَردوں میں سے نہیں تھا' اسے اچھی طرح پتہ چل چکا تھا۔ پھر بھی اس نے ایسی حماقت کی۔ وہ کیوں آنے لگا اور کس برتے پر۔ کیا ان کے ایسے تعلقات تھے کہ وہ اس کے اندر چُھپ جانے پر بے قرار ہو جاتا۔

اوہو...!

بہت غلطی ہو گئی۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ وہ اسے ڈر کا واسطہ دے کر اندر سونے پر مجبور کر لیتی۔ پھر جب وہ اندر آجاتا تو کچھ بھی ممکن ہو سکتا تھا مگر افسوس اس نے خود ہی یہ موقع کھو دیا اور اب اکیلے سونے سے کس قدر ڈر لگ رہا تھا۔

اس کا دل چاہا کنڈی کھول دے اور آفاق کو آواز دے کر بُلا لے مگر یہ تو بڑا بودا پن ہو گا۔ وہ اس کا مذاق اڑائے گا کہ کس برتے پر پہلے دروازہ بند کیا تھا۔ جو اَب بُلا رہی ہو۔ کیا خبر وہ آئے ہی نہ۔ اس کی آواز ہی نہ سنے۔ سو چکا ہو اور دروازہ کھول دینے سے کوئی اور بلا اندر آجائے۔ کوئی اور مصیبت کھڑی ہو جائے۔ نہ بابا نہ۔ اسے جھرجھری آگئی۔

گھبرا کر وہ اٹھ بیٹھی۔ تین بج رہے تھے اور نیند کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ اٹھ کر کوئی کتاب تلاش کرنے لگی۔ سامنے شیلف میں بے شمار انگریزی اور اردو کی کتابیں پڑی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا آفاق رات کو مطالعہ کرنے کا عادی ہے۔ اس نے اٹھ کر ایک کتاب تلاش کی اور لیٹ کر پڑھنے لگی لیکن پڑھتے میں بار بار دھیان باہر کو چلا جاتا۔ ایسا معلوم ہوتا کوئی باہر ٹہل رہا ہے۔ ڈرے خوف کے اس کا سارا خون چہرے پر آجاتا۔ سونا چاہتی تو سویا نہ جاتا۔ سخت مضطرب تھی کہ خدایا۔ یہ کیسا عذاب اس پر نازل ہو رہا ہے۔ تین راتیں ہو گئیں' اضطراب اور کرب کی طویل راتیں۔ سردیوں کی رات ویسے بھی جم جاتی ہے۔ رینگ رینگ کر گزرتی ہے۔ اچھی طرح تہجّد کر' بے سکون ہو کر نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ تو پھر مزے سے پڑی سوتی رہی۔ صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو کلاک گیارہ بجا رہا تھا۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ نہ جانے ہر روز کیا کیوں ہو رہا تھا۔ غالباً" رات وہ چار بجے سوئی تھی۔ پھر اسے ہوش نہ رہا۔ خوب جی بھر کر سوئی اور اب فریش ہو رہی تھی۔ اٹھ کر غسل خانہ میں گئی۔ منہ ہاتھ دھویا۔ خود ہی دروازے کی کنڈی کھول دی۔

دستک ہوئی تو اس نے بڑے مہذّب انداز میں کہا۔

"کم اِن..."

بیرا دست بستہ حاضر ہوا۔ "بیگم صاحب ناشتہ لے آؤں؟"

"لے آؤ..." بڑے تحکّمانہ انداز میں کہہ کر وہ خود ایک رسالہ اُٹھا کر دیکھنے لگی۔

اس کا دل چاہا کہ وہ آفاق کے بارے میں پوچھے کہ وہ کہاں ہے؟ اس نے ناشتہ کر لیا یا نہیں مگر اس نے کچھ نہیں پوچھا۔

اتنے میں بیرا ناشتے کی ٹرالی لے کمرے میں داخل ہوا۔ پھر اس کے لیے چائے بنانے لگا۔

"صاحب جی ناشتہ کر کے دفتر چلے گئے ہیں۔ کہہ گئے تھے وہ بارہ بجے کھانے پر پہنچ جائیں گے۔"

اچھا تو یہ دفتر جانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس نے دل میں سوچا۔ ناشتہ کرنے کے بعد اس

نے پھر کمرے کی کُنڈی لگالی۔

اب کیا کرنا چاہیے؟

وہ لیٹ کر اپنی آیندہ زندگی کا پروگرام بنانے لگی۔

ایک تو یہ مصیبت ہے کہ کسی سے کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا۔ کچھ کہنا چاہتی ہے تو رونا آج ہے۔ وہ مضمون باندھنے لگی۔ می کو فون کرکے بلایا جائے اور اس طرح ان سے بات کی جائے پنکی سے مشورہ کیا جائے یا سیدھے سیدھے بوبی کو فون کردیا جائے مگر بوبی کو فون کرکے وہ کہے۔ اس طرح سب کہنے سے تو شرم آئے گی۔ وہ بھی کیا کہے گا۔ بڑی اکڑتی تھی۔ میری محبت کو ٹھکراتی تھی۔ اب مزہ مِلا ہے۔ ہاں' بات اس طرح کی جائے کہ اپنی سُبکی بھی نہ ہو اور اس احسان بھی ہوجائے لیکن وہ کم بخت ہوگا کہاں۔ سمجھ نہیں آرہی۔ اپنے گھر بھی نہیں جاتا او ولیمے پر بھی نہیں آیا تھا۔ پنکی کہہ رہی تھی دن رات بار میں بیٹھا رہتا ہے اور یہی اس کی بہت زیادہ پینے کی عادت ہی اسے بری لگتی تھی۔

وہ تو قسمیں کھاتا تھا کہ شادی کے بعد پینا چھوڑ دے گا مگر وہی اس کی کسی بات کا اعتبار نہ کرتی تھی۔

اور اب اس برباد محبت کی ایک ایک بات یاد آرہی تھی۔ آہ' کس حال میں ہوگا غریب فلکی کے عشق نے اسے تباہ کردیا ہوگا۔ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہاتھوں سے نکل گیا ہوگا۔ ان کا تو پورا خاندان برباد ہوجائے گا۔

فلکی کے دل میں بوبی کے لیے ایک انوکھی نرالی محبت کا طوفان اُٹھا۔ اس کا دل چاہا۔ دوڑ کر جائے اور رُوٹھے ہوئے بوبی کو سینے سے لگا لے۔

شدّتِ جذبات سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

اس نے سوچا۔ بوبی کے گھر فون کرکے پتہ کرلے کہ وہ کہاں ہے مگر ڈر گئی بوبی کی می پہلے ہی فلکی سے خفا رہتی تھیں۔ کہتی تھیں' اس نے میرا بچہ تباہ کردیا۔ اب اگر وہ پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ گئیں تو... اچھا پنکی کو فون کرکے پتہ لگانا چاہیے مگر...

آج شادی کو چوتھا دن تھا اور پنکی پوچھے گی' آخر بوبی کی ضرورت کیوں پڑ گئی۔

وہ بوبی جس کو اس نے ہمیشہ ٹھکرایا اور جس کی محبتوں کا مذاق اڑایا اور پھر پنکی تو سمجھ رہی ہے کہ اس نے ایک آئیڈیل آدمی سے شادی کی ہے جو اسے روح کی گہرائیوں سے چاہتا ہے۔

اونہہ...

ل اوقات انسان گدھے کو ہیرا سمجھ لیتا ہے۔

رکیا کیا جائے!

ل' پہلے می کو فون کرکے بلایا جائے اور پورا کچّا چٹھا کھول کے بتایا جائے۔

اٹھ کر فون تک گئی۔ ساڑھے گیارہ بج رہے تھے اور آفاق بارہ بجے آنے کا کہہ گیا تھا۔

ر' بات تو کریں جو کچھ فون پر کہا جاسکے گا' کہہ لے گی۔

ں نے می کا نمبر ملایا تو نوکر بولا۔

ادم حسین می کہاں ہیں؟"

ل' چھوٹی بی بی بول رہی ہیں۔ ہاں... سلاماں لیکم جی..." وہ خوش ہو کر بولا۔

ں کہاں ہیں خادم حسین؟"

ہ تو جی باہر گئی ہیں۔"

ہاں...؟"

ں جی.. ہاں جی... وہ تو آپ کے ہاں گئی ہیں۔"

ے ہاں۔ یہاں تو نہیں آئیں۔"

ہیں جی... نہیں آئیں... تو پھر کہاں گئیں؟"

ہ تو جی۔ آپ کے صاحب کے ساتھ گئی تھیں۔"

ان سے صاحب؟"

ی وہ دولہا صاحب' جی وہ آپ کے دولہا صاحب۔"

افاق کے ساتھ؟"

اں جی ہاں!"

ب گئیں؟"

ولی دس بجے۔"

افاق خود آئے تھے؟"

ں ہاں.... اپنی گاڑی میں آئے تھے۔"

ب واپس آئیں گی؟"

ہاکر نہیں گئیں۔"

م نے پوچھا بھی نہیں؟"

"جی' پوچھنے گیا تھا۔ وہ اتنا زیادہ ہنس رہی تھیں کہ میری بات کا جواب بھی نہیں دیا۔
فلکی نے ریسیور زور سے پٹخ دیا۔
تو یہ چال چل رہا ہے وہ خبیث' اور می کو دیکھو کس قدر احمق ہیں۔ ویسے کتنی ہو
ہیں۔ پتہ نہیں ان کو کہاں لے گیا اور کیوں لے گیا۔ ٹھیک کہتے ہیں لوگ' عورت جلا
وقوف بن جاتی ہے۔ اب مجھ پر تو اس کا زور چلا نہیں۔ می پر ڈورے ڈالنے شروع کر
می کو کون سمجھائے۔
کون سمجھائے می کو۔
جلتی کڑھتی وہ اپنے بیڈ روم میں چلی گئی۔ دھم سے بستر پر گر گئی۔
ہر روز نئی اور عجیب و غریب باتیں ہو رہی تھیں۔ اگر وہ می کو لینے گیا تھا تو ابھی تک آ
نہیں لایا۔
اور ابھی تک می واپس کیوں نہیں آئیں؟
کبھی اسے می پر غصہ آتا۔ کبھی حالات پر اور کبھی اسے دل ہی دل میں حسد محسوس
لگتا۔
حسد کیوں؟
وہ خود ہی چڑ جاتی۔ حسد کیوں بھلا؟ آفاق اس کا کیا لگتا ہے۔ فضول سا آدمی ہے۔
اور اوچھی حرکتیں کر کے اس کو امپریس کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔
امپریس نہیں۔ زیر کرنے کی مگر وہ بھی زیر ہونے والی نہیں۔ بڑی کائیاں چیز ہے۔
کر لے گی سب کو۔
جونہی اس نے پاؤں رضائی کے اندر کیے تو اس کا جسم ڈھیلا ہو گیا۔
ذرا سا آرام ملا تو ذہن کا تناؤ بھی کم ہو گیا۔
تناؤ کے کم ہوتے ہی سارے اعصاب ڈھیلے ہو گئے۔ اسے غنودگی سی محسوس ہوئی۔
نیند آنے لگی۔
گھڑی دیکھی۔ پورے بارہ بج رہے تھے۔
جانے آفاق کب آئے گا۔
اسے اس کا انتظار کیوں تھا؟
کیا یہ انتظار کرنے والے تعلقات تھے جن کی بنیاد اس نے رکھی تھی۔ پھر وہ کس

رہی تھی؟
اونہہ...
اس نے کروٹ بدل لی۔ می آئیں۔ ان کی خوب خبر لوں گی۔ اپنا زمانہ گزار کے اب خواہ
ا بے وقوف بن رہی ہیں۔
اونہہ... اونہہ۔
سوچتے سوچتے وہ سو گئی۔
جونہی اس کی نیند کھلی۔ اس نے رضائی اُٹھا کے دور پھینک دی۔
کلائی پر نظر پڑ گئی۔ دن کے تین بج رہے تھے۔ تین گھنٹے تک وہ سوتی رہی۔ اٹھ کر بیٹھی تو
نے پر نظر پڑ گئی۔ آفاق آنکھیں بند کیے' صوفے سے ٹیک لگائے سو رہا تھا۔ پہلے تو اسے
پھر ہی فلکی کا دل دھڑک اٹھا۔
دھڑ دھڑ دھڑ...
آفاق... آفاق... آفاق
خوف... خوف... خوف...
اس کی دھڑکنوں نے کیا کہا۔ وہ سمجھ نہ سکی۔ بھلا آفاق کو دیکھ کر ہر بار دل نئے انداز سے
یوں دھڑکتا ہے۔
نہیں....
مجھے اسے دیکھ کر غصہ آجاتا ہے اور بس۔
اس نے پھر نظر اُٹھا کر آفاق کی طرف دیکھا۔
وہ سو رہا ہے یا بن رہا ہے۔ کم بخت بن رہا ہو گا۔ چلتا پھرتا ڈرامہ ہے۔
اس سے ہر بات کی توقع کی جا سکتی ہے۔ جانے اب کیا کرنے کا ارادہ ہے۔
یہ بھی کوئی سونے کی جگہ ہے۔
کئی اور بھی کمرے تھے۔ جہاں رات کو سوتا ہے' وہاں سو سکتا تھا مگر ہوا جو شعبدہ باز۔
مگروہ آفاق پر سے نگاہ نہ اٹھا سکی۔ اس وقت سو رہا تھا اس لیے جی بھر کر دیکھنے کا موقع مل
گیا۔ ورنہ عام حالات میں تو وہ جان بوجھ کر اس پر نگاہ نہ ڈالتی تھی' نہ نظر بھر کر دیکھتی تھی کہ
خواہ مخواہ اِترائے گا بلکہ اس کی طرف دیکھے بغیر ہی بات کرتی اور زیادہ سے زیادہ اسے نظرانداز
کرنے کی کوشش کرتی۔

اس وقت اس نے ہلکا براؤن چیک سوٹ پہنا ہوا تھا۔ اندر پیلی لکیروں والی قمیہ
ڈارک براؤن ٹائی لگائی ہوئی تھی۔ براؤن چیک جرابیں تھیں۔ کوٹ میں پیلا ریشمی رو
اور گہرے براؤن رنگ کے بوٹ تھے۔ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ کتنے قرینے سے لباس پہنا
چہرہ صاف شفاف تھا۔ رنگ کوئی خاص گورا نہیں تھا۔ عام مردوں کی طرح کِھلتا ہوا
رنگ تھا مگر پھر بھی چہرہ روشن روشن نظر آرہا تھا۔ غصیلی مغرور آنکھیں بند تھیں جن
کے سامنے فلکی کے سب وار ضائع ہوچکے تھے۔ ہر وقت انگارے اگلنے والے بھرے
ہونٹ کس قدر معصومیت سے سو رہے تھے۔ اس کا دل پھر تیزی سے دھڑکنے لگا۔ آفا
ایک بازو اپنے سر کے نیچے رکھا ہوا تھا اور دوسرا صوفے کے بازو پر تھا۔ بھرے بھرے صحو
ہاتھ تھے۔ ایک دم مردانہ ہاتھ لگتے تھے۔ فلکی کو ہمیشہ سے مرد کے بھرے بھرے مضبو
کھردرے ہاتھ پسند تھے۔ مرد کے ایسے ہاتھ اسے پسند تھے جو لڑکی کے ہاتھ پکڑیں تو لڑکی
اس میں چڑیا کی طرح بند ہوجائے۔ اف اللہ' بوبی کے ہاتھ اسے پسند نہیں تھے۔

بالکل لڑکیوں کی طرح تھے اس کے ہاتھ۔ سفید سفید' ملائم ملائم۔ جیسے روز ان پر پینڈ
لگاتا ہو اور پھر ناخن بڑھا کے اس نے انگلیاں بھی مخروطی بنالی تھیں۔ جب کبھی فلکی کا
پکڑتا' اس طرح معلوم ہوتا جیسے کسی سہیلی نے اس کا ہاتھ پکڑا ہو۔ ذرا بھی تو دل میں ہلچل
ہوتی تھی۔ دل شدّتِ احساس سے یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے سینے سے ٹکرا جائے۔

مگر آفاق کے ہاتھ بوبی سے بالکل مختلف تھے۔

خالص مردانہ ہاتھ تھے۔ مردانہ انگلیاں تھیں بھری بھری مضبوط' چوڑے چوڑے نا
سرخ پوریں۔ سانولے سانولے' صاف ستھرے اور صحت مند ہاتھ۔

ان ہاتھوں کو دیکھ کر اس کا دل پھر دھڑکنے لگا۔ کیا اسے ایسے ہی ہاتھ پسند نہ تھے جو یا
دل میں پیار جگاتے ہوں۔

ایک دم اس کا دل چاہا۔ وہ اٹھ کر ان ہاتھوں کو تھام لے۔ ان بند ہونٹوں پر اپنی انگ
دے۔ اس چوڑے چکلے سینے پر' جس کے اندر دل دھڑک رہا تھا اور دل کی جنبش سے قمیص
رہی تھی' اپنا سر رکھ دے۔

اور اس سے کہے۔

ظالم میری سب خطائیں معاف کردے۔

اگر تجھے پیار کرنے کے انداز نہیں آتے تو میں سکھاؤں۔

ں تجھے بتاؤں محبت کسے کہتے ہیں۔ پیار کیا ہوتا ہے۔

پ کے جلوے کیسے ہوتے ہیں۔ زندگی کی خوشیاں کہاں ملتی ہیں۔

ت کی چھاؤں میں کتنا کیف ہے۔

ت میں کتنی مٹھاس ہوتی ہے۔

ر تو جھکنا نہیں چاہتا...

ں جھک جاتی ہوں۔

انا تو محبت ہے۔

ر میں محبت کی پیاسی ہوں۔

ہ محبت سے اپنا غلام بنالے۔

... ساری رنجشیں بھول جائیں۔

رف پیار کریں۔

، زندگی صرف پیار کرنے کے لیے ہے۔

ہاں صرف ہم دونوں ہیں۔

ہمارے درمیان زمانہ بھی نہیں۔

ر تو نے یہ کیسی دیواریں حائل کردی ہیں؟

نفرت کی یہ خلیج کیوں؟

محبت کی ایک رات پر زندگی کے سو دن قربان ہوسکتے ہیں۔

نہ جانے وہ سوچتی سوچتی کیا کر بیٹھتی کہ اچانک آفاق جاگ اٹھا۔

چونک کر اس کو دیکھا اور بولا۔

"لے چکیں میرا جائزہ اور کر چکیں میرا تجزیہ....

"اب اجازت ہو تو میں سوجاؤں؟"

وہ ایک دم گڑبڑا گئی۔ کتنی محویت سے وہ اسے دیکھ رہی تھی اور بھول گئی تھی کہ وہ سو ر
ہ۔ ہوئی نا وہی بات۔ بہت اِترا رہا ہے دل میں... اونہہ...
اس نے منہ پھیرلیا۔ سارے جذبات اِدھر اُدھر اُڑ گئے۔ نفرت کے مارے اس کا جی جلنے

"حضور اجازت دیں تو اب میں بھی ذرا سوجاؤں۔ آپ تو اس گھر میں صرف سونے کے لیے

آئی ہیں اور اس پلنگ پر اپنی اجارہ داری سمجھتی ہیں۔ خاکسار اس وقت سے صوفے ہے۔ تشریف کا ٹوکرا اٹھایئے۔ اب ذرا میں آرام کرلوں۔"

اسے کچھ سمجھ نہیں آئی کہ آفاق کا یہ کہنے سے کیا مطلب ہے۔ ہاں' وہ یہ پوچھنا م کہ جناب روز آپ جہاں سوتے ہیں کیا آج وہاں نہ سو سکتے تھے مگر وہ ایسی کوئی بات مصیبت میں گرفتار نہ ہونا چاہتی تھی۔ ویسے ہی بیٹھی رہی۔

"محترمہ میں آپ سے گزارش کررہا ہوں کہ میں سونا چاہتا ہوں۔"

"تو سوجائیں کس نے منع کیا ہے۔" اس نے تلخی سے جواب دیا۔

"اجازت نہیں لے رہا۔ آپ سے عرض کررہا ہوں کہ آپ کی زلفوں کی چھاؤں میں سونا چاہتا' اپنے پلنگ پر سونا چاہتا ہوں۔ چار راتیں ہوگئیں مجھے بے آرام ہوتے ہوئے اُدھر دھکے کھا رہا ہوں۔ مجھے اپنے پلنگ کے سوا کہیں نیند نہیں آتی اور آپ ہیں کہ چا سے مسلسل دن رات اس پر استراحت فرما رہی ہیں۔ اجازت ہو تو میں اپنے پلنگ پر..."

فلکی ایک جھٹکے سے کھڑی ہوگئی۔ میں لعنت بھیجتی ہوں اس پلنگ پر۔ اس نے دل میں کہ میں آج ہی کمرہ بدل لوں گی۔

وہ کھڑی ہوگئی تو اس نے کوٹ اتار کر صوفے کی پشت پر ڈالا اور بستر پر دراز ہوگیا۔ اس پاؤں فلکی کی طرف تھے۔ ذرا سا سر اونچا کرکے بولا۔ "آپ کو زحمت تو ہوگی ذرا میرے جو اتار دیجئے گا۔"

"اونہہ..."

فلکی نے نفرت سے منہ موڑ لیا اور باہر جانے کو رخ ادھر کیا۔

"خیر کوئی بات نہیں۔ مجھے تو جوتوں سمیت سونے کی عادت ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ا پاؤں رضائی کے اندر کرلیے۔ فلکی کو بہت تجسس آئی۔

توبہ۔ تھوڑی دیر پہلے وہ اس آدمی کی نفاست کے گُن گا رہی تھی۔

"سنئے...!"

اس نے سر اُٹھا کر پھر فلکی کو مخاطب کیا۔

"میں نے کھانا کھا لیا ہے۔ آپ میرے سے کہہ کر کھانا نکلوا لیجئے۔ میں کھانے کے وقت گ آگیا تھا۔ میں نے آپ سے عرض کیا تھا نا کہ میں بھوک برداشت نہیں کرسکتا۔ ا وقت آ آرام فرما رہی تھیں۔ آپ کو جگانا مناسب خیال نہ کیا۔ یہ خواب دیکھنے کی عمر ہے۔ میں نے

آپ ڈسٹرب نہ ہوجائیں اور...

اسے جاتے دیکھ کر پھر بولا۔

"آپ کی ممی میرے ساتھ تشریف لائی تھیں۔" وہ جاتے جاتے رک گئی اور نہ چاہتے ہوئے ہی مڑ کر دیکھا۔

"وہ آپ کے کمرے میں آئی تھیں۔ آپ کو سوتا دیکھ کر چلی گئیں بلکہ میں نے انھیں کھانے بٹھا لیا تھا۔ کہا تھا۔ آپ کی بیٹی تو مجھے یہ اعزاز بخشتی نہیں۔ آپ ہی بخشئے۔ خوب گپ بازی رہی۔ تقریباً" دو گھنٹہ بیٹھ کر ابھی گئی ہیں۔"

فلکی کا دل چاہا۔ کچھ کہے۔ اور نہیں تو گالی ہی دے مگر کس کو۔ ممی کو یا آفاق کو۔

"صبح بھی ایک بار انھوں نے فون کیا تھا۔ اس وقت بھی آپ سو رہی تھیں وہ پوچھ رہی تھیں:

"تم نے کیا نشہ پلایا ہے میری بیٹی کو۔ سارا وقت سوئی رہتی ہے۔"

ضبط کرنے کے باوجود فلکی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

میں نے کہا۔

"میڈم... یہ تو..." وہ سوئی سوئی آواز میں بولا۔ "یہ تو نفرت کا نشہ ہے۔"

اس کے بعد وہ اندر نہیں مڑی۔ باہر نکل آئی۔

کوریڈور میں کھڑے ہوکر اس نے اپنے آنسو صاف کیے۔ ابھی کھڑی سوچ رہی تھی کہ کیا کرے کہ بیرا سامنے آگیا۔

"میڈم آپ کے لیے میز پر کھانا لگا دیا ہے۔"

"میں آرہی ہوں۔"

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کھانے کی میز پر جا بیٹھی۔ گو بھوک لگی تھی مگر کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

وہ کیا کرے؟

ممی کا کیا کرے؟

جتنا وہ ممی کے قریب ہونے کی کوشش کررہی تھی' اتنا ہی ممی اس سے دور ہورہی تھیں بلکہ آفاق اس کے اور ممی کے درمیان خوش فہمی کی ایک دیوار تعمیر کررہا تھا۔

وہ کیا کرے؟

اس وقت اسے ممی پر اس قدر غصہ آرہا تھا کہ اس کا فون کرنے کو دل نہیں چاہا۔
ماں سے وہ کیا کہے' جو اس کے دکھی چہرے کو نہیں پڑھ سکتی۔ اس کی بے حسی کی نیز
مدہوشی سمجھتی ہے۔ کیا ماں بھی بیٹی کے دل سے بے خبر ہو سکتی ہے؟
کھانا کھاتے کھاتے فلکی اپنی ماں سے بدظن ہو گئی۔
اور اس نے سوچا کوئی فائدہ نہیں ایسی ماں کو فون کرنے کا یا کچھ کہنے کا۔ وہ کوئی ا
نکالے گی۔

نہ جانے کس طرح اس نے کھانا زہر مار کیا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ کمر
تو بے خیالی میں ہی آگئی تھی۔
اندر آکر محسوس ہوا کہ اس وقت بستر میں آفاق سویا ہوا تھا۔ آفاق واقعی گہری نیند
تھا۔ بالکل بے سُدھ۔ اس کے پاؤں میں ابھی تک جوتے تھے۔ لحاف ایک طرف گرا ہوا
اسی مردانہ اور ازلی بے پرواہی سے وہ اِدھر اُدھر بکھر کر لیٹا ہوا تھا مگر کس قدر معصومیت
اس کے چہرے پر۔
وہ سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔
مگر اب محویت سے اسے نہیں دیکھ رہی تھی بلکہ ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالتی اور نظر چُرا لیتی۔
لوگ کہتے ہیں خوابیدہ عورت قیامت ہوتی ہے۔ بعض مرد سوئے ہوئے کتنے اچھے ا
ہیں۔

جیسے ایک روٹھا ہوا بگڑا ہوا بچہ اطمینان سے سو رہا ہو۔
جو مرد ہر وقت چہرے پر برہمی اور کرختگی طاری رکھے اس کا اصل روپ سوتے میں نظر آ
ہے۔

جب مرد سوتے میں معصوم فرشتہ دکھائی دے تو عورت بڑھ کر اسے کلیجے سے لگا لیتی ہے۔
کاش آفاق اتنا معصوم ہوتا جتنا دکھائی دیتا ہے۔
اب وہ کیا کرے۔ فلکی نے سوچا۔
باہر نکل جائے اور فون کرے۔
نہیں۔ آفاق کی موجودگی میں وہ کسی کو فون نہیں کر سکتی۔ کوئی کتاب پڑھے۔
دل تو چاہ رہا تھا۔ گاڑی لے کر باہر نکل جائے اور سڑکوں پر آوارہ پھرے۔ ڈیڈی نے اس
کی مزدا دوسرے دن یہاں بھیج دی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا اپنی گاڑی چلائے۔ سڑکوں پر

ارلی پھرے۔ اپنے آپ کو آزاد محسوس کرے اور دل کی گھٹن کو کم کرے۔
کاش ایسا ہو سکتا۔
ایک انگریزی میگزین اٹھا کر وہ ورق گردانی کرنے لگی۔
دیکھتے دیکھتے پانچ بج گئے۔
دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔
"کم اِن" اس نے آہستہ سے کہا۔
باوردی بیرا اندر آگیا۔
"صاحب کے دوست آئے ہیں۔ ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے۔ اٹھانے کو کہہ رہے ہیں۔"
یرے نے ایک کارڈ بھی فلکی کو پکڑا دیا۔
فلکی نے ایک نظر کارڈ پر ڈالی اور کھڑی ہو گئی۔
پہلے تو اس کا دل چاہا کہ وہ بیرے سے کہہ دے۔ خود ہی اٹھا کر لے جائے آفاق کو۔
پھر وہ رک گئی۔
بھلا بیوی کے ہوتے نوکر جگائے۔ نوکر کیا سوچے گا۔
"جاؤ ان سے کہہ دو۔ ابھی آتے ہیں۔"
پھر جلدی سے پوچھا۔
"کیا ان کی بیگم بھی ساتھ ہیں؟"
"نہیں جی' بس دو صاحب لوگ ہیں۔"
"اچھا جاؤ' میں بھیجتی ہوں۔"
کہنے کو تو اس نے بیرے کو کہہ دیا۔ تم جاؤ میں بھیجتی ہوں۔
مگر الجھن میں گرفتار ہو گئی۔
اس ستم گر کو تو جگانا بھی ایک مسئلہ تھا۔ جگانے کا تو صرف ایک ہی انداز ہے کہ اسے چھو کر
گایا جائے۔ محبت کا معاملہ ہو تو بیوی ذرا سا بالوں میں ہاتھ چلائے یا کندھے سے پکڑ کر ہلائے یا
ھر وہ سوچنے لگی اس کا اختیار دیا جاتا تو وہ اس کے معصوم چہرے پر اپنی انگلیاں یوں دوڑاتی جیسے
گلاب کا پھول پھیرا جاتا ہے۔ پھر کتنا مزہ آتا۔ مگر یہ ہے الٹے دماغ کا۔ سوچے گا میں نے ہار مان
ں۔ یا میرا دل اس پر آرہا ہے۔ دفع کرو۔ اپنے آپ کو ذلیل کرنے کا کیا فائدہ؟
تو پھر کیسے جگایا جائے؟

پاؤں سے پکڑ کر ہلایا جائے۔ کہیں برا نہ مان جائے اور معلوم نہیں اس کی نیند بھی کچی ہے۔ ہلکی آواز سے جاگتا ہے یا جھنجھوڑنے سے۔

کیوں نہ ریڈیو لگا دیا جائے۔

ایسا نہ ہو گانے کی آواز سن کر نیند اور بھی گہری ہو جائے۔ یہی سمجھتا رہے کوئی مجھے لوری دے رہا ہے۔

باہر مہمان بیٹھے انتظار کر رہے ہیں اور مجھے کوئی طریقہ نہیں سوجھ رہا۔

کیا کیا جائے۔

کتاب لے کر زور سے فرش پر گرائی جائے۔

نہیں اس سے کوئی واضح آواز پیدا نہیں ہوگی۔

کپڑا منہ پر مارا جائے۔

کہیں ایسا نہ ہو وہ الٹے ہاتھ کا تھپڑ رسید کر دے... پھر...

جا کر دروازہ کھٹکھٹایا جائے۔

نہ بابا۔ کہیں دروازہ کھٹکھٹانے سے ہیرا نہ اندر آ جائے۔

پھر کیا کروں؟

اس کا دل دھڑکنے لگا۔

اسے اٹھانا بھی مسئلہ بن گیا۔

لحاف کا کونہ کھینچوں۔

ہاں یہ ٹھیک ہے۔

وہ جوتا اتار کر دبے پاؤں نزدیک گئی اور آہستہ سے نیچے لٹکے ہوئے لحاف کا کونہ کھینچا۔

جنبش تو پیدا ہوئی مگر اس نے لحاف کھینچ کر دوسری طرف کروٹ لے لی۔

تو اور بھی مسئلہ سنگین ہو گیا۔ پہلے وہ سیدھا لیٹا ہوا تھا اور جگانے کے طریقے تھے۔ اب نے منہ دیوار کی طرف کر لیا تھا۔

وہ نگلے پاؤں وہیں کھڑی رہی۔ پورے پندرہ منٹ ہو گئے تھے۔

اس نے سوچا کہ دوسری طرف جائے۔

ادھر سے لحاف کا لٹکتا ہوا کونہ کھینچے۔ لحاف چونکہ سارا اس کے نیچے آ گیا ہے' اس لیے ضرور اس مرتبہ جاگ کر ادھر اُدھر دیکھے گا۔ ہاں...

یہ سوچ کر وہ دوسری طرف گئی... بڑی احتیاط سے پنجوں کے بل آگے ہو کر ہاتھ بڑھا کر لحاف کا کونہ پکڑا۔

خود اپنے ہی ہاتھ کے سائے سے ڈر کر اُچھلی اور سنبھلنے سے پیشتر سالم کی سالم اس پر گر گئی۔

توبہ' کیا انداز تھا گرنے کا۔ کوئی مان نہیں سکتا کہ اچانک گری ہو۔

آفاق کے چہرے سے اس کا چہرہ ٹکرایا۔

بے خودی میں اس نے آفاق کا بازو پکڑ لیا۔

اور پھر چونک گئی۔

وہ جاگ گیا تھا۔

مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ پتہ نہیں اس وقت اس کی آنکھوں میں طنز تھا کہ نہیں۔

وہ شرمندہ سی ہو کر اٹھنے لگی۔

"میں آپ کو جگانا چاہتی تھی۔"

"آپ نے مجھے جگا دیا ہے۔"

آفاق نے اسی طرح مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "میں جاگ گیا ہوں۔ فرمایئے۔"

وہ بالکل سیدھی کھڑی ہو گئی۔

ابھی تک آفاق کے سینے پر اس کا دوپٹہ پڑا تھا وہ اس کی طرف دیکھ رہی تھی مگر اٹھانے کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا۔

"باہر آپ کے دوست آئے ہیں۔"

"اچھا..." وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"میں تو کچھ اور ہی سمجھ بیٹھا تھا۔" اس کا دوپٹہ وہ اپنے ہاتھ پر لپیٹنے لگا۔ "میں نے جانا میری شخصیت اور وجاہت نے آخر آپ کے دل کو جھکنا سکھا ہی دیا۔"

اونہہ۔ وہ منہ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔ سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو۔

"ہائے وا دے۔ اٹھانے کا یہ انداز مجھے بھی پسند آیا ہے۔ خواب میں ایسے محسوس ہوا جیسے ایک معطر اور پھول جیسی پری میرے سینے سے آ لگی ہو۔ بخدا جاگنے کو نہیں سونے کو دل چاہ رہا تھا۔"

پھر وہ اٹھ کر انگڑائی لینے لگا۔

"کبھی کبھی کسی بہانے سے جگایا کیجئے۔ شاید اسی طرح آپ کی بات بن جائے۔"

وہ کوٹ پہنتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کے دوست کا کارڈ فلکی کے ہاتھ میں ہی رہ گیا۔ اس نے منہ پر نہ مار سکی۔

اُلو کا پٹھا۔

اس نے دل میں گالی دی۔ کس قدر خودپسند آدمی ہے۔

شکر ہے اسے ڈرائنگ روم میں نہ جانا پڑا۔ اگر کوئی بیگم ساتھ آئی ہوتی، تو پھر اسے جا پڑتا۔ توبہ وہ تو اس کے سامنے بھی کبھی نہ جائے گی۔

اتنے میں بیرا خود ہی اس کے لیے چائے لے آیا۔ شاید آفاق نے کہا ہوگا۔ وہ چائے پینے لگی۔

کیا کرے؟ زندگی زہر ہوگئی تھی۔ ریڈیو لگالیا اور پرانے گانے سننے لگی۔

کبھی کبھی پرانے گیت اتنے اچھے لگتے ہیں جیسے گھر کے پچھواڑے سے ایک دَم ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے آنے لگیں یا پرانی یادیں اور پرانے چہرے دل میں سوئے درد جگانے کو تصوّر میں چلے آئیں۔

پرانے گانوں میں اتنا سوز کیوں ہوتا ہے۔

گزرے ہوئے دن خوب صورت کیوں لگتے ہیں۔

جو چھن جاتا ہے وہ عزیز کیوں لگنے لگتا ہے۔

وہ پڑاؤ جو ہم چھوڑ آتے ہیں، زندگی پلٹ کر ان کی جانب کیوں جانا چاہتی ہے۔

فلکی کی آنکھوں میں پھر آنسو آگئے۔

اس میں خوشیاں ہیں کم۔

بے شمار ہیں غم۔

اک ہنسی اور آنسو ہزار۔ کہہ دو کوئی نہ کرے یہاں پیار۔

گیت کے بول ماحول کو اور اداس بنا رہے تھے۔

فلکی نے ریڈیو بند کردیا۔

تھوڑی دیر بعد دروازے پر چاپ ہوئی۔ بیرا اندر آنے کی اجازت مانگ رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟"

"صاحب کہتے ہیں آٹھ بجے ایک ڈنر پر جانا ہے۔ آپ تیار ہوجائیں۔"

"صاحب سے کہہ دو میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں آج ڈنر پر نہیں جاؤں گی۔"

اسے بہت خوشی ہوئی کہ اس نے نہایت مناسب جواب دیا تھا۔

اسے کل والا ڈر یاد آگیا۔ کیا ضرورت ہے خود بخود ذلیل ہونے کی۔ پندرہ بیس منٹ گزر گئے۔ بیرا پلٹ کر نہیں آیا تو اسے اطمینان ہوگیا۔ ابھی آٹھ بجے تک اس نے بستر میں ہی لیٹنا تھا۔ پھر اس کے بعد اس نے سوچا جب آفاق چلا جائے گا تو وہ ممی کو فون کرکے بُلالے گی اور پھر اچھی طرح ممی کی خبر لے گی اور اس آفاق کی حقیقت بھی ان پر عیاں کردے گی۔

ٹھیک ہے۔

لیکن آفاق کے جانے کے بعد اسے ڈر لگا تو...

کوئی بات نہیں۔ وہ کسی نوکر کو بلا کر یہاں بٹھالے گی۔

کافی دیر تک وہ بستر میں گھسی رہی۔

بستر میں سے آفاق کی خوشبو آرہی تھی۔ کتنی اچھی خوشبو وہ استعمال کرتا تھا کاش خوشبو کی طرح وہ بھی اچھا ہوتا۔

آٹھ بج گئے تو اسے بڑی خوشی ہوئی۔ اٹھ کر باتھ روم میں گئی۔ اس نے سوچا اب وہ ہمارے گھر کا چکر لگا کر اطمینان کرلے گی کہ آفاق جاچکا ہے۔ پھر جو دل چاہے گا کرے گی۔ خیالی پلاؤ پکاتی ہوئی وہ باتھ روم سے نکل رہی تھی کہ ایک دَم آفاق اندر آگیا۔

وہ اسے دیکھ کر دھک سے رہ گئی۔

اس نے ڈنر کا سیاہ سوٹ پہن رکھا تھا۔ کوٹ کے اندر سیاہ دھاریوں والی قمیص تھی اور ہمیشہ سے زیادہ اچھا لگ رہا تھا بلکہ کالے سوٹ میں بہت بارعب لگ رہا تھا۔

"آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئیں۔" اس نے اپنے تحکمانہ لہجے میں پوچھا۔

"میں نے بیرے سے کہلوا دیا تھا کہ میں نہیں جاؤں گی۔"

"میں یہی پوچھنے آیا تھا کہ آپ کیوں نہیں جائیں گی؟"

"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"آپ کی طبیعت کو کیا ہوا ہے؟"

"بس نہیں ٹھیک..."

"اگر بہانہ کرنا ہو تو پیٹ درد یا سر درد کا کیجئے گا کیونکہ یہ دونوں دردیں عورتوں کو کثرت سے ہوتی ہیں اور چونکہ نظر نہیں آتیں، اس واسطے ان کا بہانہ چل جاتا ہے۔"

"جی نہیں۔ نہ مجھے سر میں درد ہے۔ نہ پیٹ میں' بس میرا جی اچھا نہیں' میں نہیں جاتی۔"

"لیکن میں اپنے دوست سے وعدہ کر چکا ہوں۔"

"آپ اپنا وعدہ نبھائیے۔ آپ کو کس نے روکا ہے۔"

"مجھے روکنے والا ابھی تو کوئی پیدا نہیں ہوا مگر آپ کو میرے ساتھ جانا ہو گا۔"

"میں بھی اپنی طبیعت کی خود مالک ہوں۔ آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔"

"اس گھر میں صرف ایک آدمی کی مرضی چلے گی۔"

"اس گھر میں رہنا کون چاہتا ہے۔"

"جب تک آپ یہاں ہیں آپ کو میری مرضی پر چلنا ہو گا۔"

"میں کسی کی مرضی کی غلام نہیں ہوں۔"

"میں تمہارا شوہر ہوں۔"

"میں اپنے آپ کو تمہاری بیوی نہیں سمجھتی۔"

" تمہارے سمجھنے نہ سمجھنے سے کیا ہوتا ہے۔"

"تم شوہر کہلائے جانے کے قابل نہیں ہو۔ نہ میں اب تک تمہاری بیوی بنی اور نہ کبھی بن سکتی ہوں۔ تم بھی اچھی طرح جانتے ہو اور میں بھی۔"

"تم پہلے اپنے آپ کو اس قابل بناؤ۔"

"شٹ اپ۔" فلکی غصے سے چیخی۔ "تم انتہائی کمینے اور ذلیل انسان ہو۔ تم احساسِ کمتری کے مارے ہوئے ہو۔ تمہارے ساتھ کوئی عورت نہیں رہ سکتی۔"

"خاموش رہو۔" آفاق نے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا۔ چلّا چلّا کر نوکروں کو مت سناؤ۔ ہمارے گھر میں عورت کا اونچی آواز میں بولنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔"

" تمہارے خاندان میں تو عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا بھی برا سمجھا جاتا ہے۔ مجھے اس کا اندازہ ہو گیا ہے۔"

"عورت' عورت میں فرق ہوتا ہے۔"

مرد' مرد میں بھی فرق ہوتا ہے۔"

"میں تمہارا لحاظ کر رہا ہوں ورنہ میں بدزبان عورت کا علاج خوب جانتا ہوں۔"

"مت کرو لحاظ میرا۔" فلکی نے غرا کر کہا۔ "جو کسر رہ گئی ہے' پوری کر لو۔ میں تم سے نہیں

لی اور نہ تمہارے پاس رہوں گی۔ میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔ مجھے کسی کی پرواہ نہیں۔ ری جوتی کو بھی تمہاری پرواہ نہیں۔" وہ چلّا چلّا کر کہنے لگی۔

"میں کہتا ہوں آہستہ بولو۔ تمہاری آواز اس دروازے سے باہر نہیں جانی چاہیے۔"

"تم اس دروازے کی بات کرتے ہو' میں ساری دنیا کو چیخ چیخ کر بتاؤں گی۔

"کیا بتاؤ گی؟"

آفاق اس کے قریب آگیا۔

"یہی کہ تم انتہائی کمینے آدمی ہو۔ گھٹیا ہو۔ تم مصنوعی آدمی ہو اور ذلیل ماحول کی پیداوار ۔ تمہاری تربیت میں کھوٹ ہے۔ تمہارے... تمہارے خون میں...."

تڑاخ....

تڑاخ....

تڑاخ....

تڑاخ....

ایک چانٹا آفاق نے سیدھے رخسار پر مارا' دوسرے الٹے پر۔ تیسرا سیدھے پر' چوتھا الٹے ۔ پانچواں... چھٹا....

اور پھر فلکی خود ہی پلنگ پر گر گئی۔ اسے ہرگز امید نہ تھی کہ آفاق کا ہاتھ اس پر اُٹھے گا۔ خود آفاق کو بھی امید نہیں تھی۔

مگر اب جبکہ ایسا ہو گیا تھا تو وہ پچھتا نہیں رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ "جب عورت کی زبان چلنے لگے تو مرد کو ہاتھ اٹھانا پڑتا ہے۔ شوہر اور نوکر میں بہت فرق ہوتا ہے۔ تمہیں تمہارے گھر والوں نے یہ بات نہیں سکھائی تو میں سکھاؤں گا کہ کس طرح شوہر کو مخاطب کرتے ہیں اور یاد رکھو کوئی کمینے سے کمینہ آدمی بھی اپنی بیوی کے منہ سے' اپنے والدین کے لیے برے کلمات نہیں سن سکتا۔ اپنی عزت تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے۔"

یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

اور جانے سے پہلے اس نے باہر سے تالا لگا دیا۔

اس مرتبہ فلکی سچ مچ بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس کے کومل سے رخسار اتنے تھپڑ برداشت کرنے کے متحمل نہ ہو سکتے تھے مگر سب سے زیادہ صدمہ اس کے ذہن کو پہنچا تھا۔ اسے تو کبھی کسی نے پھول کی چھڑی بھی نہیں ماری تھی۔ ڈیڈی تو کبھی اسے اونچی آواز سے بلاتے تک نہیں تھے۔ ممی کی ڈیئر ڈیئر اور ڈارلنگ ڈارلنگ کہتے زبان سوکھتی تھی۔

پھول پھول اس کا جسم تھا۔

اور پتی پتی اس کا چہرہ۔

ظالم نے ساری پتیاں بکھیر دیں۔ سب پھول نوچ لیے۔

اس کی سانس رک گئی۔ دل تھم گیا۔ زبان گنگ ہو گئی۔ پھر وہ پلٹ کر گری اور بے ہوش ہو گئی۔

آفاق دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

اور جاتے جاتے باہر سے کنڈی لگا گیا۔

جانے وہ کب تک بے ہوش پڑی رہی۔

رات کے کسی پہر خود بخود ہوش آگیا۔

تھوڑی دیر بعد اٹھ کر بیٹھنے کی طاقت بھی آگئی۔ وہ بیٹھ گئی۔ ہاتھوں سے چھو کر اپنے رخسار دیکھے۔ پھوڑے کی طرح دکھ رہے تھے۔ پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

ہائے رونا ہی اس کا مقدر بن گیا تھا۔

"ممی... ممی... ڈیڈی... ڈیڈی..."

چلا چلا کر وہ روئی۔ چیخ چیخ کر ممی ڈیڈی کو پکارا۔ بالکل ایسے جیسے وہ بچپن میں زمین پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر رویا کرتی تھی مگر بجز دیواروں کے کسی نے اس کی آہ و بکا نہیں سنی۔

آسمان سن تھا۔

...وا بھی چپ۔

...در و دیوار ٹھٹھک گئے تھے۔

...ن تھا جس کو وہ اپنی فریاد سناتی۔

...ل دیر رو چکنے کے بعد جب وہ تھک گئی۔ اس کا سر، اس کی آنکھیں، اس کے جبڑے دکھنے ...تو وہ ہچکیاں لیتی لیتی خاموش ہو گئی۔

...ا اپنی حالت پر اسے ترس آگیا۔

...پیاس لگ رہی تھی۔

...بھوک بھی لگ رہی تھی۔

...کر شیشے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ کس قدر بھیانک ہو رہا تھا۔ آنکھیں سوج کر انگارہ بن رہی ...دونوں رخساروں پر انگلیوں کے پیلے پیلے نشان تھے۔

...میان میں سرخ سرخ لکیریں صاف نظر آ رہی تھیں۔

...نٹوں میں سے جھاگ نکل رہی تھی۔

...بکھر گئے تھے۔

...کیسی بھیانک شکل لگ رہی تھی۔

...وہ اپنا چہرہ دیکھ کر ڈر گئی۔

...لات چہرے پر بھی اثر ڈالتے ہیں۔

...ن چہرہ ہمیشہ حسین نہیں ہوتا۔

...ی اور غم چہرے کو مختلف روپ عطا کرتے ہیں۔ آج ہی اسے پتہ چلا تھا۔۔۔ وہ غسل ...میں چلی گئی۔

...گرم پانی سے منہ ہاتھ دھویا۔ دانت صاف کیے۔ باہر نکل کر چہرے پر تھوڑی سی کریم ...ہاتھ لگانے سے رخسار دکھتے تھے۔ آہستہ آہستہ نرم نرم ہاتھوں سے اس نے سارے ...ا چکنا کر دیا۔

...کنگھی سے اپنے بال سنوارے۔

...ند دیکھا تو رات کے دو بج رہے تھے۔

...ہوں کی لمبی رات اور ابھی دو بجے تھے۔

...ل نے اٹھ کر دروازہ کھولنا چاہا تاکہ باہر جائے اور کھانے کے لیے کچھ لے آئے۔ مگر

دروازے کو ہاتھ لگانے کے بعد اسے محسوس ہوا ظلم کا ایک اور تیر چل چکا ہے۔
سے دروازہ بند کر گیا ہے۔

کیوں آخر...؟

کس لیے....

کیا اسے اس بات کا ڈر تھا کہ میں بھاگ جاؤں گی۔ فرار ہو جاؤں گی۔ تو ٹھیک۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے بھاگنے سے نہیں روک سکتی۔ آج میں اس کے اختیار میں؛ سختی کرنا چاہے' کرے... ایک دن اس کو مزہ چکھا کے رہوں گی۔ ایک ایک بات کا گی۔ تب اسے پتہ چل جائے گا کہ کسی لڑکی کو مجبور بنا کر اس کے ساتھ ایسی چالیر مطلب ہوتا ہے۔

اس نے جی بھر کے آفاق کو گالیاں دیں۔ اسے کوسا۔ اس کے بزرگوں کو بُرا بھ خون تھا تو برا کر دکھایا۔ ایک عورت پر ہاتھ اٹھایا۔ اگر اس کے بڑوں نے اچھی تربیت آج وہ اس کے ساتھ گھٹیا برتاؤ نہ کرتا۔

اونہہ بڑا آیا...

"مجھے گالی نہ دو۔ میرے باپ کو گالی نہ دو۔"

دوں گی اور بھرے بازار میں دو گی۔ دیکھوں میرا کیا کرلیتا ہے۔

سارے کمرے میں وہ دیوانوں کی طرح چکر لگا رہی تھی۔ غصے سے کھول رہی تھی۔ فلموں کے سارے سین اس کے ذہن میں آنے لگے۔ کاش اس کے پاس کوئی ایسا اوزا چھت کو اُڑا دیتی اور باہر نکل جاتی۔ اے کاش وہ اس قید خانے سے نکل سکتی۔

مگر وہ کیا کرے۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ وہ فولادی طاقت نہیں رکھتی ناممکن کو ممکن کر دکھاتی۔

اس اتنے بڑے گھر میں وہ قید تھی اور اس کے ممی ڈیڈی کو کچھ پتہ نہیں تھا۔

کاش کہیں سے فون مل سکتا۔

اس نے جا کر دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ لاحاصل...

رات کے اس پہر کون اس کی دستک سن سکتا ہے۔ اگر گھر میں وہی کم بخت ہوا دروازہ کھولے گا۔

سخت سردی کے باوجود حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔

بالآخر مجبور ہو کر اسے غسل خانے میں جا کر اپنی پیاس بجھانی پڑی۔

الڑ کیا کرتی۔

پیاس سے تڑپ تڑپ کر مرنا تو اسے بھی قبول نہ تھا۔

پانی پی کر ذرا جان میں جان آئی۔

پھر سردی محسوس ہونے لگی۔ وہ بستر میں گھس گئی۔ بستر میں گھس کر محسوس ہوا سخت بھوک رہی ہے۔ بھوک کا کیا علاج ہو..

وہ تو جب سے اس گھر میں آئی تھی۔ پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا تھا۔ ہاں بس اس دن می ہ ٹھیک سے کھانا کھایا تھا۔ یہاں تو ہر وقت اتنا غصہ چڑھا رہتا کہ کھا ہی نہ سکتی۔

اور اب بے حد بھوک لگ رہی تھی۔

بالآخر ڈرتی' اپنے آپ کو بہلاتی' کبھی روتی اور کبھی کوستی ہوئی فلکی سو گئی۔ اس وقت صبح چار بج رہے تھے۔ خیال تھا کہ گیارہ بجے تک پڑی سوتی رہے گی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ جب خالی ہو اور ذہن دکھ رہا ہو تو انسان سو نہیں سکتا۔ علی الصبح ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔

اسے بڑی حیرت ہوئی۔ ابھی صبح کے سات بجے تھے۔

بہت کوشش کی دوبارہ سونے کی۔ مگر نیند ہی نہیں آئی۔ گرم گرم چائے کی طلب نے بے کر دیا۔ اٹھ کر باتھ روم گئی۔ منہ ہاتھ دھویا۔

دونوں رخسار اور زیادہ سوج گئے تھے اور پیلے نشان نیلے ہو گئے تھے۔

پھر اس وقت تو اس کے پیٹ میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔

نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔

کوئی آہٹ نہیں ہوئی۔ کوئی نہیں آیا۔

خدا جانے گھر میں کوئی تھا نہیں یا اس کی آواز کو کوئی اہمیت نہیں دی جا رہی تھی۔

دوسری بات اسے صحیح لگ رہی تھی۔

کتنی ہی بار وقفے وقفے سے اس نے دروازہ پیٹا مگر دروازہ نہیں کھلا۔

تب اس کی ہمت جواب دے گئی۔

اور وہ بے اختیار رونے لگی۔

بھوک سے مرنا بھی کہاں کی شرافت ہے۔ اسے ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ اگر کچھ کھانے کو نہ تو وہ مر جائے گی۔

دروازے کو ہاتھ لگانے کے بعد اسے محسوس ہوا ظلم کا ایک اور تیر چل چکا ہے۔
سے دروازہ بند کر گیا ہے۔

کیوں آخر...؟

کس لیے....

کیا اسے اس بات کا ڈر تھا کہ میں بھاگ جاؤں گی۔ فرار ہو جاؤں گی۔ تو ٹھیک
دنیا کی کوئی طاقت مجھے بھاگنے سے نہیں روک سکتی۔ آج میں اس کے اختیار میں
سختی کرنا چاہے' کرے... ایک دن اس کو مزہ چکھا کے رہوں گی۔ ایک ایک بات کا
گی۔ تب اسے پتہ چل جائے گا کہ کسی لڑکی کو مجبور بنا کر اس کے ساتھ ایسی چالیں
مطلب ہوتا ہے۔

اس نے جی بھر کے آفاق کو گالیاں دیں۔ اسے کوسا۔ اس کے بزرگوں کو برا بھلا
خون تھا تو برا کر دکھایا۔ ایک عورت پر ہاتھ اٹھایا۔ اگر اس کے بڑوں نے اچھی تربیت
آج وہ اس کے ساتھ گھٹیا برتاؤ نہ کرتا۔

اونہہ بڑا آیا...

"مجھے گالی نہ دو۔ میرے باپ کو گالی نہ دو۔"

دوں گی اور بھرے بازار میں دوں گی۔ دیکھوں میرا کیا کر لیتا ہے۔

سارے کمرے میں وہ دیوانوں کی طرح چکر لگا رہی تھی۔ غصے سے کھول رہی تھی۔
فلموں کے سارے سین اس کے ذہن میں آنے لگے۔ کاش اس کے پاس کوئی ایسا اوزار
چھت کو اُڑا دیتی اور باہر نکل جاتی۔ اے کاش وہ اس قید خانے سے نکل سکتی۔

مگر وہ کیا کرے۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ وہ فولادی طاقت نہیں رکھتی
ناممکن کو ممکن کر دکھاتی۔

اس اتنے بڑے گھر میں وہ قید تھی اور اس کے ممی ڈیڈی کو کچھ پتہ نہیں تھا۔
کاش کہیں سے فون مل سکتا۔

اس نے جا کر دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ لاحاصل...

رات کے اس پہر کون اس کی دستک سن سکتا ہے۔ اگر گھر میں وہی کم بخت ہو
دروازہ کھولے گا۔

سخت سردی کے باوجود حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔

الآخر مجبور ہو کر اسے غسل خانے میں جا کر اپنی پیاس بجھانی پڑی۔
آخر کیا کرتی۔
پیاس سے تڑپ تڑپ کر مرنا تو اسے بھی قبول نہ تھا۔
پانی پی کر ذرا جان میں جان آئی۔
پھر سردی محسوس ہونے لگی۔ وہ بستر میں گھس گئی۔ بستر میں گھس کر محسوس ہوا سخت بھوک
رہی ہے۔ بھوک کا کیا علاج ہو..
وہ تو جب سے اس گھر میں آئی تھی۔ پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا تھا۔ ہاں بس اس دن ممی
گھ ٹھیک سے کھانا کھایا تھا۔ یہاں تو ہر وقت اتنا غصہ چڑھا رہتا کہ کھا ہی نہ سکتی۔
اور اب بے حد بھوک لگ رہی تھی۔
الآخر ڈرتی' اپنے آپ کو بہلاتی' کبھی روتی اور کبھی کوستی ہوئی فلکی سو گئی۔ اس وقت صبح
چار بج رہے تھے۔ خیال تھا کہ گیارہ بجے تک پڑی سوتی رہے گی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ جب
پیٹ خالی ہو اور ذہن دکھ رہا ہو تو انسان سو نہیں سکتا۔ علی الصبح ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔
اسے بڑی حیرت ہوئی۔ ابھی صبح کے سات بجے تھے۔
بہت کوشش کی دوبارہ سونے کی۔ مگر نیند ہی نہیں آئی۔ گرم گرم چائے کی طلب نے بے
ن کر دیا۔ اٹھ کر باتھ روم گئی۔ منہ ہاتھ دھویا۔
دونوں رخسار اور زیادہ سوج گئے تھے اور پیلے نشان نیلے ہو گئے تھے۔
پھر اس وقت تو اس کے پیٹ میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔
نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔
کوئی آہٹ نہیں ہوئی۔ کوئی نہیں آیا۔
خدا جانے گھر میں کوئی تھا نہیں یا اس کی آواز کو کوئی اہمیت نہیں دی جا رہی تھی۔
وہ سری بات اسے صحیح لگ رہی تھی۔
کتنی ہی بار وقفے وقفے سے اس نے دروازہ پیٹا مگر دروازہ نہیں کھلا۔
تب اس کی ہمت جواب دے گئی۔
اور وہ بے اختیار رونے لگی۔
صبح سے مرنا بھی کہاں کی شرافت ہے۔ اسے ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ اگر کچھ کھانے کو نہ
ا تو وہ مر جائے گی۔

وہ روتی رہی.... روتی رہی...

نمکین نمکین آنسو اس کے گال بھگوتے رہے اور پھر کوئی آنسو ہونٹوں کے راستے منہ میں چلا جاتا۔ آنسوؤں کا یہ نمکین مزہ اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔

آج اسے پہلی بار پتہ چلا کہ آنسو نمکین بھی ہوتے ہیں اور مزے دار بھی ہوتے ہیں۔

اور بھلا آنسو پی کر بھی کبھی گزارہ ہوتا ہے۔

اور جو آنسو ختم ہو گئے تو کیا ہوگا۔

رفتہ رفتہ اسے نقاہت محسوس ہونے لگی۔

صرف گھڑی کی ٹِک ٹِک اسے وقت کے گزرنے کا احساس دلا رہی تھی۔ ورنہ ا:
ہوئے اسے بالکل پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وقت کہاں جا رہا ہے۔ دھوپ کہاں تک نکل آئی
عجیب کھڑکیاں تھیں اس گھر کی۔ اندر سارا شیشہ اور باہر گرل لگی ہوئی تھی دھوپ تو
سکتی تھی۔ بھلا کوئی کیسے اس راستے سے فرار ہو سکتا ہے۔

اگلے زمانے کے گھر کتنے اچھے ہوتے تھے۔ اس نے فلموں میں دیکھ رکھا تھا۔ کھڑ
راستے ہیرو کمند ڈال کر ہیروئن کو بچا لاتا تھا یا ہیروئن خود نکل جاتی تھی۔

کتنے موزوں گھر ہوتے تھے۔ کھلے کھلے۔ یہ نیچی نیچی چھتوں والے بیہودہ گھر...

نہ کوئی روشندان، نہ کوئی کھڑکی۔

اس نے ہر شے پر تبصرہ کر لیا تو تھک گئی۔

دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ بھوک نے کلیجے میں کہرام مچا رکھا تھا۔ اس کی جان نـ
جا رہی تھی۔ کاش کوئی اسے ایک پیالی گرم گرم چائے کی دے دیتا اور اس کے بدلے...

اف کیسی ہوتی ہے چائے اور کیا ہوتا ہے اس کا مزہ؟

اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا یہ معمولی سی چائے جو وہ دن میں بیسیوں مرتبہ پیتی
پیالیاں بھر بھر گرا دیتی ہے، کبھی اتنی اہمیت اختیار کر جائے گی۔

چائے، وہ اک آواز دیتی۔

اور بھری ہوئی کیتلی اس کے آگے آ جاتی۔ ایک پیالی پی کر وہ اٹھ جاتی اور باقی سب
ضائع چلی جاتی۔ یا نوکر پی لیتے۔

آج اسے کوئی نوکروں کی جھوٹی چائے دے دیتا تو وہ پی لیتی۔

اٹھتے بیٹھتے اس پر بھوک اور فاقے کے اَسرار، رموز کھلنے لگے۔

وہ یہ سوچ کے حیران ہوئی کہ لوگ بھوک ہڑتال کیسے کرتے ہیں۔ یہ تو انتہائی خطرناک اقدام

پھر اسے بہت سے غریب لوگوں کا خیال آیا۔ فقیروں کا خیال آیا۔ جب بھی اس کی موٹر
مارکیٹ میں جا کے کھڑی ہوتی تھی، کئی فقیر اور بچے ہاتھ پھیلا کر کہا کرتے۔ "رات سے بھوکا
ہے۔ روٹی کھلا دو۔"

"نان سنس...."

اگرچہ وہ پیسے دے دیتی مگر دل میں سوچتی۔ اونہہ ان کو کھانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ سوکھی
ہڈیاں اور کالا چمڑا۔ کھا کر کیا کریں گے؟

اگر یہ لوگ نہ بھی کھائیں تو کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر غریب لوگ زندہ نہ بھی رہیں تو کیا کمی
ہو جائے گی۔

اگر لوگوں کے پاس روٹی نہیں تو میں کیا کروں؟

پھر کیا یہ ضروری ہے کہ یہ محض روٹی ہی کھائے۔

پھل کھایا جا سکتا ہے۔ آئس کریم کھا سکتے ہیں۔ کیک بسکٹ کھا سکتے ہیں۔ توبہ روٹی کے لیے
مرے چلے جا رہے ہیں۔

آج اسے احساس ہوا کہ ہر پیٹ روٹی کیوں مانگتا ہے۔ ہر آدمی روٹی کی دوڑ میں کیوں لگا ہوا

اس نے کبھی روزہ نہیں رکھا تھا۔ روزے سے اسے بہت ڈر لگتا تھا۔ ان کے گھر میں کوئی
روزہ نہیں رکھتا تھا اور اس کو تو ممی کہتی تھیں۔ تو ابھی بچی ہے۔ تجھ پر روزے فرض نہیں

یوں بھی وہ سمجھتی تھیں۔ روزہ صرف درمیانے طبقے کا مسئلہ ہے۔ ایسے ہی اللہ تعالیٰ کی
خوشنودی حاصل کرنے کو روزہ رکھ لیتے ہیں۔ پھر اسے ڈر بھی لگتا تھا۔ ہر وقت تو وہ کچھ نہ کچھ کھاتی رہتی
تھی... وہ سوچتی اگر اس نے روزہ رکھ لیا تو ضرور مر جائے گی۔

ایک بار ہوسٹل میں اس کی سہیلیوں نے زبردستی اسے روزہ رکھوا دیا۔

صبح ناشتے کے وقت سے ہی اس نے رونا شروع کر دیا تھا۔ اس کی حالتِ زار دیکھ کر وارڈن
نے اس کا روزہ تڑوا دیا۔

پھراس نے یہ کارنامہ ممی کو بھی آکر سنایا تھا۔

ممی نے ہنس کر کہا تھا۔

"پور ڈارلنگ۔"

"بھلا تجھے کیا ضرورت تھی روزہ رکھنے کی۔ اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔"

"مجھے تو اس میں کوئی تک نظر نہیں آتی۔ دنیا کی نعمتیں تمہارے آس پاس پڑی ہوں
منہ سی کے بیٹھی جاؤ۔"

پھر آج اسے اندازہ ہو رہا تھا۔ روزہ کیوں ضروری ہے۔

اگر اس نے کبھی روزے رکھے ہوتے تو اس کی قوتِ ارادی بیدار ہو چکی ہوتی۔ ک
چوبیس گھنٹے تو وہ زندہ رہ سکتی تھی۔

مگر اب تو ایسے لگ رہا تھا۔ جان نکلی کہ نکلی۔

یوں لگ رہا تھا' سب گناہوں کی سزا آج ہی مل جائے گی۔

افوہ...

دل نیچے نیچے جا رہا تھا۔

اور آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا رہا تھا۔

ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوتے جا رہے تھے۔

رونا چاہا تو رونے کی سکت نہ رہی۔

نڈھال ہو کر صوفے پر پشت ٹکا دی۔

اور اپنے مرنے کا انتظار کرنے لگی۔

ممی ڈیڈی تو یہی سمجھیں گے کہ ان کی لاڈلی کا ہارٹ فیل ہو گیا۔

مگر انھیں کون بتائے گا کہ نازوں کی پالی فلکی روٹی کے ایک نوالے کو ترس کر مر گئی۔

یہ سوچتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس مرتبہ آنسو بھی بہت تکلیف سے آ
جیسے کہ ... غروں سے گزر کر آ رہے ہوں۔

دونوں آنکھیں کڑوی ہو گئیں۔ پپوٹے دکھنے لگے۔ کیا آنسوؤں کا خزانہ بھی ختم ہو گیا۔

اور اب آنکھوں سے جسم کا خون بہنے لگا۔

اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔

دو چار آنسو نکلے اور پھر رک گئے۔

بارہ۔ ایک.... دو....

....اور تین بج گئے۔

فاقہ کیے اسے پورے پچیس گھنٹے ہو چکے تھے۔ کل دو بجے اس نے کھانا کھایا تھا۔ پتہ نہیں
ی موت کس طرح واقع ہو۔ وہ سوچنے لگی۔ کم از کم وہ اٹھ کر بستر پر ہی لیٹ جائے۔

شاید نیند آجائے۔

مگر بستر پر لیٹنے کی ہمت بھی نہ ہو سکی۔

اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر کے وہ وہیں صوفے پر بیٹھی رہی۔

اس کا دل چاہا اٹھ کر ایک پرچہ ممی کے نام لکھ دے کہ کس عالم میں ان کی فلکی دنیا سے
ہی ہے۔ مگر اس کے پاس تو پین ہی نہیں تھا۔ نہ اسے پرس میں پین رکھنے کا شوق تھا۔ اس
پرس میں تو لپ سٹک اور آئی شیڈو ہوا کرتے تھے۔

اس کا دل چاہا اٹھ کر کمرے میں تلاش کرے۔ شاید کوئی پین یا پنسل مل جائے مگر اٹھنے کی
ت نہ ہوئی۔ اٹھ کر کھڑی ہوئی تو ایسا چکر آیا۔ تیورا کر بیٹھ گئی۔

اس کے بعد کچھ بھی اس کے اختیار میں نہ رہا۔

کمرے میں آہستہ آہستہ تاریکی اتر آئی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ شام ہو گئی ہے۔ افوہ... ابھی
ات ہو جائے گی۔ اس میں تو بتی جلانے کی ہمت بھی نہ تھی اور پھر رات کیونکر گزرے گی۔

ات کی آمد سے ہی اسے خوف آنے لگا۔

سارا جسم پھر ٹھنڈا ہو گیا۔

اپنی بے بسی پر چیخنے چلّانے کو دل چاہا مگر اب تو چلّانے کی طاقت بھی نہ تھی۔ شاید وہ بے
وش ہو چکی تھی یا خوف سے شل ہوئی پڑی تھی۔ جب ایک دم دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔

وہ اپنی جگہ سے بالکل نہیں ہلی۔ ہل ہی نہیں سکتی تھی۔ حتیٰ کہ وہ دروازہ کھلنے کی خوشی بھی نہ
نا سکی۔

اندھیرے میں کوئی اندر داخل ہوا اور اس نے داخل ہوتے ہی بتی جلا دی۔

کمرے میں روشنی ہو گئی۔

فلکی نے دیکھا۔ وہ آفاق تھا۔

نقاہت کے مارے وہ اٹھ نہ سکی۔ نہ اچھی طرح دیکھ سکی۔

آفاق کے ہاتھ میں چائے کی ایک گرم گرم پیالی تھی۔

اس نے پیالی اٹھا کے فلکی کے آگے رکھی اور پھر اس پر چائے کی پیالی رکھ دی۔
پیالی میں سے گرم گرم بھاپ نکل رہی تھی۔
فلکی کی جان نکل رہی تھی۔
دل نیچے ہی نیچے جا رہا تھا۔
اف کون جانتا تھا۔ کبھی یہ صورت حال بھی ہو گی۔
اس کو معلوم تھا۔ یہی چائے کی گرم گرم پیالی اس کو اس وقت بچا سکتی ہے۔
مگر اس کی غیرت کا تقاضا تھا کہ یہ پیالی اٹھا کے آفاق کے منہ پر دے مارے اس کو دھکے
کریساں سے نکال دے۔ اس کے گریبان کی دھجیاں بکھیر دے۔
آہ' وہ کیا کرے کیا نہ کرے۔
فلکی نے دکھ کے مارے آنکھیں بند کر لیں۔
آفاق چائے رکھ کر باہر چلا گیا۔
فلکی نے پھر آنکھیں کھولیں۔ تھوڑی دیر اس بھاپ کو دیکھتی رہی جو چائے میں سے نکل
تھی۔ تب اسے خیال آیا یہ غیر محسوس سا دھواں جو اوپر کو جا رہا ہے بالکل انسانی روح سے م
ہے جو وجود سے نکل کر اوپر کو دائرے بناتی چلی جاتی ہے۔ اسے ایک دم سے جھرجھری آ گئی۔
ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ آ گیا۔
اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ چائے ضرور پئے گی خواہ یہ بے غیرتی ہی کیوں نہ ہو۔
چائے پینے کے بعد اس میں زندگی کی حرارت دوڑ جائے گی اور تب وہ آفاق کے ساتھ ل
کے قابل ہو سکے گی۔
ہاں' بھلا خالی پیٹ بھی کوئی کسی سے لڑ سکتا ہے؟
وہ ذرا سا اونچا ہو کر بیٹھ گئی اور اس نے کمزور ہاتھوں سے پیالی اٹھائی۔
جلدی سے منہ کے ساتھ لگائی۔
ہونٹ جل گئے۔ زبان بھی جل گئی۔
مگر ذرا سی زندگی کی حرارت محسوس ہوئی۔
پھر رفتہ رفتہ اس نے ساری پیالی ختم کر لی۔ واہ پیٹ بھی عجیب شے ہے۔
کھانا کتنی بڑی حقیقت ہے۔
ایک چائے کی پیالی سے ہی جی اٹھی تھی۔

ورنہ وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ وہ مر چکی ہے۔
دس پندرہ منٹ یونہی بیٹھی رہی۔
خالی پیٹ کے لیے صرف ایک پیالی چائے کافی نہیں تھی۔
بلکہ بھوک بُری طرح چمک گئی تھی۔
کچھ اور کھانے کو دل چاہ رہا تھا۔
تھوڑی دیر بعد چاپ ہوئی اور پھر آفاق کمرے میں داخل ہوا۔
اب اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی۔ وہ اس نے تپائی پر رکھ دی۔
ایک پلیٹ میں نمکین بسکٹ تھے اور ایک پلیٹ میں تازہ پھل رکھے ہوئے تھے۔
وہ چلا گیا۔
فلکی نے بسکٹوں والی پلیٹ اٹھالی اور ایک ایک کر کے چبانے لگی۔ بہت اچھے لگ رہے
تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ساری پلیٹ خالی کر دی۔
اور اس کے بعد پھل کھانا شروع کر دیا۔
واقعی۔ ایک دن بھوکی رہ کر وہ ثقیل غذا نہیں کھا سکتی تھی۔ پہلے معدے کو ایسی ہلکی پھلکی
ہی کی ضرورت تھی۔
بظاہر پیٹ بھر گیا تھا اور جسم میں بھی توانائی آ گئی تھی۔ کھا لینے کے بعد تھوڑی دیر تو وہ
صوفے پر نیم دراز رہی۔ پھر اٹھ کر کھڑی ہوئی...
کمرے میں ٹہلنے لگی۔
اب وہ نارمل تھی۔
جونہی جسم میں زندگی کی لہر دوڑی۔ اس کے پرانے جذبے بھی جاگنے لگے۔
آفاق کے خلاف ساری نفرت ایک زہر کی صورت میں اکٹھی ہونے لگی۔
مگر اب دروازہ کھلا تھا۔ وہ باہر جا سکتی تھی۔
رات کے آٹھ بج رہے تھے۔
کافی دیر وہ بیٹھی سوچتی رہی۔ وہ کیا کرے؟
اس کا خیال تھا۔ آفاق خود اندر آئے گا۔ گو اس سے اپنے رویے پر معافی مانگنے کی امید تو نہ
تھی۔ پھر بھی دل جلانے کی کوئی بات تو کرے گا۔ گفتگو کا آغاز تو کرے گا۔
مگر وہ کیا کہے گی؟ کیا فیصلہ کرے گی۔ کاش وہ کوئی فیصلہ کر سکتی۔ اس آدمی کے سامنے تو اس

ی چلتی نہ تھی۔

لڑائی ہوگی...

تو تو میں میں ہوگی۔

تو تو میں میں کا کیا نتیجہ نکلا؟

پہلی مرتبہ زبان چلائی... اور مار کھائی...

زیادہ بک بک کرنے کا مطلب... ہوگا کہ مسلسل مار کھائی جائے..... کیوں.....؟

اس نے بتا دیا ہے کہ زبان چلانے والی عورت کا کیا انجام ہوتا ہے۔

نہ اس کے سامنے دھمکی کام کرتی ہے۔ نہ زبان کا وار چلتا ہے۔

نہ کوئی تدبیر کارگر ہوتی ہے۔

خداوندا! میں کیا کروں؟

میں ہار گئی ہوں۔

نہیں۔ ہارنے کا تو یہ مطلب ہوگا کہ مجھے اس آدمی کے اشاروں پر چلنا ہوگا اس کی پابند ہو کے رہنا ہوگا اور یہ' وہ ہرگز نہ ہونے دے گی۔

پھر کیا کیا جائے؟

جب تک ممی اور ڈیڈی کو ہم خیال نہ بنایا جائے۔ اس سے نجات نہیں مل سکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ اتنی مار کھانے کے بعد وہ اس سے ڈر گئی تھی۔ اس کے منہ نہیں لگنا چاہتی تھی۔ پورا ایک دن اور ایک رات اسے بھوکا پیاسا اندر بند کرکے آفاق نے اسے بتا دیا تھا کہ کس حد تک سختی اور تشدد کر سکتا ہے۔

اف خدایا' ایک ہفتے میں اتنے بڑے انقلاب آگئے تھے۔ اس کی کائنات بدل گئی تھی۔

اور اس کے علاوہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

ہاں وہ اسے مار بھی سکتا تھا۔ قتل بھی کر سکتا تھا؟

فلکی کو جھرجھری آگئی۔

اس نے گھڑی دیکھی' رات کے دس بج رہے تھے۔

کمرے کا دروازہ کھلا تھا مگر یوں محسوس ہو رہا تھا۔ باہر کوئی نہیں ہے۔

کیا وہ پھر چلا گیا...؟ لیکن دروازہ کیوں کھلا چھوڑ گیا۔

چھبیس گھنٹے ہوگئے تھے اسے کمرے میں بند ہوئے۔

اس لیے اس کا دل چاہ رہا تھا۔ باہر نکل جائے۔ سو اس نے اپنی گرم شال اٹھائی اور باہر نکل آئی مگر بہت آہستہ آہستہ قدم قدم چلتی ہوئی۔ وہ لاؤنج میں آگئی۔

وہاں اس کے قدم جم گئے۔

کمرہ خالی خالی لگ رہا تھا۔ غور کرنے پر اس نے دیکھا کہ یہاں جو ایک ٹی وی پڑا تھا' وہ نہیں ہے۔ ریڈیو' کیسٹ ریکارڈر... حتیٰ کہ ٹیلی فون بھی غائب تھا۔

یہ سب چیزیں کہاں گئیں۔ کیا کوئی چوری کرکے لے گیا ممکن ہے۔ رات کو جب آفاق اسے بند کرکے گیا تھا۔ کسی نوکر نے یا چور نے موقع پا کر سب چیزیں اڑالی ہوں۔

وہ چلتی ہوئی ذرا آگے گئی تو ٹھٹھک گئی۔ دوسرے بیڈ روم میں آفاق تھا۔ وہ پلنگ پر نیم دراز تھا۔ ٹیبل لیمپ جل رہا تھا اور وہ کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ اچھا تو یہ یہاں سوتا ہے۔ اس نے دیکھ کر دل میں کہا۔ وہاں سے وہ آگے نکل گئی اور کچن میں پہنچ گئی۔ یہ سب وہ غیرارادی طور پر کر رہی تھی مگر کچن میں پہنچ کر اسے احساس ہوا کہ اسے بھوک بہت لگی ہوئی ہے۔ کچن میں کوئی ملازم نہیں تھا۔ وہ ملازموں کی فوج جانے کہاں چلی گئی تھی۔ چولھے ٹھنڈے پڑے تھے۔ جیسے کسی نے انھیں چھوا تک نہ ہو تو ابھی چائے کس نے بنائی تھی۔ اس نے اردگرد چائے کے بکھرے ہوئے برتن دیکھ کر سوچا۔

فریج کھول کر دیکھا۔ سب بھرا ہوا تھا "ڈیپ فریزر" کھولا۔ اس میں گوشت' قیمہ' مرغیاں' مچھلی' سب قسم کا گوشت پڑا ہوا تھا... اور موسم کی سبزیاں بھی۔

یکایک اس کا دل چاہا۔ مرغ روسٹ ہو کر سامنے آجائے اور وہ جھٹ کھالے۔

نہ جانے کیا چکر ہے۔

وہ سر پکڑ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

کس سے پوچھے؟

ابھی وہ بیٹھی سوچ ہی رہی تھی کہ آفاق آتا ہوا دکھائی دیا۔ خوف کے مارے اس کا دل دھڑکنے لگا۔ نہ جانے اب کیا ہوگا؟

مگر وہ یوں چلتا ہوا آیا جیسے اس نے فلکی کو نہیں دیکھا۔ فریج کھول کر اس میں ڈبل روٹی نکالی۔ مکھن کی ٹکیاں نکالی۔ سروس کاؤنٹر پر کھڑے ہو کر اس نے دو ٹکڑوں کو مکھن لگایا۔ اس میں جام لگایا اور سینڈوچ بنا لیا۔ پھر فریج کھولا۔ ایک کیلا۔ ایک سیب اور ایک کینو نکال کر ایک پلیٹ میں رکھا اور اپنے کمرے میں لے گیا۔

تو فلکی بی بی' یہ ہے بھوک مٹانے کا طریقہ۔

اس کا مطلب ہے آفاق نے سب نوکروں کو خود چلتا کر دیا ہے۔ یہ اس کی ہیبت کا دوسرا رخ ہے۔ مجھے طرح طرح کی اذیتیں دینا چاہتا ہے۔

میرا بھی نام فلکی نہیں اگر کبھی کچھ پکا کے دوں۔

کافی دیر تک وہ سر پکڑ کر وہاں بیٹھی رہی۔ جب بھوک نے بہت تنگ کیا تو اس نے بھی اٹھ کر فریج کھولا۔ ڈبل روٹی نکالی۔ مکھن اور جام نکالا۔ دو سینڈوچ بنائے اور کھا لیے۔ اس کے بعد پھر فریج کھولا' اپنی پسند کا پھل نکالا۔ خوب جی بھر کر کھایا۔ پانی پیا۔ اب صحیح معنوں میں اسے ہوش آیا تھا اور وہ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوئی تھی۔

کھانا کھا کے ڈرائنگ روم میں نکل آئی۔ اِدھر اُدھر ٹہلتی رہی۔

نہ ریڈیو تھا سننے کو' نہ ٹی۔وی تھا دیکھنے کو۔

جب رات کے گیارہ بجے تو وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ آتے ہوئے اس نے راستہ میں اچٹتی سی نگاہ آفاق کے کمرے پر ڈالی۔ لیمپ جل رہا تھا۔ مگر وہ لحاف اوڑھے بے سُدھ سو رہا تھا اور سوتے میں کتنا معصوم لگ رہا تھا۔

اس کا دل جل گیا۔

کمرے میں آ کر اسے سمجھ نہ آئی کہ وہ کیا کرے؟

دروازہ کھلا تھا اور کتنی خوشی کی بات تھی کہ وہ قید نہ تھی اور اسے یہ بھی معلوم تھا۔ ساتھ والے کمرے میں آفاق سو رہا ہے۔ وہ گھر میں اکیلی نہیں ہے۔

کم از کم رات تو ٹھیک گزر جائے گی۔

سو کسی نہ کسی طور رات گزر ہی گئی۔

صبح چھ بجے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اٹھ کر ہاتھ منہ دھویا۔ پھر باہر نکل گئی۔

یہ دیکھ کر اسے حیرت ہوئی کہ آفاق مصلّے پر بیٹھا کلام پاک پڑھ رہا تھا۔ اس کا مطلب ہے اس نے نماز بھی پڑھی ہو گی۔

کتنی عجیب بات ہے۔ وہ دل میں بے حد حیران ہوئی۔ اتنا امیر اور فیشن ایبل آدمی نماز پڑھتا ہے۔

اور وہ بھی اس زمانے میں۔

حیران ہوتی ہوئی وہ کچن کی طرف نکل گئی۔

چائے کی طلب ہو رہی تھی اور ظاہر ہے۔ چائے تو خود بنانا تھی اور چائے پیے بغیر دن کی ابتدا نہیں ہو سکتی تھی۔

کچن میں گئی تو سمجھ نہ آئی۔ چولھا کیسے جلاتے ہیں۔ کئی تیلیاں پھونکنے کے بعد جب وہ چولھا جلا چکی تو یہ پتہ نہ چلتا تھا۔ کیتلی میں کتنا پانی ڈالنا چاہیے۔ یہ تو اس نے گھر میں دیکھا تھا کہ چائے کا پانی ہمیشہ کیتلی میں ڈال کے اُبالنے کو رکھتے ہیں مگر اور کچھ معلوم نہ تھا۔

بڑی مشکل سے اس نے برتن اکٹھے کیے۔ چائے کی پتی تلاش کی۔ فریج میں سے دودھ کی پتیلی نکالی۔ چینی ڈھونڈ کے رکھی۔ جب سب برتن ٹرالی پر رکھ دیے تو پھر چائے دانی میں پتی ڈال کے کھولتا ہوا پانی اس میں ڈال دیا۔ ٹی۔کوزی نہیں مل رہی تھی۔ پانی ڈالتے وقت اس کا ہاتھ جل گیا۔ جانے کتنی بار اس نے ہاتھ جلایا۔ تب کہیں جا کر اس نے چائے بنائی۔ ٹرالی گھسیٹ کر رہی تھی.... کہ آفاق ہاتھ میں اخبار پکڑے ہوئے اندر آیا اور بولا۔ "اگر آپ نے چائے بنا ہو تو مجھے بھی دے جائیں۔"

جب تک وہ مڑ کر دیکھتی۔ وہ جا چکا تھا۔

وہ کھڑی سوچتی رہی کہ اب کیا کرے۔

کیا کرے؟

اس طرح حکم دے گیا ہے جیسے میں اس کی خانہ دار ملازم ہوں۔

میں کیوں دوں چائے بنا کر' میری جاتی ہے جُوتی....

اس نے اپنے لیے چائے بنائی۔ پینے لگی تو خوف آ گیا۔ کم بخت کوئی اور چکر ہی نہ چلا دے۔ ے ہی آؤں۔

اپنی پیالی میز پر رکھ کے وہ ٹرالی گھسیٹتی ہوئی لے گئی اور اس کے کمرے میں رکھ آئی۔

آنے لگی تو وہ بولا۔

"تھینک یو۔"

وہ خاموشی سے باہر نکل آئی۔

پھر آ کر چائے پی اور باورچی خانے میں ہی بیٹھ گئی۔ اب بھوک مٹانا تھی کسی طرح؟

وہی رات والا طریقہ اختیار کیا۔ شکر ہے فریج میں ڈبل روٹی تھی۔ نکالی۔ سلائس بنائے۔ دل چاہا کہ آملیٹ بنایا جائے۔ مگر کیسے؟ کبھی بنایا جو نہیں تھا۔

بہرحال کوشش کرنی چاہیے۔ سنا تھا۔ انڈہ پھینٹتے ہیں۔ فرائی پین میں ڈالتے ہیں۔ انڈہ

پھینٹا' فرائی پین میں گھی ڈالا۔ سب کچھ کیا۔ مگر انڈے کی شکل نہ جانے کیسی بن گئی؟

وہ سوچنے لگی کہ گھر پر تو پھولا پھولا پلیٹ کی طرح کا انڈہ آتا تھا۔ وہ کیسے بناتا تھا۔

اب جو کچھ اس نے بنایا تھا۔ اسی کو کھانا تھا۔ جلدی جلدی کھانے لگی کہ آفاق دیکھ نہ لے

اف کتنی بدمزہ چیز تھی۔ کہیں سے پھیکا تھا۔ کہیں پر نمک ہی نمک تھا۔ کہیں سے کچا مزہ کہیں سے اچھا۔

جلدی سے سارا کھا گئی۔ شکر ہے۔ جب کھا چکی تو آفاق شیو کے لیے گرم پانی لینے کے۔ آگیا۔

کیتلی میں سے اس نے خود ہی پانی انڈیل لیا اور بولا۔

"اگر آپ ناشتہ بنانا جانتی ہیں تو میرے لیے بھی تکلیف کیجئے۔ میں فرائی انڈہ اور ٹوسٹ کھ ہوں۔"

فرائی انڈہ..... وہ کھڑی کھڑی سُن ہو گئی۔

اسے تو آج تک سمجھ ہی نہ آئی تھی کہ فرائی انڈے کی زردی سالم کیسے پڑی رہتی ہے گ وہی ہوا نا... چائے بنا کر دی تو وہ ناشتہ مانگنے آگیا۔

پھر تو یہ دوپہر کا کھانا بھی مانگے گا۔ پوری نوکری دینی پڑے گی۔

وہ خاموشی سے جا کر لاؤنج میں بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر بعد آفاق تیار ہو کر آیا۔ بہت اسمارٹ لگ رہا تھا اور خوشبو کی لپٹیں چھوڑ رہا تھا.....

اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

"ناشتہ نہیں بنایا آپ نے؟"

"نہیں۔" اس نے گردن ہلائی۔

"کیوں؟"

"مجھے بنانا نہیں آتا۔"

"آپ کو کیا آتا ہے؟"

"مجھے کچھ بھی نہیں آتا۔"

"شکر کیجئے آپ کی ساس یہاں نہیں ہیں ورنہ باورچی خانے کی حالت دیکھ کر آپ کی تو خیر کرا دیتیں۔"

"کاش کرا دیتیں۔"

اس نے اتنا آہستہ کہا... کہ آفاق نہ سن سکا۔

وہ خود ہی باورچی خانے میں چلا گیا۔ ایک سیب نکال کر کھایا اور ایک گلاس دودھ کا پی کر باہر نکل گیا۔

جب اس کی کار گیٹ سے باہر چلی گئی اور اسے تسلی ہو گئی کہ پلٹ کر نہیں آئے گا تو وہ مطمئن ہوئی باہر نکل آئی۔

گیٹ بند تھا۔

اس نے کھینچ کر دیکھا تو اس میں باہر کی طرف بہت بڑا تالا لگا ہوا تھا۔

اس کے بار بار کھینچنے سے چوکیدار قریب آگیا۔

چھوٹی سی درز میں سے دیکھ کر بولا۔

"بیگم صاحب! سلام۔ حکم بولو۔"

فلکی نے کہا۔ "تالا کھولو۔"

وہ بولا

"چابی تو صاحب ساتھ لے گیا ہے۔"

فلکی کا دل ایک دم بیٹھ گیا۔

آفاق سے ہر قسم کی کمینگی کی توقع کی جا سکتی ہے۔

"ڈرائیور کہاں ہے؟"

اس نے پھر پوچھا۔

"ڈرائیور بھی صاحب کے ساتھ گیا ہے۔"

"اور میری گاڑی کہاں ہے؟"

اس نے اپنی گاڑی کو گیراج میں نہ پا کے بڑے رعب سے پوچھا۔

"جی وہ بھی صاحب نے دفتر میں منگا لیا تھا۔"

"اچھا۔"

فلکی کو پھر طیش آنے لگا تھا۔

آخر میری گاڑی پر اس کا کیا حق بنتا ہے۔ گویا اسے باقاعدہ نظر بند کر کے رکھنے کا پروگرام تھا۔

نہ معلوم فون کہاں گیا تھا۔ وہ ممی کو فون کرنا چاہتی تھی۔

مگر کیا کرتی...؟ اس کا دل چاہ رہا تھا۔ دیوار پر چڑھ جائے اور دوسری طرف سڑک پر کود بھاگ جائے۔ ہاں ایسا ہو سکتا تھا۔ چوکیدار تھوڑی دیر شور مچائے گا۔ پیچھے بھاگے گا۔ پھر چپ کر جائے گا۔ گویوں فرار ہونا کوئی شریفانہ بات نہ تھی مگر کوشش تو کی جا سکتی تھی۔

اس نے ایک گملا اٹھایا۔ اس کو اوندھا کر کے دیوار کے قریب رکھا۔ اس پر احتیاط سے ایک پاؤں جمایا اور باہر جھانکا۔

"کیا بات ہے بیگم صاحب!"

پٹھان چوکیدار قریب آ گیا۔

"کسی چیز کا ضرورت ہے؟ بولو۔ حکم کرو۔"

"نہیں۔" وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

"میں یونہی دیکھ رہی تھی۔"

"صاحب نے بولا تھا..." وہ رک رک کر بولا۔

"اگر کوئی گیٹ پار کرے تو اس کو گولی مار دو۔"

اف اللہ۔ وہ نیچے اتر گئی۔ کمینہ کہیں کا... یہاں تک کہہ دیا۔ گویا اسے شک تھا کہ میں گیٹ پار کروں گی۔

وہ اتر کر اندر چلی گئی۔

گھر سارا بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ گھر میں مکیں نہ ہوں۔ باورچی خانے میں کھانا نہ پک رہا ہو تو یہ خانہ ویراں لگتا ہے۔

گھر کی رونقیں لوگوں سے، باتوں سے اور کھانوں کے دَم سے ہیں۔

جس گھر میں کھانا نہ پکتا ہو۔ وہ بھی کوئی گھر ہے۔ بارہ بجنے والے تھے۔ بھوک چمکنے لگی تھی۔ اس کا دل چاہا وہ جا کر کچھ پکائے۔

مگر اسے تو کچھ بھی پکانا نہیں آتا تھا۔ اگر کبھی وہ کچن میں جاتی تھی تو ممی ڈانٹ دیتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں۔ اتنے بے شمار نوکر ہیں۔ بھلا اسے کام کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کھانا وغیرہ پکانا تو متوسط درجے کی لڑکیوں کا کام ہے کہ اسی بل بوتے پر لوگ انھیں بیاہ کر لے جاتے ہیں۔

اس کو تو جہیز میں اتنا سامان اور نوکر ملنے والے ہیں کہ زندگی بھر کام کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

اب کہاں گئے وہ نوکر... آفاق نے کپڑے اور زیور کے علاوہ جہیز کی کوئی چیز نہیں اٹھانے ی۔ یہ بہانہ کردیا کہ اس کے گھر میں جگہ نہیں ہے۔ پھر نہ جانے اس نے ممی اور ڈیڈی پر تر پھونکا کہ انھوں نے پلٹ کر اس کی خبر نہ لی۔

کیا بجھ بیٹھے وہ۔

کس قدر اندھیر ہے۔

وہ باورچی خانے میں پہنچ گئی۔ وہاں ضرورت کی ہر شے موجود تھی مگر اسے کچھ معلوم نہیں مرغی کیسے پکاتے ہیں۔ گوشت کیسے گلاتے ہیں۔

پیاز اور لہسن کا مصرف کیا ہے۔ یہ تو اسے معلوم تھا کہ ہانڈی میں ڈالا جاتا ہے مگر کب اور ...؟

گھر میں کوئی کتاب ہی نہیں تھی جس سے وہ مدد لے سکتی۔

ادھر اُدھر گھوم کر، سوچ سوچ کر وہ تھک گئی۔ بالآخر اس نے یہی فیصلہ کرلیا کہ اسے کچھ بھی ں پکانا چاہیے۔ صبح والے انڈے جیسا حال ہوگا اور اگر اتفاق سے کوئی شے ٹھیک پک بھی گئی فاق اس سے امیدیں وابستہ کرلے گا پھر ہمیشہ اسے ہی پکا کر کھلانا پڑے گا۔

بجے کے قریب اسے زبردست بھوک لگ گئی۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ اب اس کے سوا ل چارہ نہیں تھا کہ وہ ڈبل روٹی اور جام کا سہارا لے۔ فریج کھول کر دیکھا تو ڈبل روٹی کے ل چار ٹکڑے باقی تھے۔ اگر چاروں کھالے تو پھر رات کو کیا کرے گی۔

اور جو آفاق نے بھی رات کو ڈبل روٹی کھانی ہوئی تو کیا کرے گی؟

بہت سوچ کر اس نے دو ٹکڑے نکالے۔ صبح کی طرح انھیں کھایا۔ اس کے بعد پیٹ بھر کے ں کھایا۔ یوں پیٹ کی آگ بجھائی۔

چار بجے تک پیٹ پھر خالی ہو چکا تھا۔

تب اس نے خود ہی چائے بنائی اور اوپر تلے تین چار پیالیاں پی گئی۔

نہ جانے یہ صورتِ حال کب تک رہے۔

شام اُتر آئی تھی۔ نہ گھر میں ریڈیو تھا۔ نہ ٹی۔وی...

اتنا سناٹا تھا...

.... اور اس کی عقل کام نہیں کر رہی تھی...

اف کیسے عجیب گھر تھے۔ ہمسائے تو یوں تھے جیسے رہتے نہ ہوں۔ ہر کوئی اپنے گھر میں بند،

اپنے حال میں مست۔

کسی کو کسی کی خبر نہ تھی۔ اتنا ہی جان لیتے۔ ساتھ والے گھر میں ایک نئی دلہن آئی ہے اور دلہن سخت مصیبت میں ہے۔

رات کے دس بجے جب وہ لاؤنج میں بیٹھی جمائیاں لے رہی تھی تو آفاق آگیا۔

وہ خاموش بیٹھی رہی۔

ذرا سا رک کر بولا۔

"آج آپ نے کچھ پکایا ہے؟"

وہ خاموش رہی۔

"کچھ نہیں پکایا؟"

وہ پھر خاموش رہی۔

"اس طرح کب تک چلے گا...؟"

"آپ کو معلوم ہے۔ یہ آپ کا گھر ہے اور اب اس گھر کو چلانا آپ کا کام ہے۔ آپ پ گی تو میں بھی کھالوں گا۔ زیادہ دن تک ضد سے کام نہیں چلے گا۔"

آفاق اپنے کمرے میں چلا گیا۔ بہت تھکا ہوا لگ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد کپڑے بدل کر واپس آگیا اور سیدھا باورچی خانے میں گیا۔

فلکی بیٹھی اسے دیکھتی رہی۔

اس نے فریج کھولا۔

غا اور پھر ایک پلیٹ میں پھل ڈال کے لیے آیا۔ آکر فلکی کے سامنے بیٹھ گیا۔

فلکی نے دیکھا۔ اس نے وہ سلائس نہیں کھائے تھے... کیوں... کیا اس کے لیے چھو تھے۔

اس نے سلیقے سے سیب کاٹا اور کھانے لگا۔

"آپ نے کچھ کھایا؟"

فلکی نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کھانا بھی نہیں پکایا تو سارا دن کیا کرتی رہیں؟"

فلکی نے کوئی جواب نہیں دیا اور نہ ضرورت سمجھی۔ جیسے جیسے اس کا ہاتھ اپنے رخ لگ گیا۔

وں کے نشان ابھی تک تھے۔

ام سے بولی۔

ہاں فون پڑا تھا۔ کہاں گیا؟"

والے اٹھا کر لے گئے۔" بڑے سکون سے بولا۔

ں...؟"

ں سے آپ کا کیا مطلب ہے؟ بس پیسے نہیں تھے تو بل ادا نہیں کیا۔"

پ اتنے امیر آدمی ہیں اور آپ کے پاس پیسے نہیں تھے؟"

پ سے کس نے کہہ دیا کہ میں امیر آدمی ہوں؟"

لگتے تو ہیں..."

بس دنیا داری کے لیے دکھاوا کر لیتے ہیں۔"

تو یہ مکان بھی آپ کا نہیں جس میں آپ رہتے ہیں۔"

نہیں۔"

ور کیا کیا آپ کا نہیں؟"

جو کچھ اب یہاں نظر نہیں آرہا، وہ میرا نہیں تھا۔"

وہ ریڈیو، ٹی۔وی، کیسٹ ریکارڈر وغیرہ سب کرائے کے تھے؟"

جی ہاں..."

تو یہ سب کرنے کی آپ کو کیا ضرورت تھی؟"

آپ کے والدین پر رعب ڈالنا مقصود تھا۔"

اور اب جب سارا بھرم کھل جائے گا تو کیا کہیں گے؟"

کہنا تو انھیں ہوگا۔"

وہ سراسیمہ ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگی۔

یہ فرنیچر، یہ قالین، یہ پردے... سب کچھ... کیا یہ سب بھی کرائے کا ہے؟"

جی ہاں..."

ت فراڈ قسم کے آدمی ہیں آپ..."

یہ تو فلکی کہہ گئی مگر پھر ڈر کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

وہ بیٹھا مسکراتا رہا۔ تو پھر اس کی جان میں جان آئی۔

"بندہ پرور! پسند تو آپ کی ہوں۔ آپ نے اپنی خوشی سے مجھے چُنا ہے۔ دوسرے لفظو مجھے پھنسایا ہے۔ ٹھیک ہے نا؟"

"مجھے کیا معلوم تھا... میں... میں.. کیا جانتی تھی.. مجھے..."

"بھئی دولت تو خود آپ کے پاس اتنی بے شمار ہے۔ پھر آپ کو دولتمند آدمی پھنسانے ضرورت پیش آئی؟"

"کیا... آپ... آپ کی نظر میری دولت پر ہے؟"

"ہو بھی سکتی ہے۔"

"تو پھر تو آپ واقعی..."

وہ خاموش ہو گئی۔

"کہئے محترمہ..."

وہ اٹھ کر اس کے قریب آ بیٹھا۔

"کچھ نہیں۔"

وہ ڈر گئی۔

آفاق قہقہہ لگا کر بولا۔

"کہئے جو بھی جی میں آتا ہے۔ کہئے۔"

"جب آپ امیر نہیں ہیں تو امیر بن کر کیوں دکھاتے ہیں؟"

"لوگ اتنے مادہ پرست ہو گئے ہیں اور اس قسم کے الٹے رواج نکلے ہیں کہ یہ سب کچھ پڑتا ہے۔ اب دیکھو نا' جس سے بھی ملیں' وہ یہی ظاہر کرتا ہے کہ وہ ہم سے زیادہ امیر ہے۔ ا بن کر دکھانا تو کوئی عیب نہیں۔ آج ہر کوئی امیر کی عزت کرتا ہے۔ گھر میں آسائش کی یہ چیزیں اگر کسی کے پاس نہ ہوں تو کوئی اسے پاس پھٹکنے کی اجازت بھی نہیں دیتا۔"

"آپ کا تو اتنا بڑا کاروبار ہے۔"

فلکی نے رکتے رکتے کہا۔

"ارے جانے دیں۔ آپ کہاں سمجھ سکیں گی۔ کس کا کاروبار ہے اور کون کرتا ہے؟"

"میں اپنی ممی کو فون کرنا چاہتی ہوں۔"

فلکی گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بس اتنی جلدی گھبرا گئیں۔"

"پلیز۔ مجھے بتائیں۔ میں کیسے فون کروں؟"

"ہاں۔ اب ٹھیک طرح پوچھا ہے آپ نے۔ مجھے پیغام دے دیں میں صبح دفتر سے فون دوں گا۔"

"نہیں' مجھے ابھی بات کرنی ہے' مراد ممی کے لیے بہت اداس ہو رہا ہے۔"

"مگر جب آپ کی ممی الجیریا چلی جائیں گی تو کیا کیجئے گا؟"

"کیا... کیا ممی جا رہی ہیں؟ آپ سے کس نے کہا؟"

"ہاں مجھے تو آپ کو بتانا یاد ہی نہیں رہا۔ کل ہی تو ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ انھوں نے بتایا کہ آپ کے ڈیڈی ایک ضروری کام سے الجیریا جا رہے ہیں۔"

"مگر ممی کچھ دن وہاں رک کر امریکہ چلی جائیں گی۔"

"سچ سچ..."

"میں جھوٹ کیوں بولنے لگا۔"

"پھر ممی نے مجھے اِطلاع کیوں نہیں دی۔"

"مجھے جو دے دی۔"

فلکی بے چینی سے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگی۔ اس کا مطلب ہے اس کا معاملہ یونہی انکار ہے گا۔

"کب جا رہی ہیں وہ؟"

"پرسوں۔"

"پرسوں... اور آپ نے مجھے آج بتایا ہے۔"

"انہوں نے تو مجھے شادی کے فوراً" بعد بتا دیا تھا۔ اب اگر انھوں نے آپ کو اس قابل میں سمجھا تو غصہ مجھ پر کیوں اُتار رہی ہیں۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہی۔

ممی سیدھی انگلی سے نہیں نکلے گا اور ممکن ہے ٹیڑھی انگلی سے بھی نہ نکلے۔ یہ ستم گر کوئی اور ستم توڑے۔

ممی سے ملنا بہت ضروری ہو گیا تھا۔ ڈیڈی بھی ساتھ جا رہے تھے جانے کب تک کے لیے۔

پھر وہ آہستہ سے آفاق کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور نہایت انکساری سے بولی "پلیز مجھے ممی سے ملنے کی اجازت دیں۔ ان کے جانے سے پہلے میں انھیں ملنا چاہتی ہوں۔"

"میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ اگر ممکن ہوا تو ہم آئیں گے ورنہ نہیں۔"

"کیوں؟"

"کیوں... یہ آپ مجھ سے پوچھ رہی ہیں؟ ہمہ وقت آپ یہ سوچتی رہتی ہیں کہ مو
اس گھر سے فرار ہو جائیں۔ ممی ملیں تو ان کو ایک کی دس لگائیں۔ ڈیڈی ملیں تو ان
مظالم کے قصے سنا سنا کر ان کے رونگٹے کھڑے کردیں۔ آپ کی جھوٹی سچی باتیں سن کر
سوال کریں گے جن کے جواب دینے کا میرے پاس وقت نہیں ہوگا۔ میں کیوں اپنے
ایک نئی مصیبت میں گرفتار کروں۔"

تو کیا شادی کے بعد لڑکی کا والدین کو ملنا معیوب ہوتا ہے؟"

"بعض حالتوں میں معیوب ہوتا ہے۔"

"اپنے ماں باپ سے ملنے کا ہر لڑکی کو حق ہونا چاہیے۔"

"شادی کے بعد والدین کا درجہ شوہر سے زیادہ کا نہیں۔"

"آپ خود سوچیں۔"

فلکی رونے لگی۔

"آپ نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟"

"آپ خود سوچیں کہ آپ کے ساتھ ایسا کیوں ہوا ہے؟"

"میں کچھ نہیں جانتی۔" وہ روتے ہوئے بولی۔

"خدا کے واسطے مجھے ممی کے پاس جانے دیں۔"

"شادی مذاق نہیں ہوتی فلک ناز۔" یہ کہہ کر آفاق اٹھ گیا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔
تھوڑی دیر تک فلکی بیٹھی روتی رہی۔ پھر اپنے کمرے میں چلی گئی۔
نجات کا کوئی راستہ نہ تھا۔

وہ بیٹھی سوچتی رہی۔ اس نے کئی ترکیبیں نکالیں مگر جانتی تھی کہ آفاق کے آگے ایک
چلے گی۔

جب رات کے گیارہ بجے تو اس نے سوچا' جو کام منت سے نکل سکتا ہو' اس کے لیے
کرنے سے کیا شرمانا۔

ممی سے ایک بار ملنا اشد ضروری تھا اور اس کے لیے اسے آفاق کی ہر شرط منظور
ایک ملاقات کا موقع مل جائے تو وہ سب کہہ دے گی۔

ایسا نہ ہو آفاق سو جائے۔ یہ سوچ کر وہ اٹھی اور آفاق کے کمرے کی طرح چل پڑی۔

وہ لحاف کو اردگرد لپیٹے مگن ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔
خود بخود اس کے کمرے میں جانا کتنا برا لگتا تھا۔ وہ کس قدر خوددار اور ضدی لڑکی تھی۔ ایسا
ں نہ کرنا چاہتی تھی۔ پر کہتے ہیں نا کہ وقت پر تو گدھے کو بھی باپ بنا لینا چاہیے۔ سو وہ
تہ آہستہ چلتی ہوئی۔ خود اپنی دھڑکنوں سے بچتی ہوئی' اپنے ارادے پر شرماتی ہوئی' بدقت
م اس کے دروازے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

جب بہت دیر تک اس نے چوںک کر نہیں دیکھا تو فلکی کا دل چاہا کہ اب بھی لوٹ جائے۔
ہں چلی جائے۔ اپنے آپ کو یوں نظروں سے گرانے کا فائدہ؟ لیکن پھر اس نے قدم جما لیے۔
سوچ کر کہ اگر ایک بار چلی گئی تو وہ پھر دوبارہ یہ جرأت نہ کرسکے گی۔ اگر آ گئی ہے تو اپنی
ای کے کان بند کرکے اس مرحلے سے بھی گزر جانا چاہیے۔

اس نے گلا صاف کیا اور بہت زور لگا کر بولی۔

"میں آجاؤں..."

شاید آفاق نے سنا نہیں یا شاید جان بوجھ کر بن رہا تھا یا پھر اس سے اونچا بولا ہی نہ گیا۔
بہرحال تھوڑی دیر انتظار کرکے اس نے دوبارہ ہمت کی۔

"میں آجاؤں..."

اب کے آفاق چونکا۔ اس نے لحاف پرے پھینک دیا اور اٹھ بیٹھا۔
پہلے حیرت سے اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔

"فرمایئے... کیا بات ہے؟"

وہ چلتی ہوئی اندر گئی اور جلدی سے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ بیٹھ نہ جاتی تو شاید گر جاتی۔

"میں نے آپ کی آواز پہلے بھی سنی تھی مگر یہ سوچ کر بیٹھا رہا کہ میرے کان بج رہے ہیں۔
"کیا مسئلہ درپیش ہے۔ فرمایئے؟"

فلکی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"میں ممی سے ملنا چاہتی ہوں اور اس کے لیے مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے۔"

"مثلاً..."

"جو بھی آپ کہیں اور جیسا آپ کہیں گے میں کروں گی۔"

"تو بیگم فلک ناز' میں آپ سے ایک ہی بات کہوں گا۔ میاں بیوی کو اپنے جھگڑے بالا بالا
نمٹانے چاہئیں۔ کبھی ماں باپ کو ملوث نہیں کرنا چاہیے۔"

"شادی ایک بہت بڑا گورکھ دھندا ہے۔ یہ کوئی فلم کی کہانی نہیں ہے کہ ایک نئے انجام سامنے آجاتا ہے۔ اگر آپ اپنے گھر کی باتیں اپنی ممی کو بتائیں گی تو آپ کبھی ا مل سکیں گی۔"

فلکی کے آنسو پھر بہنے لگے۔

"کچھ نہیں بتاؤں گی۔ کچھ بھی نہیں بتاؤں گی۔"

"وہ سمجھتی ہیں کہ ہم دونوں بہت خوش ہیں۔ ان کو اس خوش فہمی میں زندہ رہنے دوسرے یہ کہ آپ اس گھر کو گھر بنائیں گی۔ اس میں دل لگائیں گی۔ کھانا پکائیں گی اور کریں گی جو ایک اچھی خاتون کو زیب دیتا ہے۔"

"کروں گی۔ سب کروں گی۔" روتے روتے فلکی نے کہا۔

"اگر آپ کا وعدہ سچا ہے تو پھر میں آپ کو ممی سے ضرور ملواؤں گا مگر پرسوں ایرپو جب وہ جارہی ہوں گی۔"

"پرسوں..." وہ چیخ کر بولی۔

"کل کیوں نہیں۔"

"کل آپ ان سے نہیں مل سکتیں۔" اس نے بڑے غصّے سے کہا۔

"پرسوں صبح نو بجے میں آپ کو ایرپورٹ پر لے چلوں گا اور آپ اپنا وعدہ یاد رکھیں گی روتی ہوئی فلکی اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔

اس کو معلوم تھا اس کے آگے اس کی ایک نہ چلے گی۔

تو اب رونا کیسا...؟

جس دن ممی نے جانا تھا۔ اس نے صبح ہی صبح اٹھ کر ناشتہ بنا لیا اور بہت اچھی طرح ہوئی۔ بالکل اس طرح جس طرح نئی دلہنیں تیار ہوتی ہیں۔

پھر اسے تو آفاق کو خوش کرنا بھی مقصود تھا۔

دل میں اسے امید تھی۔ کوئی نہ کوئی موقع ضرور مل جائے گا درد دل کہنے کا۔

جب وہ دونوں ایرپورٹ پر پہنچے تو ممی ڈیڈی وہاں موجود تھے۔ ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا ان اندر جانے میں۔

ممی نے حسبِ معمول اس کی پیشانی چومی۔ ممی کے ہونٹوں کا لمس پاکر وہ رونے لگی۔ مشکل سے روکے ہوئے آنسو خود بخود پلکوں کے دریچے توڑ کر باہر نکل رہے تھے۔ وہ ا

روکنے کی کوشش کرتی۔ اسے آفاق سے ڈر آتا۔ وہ اپنا وعدہ توڑ رہی تھی مگر کیا کرتی۔ آنسو اس کے اختیار میں نہیں تھے۔

ممی حسبِ معمول آفاق کے ساتھ ہنسی مذاق کررہی تھیں اور آفاق حسبِ معمول انھیں بردبار جواب دے رہا تھا۔

"کیوں روتی ہے چاند۔" ممی نے اسے سینے سے لگا کر کہا۔

"ممی آپ اتنی دور جارہی ہیں اور فلکی آپ کی اکلوتی بیٹی ہے اسی لیے بیچاری آزردہ ہورہی ہے۔"

"ارے میں تو ہر سال جاتی ہوں اور زیادہ تر فلکی کو چھوڑ کر جاتی ہوں۔"

"مگر اب اور بات ہے نا؟"

"اب فلکی پرائی ہوگئی ہے۔ اب ماں کی زیادہ قدر آئی ہے۔" آفاق نے ہنس کر کہا۔

"نہیں تو۔" ممی ہنسی۔ "میری فلکی تو اپنے گھر کی ہوگئی ہے۔ ہر لڑکی اپنے گھر جاتی ہے۔ اب فلکی کا سب سے بڑا ناطہ تو تمہارے ساتھ ہے بیٹا۔"

یہ سنتے ہی فلکی کے آنسو تیزی سے بہنے لگے۔ ممی ایسی کبھی بھی نہ تھیں۔ یہ سب آفاق کا کیا ہوا چکر ہے۔ ورنہ اپنی انتہائی محبت میں وہ ہمیشہ یہی کہا کرتی تھیں۔ میں فلکی کو جانے نہ دوں گی۔ اس کے شوہر کو گھر جوائی رکھوں گی۔

"ممی اس کو پیار سے تسلی دیں نا؟"

آفاق نے پھر کہا۔

"آخر تو بچی ہے نا؟"

ممی نے فلکی کو پھر سینے سے لگا لیا۔ ڈیڈی بھی قریب آگئے۔

"گھبراتی کیوں ہو۔ ہم صرف چھ ماہ کے لیے جارہے ہیں۔"

"چھ ماہ..." فلکی کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ چھ ماہ میں نہ جانے اس پر کیا بیت جائے گی۔

"خط لکھو گی نا؟"

فلکی نے روتے ہوئے صرف اثبات میں سر ہلایا۔

"اور تم بھی لکھنا آنی۔" ممی نے آفاق کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ضرور ممی... میں تو آپ سے فون پر بات کیا کروں گا اور فلکی کی بھی بات کراتا رہوں گا۔ بس جاتے ہی اپنا فون نمبر اور پتہ ضرور لکھئے گا۔"

"ضرور ڈارلنگ..."

ابھی تک فلکی' ممی کے بازوؤں سے لپٹی ہوئی تھی۔ اس بچی کی مانند' جو پہلے پہل سکول شروع کرتی ہے تو استانیوں کے ڈر سے ماں کے بازوؤں سے لپٹ جاتی ہے کہ اسے سکول سے بچالیا جائے۔

ڈیڈی مسکراتے ہوئے قریب آگئے۔ فلکی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

آج فلکی کا دل چاہ رہا تھا۔ ڈیڈی کے سینے سے لگ جائے اور دھاڑیں مار مار کے رو۔ وہی ڈیڈی جنہیں وہ بس ایسے ہی سمجھتی تھی۔ ان سے دور رہتی تھی۔ انہیں پیسہ بنانے کی مشین کہتی تھی۔ ممی کا کھلونا کہتی تھی۔ آج وہی ڈیڈی بہت بڑے اور عظیم دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے سینے سے لگ کے ان کی شفیق خوشبو سونگھنے کو دل چاہ رہا تھا۔ شاید اس طرح لپٹنے سے اپنی بیٹی کے دل کا درد جان سکتے۔

مگر ڈیڈی تو سادگی سے یوں مسکراتے چلے جارہے تھے جیسے فلکی معصوم اور نادان بچی ہو انھوں نے کھیلنے کے لیے اسے ڈھیر سارے خوب صورت کھلونے لے دیے ہوں۔

آفاق برابر میں کھڑا تھا۔ سب گپیں لگا رہے تھے۔ وقت اُڑا چلا جارہا تھا۔ وہ جو کہنا چاہتی تھی۔ جو کہنے آئی تھی نہ کہہ سکتی تھی۔ پورے چھ ماہ تھے۔

اور وعدہ خلافی کی جانے کیا سزا تھی؟ چھ ماہ اسے آفاق کے ساتھ رہنا تھا۔ اس کے رحم و کرم پر بغیر کسی سہارے کے۔

جب مائیکرو فون میں بیرونِ ملک جانے والے مسافروں کو بُلایا گیا تو ممی آخری بار لپٹ گئیں۔

وہ جی بھر کے روئی۔ بالکل ایسے جیسے آج اس کی رخصتی ہورہی ہو۔

ممی نے اس کے آنسوؤں کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

"چاند تمہارے لیے کیا لاؤں؟"

وہ چپ رہی تو مسکرا کر بولیں۔

"مجھے معلوم ہے تم امریکہ سے ہمیشہ چاکلیٹ منگوایا کرتی ہو۔ ڈھیر ساری لاؤں گی۔"

"میرے لیے بھی ممی۔" آفاق آگے ہو کر بولا "مجھے بھی بہت پسند ہے۔"

"آفاق میں امریکہ میں تمہاری امی سے ملوں گی۔"

"بلکہ وہیں رہیے گا۔ میں نے امی جان کو لکھ دیا ہے۔"

"اچھا' تو پھر ٹھیک ہے۔"

آفاق نے بڑھ کر ممی کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ ڈیڈی سے ہاتھ ملایا۔ ایک ہاتھ سے فلکی کا ہاتھ پکڑا' دوسرے سے ممی کا بازو اور انھیں آخری حد تک چھوڑنے گیا۔ مڑ مڑ کر خدا حافظ کہتے کہتے ممی اندر لاؤنج میں غائب ہوگئیں۔

فلکی اور آفاق باہر نکل آئے۔ کافی رش تھا۔ فلکی نے خود پر قابو پالیا تھا۔ وہ جنگلے کے ادھر کھڑی ہو کر ممی کے جہاز کو جاتا ہوا دیکھنا چاہتی تھی مگر آج اس نے کوئی ضد نہیں کی تھی۔ پہلی بار اسے احساس ہوا۔ بازی جیتنے کے لیے اس کے ہاتھ میں کوئی بھی پتا نہیں۔

آفاق نے دروازہ کھولا اور وہ اس میں بیٹھ گئی۔

جب اس نے کار موڑ کر رخ شہر کی طرف کیا تو فلکی نے ایئرپورٹ پر ایک حسرت آمیز نظر ڈالی۔

اسے یوں محسوس ہوا جیسے آج وہ بھری دنیا میں بالکل تنہا ہوگئی ہے۔ اس کا کوئی پُرسانِ حال نہیں۔ کوئی دوست نہیں۔ کوئی غمگسار نہیں۔

لق ودق میدان میں وہ اکیلی کھڑی ہے اور اوپر سوا نیزے پر سورج چمک رہا ہے۔

اور اس کی جان گھلتی جارہی ہے۔ بغیر آواز کے اس کے آنسو نکلنے شروع ہوگئے۔

اس کے حلق میں کچھ اس قسم کی چیخیں دم توڑ رہی تھیں۔

ممی لَوٹ آؤ۔

ڈیڈی خدا کے لیے واپس آجاؤ۔

ممی مجھے بھی ساتھ لے جائیں۔

ممی ڈیڈی خدا کے واسطے واپس آجاؤ۔

واپس آجاؤ اور مجھے اپنی گود میں چھپالو۔ مجھ سے دنیا کے تلخ حقائق کا سامنا نہیں ہوتا۔

میں مٹی کی وہ گڑیا ہوں جس پر خوب صورت رنگ و روغن کردیا گیا ہے۔

میں ریزہ ریزہ ہورہی ہوں۔ میں ٹوٹ جاؤں گی۔ میں گھل جاؤں گی۔

میری ماں' مجھے بچالو۔ میری ماں' میرے باپ۔ تم دونوں آکر مجھے بچالو۔ مجھے سینے سے لگا

فلکی کی شادی کو ایک مہینہ ہو گیا تھا۔

کہنے کو ایک مہینہ کوئی بات ہی نہیں مگر یہ تو فلکی ہی جانتی تھی کہ یہ ایک مہینہ ایک صد
کر گزرا تھا۔

زندگی کا چلتا پانی ٹھہر جائے تو وقت ایک بھاری چٹان بن جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے یہ چٹان
نہ ہلے گی۔ یوں ہی سینے پر چڑھی آئے گی۔

سردیوں کے اداس اور مختصر دن اور بوجھل شامیں۔

زلفِ محبوب سے دراز لمبی کالی کالی راتیں۔

بے حس اور ٹھنڈی راتیں جو سُماگن بن جاتیں تو چاند تارے مقدر بن جاتے۔ پھر
وقت کا احساس ہوتا....؟

مگر آہ!

وہ خوب صورت دن اور رات جنھیں وصل کی لوریاں سن کر مدہوش ہونا تھا جیل خانے
شب و روز بن گئے تھے۔

وہ ہلکی ہلکی سرگوشیاں جو ہر رات سپنوں کے شبستانوں میں چراغاں کرنے والی تھیں۔
صورت لبوں پر دَم توڑ رہی تھیں۔

اور وہ باتیں۔

بے شمار باتیں جو عاشق و محبوب تخلیے میں ایک دوسرے سے کرتے ہیں۔

نفرت کی چنگار بن کر نکل رہی تھیں۔

فلکی دن رات انگاروں پر جل رہی تھی۔

دیدہ زیب اور بیش قیمت ملبوسات صندوقوں میں پڑے پڑے ٹھنڈے ہو گئے تھے۔ زیور
الگ بے حسی کی شکایت کر رہے تھے۔

سنگھار کا سامان سنگھار میز کی زینت بن چکا تھا۔

لب صورت چہرہ مُرجھا گیا تھا۔

آنکھیں رو رو کر ویران ہو چکی تھیں۔

دل پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا اور دماغ سوچ سوچ کر مفلوج ہو چکا تھا۔

یہ سب کیوں ہوا؟

اور اب کیا کیا جائے؟

گھر کے ماحول میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

فاق علی الصبح ناشتہ کر کے دفتر چلا جاتا۔ دوپہر کا کھانا وہیں دفتر میں کھا لیتا اور رات کو کچھ
انے کے لیے لے آتا۔

فلکی اس کے ساتھ برائے نام سی بات کرتی تھی۔ وہ بھی پرواہ نہیں کرتا تھا۔ رات کو گھر آ کر
وہ تر پڑھتا رہتا جیسے گھر میں دلچسپی کا اور کوئی سامان نہ تھا۔

اور واقعی کیا تھا یہاں...

نہ ریڈیو' نہ ٹی۔ وی' نہ ٹیلیفون....

نہ کوئی گھنٹی بجتی۔ نہ کوئی گھر میں آتا۔

فلکی کو یوں محسوس ہوتا۔ جیسے وہ سناٹوں کے شہر میں آ گئی ہو۔

سناٹوں سے وہ ہمیشہ خوف زدہ رہتی تھی اور اب تو اس کی زبان کو بھی زنگ لگ گیا تھا۔

اس قدر چرب زبان تھی وہ کہ ایک منٹ کو بھی کبھی چپ نہ ہوتی تھی۔ سکول میں۔ کالج
اور پھر گھر میں۔

حتیٰ کہ وہ تو دفتر میں بھی مسلسل بولتی رہتی تھی۔

مگر اب اپنی آواز بھی اسے اجنبی معلوم ہوتی۔

جب دل بہت گھبرا جاتا تو رونے لگتی۔ تھک جاتی تو چپ ہو جاتی۔ اس اتنے بڑے گھر میں
ایک روح کی طرح منڈلاتی پھر رہی تھی۔

بار بار اس کی نگاہیں بند گیٹ سے جا ٹکراتیں۔

یہ گیٹ تھا یا جادو کے قلعے کا دروازہ۔ اس طرف سے کوئی دستک نہیں ہوتی تھی۔

شاید اس کے دوست احباب سب اسے بھول گئے۔ کوئی بھی نہیں آتا تھا۔ نہ اس کی خیر لیتا
تھا۔

ممی' ڈیڈی نے شہر کیا چھوڑا تھا۔ یوں لگتا تھا۔ شہر میں اس کا کوئی نہیں رہا تھا۔
شہر کیا' اس کے لیے تو پوری دنیا ہی ویران ہو گئی تھی۔
نہ جانے کس جرم کی یہ سزا تھی۔
کم از کم جیل خانوں میں مجرموں کو اپنے جرم کا تو پتہ ہوتا ہے۔ انھیں اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع دیا جاتا ہے اور پھر سزا بھی سنائی جاتی ہے۔
یہاں تو ہر بات ہی نرالی تھی۔ نہ کوئی جرم بتاتا تھا نہ صفائی کا موقع دیتا تھا البتہ سزا برابر دی جا رہی تھی۔
اور یہ سزا کب ختم ہو گی' اسے کچھ پتہ نہ تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے اسے کالے پانی بھیج دیا گیا ہے یا وہ عمر قید کی سزا کاٹ رہی ہے۔
اف خدایا۔
اس کا دل ڈوبنے لگتا۔ اگر یہ عمر قید ہے تو عمر کس طرح بیتے گی۔
کبھی کبھی وہ خودکشی کے بارے میں سوچنے لگتی۔
مگر مرنے سے اسے بہت ڈر لگتا تھا۔ زندگی اتنی قیمتی شے ہے اور بار بار نہیں ملتی۔ دنیا کون بار بار آتا ہے۔ کیوں نہ اس زندگی سے فائدہ اٹھایا جائے' خوش رہا جائے' عیش و نشاط جھولے جائیں۔ وہ تو ہمیشہ یہی کہتی تھی۔
اس طرح نامراد و ناشاد اس کا مرنے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا۔
بہرحال اس نے دل میں تو سوچ رکھا تھا کہ آخری راستہ فرار کا ہی ہو گا جب کچھ نہ بن پڑے گا اور جفا شعار کے ستم وافر ہو جائیں گے تو وہ خودکشی کر لے گی۔
کس طرح...؟
بڑی سنجیدگی سے سوچا کرتی کہ.....
بجلی کے ننگے تار کو چھو لے گی۔ نہیں نہیں.... وہ کانپ جاتی۔ کرنٹ لگوانا کہاں کی شرا ہے۔ بجلی سے تو اسے ویسے بھی خوف آتا تھا۔ اگر چمٹ گئی اور کوئی چھڑانے والا بھی نہ ہوا پتہ نہیں رات تک اس کا کیا حشر ہو جائے۔
پھر وہ سوچتی کہ مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا لے۔ کیونکہ اس قسم کی وارداتیں اس نے رکھی تھیں۔
مگر خوف سے اسے جھرجھری آجاتی۔ بہت دل گردے کی ضرورت ہے آگ لگانے

لیے۔ فرض کرو وہ لگا بھی لے تو بعد میں کیا حشر ہو گا اس کا۔ خوب صورت چہرہ جھلس کر کتنا مکروہ ہو جائے گا کہ لوگ دیکھنا بھی گوارا نہیں کریں گے۔
توبہ توبہ....
اس کا ارادہ بدل جاتا۔
تو پھر آسان اور آرام دہ طریقہ کون سا ہو گا۔
کوئی گولی کھائی جائے۔
دوائیاں تو اس گھر میں نظر ہی نہ آتی تھیں۔ آئے دن یہ فلم ایکٹر ملیس وغیرہ نیند کی گولیاں کھاتی تھیں۔ ہسپتال بھی پہنچا دی جاتی تھیں اور بچ بھی جاتی تھیں۔ کوئی ایسا ہی بندوبست اسے کرنا تھا۔
اصل میں وہ آفاق کو دھمکانا چاہتی تھی کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ سچ مچ مرنے کو اس کا دل نہیں چاہتا تھا۔ ڈراوے کی خاطر تھوڑی دیر کے لیے مرنا چاہتی تھی۔ شاید اس طرح آفاق کا دل پسیج جاتا۔
اور کوئی طریقہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔
بہرحال خودکشی تو اس نے اپنے پروگرام میں آخری شق کے طور پر رکھ چھوڑی تھی۔
اتنے دن ہو گئے تھے اور ممی کا خط بھی نہیں آیا تھا۔
اس نے پیٹ بھر کے کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔
آفاق نے تو اس سے کہہ دیا تھا کہ سب کچھ فرج میں پڑا ہے۔ وہ پکا لیا کرے اور کھا لیا کرے۔
سلائس کھا کھا کے جب وہ تنگ آگئی تو اس نے سوچا کچھ پکا ہی لینا چاہیے۔ آخر اس پکانے والے قصے کو جان جوکھم کیوں بنا رکھا ہے۔ ہزار بار گھر کا پکا ہوا سالن کھایا تھا۔ کئی بار پکتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ اچھی طرح پتہ تھا کہ سالن میں نمک' مرچ' پیاز' لہسن اور گھی ڈالا جاتا ہے۔
اگر وہ کوشش کرے تو پکا سکتی ہے۔
پہلے دن اس نے مرغی پکانے کی کوشش کی۔
ہانڈی کو چولھے پر رکھ کے اس میں کٹی ہوئی مرغی ڈال دی۔ جب تک وہ اس میں مصالحے ڈالتی' اس سے جلنے کی بُو آنے لگی' جھٹ دیگچی اُتار لی۔ پھر یاد آیا پہلے دیگچی میں گھی ڈالنا

چاہیے تھا۔ سو اس نے گھی ڈال دیا۔ سارے مصالحے ڈال دیے۔ ثابت لہسن اور مو
پیاز ڈال دیا۔ خوب چمچ ہلاتی رہی۔ گھی نے شور مچانا شروع کردیا۔ اس کے بعد اس کی سمج
نہ آیا کہ کیا کرے۔

بہت سوچ سمجھ کر اس نے دیگچی میں پانی ڈال دیا بلکہ دیگچی پانی سے بھردی۔ پھر انتظا
بیٹھ گئی۔

کئی گھنٹے گزر گئے اور پانی سوکھنے میں نہیں آتا تھا۔ آنچ تیز کرکر کے ہار گئی۔

پانی بھی اپنی مرضی سے سوکھا۔

جب وہ پانی میں دیکھنے کے قابل ہوئی تو عجیب چیزیں نظر آئیں۔

گوشت کا حلوہ بن گیا تھا اور ہڈیاں جا بجا نظر آرہی تھیں۔ ان ہڈیوں کے درمیان ثا
لہسن اور موٹا پیاز اس طرح پڑے تھے کہ جیسے جادو گر بڑھیا کے بڑے بڑے دانت ہوتے ہیں
پھر بھی وہ چکھنے کی ہمت کر بیٹھی۔ کیا پتہ اسی کو سالن کہتے ہوں۔ مگر چکھنے کے بعد کھا
ہمت نہ کرسکی۔ اس کے اور کئی نام ہوسکتے ہیں مگر اسے سالن ہرگز نہیں کہتے۔

پھر ایک دن اس نے گوشت کے ساتھ طبع آزمائی کرنے کی جسارت کی۔ اس دن بھی
ہوا۔

اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ جب وہ سارے مصالحے ڈالتی ہے تو سالن کیوں
نہیں ہوتا۔ گھر میں سب مصالحے پڑے تھے۔ ایک ایک کا ڈھکن اُٹھا کر اس نے دیکھا تھا۔

کئی چیزوں کے نام تو اسے یاد بھی نہیں آتے تھے۔

آٹے والے کنستر کا ڈھکن اُٹھا کر دیکھا۔ آٹا گوندھنے کی کوشش کی تو وہ لئی کی شکل اختی
کرگیا۔

تب وہ سوچنے لگی' جو لوگ کھانا اور روٹی پکا لیتے ہیں واقعی بہت ذہین لوگ ہوتے ہیں۔ فا
انھیں معمولی اور گھٹیا لوگ سمجھا کرتی تھی۔ کھانا کھانا اگرچہ بڑا اچھا فعل ہے مگر پکانا اسے
گھٹیا لگا کرتا تھا اور وہ سوچتی تھی یہ خانساماں لوگ اور یہ ماما لوگ بس اسی گھٹیا کام کے لیے چ
کیے گئے ہیں۔

وہ سمجھتی تھی ایک طبقہ صرف کام کرنے اور پکانے کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور دوسرا کھانے
اور عیش کرنے کے لیے۔

لیکن اب اسے پتہ چل رہا تھا کہ ایسا ممکن نہیں۔ ہر شخص کے پاس پیٹ ہوتا ہے اور ہر کو

آگ بجھانا چاہتا ہے۔ غریب غریبانہ انداز میں۔ امیر امیرانہ انداز میں۔

امی نے اسے یہ باتیں کیوں نہیں بتائی تھیں۔

نے تو اسے کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔

یں کہتی تھیں۔ کھاؤ' پیو' عیش کرو۔ زندگی اسی کا نام ہے۔

وقت اسے سناتی تھیں کہ وہ بے انتہا دولت کی تنہا وارث ہے۔ بہتر سے بہتر شوہر اسے
ہے۔ اسے کسی قسم کے تردد کی ضرورت نہیں۔

زعم میں اس نے بہتر سے بہتر آدمی پر ہاتھ رکھ دیا۔ گویا اسے خرید لیا۔ مگر یہ اس کی
تھی۔

سان کو خریدنا بہت مشکل ہے اس دنیا میں۔

وہ خود ہی بک گئی۔

س قیمت پر...؟

بے مول ہی... والدین نے تو اس کی کوئی قیمت ہی نہ لگائی۔ خود دور جا بیٹھے۔

ں بھری پُری دنیا میں لاکھوں کروڑوں کا مالک ہونے کے باوجود کوئی شخص اس قدر بے بس
ہوسکتا ہے۔

اسے یہ بات سمجھ میں آئی تھی۔

وہ پیسہ ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ مقدر بھی کوئی چیز ہوتا ہے۔ ورنہ وہ تو سمجھتی تھی کہ یہ
قدر' تقدیر' قسمت سب نچلے اور متوسط طبقے کی لغت کے الفاظ ہیں۔

ان اب یہ سمجھنے سے فائدہ کیا تھا؟

را ہوا وقت تو واپس نہیں آسکتا تھا۔

ر نہ یہاں کوئی حال دل سننے والا تھا۔

کا سنانا تھا اس گھر میں۔ اور وہ اس حبس بے جا والے ماحول سے تنگ آگئی تھی۔

اس کی عقل کام کرتی تھی نہ دل۔

اب وہ کوئی بھی سمجھوتہ کرنے پر تیار تھی۔

یہاں سے چھٹکارا مل جاتا۔

فاق نے اس کی پرواہ کرنا چھوڑ دی تھی۔

ہی سارا دن باورچی خانے میں تجربے کرتی رہتی اور آفاق کے آنے سے پہلے سب کچھ

جا کر باہر پھینک آتی اور باورچی خانے کو پہلے جیسا کر دیتی۔ اگر کوئی تجربہ کامیاب ہو جا اس کا اظہار کر دیتی مگر کیا کرتی۔ ابھی تک تو ایک آملیٹ بھی وہ نہ بنا سکی تھی۔ اس وہ بازار سے کھانا پکانے کی کتابیں خرید لائے اور پھر تجربے کرے مگر بازار جانا کہاں" ہر روز وہ سوچتی آج رات کو وہ آفاق سے بات کرے گی اور جب آفاق آتا اور بے اپنے کمرے میں چلا جاتا تو اس کا خون کھول اٹھتا۔ وہ سوچتی۔ وہ کبھی نہیں جھکے گی۔ دے گی کہ وہ بڑی آن بان والی لڑکی ہے۔ ایسی سزاؤں اور جفاؤں سے گھبراتی نہیں۔

تمام رات وہ کُڑھتی رہتی...

اور صبح جب وہ دفتر چلا جاتا تو پھر اپنے آپ پر لعنت ملامت بھیجنی شروع کر دیتی۔ کا سے بات کر ہی لیتی۔

بڑے کٹھن موڑ پر آ گئی تھی وہ۔

زیادہ تر وقت رونے میں گزرتا۔ گویا رونا اس کی عادت بن گیا تھا۔

پھر ایک رات...

عجیب اتفاق ہوا...

لائبریری میں سے ایک کتاب اسے مل گئی تھی۔ کتاب تھی تو دیومالائی قصوں کی۔ نے اس سے پہلے ایسی کتاب پڑھی نہیں تھی۔ اس لیے رات تک پڑھتی رہی۔ بڑے اور حیرت انگیز قصے تھے۔

پھر وہی ہوا۔

خواب میں اسے طرح طرح کے بھوت، جنّات اور چڑیلیں ڈرانے لگیں۔

وہ چیخ مار کر بیدار ہو گئی۔

جسم سارا پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ حلق خشک ہو رہا تھا۔

گو وہ غسل خانے کی بتّی جلا کر سوتی تھی۔

مگر یوں محسوس ہو رہا تھا۔ کمرے میں گھُپ اندھیرا ہے۔

اور سارے کمرے میں بھوت ناچ رہے ہیں۔

گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ دروازے کی چٹخنی نہیں لگائی تھی۔ وہ اسے یونہی بند کر دیتی تھی نے گھبرا کر دروازہ کھول دیا۔ سارا گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا صرف لابی میں زیرو روشن تھا اور وہ بلب بھی مریض کی آخری امید لگ رہا تھا۔

جانے کیا ہوا کہ وہ چلّاتی ہوئی دوڑی اور جا کر آفاق کے کمرے میں گر گئی۔ شاید آفاق کے کا دروازہ ساری رات کھلا رہتا تھا۔

دروازے میں اس نے ٹھوکر کھائی اور اوندھے منہ فرش پر گر گئی۔

وہ اس کی اپنی چیخیں اپنے اختیار میں نہ رہی تھیں۔ ایسے معلوم دے رہا تھا کوئی بدروح کو بھینچا کر رہی ہے۔

آفاق گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور جلدی سے کمرے کی بتّی جلا دی۔

فلکی فرش پر اوندھی پڑی رو رہی تھی۔

"کیا بات بھئی..."

وہ اپنی بھاری اور نیند سے بوجھل آواز میں بولا۔

مگر فلکی روتی رہی۔ چلّاتی رہی۔

اس نے بڑھ کر اسے نہیں اٹھایا بلکہ وہیں بیٹھ کر پوچھتا رہا۔

"اگر آپ اسی طرح روتی چلّاتی رہیں تو مجھے کچھ معلوم نہ ہو سکے گا کہ کیا ہوا ہے۔"

فلکی روتے روتے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"میں مر جاؤں گی۔ اس طرح میں مر جاؤں گی۔"

"کیا ہوا ہے؟"

"میں... میں ڈر گئی تھی۔"

"بس..."

"خدا کی قسم میں مر جاؤں گی۔ میں یہاں زندہ نہیں رہوں گی۔ آپ مجھے کوئی اور سزا دے مگر رات کو اس کمرے میں نہ سُلائیں۔"

آفاق نے بڑی بے اعتباری سے فلکی کی طرف دیکھا۔

"مجھے تنہا سونے کی عادت نہیں ہے۔ میں اتنے بڑے گھر میں کبھی اکیلی نہیں رہی۔ میری کا یقین کریں۔"

"یقین کر لیا آپ کی بات کا... اب کیا کروں؟"

فلکی گھٹنوں میں منہ دے کر رونے لگی۔

اور اسے کچھ سمجھ نہیں آئی۔ آفاق اسے چپ چاپ دیکھتا رہا۔

"آپ کا خیال ہے کہ میں آپ کے دروازے کے باہر پہرہ دیا کروں۔"

"میں نے یہ کب کہا ہے۔"

"پھر میں کیا کروں؟"

"آپ مجھے اپنے کمرے میں سونے کی اجازت دیں۔ میں یہاں فرش پر بستر لگا کر ر گی اور صبح صبح اٹھ کر چلی جایا کروں گی۔"

تھوڑی دیر بعد آفاق نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔"

فلکی جلدی سے بولی "اپنا بستر لے آؤں۔"

آفاق نے گھڑی دیکھی۔ رات کے دو بج رہے تھے۔

"نہیں۔" وہ بولا "آج تم اسی صوفے پر سوجاؤ۔ کل اپنا بستر یہاں ڈال لینا۔" ا ایک تکیہ اور ایک کمبل دوسرے پلنگ سے اٹھا کر اس کی طرف پھینکا۔

فلکی نے اسے دونوں ہاتھوں سے ایسے تھام لیا۔ جیسے وہی آخری سہارا ہوں اور جلا اٹھ کر صوفے پر لیٹ گئی۔

سر کے نیچے تکیہ رکھا اور کمبل اوڑھ لیا۔ خوف اور سردی کے مارے اس کا سارا بدا ہو گیا تھا اور تھر تھر کانپ رہا تھا۔

وہ جتنا جسم کو گرم کرنے کی کوشش کرتی' وہ اتنا ہی زیادہ کانپتا۔ پھر لیٹے لیٹے اسے گرم بوتل یاد آئی۔ ممی ہمیشہ اس کے بستر میں گرم پانی کی بوتل رکھوا دیا کرتی تیں۔ ہیٹر تو ساری جلا کرتا تھا۔

پھر بھی اسے سردی لگا کرتی تھی۔

اور اب ٹھنڈے برف صوفے پر وہ صرف ایک کمبل لیے لیٹی تھی۔

نہ کمرے کی گرمی تھی۔ نہ محبت کی۔

تھوڑی دیر بعد آفاق کی لمبی لمبی سانسوں کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ پھر گہری نیند میں ا گیا تھا۔

نہ جانے کب اپنے آپ سے لڑتی الجھتی فلکی بھی سو گئی۔

صبح آفاق کب اٹھ کر دفتر چلا گیا تھا۔ اسے پتہ ہی نہ چلا کیونکہ جب وہ اٹھی تو دن کے بج رہے تھے۔

کمرے میں کافی دھوپ آ رہی تھی۔

اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے سارے کمرے کا جائزہ لیا تو اسے احساس ہوا کہ آفاق کا کمرہ ہ تھا۔ ہر شے پر گرد پڑی تھی۔

بھی میلا تھا۔

آفاق کا کمرہ ہی کیا' اسے سارا گھر ہی گندہ نظر آنے لگا تھا اس لیے کہ کوئی نوکر یا جمعدار کرنے نہیں آتا تھا۔ ہر شے پر مٹی پڑ چکی تھی چونکہ ہر کمرے میں قالین بچھے ہوئے تھے' اسطے پہلی نظر میں گندگی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

لی کو یاد آیا جب وہ اس گھر میں آئی تھی تو گھر صاف ستھرا تھا اور چم چم کر رہا تھا۔ اس وقت یں کوئی عورت نہیں رہتی تھی اور اب اس گھر میں ہمیشہ کے لیے ایک عورت آگئی تھی تو ایب زدہ معلوم ہو رہا تھا۔ یہ تو درست ہے کہ آفاق کا رویّہ فلکی کے ساتھ اچھا نہیں تھا مگر عورت نہیں ہے۔

ورت کا دوسرا نام صفائی اور سلیقہ ہے۔ چلو مانا اسے کھانا پکانا نہیں آتا۔ مگر کیا صفائی کرنا ہیں آتا۔ اچھے اور صاف ستھرے گھر میں رہتی تھی۔ اتنا تو معلوم ہے گھر کیسے صاف کیا ہے۔ اسے چاہیے تھا۔ ہر صبح اٹھ کر اپنا کمرہ ٹھیک کرتی۔ آفاق کا کمرہ درست کرتی۔ ہر ن چادریں اور تکیے بدلتی۔ پھول دانوں میں نئے پھول سجاتی۔ جھاڑ پونچھ کرتی۔ کیا وہ یافتہ نہیں ہے۔ مہذّب سوسائٹی میں رہنے والی نہیں ہے۔ گو گھر میں اس نے ایسے کام کیے تھے لیکن بالآخر عورت تھی۔ جانتی تھی یہ کام کیسے کرنے چاہئیں۔

ے اپنے دل میں بہت شرم محسوس ہوئی۔ آفاق کیا کہتا ہوگا۔ ممکن ہے... اگر وہ گھر میں لیتی۔ اس کا کمرہ صاف کر دیتی تو اس کا دل اور خیالات بدل جاتے۔ اس نے بھی تو کچھ ے کی کوشش نہیں کی۔

یکن کیوں...؟

ھوڑی ہی دیر بعد فلکی کو غصّہ آنے لگا۔

یں یہ سب کر کے اپنی شکست تسلیم کر لوں۔ وہ تو پہلے ہی مجھے نوکرانی بنا کے رکھتا ہے۔ گھر سارے نوکر نکال دیے ہیں اور مجھے طرح طرح کی اذیتیں دے رہا ہے۔

یں سب کروانے کے لیے؟

ہیں یہ سب نہیں کروں گی۔ میں ایورج عورت بن کر زندہ نہیں رہنا چاہتی۔ مجھ پر کسی کی ں نہیں چلے گی۔ وہی کروں گی جو میرا دل چاہے گا۔

لیکن اب تک تو تو کچھ بھی نہیں کر سکی۔

تم دونوں کے درمیان ایک سرد جنگ جاری ہے۔

نہ وہ اپنی ہٹ دھرمی سے باز آرہا ہے' نہ تم جھکنا چاہ رہی ہو۔

نتیجہ" دونوں ہی بے سکون زندگی گزار رہے ہو۔

جب تک اپنی ضد سے باز نہیں آؤ گی۔ وہ یہی سزا تمہیں دیتا رہے گا۔ بدمزہ کھانا تنہائی کی زندگی بسر کرو گی۔ رات کو ڈر ڈر کر چلایا کرو گی اور ہر رات اپنی خودداری طاق رکھ کر اس کے آگے ہاتھ جوڑنے پڑیں گے۔

اس کے کمرے میں سونے کی بھیک مانگنا پڑے گی۔

فلکی کو جھرجھری آگئی۔

لعنت ہے ایسی زندگی پر۔

رات والی باتیں اسے یاد آنے لگیں اور وہ سوچنے لگی۔ وہ اتنی بے غیرت کیسے ہو گم کے کمرے میں چلی آئی اور پھر اس سے التجا کی۔

اور اس نے بھی صوفے پر سونے کی یوں اجازت دی جیسے کسی بھکارن کی جھولی میں ٹکڑا ڈال دیتے ہیں۔

اُف میرے خدا...

فلکی پھر رونے لگی۔

یہاں تو بے غیرتی کی زندگی گزارنی پڑے گی۔

میں کیا کروں...؟

میں کیا کروں.....؟

روتے روتے اسے وہ رات والے سارے جن بھوت یاد آنے لگے۔

گھبرا کر وہ باہر نکل آئی۔

آج وہ بہت زیادہ بے چین تھی۔ آج ایک ایک لمحہ اسے ڈس رہا تھا۔ رات کے ۲ اسے خوف آرہا تھا۔

وہ کیا کرے...

وہ کیا کرے آخر.....

سارے گھر میں وہ بَولائی بَولائی پھرتی رہی۔

دو ہی راستے تھے اس کے سامنے۔ شکست کا راستہ اس کی انا تسلیم نہیں کر رہی تھی۔

ممکن ہے شکست تسلیم کرنے سے ہی کوئی نجات کا راستہ نکل آئے۔

شام تک اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔

آفاق جب آیا تو اس کے کمرے میں چلی گئی۔

اور جا کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

"کیا بات ہے؟" آفاق نے نظر اُٹھا کر اسے دیکھا۔

"میں آپ سے بات کرنے آئی ہوں۔"

"کریں پھر...؟"

آفاق کا لہجہ اتنا ٹھنڈا تھا کہ کتنی دیر فلکی گم صم بیٹھی رہی اسے سمجھ نہ آئی کہ وہ کیا کرے اور کیا کہے۔ سارے سوچے ہوئے الفاظ اس کے گلے میں دَم توڑنے لگے۔

وہ نئے سِرے سے سوچنے لگی۔ اسے آفاق سے بات کرنی چاہیے یا نہیں۔

جب وہ کافی دیر گم صم ہی بیٹھی رہی تو آفاق ہی بولا۔

"کیوں' کیا ارادہ بدل گیا ہے بات کرنے کا...؟"

فلکی کا سارا خون پھر دماغ کی طرف جانے لگا یعنی اب وہ طعنے سن سن کر ہی ساری زندگی تمام کرے گی۔

تخت یا تختہ...

آخر بات کرنے میں کیا حرج ہے۔

گلا صاف کر کے بولی۔

"مجھے... مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ آپ میرے ساتھ شادی کر کے خوش نہیں ہیں۔"

"اچھا!" آفاق مصنوعی حیرت سے بولا۔ "اب آپ اندازے بھی لگانے لگی ہیں اور وہ بھی صحیح۔"

فلکی نے ایک کڑوا گھونٹ بھرا۔

"اور کیا اندازہ لگایا ہے آپ نے؟"

فلکی نے ضبط کیا کہ کہیں کوئی غلط بات ہی نہ کہہ دے۔

"ہاں' تو آپ کا اپنے بارے میں کیا اندازہ ہے؟ آپ خوش ہیں یا نہیں؟"

"میں بھی خوش نہیں ہوں۔"

اس نے صاف گوئی سے کہا۔

"تو اب کیا کیا جائے...؟ آفاق نے مصنوعی تاسف سے خراب سی شکل بنائی۔

"بس اب تو ایک ہی راستہ ہے کہ... ہم... ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں۔"

"ہوں...." آفاق نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"تو اس کا حل آپ نے یہ سوچا ہے؟"

"جی۔"

"کوئی اور حل بھی تو ہو سکتا ہے؟"

"مثلاً...؟" وہ جلدی سے بولی۔

"مثلاً... یہ کہ... آپ مجھے خوش رکھنے کی کوشش کریں اور میں آپ کو خوش رکھنے کی جدوجہد کروں۔"

"مگر یہ ممکن نہیں ہے۔"

"کیوں؟"

"میں آپ کو خوش نہیں رکھ سکتی۔"

"وجہ...؟"

"میری تربیت مختلف انداز میں ہوئی ہے۔"

"اگر آپ یہ فیصلہ کریں کہ آپ کی وہ تربیت غلط تھی... اب نئے سرے سے نئی تربیت لی جائے تو...؟"

"نہیں... میرا خیال ہے.... اب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"اور کیا' میں آپ کو خوش رکھ سکتا ہوں۔"

"نہیں۔"

"مجھے کوشش کرنے کا موقع تو دیا جائے؟"

"مجھے معلوم ہے۔" وہ جلدی سے بولی "آپ کچھ نہیں کر سکتے۔"

"کیوں' کیا آپ کو خوش کرنے کے لیے کوہ قاف سے کوئی خاص قسم کی انگوٹھی لانی پڑے گی؟"

"نہیں۔ یہ بات نہیں۔"

"پھر کیا بات ہے؟"

"آپ.. آپ.. ذرا اور مردوں سے... بہت... بہت مختلف ہیں۔"

"تم' مجھے نئے سرے سے سکھا لو۔"

"میں کچھ نہیں کر سکتی۔"

"کیوں...؟"

"آپ اور طرح کے آدمی ہیں۔"

"آدمی تو ہوں نا؟"

اس نے ذو معنی انداز میں پوچھا۔

فلکی خاموش ہو گئی۔

"میرا خیال ہے ہم دونوں ایک دوسرے کے اچھے ساتھی نہیں بن سکتے اس لیے دو ہوش مند انسانوں کی طرح اپنے راستے الگ کر لینے چاہئیں۔"

"شروع شادی کے زمانے میں بعض دفعہ فریقین اسی انداز میں سوچتے ہیں۔ ان کی عادتیں اور خصلتیں ایک دوسرے کے موافق نہیں ہوتیں مگر کچھ عرصہ کوشش کرتے رہنے سے ان میں ایک سمجھوتہ ہو جاتا ہے.... اور سمجھوتے میں دونوں فریقوں کو کچھ لینا اور کچھ دینا پڑتا ہے۔"

"اصل بات محبت کی ہوتی ہے۔"

فلکی جلدی سے کہہ تو گئی۔ پھر اسے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔

یہ بات نہیں کہنا چاہیے تھی۔

"یعنی آپ کا خیال ہے کہ آپ کو مجھ سے محبت نہیں ہے؟"

"یہی سمجھ لیں۔" وہ ڈھٹائی سے بولی۔

"مگر میں نے تو سنا تھا کہ یہ آپ کی محبت کی شادی ہے؟"

"محبت کی شادی صرف ایک طرف سے نہیں ہوتی۔"

"چلیے یہ کہہ لیتے ہیں کہ... یک طرفہ محبت کی شادی تھی۔"

"کہہ لیجیے۔"

"کیا اب آپ کی محبت نفرت میں بدل گئی ہے؟"

"محبت اچھے انسانوں سے کی جاتی ہے۔"

"میں اچھا انسان نہیں ہوں۔ یہ تو ثابت ہو گیا مگر اپنی محبت سے آپ مجھے اچھا انسان تو بنا

سکتی ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ نہیں۔"

"یعنی آپ مجھ سے اس حد تک مایوس ہیں؟"

"مایوسی کی بات نہیں۔ میری ایسی کوئی خواہش نہیں ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ آپ کی محبت عارضی تھی۔"

"جو بھی سمجھ لیں...!"

"ہر انسان زندگی کی خوبصورتیوں سے پیار کرنا چاہتا ہے۔"

"میرے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

"میرا خیال ہے آپ کو عورت کی ضرورت نہیں ہے۔"

"تو پھر میں شادی کے فریب میں کیسے آگیا؟"

"آپ کو ایک نوکرانی کی ضرورت ہے۔"

"یہ تو مجبوری ہے۔"

"لیکن میں نوکرانی نہیں بن سکتی۔"

"اسی لیے تو میں نے آپ کو بیوی بنالیا ہے۔"

"کیا بیوی کو اس طرح رکھا جاتا ہے؟"

"کیا تکلیف ہے آپ کو یہاں؟" پورا کا پورا گھر آپ کا ہے۔ حتیٰ کہ میں بھی دخل اندازی نہیں کرتا۔ ہوٹل سے کھانا کھالیتا ہوں۔ بدمزہ چائے پی لیتا ہوں۔ آپ کو گھرداری سے دلچسپی نہیں ہے اور میں آپ کو مجبور نہیں کرسکتا۔"

"میں یہاں پھر بھی خوش نہیں ہوں۔"

"اس سلسلے میں میں کیا کرسکتا ہوں؟"

"آپ مجھے آزاد کردیں۔"

"ہوں... تو آپ اپنی آزادی واپس لینا چاہتی ہیں؟"

"جی ہاں..؟"

"ہر آزادی کی ایک قیمت ہوتی ہے۔ آپ جانتی ہیں؟"

ہاں' میں جانتی ہوں اور میں ہر قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"سوچ لیں۔"

"سوچ لیا ہے۔"

"نہیں میں سوچنے کے لیے آپ کو ایک ہفتہ دے سکتا ہوں۔"

"میں فیصلہ کرنے میں اتنی دیر نہیں لگاتی۔"

"کبھی تو بعد میں پچھتانا پڑتا ہے۔"

فلک زچ ہوگئی۔

"آپ اپنی قیمت بتائیں؟"

بھئی' میں اپنی قیمت تو نہیں بتا رہا۔ میں تو آزادی کی قیمت کی بات کررہا ہوں۔"

"مانگئے' جتنے لاکھ بھی مانگتے ہیں۔ میں آپ کو نقد ادا کروں گی اور فوراً ادا کروں گی۔"

آفاق قہقہہ لگا کر ہنسا۔

"اس کا مطلب ہے میں امیر آدمی بن جاؤں گا پھر تو مجھے سوچ سمجھ کر کچھ مانگنا چاہیے۔"

"میں اپنی آزادی کے بدلے آپ کو اپنی ساری جائداد دے سکتی ہوں۔"

"دیکھ لیجئے۔ میرے جیسا شوہر پھر نہیں ملے گا۔"

"استغفراللہ۔" وہ بھڑکی "میں تو شادی کے نام سے ہی کانوں کو ہاتھ لگا رہی ہوں۔ بس ایک بار آزاد ہوجاؤں...

بولیے نا..."

آفاق تھوڑی دیر تک سگریٹ پیتا رہا۔ پھر اس کا چہرہ سنجیدہ ہوگیا اور سنجیدگی کی لہریں اور گہری ہوتی گئیں۔

"ہر شے کی ایک قیمت ہوتی ہے۔ تم نے ٹھیک اندازہ لگایا ہے۔ تم بیوی بن کر نہیں رہنا چاہتیں' لیکن اگر میں ضد پر آجاؤں تو دنیا کی کوئی طاقت بھی مجھے' تمہیں چھوڑنے پر آمادہ نہیں کرسکتی۔"

"میں جانتی ہوں۔"

فلک جلدی سے بولی۔

"لیکن صرف تم..."

"میں...؟ میں کس طرح؟"

"اس طرح کہ تم مجھے بہترین عورت بن کر دکھاؤ۔ میں تمہیں آزاد کردوں گا۔"

"بہترین عورت کیسی ہوتی ہے؟"

"بہترین' صحیح اور مکمل..." آفاق نے پھر کہا...

... اور یہی تمہاری آزادی کی قیمت بھی ہے جس دن مجھے یقین ہو گیا کہ تم اب بدل گئی ہو میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔"

"آپ ذرا بہترین اور مکمل عورت کی وضاحت کریں؟" فلکی نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تم اس پورے گھر کو سنبھالو گی۔"

"کس طرح...؟"

"گھر کا سارا کام کرو گی۔"

"کیا کیا؟"

"کھانا خود پکاؤ گی۔ برتن دھوؤ گی' کپڑے دھوؤ گی اور گھر کی صفائی بھی خود کرو گی۔"

"اس اتنے بڑے گھر کی صفائی میں اکیلی کروں گی؟"

"جی ہاں..."

"اتنا زیادہ کام مجھ سے کیسے ہو گا؟"

"یہ اتنا زیادہ کام نہیں ہے۔ ہم تو گھر کے صرف دو افراد ہیں...

.....اور دو افراد کا کام زیادہ نہیں ہوتا۔"

"مگر گھر تو اتنا بڑا ہے نا؟"

"یہ تو تمہارے سلیقے پر منحصر ہے۔"

"باہر کی صفائی بھی میں کروں گی؟"

"ہاں' لان بھی تم صاف کرو گی اور پودوں کی دیکھ بھال بھی کرو گی۔"

"یہ تو ظلم ہے یعنی مالی کا کام بھی میں کروں؟ یہ ستم ہے' قید ہے' سزا ہے.... یہ قیمت نہیں ہے۔"

فلکی رونے لگی۔

آفاق سگریٹ پیتا رہا۔

پھر بجھی ہوئی سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا کر ذرا سیدھا ہو گیا۔ بولا۔

"میں نے تو تم سے کہا تھا کہ یہ قیمت تم ادا نہیں کر سکو گی۔ آزادی بڑی پیاری شے ہے اور ابھی تم کہہ رہی تھیں' تم اس کے لیے بڑی سے بڑی قیمت ادا کر سکتی ہو۔ میں جانتا ہوں' تم

صاحب جائداد ہو مگر صحیح قیمت وہ ہوتی ہے جو آدمی تکلیف سے گزر کر ادا کرتا ہے۔ فیصلہ اب تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ انکار کر سکتی ہو؟ تمہارے یہاں رہنے میں مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔ میں تو اس قسم کی زندگی کا عادی ہوں۔ کچھ گھر میں کچھ دفتر میں۔ بھلا مجھے کیا فرق پڑ سکتا ہے؟"

"نہیں... نہیں..."

فلکی نے ایک دم اپنے آنسو پونچھ لیے اور بولی۔

"میں یہ قیمت ادا کروں گی۔ اس جہنم میں رہنے سے بہتر ہے کہ میں کام کرتے کرتے مر جاؤں... مجھے آپ کی یہ شرائط منظور ہیں مگر مجھے یہ بتائیں' کتنا عرصہ مجھے یہ سب کرنا ہو گا؟"

"عرصہ تم پر منحصر ہے۔ تم جتنی تندہی سے اپنے آپ کو گھر کے ان معمولات میں ڈھال لو گی' اتنی ہی تمہاری نجات آسان ہو جائے گی۔ روؤ گی' پچھتاؤ گی' کوستی رہو گی تو تمہارے نمبر کٹتے جائیں گے۔"

"اگر میں یہ سب ایک مہینے میں کر کے دکھا دوں تو...؟"

"کر کے دکھا دوں سے تمہارا کیا مقصد ہے؟ میں تو چاہتا ہوں تم ان باتوں کی عادت ڈال لو۔ اب کرو گی' تب پتہ چلے گا۔ بہرحال... تم اگر ایک مہینے میں بدل سکتی ہو تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ویسے اتنا بتا دوں' یہ بات کہنی آسان ہے کرنی مشکل ہے۔"

"اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں..." فلکی نے بہت آہستہ سے کہا۔ پھر بھی آفاق نے سن لیا۔ اسی انداز میں بولا۔

"ہاں' اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں..."

فلکی چونک گئی۔ ڈر کر اس کی صورت دیکھنے لگی۔ وہ آنکھیں موندے ویسے ہی لیٹا تھا۔

فلکی فرش پر نظریں جمائے سوچنے لگی کہ وہ کیا کرے...؟

سب راستے بند تھے۔ بس یہی ایک نجات کا راستہ نظر آ رہا تھا۔ گو اس کے لیے یہ زندگی کا مشکل ترین مرحلہ تھا مگر وہ کیا کرتی۔ اپنی ہمت پر اسے بھروسہ تھا۔ دشمن دانا ہو تو سارے مقابلے خطا جاتے ہیں۔ جب عیاری کام نہ آ رہی ہو تو پھر انکساری کے ذریعے اپنا مطلب نکالنا پڑتا ہے۔ اس طرح بات صرف چند مہینوں پہ جا پڑتی تھی۔ ورنہ طویل مایوسی کا محاصرہ تھا اور راہِ فرار نظر نہیں آتی تھی۔

کافی دیر سوچنے کے بعد فلکی نے کہا۔

"مجھے یہ سب منظور ہے۔ کل سے میں گھر کا سارا کام کروں گی۔ آپ اپنا وعدہ یاد ر
"یہ ایک مرد کا وعدہ ہے۔ تم بھول جاؤ گی، مگر میں تمہیں یاد دلا دوں گا۔"
"میں بھول جاؤں گی؟" فلکی طنزاً ہنسی۔ "مجھے اس کے سوا کچھ یاد نہیں رہے گا او
اسی کے آسرے پر میں اتنی مشقت کروں گی۔"
آفاق بھی زیرِ لب مسکرایا۔
"خیر دیکھا جائے گا۔"
فلکی کھڑی ہوگئی۔
"ہر ہفتے تمہیں ضرورت کی چیزیں اور سودا سلف مل جایا کرے گا۔ اس کے مطابق
ضروریات کی لسٹ بنا کر دے دیا کرنا۔"
"ٹھیک ہے..."
فلکی جب باہر جانے لگی تو اسے یاد آیا کہ اس نے تو آج اسی کمرے میں سونا ہے کیونکہ
سے وہ اپنے کمرے میں نہیں گئی تھی اور اسے ڈر لگ رہا تھا۔
جاتے جاتے رک گئی اور ڈرتے جھجکتے بولی۔
"میں اپنا بستر یہاں لے آؤں...؟"
آفاق نے آنکھیں کھول کر اسے بڑے مشکوک انداز میں دیکھا۔ جیسے وہ کوئی چال چل
ہو۔
مگر اس وقت فلکی کی آنکھوں میں بے چارگی تھی اور جیسے وہ التجا آمیز انداز میں اس
طرف دیکھ رہی تھی۔ اس سے آفاق کو یقین ہوگیا کہ وہ چال نہیں چل رہی تھی۔
کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔
"میں اپنا پلنگ تمہارے کمرے میں لے آؤں گا۔ تم وہاں جا کر سو جاؤ... تمہارے یہ
سونے سے میں کام نہیں کر سکوں گا اور پھر یہاں میرے ضروری کاغذات بھی بکھرے پڑے
ہیں۔"
"میں کوئی بچہ ہوں جو ان کاغذات کو چھیڑوں گی؟"
"تم بچے سے بھی بدتر ہو کیونکہ غیر ذمہ دار ہو۔"
فلکی کو دل میں بہت غصہ آیا مگر اب اسے پتہ چل گیا تھا کہ وقت بے وقت غصے کا اظہار کر
ٹھیک نہیں ہوتا۔

بے دلی سے چلتی ہوئی باہر نکل آئی۔ اسے یقین تھا کہ آفاق اس کے کمرے میں بالکل نہیں
ئے گا۔ اس نے محض اسے ٹالا ہے اور اب اسے اپنے آپ سے شرم آرہی تھی کہ ایک
ی نے اس کی معصوم نیت پر شک کیا تھا۔ توبہ، کس قدر گھٹیا شے بن گئی تھی وہ اس گھر میں
کر.....
اس نے کمرے کی بتی جلائی... اپنا بستر ٹھیک کیا تو اسے احساس ہوا کہ واقعی اس کے بستر کی
ور اور تکیے کے غلاف بہت میلے تھے۔ اتنے دن اس نے یہ سب کیسے برداشت کرلیا۔ صبح ہی
ے وہ صفائی کا کام شروع کردے گی۔
مگر وہ یہ سب کام کرے گی کیسے...؟ حامی تو اس نے بھرلی تھی لیکن اسے تو ان کاموں کی
عادت نہیں تھی اگر دو چار دنوں میں اس کی ہمت جواب دے گئی تو اس چیلنج کا کیا بنے گا...؟
اور پھر آفاق اس کا کتنا مذاق اڑائے گا۔ پہلے ہی وہ کون اسے کوئی باعزت چیز سمجھتا ہے۔
بہرحال اب تو اوکھلی میں سر دے دیا ہے۔ جائے یا رہے...
وہ اسی اُدھیڑبن میں بیٹھی تھی کہ آفاق اپنا پلنگ اٹھائے اس کے کمرے میں داخل ہوا...
بہت وزنی پلنگ تھا مگر اس نے دونوں ہاتھوں میں اس طرح اٹھایا ہوا تھا جیسے سکول کے بچے بستہ
اٹھا لیتے ہیں۔ پلنگ لاکر وہ کمرے کے وسط میں کھڑا ہوگیا۔ کمرے میں چاروں طرف نظر
دوڑائی۔ صوفے کو اٹھا کر جگہ بنائی اور ایک کونے میں اپنا پلنگ لگا دیا۔
فلکی جھٹ کھڑی ہوگئی۔
وہ پھر گیا اور اپنا بستر اٹھا لایا۔ فلکی آگے بڑھی۔
"لائیے میں بستر لگا دوں۔"
"نہیں محترمہ... مجھے یہ سب کام کرنے کی بچپن سے عادت ہے۔ آپ پہلے اپنے کام کرنے
کی عادت ڈالیے۔"
فلکی دور ہٹ کر کھڑی ہوگئی۔
آفاق نے بہت سلیقے سے بستر لگا دیا۔
صوفوں کو دوبارہ ترتیب سے رکھا۔
کمرہ کافی بڑا تھا۔ ایک دیوار کے ساتھ فلکی کی شادی والا ڈبل بیڈ پڑا تھا۔ ایک دیوار کے
ساتھ ڈریسنگ ٹیبل تھی... درمیان میں صوفہ پڑا تھا اور صوفے کے دوسری طرف، بالکل پرلی
دیوار کے ساتھ آفاق نے اپنا پلنگ لگا لیا تھا کہ اگر وہ بتی جلائے بھی تو فلکی ڈسٹرب نہ ہو۔

کمرے کو ٹھیک کرنے کے بعد وہ بولا۔
"بیگم فلک ناز! خادم نے اپنا بستر یہاں لگا دیا ہے۔ میں صرف رات کو سونے کے
آیا کروں گا۔ مجھے دیر تک پڑھنے اور کام کرنے کی عادت ہے۔ وہ میں اپنے کمرے میں
کروں گا۔ جب نیند آئے گی یہاں آکر سوجاؤں گا... صبح جلد اٹھنے کی عادت ہے۔ اٹھتے
کمرے میں چلا جایا کروں گا۔ آپ کو سونے اور اٹھنے کی پوری آزادی ہے۔ جب
وقت چاہیں سوجائیں۔ البتہ یہ دروازہ ساری رات کھلا رہے گا۔ آپ کو کوئی اعتر
نہیں؟"

"جی نہیں...؟" فلکی نے جلدی سے کہا۔
"اب آپ آرام فرمائیں اور تسلّی بھی فرمائیں۔ میں نے اپنا بستر یہاں لگا دیا ہے۔ کام
آجاؤں گا۔"

"اچھا جی..."
فلکی نے کہا اور جلدی سے اپنے بستر پر بیٹھ گئی۔
"سنئے..." بیٹھتے ہی اسے ایک بات یاد آگئی۔ بولی۔
"صبح میں پہلے صفائی کروں گی۔ بستر کی چادریں اور تکیے کے غلاف ہوں گے؟"
"جی ضرور ہوں گے۔ آپ نے اب تک ڈھونڈنے کی کوشش ہی نہیں کی ورنہ آپ کو
کمرے میں رکھے ہوئے ملتے۔ اس گھر میں ضرورت کی ہر چیز ہے اور ہر موسم کے مطابق ہے
بس ذرا جذبے کی ضرورت ہے۔"
پھر خود ہی رک کر بولا۔ "میری امی سال میں ایک بار آتی ہیں تو گھر کی ضرورت کی ایک ایک
چیز الماریوں میں رکھ جاتی ہیں اور وہ اتنی مکمل اور بھرپور عورت ہیں کہ امریکہ میں بیٹھ کر یہ
گھر چلاتی ہیں مگر اب آپ پتہ نہیں کیا چلائیں گی...؟ اپنی زبان یا میرا دماغ....؟"
یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ فلکی کو پھر غصہ آگیا۔
اونہہ... میری امی.... میری امی... ہر آدمی کو اپنی امی اچھی لگتی ہے۔ خواہ وہ دو کوڑی کی
ماں ہو۔
دیکھ لوں گی...

اسے دل ہی دل میں آفاق کی امی سے حسد محسوس ہونے لگا۔ کتنی بری تربیت کی تھی اس
نے اپنے بیٹے کی۔ ذرا بھی انسانیت نہیں سکھائی۔ عورت کی عزت نہیں کرتا۔ اپنے برابر کسی کو

ہا... تُف ہے ایسی ماں پر جس نے یہ بیٹا جنا...
اچانک.... بالکل اچانک... اسے اپنی ممی یاد آگئیں۔ نہ جانے کہاں ہوں گی وہ اس
ور کیا کر رہی ہوں گی؟ پہلے تو جاتے ہی تار بھیجا کرتی تھیں اور فون کرتی تھیں۔ اب
لے کوئی اطلاع نہیں دی تھی؟
ں بھی بدل جاتی ہے؟
کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔
جب ممی اور ڈیڈی باہر جاتے تھے تو وہ اپنی کسی سہیلی کے گھر چلی جایا کرتی تھی یا
کو اپنے گھر میں لے آتی تھی۔
ن کتنے مزے کے ہوا کرتے تھے۔ جب سہیلیوں کی فوج گھر میں ہوتی تھی۔ سب کے
رینڈز بھی آیا کرتے تھے۔ فلمیں دیکھتے تھے۔ پکنک مناتے تھے ہوٹلوں میں جاتے تھے۔
میں ایک بار ممی کا فون آتا تھا۔ ممی جاتے ہوئے ڈھیر سارے پیسے دے کے جاتی
ایک موٹر اس کے تصرّف میں رہتی تھی... واہ... کتنی پیاری زندگی تھی۔
نے کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ یوں وہ قید کردی جائے گی۔ باغباں صیّاد بن جائے گا اور اپنا
آشیاں مرگھٹ میں بدل جائے گا۔
ہا کی قید میں ہم کو ہے یادِ آشیاں باقی!
باتیں' پرانی بہاریں... پرانے دوست اور پرانے دن یاد آتے ہی فلکی کی آنکھوں میں
ساون کی جھڑی لگ گئی۔
دل پھر بُری طرح دُکھ گیا تھا...
پھر بے انتہا آنسو بہانے کو دل چاہ رہا تھا..
وہ جلدی سے بستر میں گھس گئی... منہ پر رضائی لپیٹ لی تکیے میں منہ چھپا کر وہ بے حد

ن اس طرح جیسے وہ بچپن میں رضائی کے اندر چھپ کر ناول پڑھا کرتی تھی کیونکہ ممی
ل تھیں کہ اب سوجا.... وہ آفاق سے ڈرتی تھی۔ وہ اس کے آنسو نہ دیکھ لے۔ اس کے
آنسو بہانا بزدلی تھا۔
ب روتی روتی وہ سو گئی۔

اگلا ایک ہفتہ انتہائی تجرباتی ہفتہ تھا۔

اس کے ہر خیال اور ہر تصور سے زیادہ کٹھن۔ صبح جب وہ اٹھی تو آفاق دفتر جا
نے حسبِ معمول ناشتہ کیا اور دل میں سوچا پہلے صفائیاں کرنی چاہئیں کیونکہ گھر بہ
ہے...

اس نے جاکر سب کمروں کی تلاشی لی تو اسے پتہ چلا۔ ہر بیڈ روم کی الماری :
تکیے کے غلاف' کمبل اور تولیے رکھے ہیں۔

اس گھر میں چار بیڈ روم تھے۔ دو اوپر' دو نیچے۔ اوپر والے بیڈ روم بند تھے۔ ا
کیا۔ اب صرف نیچے والے دو بیڈ روم صاف کرنے تھے۔ اس کے بعد ایک بہت
لاؤنج تھا جو ٹی۔وی نہ ہونے کی وجہ سے ویران پڑا تھا۔ پھر ایک بڑا سا ہال تھا
ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم بنایا گیا تھا۔

اس کی بغل میں ایک چھوٹی سی سٹڈی تھی جس میں دنیا جہان کی کتابیں رکھی تھیں
ایک باورچی خانہ تھا... اور ایک پینٹری تھی۔

باہر کی طرف ایک کھُلا برآمدہ تھا جسے جالیوں سے بند کردیا گیا تھا مگر اس کے اردگ
پھولوں کی بیلیں اور گملے پڑے ہوئے تھے...

باہر ایک بہت بڑا لان تھا جس کی ہری بھری گھاس بے ترتیب ہو چکی تھی۔

بھلا اتنا بڑا لان رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟

اس نے دل میں پہلی مرتبہ سوچا۔

اس زمانے میں بڑے بڑے لان رکھنا بے وقوفی ہے۔ کس کو فرصت ہے صفائی کر۔
لان میں خوبصورت درخت بھی تھے۔ شاید آڑو' الوچے اور آم کے درخت تھے۔
سب درختوں تلے پتوں کا ڈھیر لگ گیا تھا۔ گملے بھی خراب ہو رہے تھے۔

اور اس نے اتنی بے وقوفی کی کہ سارے کام کرنے کی ہامی بھرلی۔

وہ بھی ایک مہینے کے اندر اندر...

بہرحال اللہ کا نام لے کر پہلے وہ آفاق کے کمرے میں گئی۔ نئی چادریں اور غلاف نکالے۔
ں بدلا۔ گھر میں ویکیوم کلینر بھی تھا۔ گو اس نے کبھی استعمال نہیں کیا تھا مگر استعمال ہوتا تو
ا تھا۔ ویکیوم کلینر سے اس نے قالین اور پردے صاف کیے۔ ایک ایک چیز کو جھاڑا...

پھر اپنے کمرے میں گئی۔ اسی طرح اپنے کمرے کی ہر چیز بدلی۔ صاف کرنے سے کمرہ واقعی
اچھا لگ رہا تھا۔

اب غسل خانوں کا مسئلہ باقی رہ گیا تھا۔ وہ کھڑی سوچتی رہی۔

واہ۔ وہ کوئی جمعدارنی ہے جو غسل خانے صاف کرے.. خیر اپنا تو کسی طرح کر ہی لیتی۔ آفاق
سل خانہ صاف کرتے ہوئے اسے بڑی گھن آرہی تھی۔

ہاں اس نے سن رکھا تھا کہ یورپ اور امریکہ میں گوریاں اپنے فلش اور غسل خانے خود
کرتی ہیں۔ تبھی تو اسے گوریوں سے گھن آتی تھی۔ اس واسطے اس نے کبھی باہر جاکر بسنے
خواب نہیں دیکھے تھے۔ بس ایک ہی بار ممی کے ساتھ گئی تھی۔

ممی اسے لندن لے گئی تھیں۔ وہاں جاکر اس قدر بور ہوئی تھی کہ حد نہیں... سارا وقت ممی
کے ساتھ کام کرنا پڑتا..... کپڑے خود دھونے پڑتے۔ فلیٹ خود صاف کرنا پڑتا' سودا خود لانا
ا۔

نہ ضائع کرنے کو وقت ہوتا نہ گپ لگانے کو دوست۔ بس سب مشہور جگہیں دیکھنے کے بعد
ے لندن سے وحشت ہونے لگی اور وہ تین مہینے کے بعد ہی لوٹ آئی تھی' اس لیے ممی اب
ے ساتھ نہیں لے جاتی تھیں۔ جتنا مزہ اپنے ملک میں تھا اور کہیں نہیں تھا۔

ایک ایک وقت میں چار چار ملازم تھے اور ہر کام کے لیے ہر وقت حاضر۔

اور اب اسی ملک میں' جہاں اس کے کئی ملازم تھے۔ اسے غسل خانہ صاف کرنا پڑ رہا تھا۔

ستم ظریفی نہیں تو کیا ہے؟

خیر اپنا غسل خانہ تو اس نے جوں توں کرکے صاف کرلیا مگر آفاق کے غسل خانے میں
ا نگنے کو اس کا دل نہ چاہا۔ پھر بھی دل پر جبر کرکے اندر چلی گئی۔

ب جھاگ جھاگ ہو رہا تھا۔

شیو کی چیزیں جابجا بکھری پڑی تھیں۔ سنک میں میل جما تھا۔

اسے ایک دم اُبکائی آگئی۔

شیو کا سامان تو ویسے بھی وہ نہ دیکھ سکتی تھی۔ یہ گندگی اس نے کبھی ڈیڈی کی بھی صاف کی تھی۔

مگر پھر سوچا...

اگر غسل خانے کو ہاتھ نہ لگایا تو نہر کٹ جائیں گے...

طوعاً" و کرہاً" اس نے بالٹی میں پانی بھرا اور برائے نام غسل خانہ دھویا۔ شیو کی چیزو انگلیوں سے اٹھا کر یوں پرے رکھ دیں' جیسے کوئی مرا ہوا چوہا اٹھایا ہے۔

یہ سب کرنے میں وہ اس قدر تھک کر ٹوٹ گئی تھی جیسے کسی نے اس کا جوڑ جوڑ ہو۔

دیکھا تو بارہ بج رہے تھے اور ابھی کھانا بھی پکانا تھا۔

صفائی کا باقی کام کل پر چھوڑ کر وہ باورچی خانے میں چلی گئی اور سوچنے لگی کیا پکا! اسے کچھ بھی پکانا نہیں آتا تھا۔ پھر بھی کوشش تو کرنا تھی۔

فرج میں سے گوشت نکالا۔ لہسن اور پیاز نکالا۔

پیاز کاٹنا کس قدر مشکل تھا۔ چھیلتے چھیلتے ہی اس کی خوبصورت آنکھیں نیر بہانے خدا جانے خانساماں یہ کام روزانہ کس طرح کرتا تھا۔ اسے پیاز کاٹنا دنیا کا مشکل ترین رہا تھا اور پھر پتہ نہیں پیاز کا مصرف کیا تھا۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا اگر ہانڈی نہیں ڈالیں گے تو کیا ہو جائے گا... آخر لہسن' پیاز جیسی بدصورت اور بے معنی چیزیں کے لیے کیوں ضروری سمجھی گئیں۔ اسے اپنی پچھلی نسلوں کی عقل پر رونا آیا۔ کھانے بھی تو بہت سے طریقے تھے۔

بمشکل تمام پیاز چھیلا۔ گوشت دیگچی میں ڈالا... پیاز اور لہسن ڈالا... پھر سمجھ نہیں کرنا ہوگا۔

گھی شور مچانے لگا' گوشت جلنے لگا۔ اس نے گھبرا کر پھر دیگچی پانی سے بھردی۔

اسی وقت باہر باران کی آواز آئی۔

دوڑ کر دیکھا تو آفاق تھا۔

آفاق آج کیسے آگیا...؟ جلدی سے اس نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی۔ پونا ایک بج رہا غالباً" آفاق کھانا کھانے کے لیے آیا ہے... کیونکہ رات کو اس نے کہا تھا نا؟

اب کیا ہوگا...؟

اب کیا ہوگا...؟

وہ جھاڑن سے ہاتھ پونچھتی ہوئی باورچی خانے میں آگئی۔ آفاق اس کے پیچھے اندر چلا آیا۔

بہت تیز آنچ کے اوپر دیگچی رکھی تھی اور اس کے کناروں سے بھاپ نکل رہی تھی۔

"کھانا تیار ہو گیا ہے...؟" آفاق نے پوچھا۔

"جی نہیں..." فلکی نے نظر جھکا کر کہا۔ "اصل میں مجھے صفائیاں کرتے کرتے دیر ہو گئی۔"

"اچھا۔" آفاق بولا۔ "میں نے سوچا آج دوپہر کا کھانا گھر چل کر کھایا جائے۔"

آگے بڑھ کر اس نے دیگچی کا ڈھکن اٹھا کر دیکھا... پھر کہنے لگا۔

"سالن پکنے کے آثار نہیں ہیں...!"

"چلئے کوئی بات نہیں۔ میں نے آتے آتے راستے میں مچھلی اور نان خریدے تھے۔ اگر آپ کھانا پسند کریں... تو کھالیں... یہ سالن رات کو کام آجائے گا۔"

فلکی نے حیرت سے مڑ کر آفاق کو دیکھا۔ وہ اسے ایک پلاسٹک کا تھیلا پکڑا رہا تھا۔

فلکی نے جلدی سے وہ تھیلا پکڑ لیا۔ اس میں تلی ہوئی مچھلی کی بڑی اشتہا انگیز خوشبو آرہی تھی۔ تلی ہوئی مچھلی فلکی کو بہت پسند تھی۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ اکثر شام کو "دارالماہی" سے تلی ہوئی مچھلی اور نان کھانے جایا کرتی تھی۔ خوشبو سونگھتے ہی اسے محسوس ہوا جیسے اسے بڑی شدت کی بھوک لگی ہے بلکہ وہ تو جنم جنم سے بھوکی ہے۔ دوڑ کر اس نے تھیلا میز پر رکھ دیا اور جلدی جلدی الماری میں سے برتن نکال کر میز پر رکھنے لگی۔ آفاق بھی آگیا... کالی آبنوسی میز پر انگلی سے لکیر ڈال کر بولا۔

"برتن رکھنے سے پہلے میز کو صاف کر لینا چاہیے۔"

فلکی شرمندہ ہو گئی۔ اسے تو خیال ہی نہ رہا اور پہلے کونسا یہ کام کرتی آئی تھی۔ جا کر جھاڑن اٹھا لائی۔ انتہائی پھوہڑپن سے میز کو صاف کیا اور جلدی سے پلیٹیں لگا دیں۔

اصل میں مچھلی کی خوشبو سونگھ کر اس سے صبر کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

چاہتی تھی جھپٹ کر کھالے۔ مگر آفاق کا لحاظ کر رہی تھی۔

اس نے بھی کرم کیا۔ جلدی سے لفافہ کھول دیا۔

دونوں نے بیٹھ کر کھانا کھایا۔

ابھی فلکی کھا ہی رہی تھی کہ آفاق اٹھ کھڑا ہوا بولا۔

"مجھے دو بجے دفتر پہنچنا ہے۔"

وہ ہاتھ صاف کر کے باہر نکل گیا۔ مگر فلکی بیٹھی ندیدوں کی طرح کھاتی رہی اور دل میں سو
بھی رہی کہ حالات انسان کو کتنا ندیدہ بنا دیتے ہیں۔ بہرحال کافی دنوں کے بعد پیٹ بھر کر مز
دار کھانا کھایا تھا۔ لطف آ گیا۔

تب اسے احساس ہوا کہ پیٹ بڑی ظالم شے ہے اور خوش خوراکی کی عادتیں انسان کو غلام بنا لیتی ہیں۔

جو مچھلی اور نان بچ گئے۔ وہ اس نے اٹھا کر شام کے لیے رکھ لیے۔

اور پھر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

کمرہ بھی آج صاف لگ رہا تھا۔

پیٹ بھی خوب بھرا ہوا تھا۔

اور تھکن کے مارے انگ انگ درد کر رہا تھا۔

اس لیے وہ بستر پر لیٹ گئی۔ ذرا سا لیٹی تھی مگر ایسی بے سُدھ ہوئی کہ تن من کا ہوش
رہا۔

اس وقت آنکھ کھلی جب اندھیرا اتر آیا تھا اور شام کے سات بج رہے تھے۔ گھبرا کر اٹ
بتی جلائی۔

اُفوہ...

آج کیسی مدہوش سوئی؟

سچ ہے پیٹ بھرا ہو تو نیند بھی خوب آتی ہے۔

خود بخود اسے احساس ہونے لگا۔

چائے کی طلب بھی جاگ اٹھی تھی۔

باورچی خانے میں گئی تو دھک سے رہ گئی۔ اس نے دوپہر کو ہنڈیا اوپر رکھی تھی۔ اتارنا بھول گئی۔ جب پیٹ بھر کر کھانا کھا لیا تو اسے یاد ہی نہ رہا۔ کچھ اور کام کرنا بھی باقی ہے۔

تیز آنچ پر رکھی ہوئی دیگچی جل کر کوئلہ بن چکی تھی۔ کہیں بھی گوشت کا نام و نشان نہ تھا
سارے کمرے میں جلے ہوئے چمڑے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

اور آفاق تو کہہ گیا تھا رات کو گھر پر کھانا کھائے گا۔

فلکی کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو گئے۔

ی سے دیگچی اُتار کر نل کے نیچے رکھ دی تاکہ آفاق کے آنے سے پہلے مانجھ کر صاف
اور دوسرا سالن اوپر رکھ دے۔ دیگچی مانجھتے ہوئے اسے یاد آیا کہ کھانے کے برتن تو
ی پڑے ہیں۔

اٹھائے گا؟

آفاق آکر کیا کہے گا...

کر ادھر گئی۔ برتن اٹھا لائی۔ وم کا ڈبہ کھولا اور مانجھنا شروع کر دیا۔ پتہ نہیں مچھلی کی بو
ے گی؟

ی سمجھ میں نہ آتا۔

ھر دیگچی اتنی کالی ہو چکی تھی کہ صاف ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔

واشنگ بیسن میں پٹخ کر فلکی دور جا بیٹھی۔ وہ جو دوپہر کو ذرا سا مزہ آیا تھا' سب کرکرا

ئے تو پینی چاہیے۔

ے ایک پیالی چائے بنائی اور پینے لگی۔

ے پی کر وہ باہر برآمدے میں آکر بیٹھ گئی۔ دل سخت گھبرا رہا تھا۔ پہلے قدم پر وہ نڈھال
ا اور آفاق نے اس سے امیدیں وابستہ کر لی تھیں۔

کرے...؟

رونا آ گیا۔

اپنے گھٹنوں پر سر رکھے رو رہی تھی تو آفاق کی کار گیٹ کے اندر داخل ہو گئی۔ وہ
س نہیں ہوئی۔

اس کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔

ہے؟"

بولی۔

آؤ۔" وہ اندر کو لپکا۔

ی تابعدار بچے کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چلی۔

تاؤ کیا ہوا ہے؟"

سب کچھ بتا دیا۔

"ہوں۔"

آفاق نے کوٹ اتارا۔ پھر ٹائی۔ پھر تسمے کھولے' بوٹ اتارے' جرابیں اتاریں پھیلا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

"چلے گا یا نہیں چلے گا؟"

"چلے گا..." فلکی نے جلدی سے کہا۔

"تو کوئی بات نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔"

فلکی باورچی خانے میں چلی آئی۔

ننگے پاؤں آفاق بھی اس کے پیچھے چلا آیا۔

"یہ باورچی خانہ ہے۔" وہ حیرت سے بولا۔ "اتنے برتن کیسے نکل آئے؟ اور ا دھوئے گا؟

برتنوں کو اس طرح پھیلا کر رکھنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ جلدی سے برتن دھو ڈالو۔

فلکی کا دل چاہا۔ صاف جواب دے دے کہ کالی دیگچی اس سے صاف نہ ہوگی۔ مانجھ اس کے ہاتھ دکھ گئے ہیں۔ یا پھر اٹھا کر باہر پھینک دے اور چین کی بانسری بجائے۔

مگر ڈر کر آستینیں چڑھائیں اور نل کھول دیا۔

"صبح کی بچی ہوئی مچھلی ہے؟" آفاق نے کھڑے کھڑے پوچھا۔

"جی ہاں..."

"گرم کر کے لاؤ وہی کھاتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا تھا۔

شکر ہے اس نے مچھلی رکھ لی تھی۔

لیکن جب اس نے مچھلی گرم کی تو اس کی شکل کچھ سے کچھ ہو چکی تھی۔

بہرحال رات کے کھانے کا مسئلہ تو حل ہو گیا۔

مگر ہر روز ایک نئی مشکل اور نئی شرمندگی کا سامنا رہا۔

صفائی کرنا کچھ ایسا آسان کام نہ تھا۔

ایک کمرہ جھاڑنے میں ہی وہ تھک کر چور ہو جاتی۔ ایک ہفتے میں ایک بار بھی وہ ڈھ سالن نہیں پکا سکی تھی۔

کبھی ہاتھ جلا لیتی۔ کبھی چوٹ لگا لیتی۔ کبھی چاقو سے انگلی کٹ جاتی۔ میلے کپڑوں کا

گیا تھا۔ کمرے روز گندے ہو جاتے۔ روز صاف کرنے پڑتے۔

پھر اسے تعجب ہوتا کہ کیا سب گھروں میں ہر روز ایسا ہی ہوتا ہے۔ روزانہ لوگ باقاعدگی سے صفائی کرتے ہیں' روزانہ کھانا پکاتے ہیں' روز برتن مانجھتے ہیں۔ پھر بھی خوش باش نظر آتے ہیں' زندگی کے ساتھ مگن رہتے ہیں۔ کیا زندگی اتنا بڑا تروّو ہے۔ روز گھر میں اتنی مٹی اور گندگی کہاں سے آجاتی ہے؟

نوکر بے چارے اتنا مشکل کام کرتے ہیں؟

اپنے گھر میں تو اسے اس بات کا احساس ہی نہ ہوتا تھا۔ جیسے سب کچھ جادو سے ہو رہا تھا۔ وہ صرف نوکروں پر حکم چلاتی تھی۔ کبھی غور نہیں کرتی تھی۔ اگر کبھی غور کیا ہوتا تو بہت سی چیزیں سمجھ میں آجاتیں مگر اسے کیا پتہ تھا تقدیر اتنا بڑا وار کرنے والی ہے۔

کبھی کبھی وہ تنگ آجاتی اور دل چاہتا اپنی شرط واپس لے لے لیکن واپس لے لینے کے بعد کونسا راستہ تھا... غلامی.... اور انتہائی ہیبت ناک غلامی۔

کم از کم آفاق کے رویے میں تو ذرا سی لچک آئی تھی۔ سارا وقت طنز نہیں کرتا تھا نہ تمسخر آمیز لب و لہجے میں بات کرتا تھا۔ گو اس کے رویے کو اچھا رویہ ہرگز نہیں کہتے مگر وہ تعاون ضرور کر رہا تھا۔

کاش کوئی جان سکتا کہ اسے آفاق سے کتنی شدید نفرت تھی اور اس سے جان چھڑانے کے لیے وہ یہ سب پاپڑ بیل رہی تھی۔

شاید آفاق بھی نہ جان سکے۔

غرض باورچی خانے میں ایسے ایسے دل شکن واقعات ہوئے کہ جتنی بار چینی کے برتن ٹوٹے' اتنی بار اس کا دل ٹوٹا اور حوصلہ چھوٹا مگر آس ایک ایسی قوت ہے جو اسے ہر بار کہتی۔

"کوشش کیے جاؤ..."

آفاق نے بھی تو یہی کہا تھا:

بار بار کوشش میں کیا حرج ہے۔

ایک ہفتے میں نہ تو وہ صفائی ٹھیک سے کر سکی تھی اور نہ ڈھنگ سے کھانا پکا سکی تھی۔

کیونکہ دو بار اسے آفاق نے ٹوکا تھا۔

"بستر کی چادر جب بچھاتے ہیں تو اس پر ایک بھی شکن نہیں ہونا چاہیے۔

"اور غسل خانے صاف کرنے کی بجائے تم گندے کر دیتی ہو..."

شیو کی چیزیں صاف کیوں نہیں ہوتیں؟

ہر بار اس کا دل چاہا۔ جُوتا اتار کر آفاق کے منہ پر دے مارے اور کہے میں تمہاری خا
ملازمہ نہیں ہوں۔ بہت صفائیوں کا شوق ہے تو اپنی والدہ کو بُلوالو۔
مگر آہ...

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے۔
والا معاملہ درپیش تھا۔

اسی کاوش اور اُدھیڑبُن میں جب ایک مہینہ گزر گیا تو آفاق نے رات کو سوتے وقت سے کہا۔

"جو چیزیں آپ کو منگوانی ہوں۔ صبح مجھے ان کی فہرست دے دیں..."

کیا کچھ منگوانا چاہیے۔ فلکی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ابھی تک ضرورت کی ہر چیز گھر تھی اور وہ کون سا ان چیزوں سے استفادہ کر رہی تھی۔ الٹے ہر چیز ضائع کر رہی تھی۔ کیا منگواتی۔

تمام رات وہ سوچتی رہی۔ سوچ سوچ کر آخر وہ کسی نتیجے پر پہنچ گئی۔

صبح جب آفاق ناشتہ کر کے دفتر جانے لگا تو فلکی ایک تہہ کیا ہوا کاغذ لے کر آئی۔

"کیا بات ہے؟"

"کچھ منگوانا ہے۔" فلکی نے آہستہ سے کہا۔

"لاؤ فہرست؟"

آفاق نے ہاتھ بڑھایا۔

فلکی نے تہہ کیا ہوا کاغذ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

آفاق نے جب کاغذ کھول کر پڑھا تو...

اتنی زور سے قہقہہ لگایا کہ فلکی ڈر کے مارے کانپ گئی۔ پھر وہ بے اختیار قہقہے لگا کر رہا۔ ہنستا رہا...

آفاق کے اس طرح بے تحاشا ہنسنے پر فلکی کو دل ہی دل میں بہت غصہ آیا۔ بس اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔ کیا کہتی۔ اپنے نفس کو ضبط کا سبق دے ہی تھی۔ قدم قدم پر کٹھن مرحلے کھڑے تھے۔

اونہہ... وہ الوؤں کی طرح ہنسے جا رہا تھا۔

ہر ہنستے ہنستے کاغذ کو دہرا کیا اور جیب میں ڈال لیا۔ کھڑا ہو گیا۔ بریف کیس اٹھایا اور خدا
کہہ کر باہر نکل گیا۔
فلکی نے جل کر کوئی جواب نہیں دیا۔
اس میں ہنسنے کی کون سی بات تھی۔
عجیب بے تکا آدمی تھا نہ اس کے غصے کی وجہ سمجھ میں آتی نہ ہنسنے کی' نہ کوئی جلال کا وقت
نہ مسخرے پن کا۔
وہ باورچی خانے میں چلی گئی۔
خود ہی تو کہا تھا کہ اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو فہرست بنا کر دے دینا۔ اسے جس چیز کی
ضرورت تھی' اس نے لکھ دی۔
اور کیا اعتراف کرنا پڑا ہے؟ ایک ہفتہ اس نے باورچی خانے کے تجربات میں گزارا تھا۔ وہ
اتنی حوصلہ شکن تھا۔ آخر بہت سوچ بچار کے بعد اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ کھانا پکانے والی
کتابیں خرید لے۔ انہی سے کچھ مدد ملے گی۔
اور وہی اس نے کاغذ پر لکھ دی تھیں۔
اس میں تو اسے ہنسنے کا کوئی پہلو نظر نہیں آرہا تھا۔ زیادہ تر پڑھی لکھی خواتین یہ کتابیں ہی
استعمال کرتی تھیں۔ ممی کے کچن میں بھی انگریزی اور اردو کی بے شمار کتابیں تھیں۔ گو انھوں
نے کبھی کھانا نہیں پکایا تھا مگر خرید کر ضرور لاتی تھیں۔
"یہ میرے کچن کی لائبریری ہے۔"
اس نے بھی کئی بار ان کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا تھا مگر صرف تصویروں کی حد تک۔
خاص طور پر انگریزی کتابوں میں تو سَلاد اور سویٹ ڈش کی اتنی دلآویز اور اشتہا انگیز
تصویریں ہوتی ہیں کہ دل چاہتا۔ یہ سب کچھ اسی صورت میں ابھی پلیٹوں میں آجائے اور
کھالیں۔ وہ جب کوئی سَلاد یا سویٹ ڈش پسند کر کے اپنے خانساماں کو آرڈر دیتی کہ یہ بنا لائے تو
کبھی سجاوٹ اور صورت کتاب کی طرح نہ ہوتی تھی۔
"یہ کیا واہیات چیز بنا لائے ہو۔" وہ اس پر برس پڑتی۔
"مس صاحب جی وہ تصویر ہے' نقلی ہے۔ یہ اصل ہے جی اصل اور تصویر میں کچھ نہ کچھ تو
فرق ہوتا ہی ہے نا؟"
"نان سینس۔"

وہ پلیٹ اٹھا کر دور پھینک دیتی۔

لیکن آخر کسی مصرف کی تو ہوتی ہوں گی یہ کتابیں جو اس قدر چھپتی ہیں اور بے حد بکتی ہیں؟

سارا دن فلکی غصّے اور خفّت سے سلگتی رہی۔ گویا آفاق نے اس کا مذاق اڑایا تھا باور کروایا تھا کہ یہ کتابیں بھی اس کی کوئی مدد نہ کر سکیں گی۔

بہرحال سارا دن کام تو پورے کرنے تھے۔ شام کو جب آفاق آیا تو واقعی کتابوں بنڈل اٹھا لایا اور لا کے فلکی کے بستر پر پھینک دیا۔

فلکی نے لپک کر اٹھا لیا۔ اس میں اردو اور انگریزی کی تمام خانہ داری کی کتابیں تقریباً" پچیس کتابیں تھیں۔ یقیناً یہ بہترین مددگار ثابت ہوں گی۔ فلکی انھیں دیکھ م ہو گئی۔

ایک کتاب اٹھاتی۔ ورق گردانی کرتی اور رکھ دیتی... پھر دوسری اٹھا لیتی۔

"جناب! آج کھانا ملے گا یا مجھے بھی ورق گردانی سے ہی پیٹ بھرنا پڑے گا۔

آفاق نے دوبارہ اندر آ کر کہا تو وہ چونک گئی۔

جلدی سے اٹھ بیٹھی۔

آج بھی اس نے کوئی سالن نما چیز بنا چھوڑی تھی۔ ڈرتے ڈرتے کھانا میز پر لگا دیا۔

"یہ سزا ہمیں کب تک ملے گی محترمہ!" آفاق نے کالا سیاہ شوربہ پلیٹ میں ڈال کر کہا۔

فلکی چپ بیٹھی رہی۔

"اب دیکھیں یہ کتابیں ہماری سزا میں تخفیف کراتی ہیں یا عمر قید عطا کرتی ہیں۔"

فلکی نظریں جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔ ان باتوں کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں جانتی تھی۔ آفاق کچوکے لگانے سے باز نہیں آئے گا۔

فلکی اپنے لمبے لمبے ناخنوں سے روٹی توڑ کر بدمزہ شوربے میں ڈبو ڈبو کر کھاتی رہی۔

"آہا۔ اپنے ہاتھ کا پکا کتنا لذیذ لگتا ہے۔ ہے نا؟"

فلکی نے اس کی طرف ذرا کی ذرا دیکھا۔ پھر نظریں جُھکا لیں۔

"ہم نے یہ سالن پکایا ہوتا تو ہم بھی مزے مزے سے کھا رہے ہوتے۔"

فلکی نے پھر بھی کچھ نہ کہا۔

"اور یہ آپ نے ناخن کس خوشی میں بڑھا رکھے ہیں؟"

اچانک اس نے فلکی کا بایاں ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ پچھلے ایک ہفتے سے فلکی کو کیوٹیکس لگا۔

مت نہ ملی تھی۔ اس نے سپرٹ سے صاف تو کر لیے تھے مگر کام کی زیادتی کی وجہ سے سارے ن بالکل سفید پڑ چکے تھے۔

گو اس کے ہاتھ بہت خوبصورت تھے اور لمبے لمبے ناخن جب وہ رنگ لیتی تو گوری گوری لیاں گنبدوں جیسی مخروطی شکل اختیار کر لیتیں۔ پھر اس کے ہاتھ بڑے فنکارانہ لگتے۔

اب بھی کچھ برے تو نہیں لگتے تھے۔ صرف سفید سفید ناخن گِدھ کے پنجوں کی طرح نظر رہے تھے۔

آفاق کے گرم ہاتھ میں فلکی کا سرد ہاتھ کانپ رہا تھا۔

"میں پوچھ رہا ہوں۔ ان چھُریوں اور خنجروں کا آخر کیا مصرف ہے؟" اس نے فلکی کا ہاتھ چھوڑ دیا جو ٹوٹی ہوئی ڈالی کی طرح میز پر گر گیا۔ "قتل تو آپ اپنے رویّے سے بھی کر سکتی ہیں۔" وہ بولا۔

"میری سمجھ میں کبھی نہیں آیا۔ یہ خواتین آخر ناخن کیوں بڑھا لیتی ہیں۔ اگر تو ان ناخنوں سے ان کا مقصد بدنصیب مَردوں کے خونِ جگر سے رنگنا ہوتا ہے تو اور بات ہے ورنہ اس سے بدصورت فیشن میں نے کوئی اور نہیں دیکھا۔"

فلکی نے اب بھی کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔

"سنا آپ نے۔ مجھے گِدھ کے پنجے پسند نہیں ہیں۔"

"اونہہ۔" فلکی جَل کر کباب ہو گئی۔

"اور ان لمبے ناخنوں سے کوئی ڈھنگ کا کام نہیں ہو سکتا۔ برتن مانجیں گی تو سارا میل ان کے اندر چلا جائے گا۔ آٹا گوندھیں گی تو پھر بھی سارا دن ان میں سے آٹا نکالیں گی اور اگر جھاڑو دینے کے بعد ہاتھ دھونا بھول گئیں تو پھر وہ سارا گند ہمیں کھلائیں گی۔ ہاں! اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی دن کام کرتے ہوئے خدانخواستہ کوئی ناخن ٹوٹ جائے' وہ سارا دن اس ناخن کے ماتم میں بسر ہو گا ہی۔ پھر کیا خیال ہے؟"

فلکی نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی گود میں رکھ لیے تھے۔

"آپ یوں کریں کہ ان ناخنوں کا صدقہ اتار دیں۔ لائیں قینچی۔ میں ہی بسم اللہ کرتا ہوں۔"

فلکی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اب وہ اپنی مرضی سے زندہ بھی نہیں رہ سکتی۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا' ناخن بڑھائے ہوئے تھے۔ دنیا بھر کی رنگ برنگی کیوٹیکس اس کے پاس

تھیں۔ ہر کپڑے کے ساتھ نیا شیڈ استعمال کرتی تھی۔ اپنے ناخنوں کو اس نے جگر گو طرح پالا تھا اور آج اس نے ایک نیا ہی شوشہ چھوڑ دیا تھا۔

"میں خود کاٹ لوں گی۔" فلکی نے آہستہ سے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔ آپ میں انھیں خود قلم کرنے کا کبھی حوصلہ نہ پیدا ہوگا۔"

"مگر میرے ناخن آپ کو کیا کہتے ہیں۔ میں تو ان کے ساتھ ٹھیک ٹھاک کام کر لیتی ہوں

"ابھی تک آپ سے کوئی کام ٹھیک ٹھاک نہیں ہوا۔ اس غلط فہمی میں مت رہیں۔ ا وجہ یہ ہے کہ آپ اپنے ہاتھوں کو بچا بچا کر کام کرتی ہیں۔ کئی دن سے میں دیکھ رہا ہوں غسل خانہ صاف نہیں ہوتا۔ بیسن میلا ہوتا ہے۔ شیو کا سامان ویسے ہی رکھا ہوتا ہے۔ چادر کی شکنیں درست نہیں ہوتیں۔ کیا اسی کو صفائی کہتے ہیں؟"

"تو کیا شیو کا سامان بھی مجھے صاف کرنا ہوگا؟"

"ظاہر ہے یہ کام بھی آپ کو کرنا ہوگا۔"

"کیا میں تمہاری نوکرانی ہوں....؟" کہتے کہتے فلکی رک گئی۔ شیو کا سامان دھونے اسے بہت گھن آتی تھی اور ہر روز بستر کی شکنیں درست کر کے چادر لگانا بھی کس قدر مشکل تھا۔ جانے آفاق گدھوں کی طرح سوتا تھا۔ ایسے جیسے ساری رات بستر پر کشتی کھیلتا رہا ہو۔ ہمیشہ اس کا بستر شکن در شکن ہوتا۔

زندگی عذاب بنتی جا رہی تھی۔

"آپ کے برتن صاف نہیں ہوتے۔ پھلکا تک پکانا نہیں آیا۔ جو عورتیں صرف اپنے ہا کی حفاظت کرتی رہتی ہیں۔ وہ کوئی اور کام نہیں کر سکتیں۔"

"میں کوشش کروں گی کہ آئندہ یہ کام اس سے بہتر طریقے پر ہو سکیں۔" فلکی نے رو آواز میں کہا۔

"ہاں' کوشش تو ضرور کیجئے گا مگر ناخن اتار کے۔ میں آپ کو بتا دوں کہ مجھے مردار کھا والے جانوروں کے پنجے پسند نہیں۔ اگر آپ کے ہاتھ خوبصورت ہیں تو ناخن بڑھانے ضرورت نہیں۔ اپنے ہاتھوں پر اعتماد کیجئے۔ صبح جب آپ میز پر ناشتہ کے لیے آئیں تو کے ہاتھ بالکل صاف ہونے چاہئیں۔" یہ کہہ کر آفاق میز سے اٹھ گیا۔

فلکی تھوڑی دیر بیٹھی رہی۔ پھر اٹھ کر برتن اٹھائے۔ میز صاف کی اور اپنے کمرے آگئی۔ اب آفاق اپنے کمرے میں بیٹھا کوئی کام کر رہا تھا۔

وہ اپنے بستر پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی اور اپنے دونوں پیارے پیارے ہاتھ گود میں رکھ لیے۔

"تیرا ہاتھ' ہاتھ میں آگیا کہ چراغ راہ میں جل گئے۔"

... فلکی کے کانوں میں جیسے کوئی آواز گونجنے لگی۔ اف کیا زمانہ تھا وہ۔ بوبی جب بھی اس کے دلکش ہاتھوں کو تھام لیتا' فوراً گانے لگتا۔

مجھے سہل ہو گئیں منزلیں کہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے۔

ایک صرف اسے بوبی کی آواز ہی تو پسند تھی۔ گہری... گمبھیر... اداس اداس...

وہ اکثر اس کا ہاتھ پکڑ کر یہی گیت گایا کرتا تھا اور پھر کہتا تھا۔

"فلکی تمہارے ہاتھ ریشم کے تکیے ہیں۔ میں صرف ان ہاتھوں پر اپنی جان دے سکتا ہوں۔ مجھے انھیں چومنے کی اجازت دو۔"

اور فلکی جلدی سے ہاتھ چھڑا لیا کرتی تھی۔

"نان سنس۔ میرے ہاتھ خراب کر دو گے۔"

اور بوبی جب بھی کہیں سفر پر جاتا' اس کے لیے اسٹاکش قسم کی کیوٹکس کی شیشیاں اور ہینڈ لوشن لایا کرتا۔

ایک اور گانا بھی بوبی بہت گاتا تھا۔

جلتے ہیں جس کے لیے تیری آنکھوں کے دیے
ڈھونڈ لایا ہوں وہی گیت میں تیرے لیے

بوبی فلکی کی آنکھوں کا بھی دیوانہ تھا۔

فلکی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔ اس نے خود ایک ناقدرے کا ہاتھ تھاما۔ جسے اس کے ہاتھ بدصورت لگتے تھے اور جو اسے رُلا کر خوش ہوتا تھا۔ ان حسین آنکھوں کا مقدر ہی رونا بن گیا تھا۔

تھوڑی دیر رو کر فلکی کو صبر سا آگیا۔ پھر وہ اٹھی۔ اپنا نیل کٹر تلاش کیا اور بڑے حوصلے سے اپنے ناخن کاٹنے لگی۔ پر سوں اس کا ایک ناخن واقعی ذرا سا ٹوٹ گیا تھا۔ انگلی میں درد بیٹھ گیا تھا مگر اس نے ناخن کو جدا کرنا مناسب خیال نہیں کیا تھا۔

آج اس نے ابتدا اسی ٹوٹے ہوئے ناخن سے کی۔ رفتہ رفتہ بے دلی کے ساتھ اس نے اپنے دسوں ناخن اتار دیے۔ اس کی انگلیاں یوں نظر آنے لگیں جیسے پھل دار درختوں کی شاخیں کاٹ دیں تو وہ ٹنڈ منڈ نظر آنے لگتے ہیں۔

نیل کٹر ایک طرف رکھ کے' اس نے کٹے ناخن کے تراشے اکٹھے کر کے اپنی ہتھیلی پر
لیے۔ ہلال کی شکل کے یہ ٹکڑے کس معرف کے تھے۔ ہتھیلی پر پڑے چبھ رہے تھے۔ نہ جا
کتنے عرصے سے پالے ہوئے تھے۔ اب تو اسے یاد بھی نہ تھا۔
اس نے اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کی دراز کھولی اور اپنی بہت سی حسرتوں کی یہ ٹکڑے بھی در
میں بند کر کے سو گئی۔

صبح سے اب اس کا ایک کام اور بڑھ گیا تھا۔
جب بھی کام سے فارغ ہوتی۔ خانہ داری کی کتابیں لے کر بیٹھ جاتی۔ پڑھ پڑھ کے جب کچھ
اس کے پلّے نہیں پڑا تو اس نے سوچا تجربہ کرنا چاہیے۔ روز دو ایک چیزیں بنائی جائیں' تب
آئے گی۔
گھر میں سبھی کچھ تھا مگر یہ کیا مصیبت تھی کہ ان کتابوں میں وزن لکھے ہوئے تھے۔ اب اگر
آفاق سے ترازو لانے کو کہتی تو وہ اس کا کتنا مذاق اڑاتا۔ اب باورچی خانے میں ہر خاتون
کو پکڑ کر تو نہیں کھڑی ہو سکتی۔ اصولاً" تو لکھنے والوں کو چھوٹے چمچ اور بڑے چمچ کا اندازہ
ہونا چاہیے۔ اب کیا کیا جائے؟
پھر بھی اللہ کا نام لے کر اس نے شروع کر دیا۔ کتاب پڑھ کر روز ایک سالن بناتی اور ایک
بناتی۔ مگر روز ہی کوئی نئی سی چیز بن جاتی۔ وہ بڑی حیران ہوتی کہ آخر کون سی شے رہ جاتی
جو اس میں استعمال ہوتی ہے۔
ایک دن آفاق نے اسے بتایا کہ "ان نسخوں میں عقل بھی استعمال ہوتی ہے۔
چونکہ خواتین کے پاس کم ہوتی ہے اس لیے انھوں نے کتاب میں اس کا ذکر نہیں کیا۔"
جل ہی تو گئی پھر اردو میں لکھی ہوئی کتابیں اس کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہی تھیں۔ اس نے
یری کی کتابوں کا سہارا لیا۔ وہ قدرے آسان معلوم ہوئیں اور انگلش کھانے بھی زیادہ
ل نہ لگے۔ زیادہ تر سبزیوں اور گوشت کو ابالنے اور فرائی کرنے کے تھے۔ اس واسطے اس
سمجھ میں آ گئے۔ پھر انگلش سوپ ڈش بنانے جس قدر آسان تھے کھانے میں اتنے ہی لذیذ

اس نے اللہ کا نام لے کر سارے انگلش کھانے بنانے شروع کر دیے۔
پہلے سوپ آجاتا۔ پھر سلاد اور باقی تمام لوازمات۔

آٹھ دن تک آفاق چپ چاپ کھاتا رہا اور ایک ہفتے کے بعد بولا۔

"میری میعاد پوری ہوگئی ہے یا نہیں؟"

"کیا مطلب...؟" فلکی تو دل میں خوش ہو رہی تھی کہ اس نے میدان مار لیا ہے۔

"بھئی اگر کسی ڈاکٹر نے آپ سے کہا تھا کہ مجھے ہفتہ بھر بدمزہ یا پھیکا کھانا کھلانا ہے تو چکا ہے۔ اب میرے منہ کا ذائقہ یوں ہو رہا ہے جیسے واقعی میں ہسپتال میں ہوں اور بھی ٹھکانے پر آگیا ہے۔ ویسے تو فالتو چربی سے میں خود بھی خوف کھاتا ہوں لیکن آ گزار ہوں کہ آپ نے رہی سہی چربی اتارنے میں میری مدد کی لیکن مجھے ہسپتال کے ا سے چھٹی کب ملے گی؟"

فلکی کا دل ٹوٹ گیا۔

وہ اس آدمی کا دل کبھی نہیں جیت سکتی۔ اب تو بمشکل اسے سمجھ آئی تھی ان کھا اس نے ٹوک دیا۔

"آپ خود بتا دیا کریں کیا کھانا پسند کرتے ہیں؟" فلکی نے ٹوٹے ہوئے لہجے کے ر

"میں آپ کی پسند کی چیز پکا دیا کروں گی۔"

"بھئی مجھے تو دال بہت پسند ہے۔ خصوصاً ماش کی دال اور جب سے آپ آئی ہیں منہ نہیں دیکھا۔ ورنہ ہفتے میں ایک دن ماش کی دال پکواتا تھا۔ آپ کو دال تو پکانا آتی اس نے فلکی سے پوچھا۔

"نہیں۔" فلکی نے صاف جواب دے دیا۔

"کیوں...."

"کیونکہ ہمارے گھر میں دال نہیں پکا کرتی تھی۔"

"ہیں... یہ کیا کہہ دیا آپ نے..."

"سچ کہہ رہی ہوں۔"

"پاکستان کا کوئی گھر ایسا نہیں جہاں یہ دال نہ پکتی ہو۔"

"ہمارے ہاں کوئی پسند نہیں کرتا تھا۔ کبھی کبھی نوکروں کے لیے پکتی تھی۔"

"اوہ۔ میں تو بھول ہی گیا تھا کہ امراء دال کو پسند نہیں کرتے مگر ہم نے تو سنا تھا کہ میں حرام کی کمائی ہو' وہاں دال نہیں پکتی..."

یہ سنتے ہی غصے سے فلکی کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اب اس کا ہاتھ میرے باپ کے گریبان

ہنچ۔

اس نے غصے کو دبایا اور پھر بولی۔

"ڈیڈی کو نفخ کی تکلیف تھی اور ممی کو گردے میں درد رہا کرتا تھا۔"

"ویسے آپ کو معلوم ہے ہمارے ملک میں کتنی قسم کی دالیں ہوتی ہیں؟"

"جی۔ چار پانچ تو ہوتی ہیں۔"

"نام بتایئے ذرا؟"

"نام سے آپ کو کیا غرض ہے۔ بتایئے۔ میں پکا دوں گی۔"

"جب آپ اسے نام سے نہ پہچانتی ہوں گی۔ تو پکائیں گی کیا... بتایئے..."

"چنا' ماش اور مونگ۔"

"ایک اور دال بھی ہوتی ہے جسے مسور کی دال کہتے ہیں اور اس کی نسبت سے ایک محاورہ ل ایجاد ہوا ہے۔ یہ منہ اور مسور کی دال' سنا ہے کبھی آپ نے؟"

فلکی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

شکر ہے آپ نے سن رکھا ہے۔ ورنہ مجھے بھی آپ نے یہی کہنا تھا۔ اپنا منہ دیکھو مسور کی ل مانگ رہے ہو۔ ویسے سبز مونگ اور سبز ماش آپ نے کبھی دیکھے ہیں؟"

"نہیں..."

فلکی نے سر ہلا دیا۔

"سب دالیں پکانا آتی ہیں؟"

"دال پکانا کون سا مشکل کام ہے۔" فلکی نے جل کر کہا۔

"کل دیکھ لیں گے۔"

"پہلے چلئے میں دالوں سے آپ کا تعارف کرادوں۔" آفاق کھڑا ہوگیا تو فلکی بھی کھڑی ہوگئی۔ وہ سیدھا پینٹری میں گیا۔ ایک الماری کھولی۔ وہاں شیشے کے مرتبانوں میں دالیں پڑی ہوئی تھیں۔ باہر چٹ پر ان کے نام لکھے ہوئے تھے۔

"یہ چنے کی دال ہے موٹی موٹی۔ اسے ماش کہتے ہیں۔ یہ مونگ ہے اور یہ مسور... اور پھر اس طرف سبز مونگ ہے اور یہ سبز ماش۔ یہ دالیں بھی پکانے کے کام آتی ہیں۔ یہ ثابت مسور ہندوستان کے لوگوں کا پسندیدہ کھانا ہے۔ اس مرتبان میں ثابت چنے ہیں جنھیں گلانے اور نے کے لیے بڑی مہارت اور مشاقی کی ضرورت ہے۔ کل کیا بنے گا پھر؟"

"ماش کی دال۔" فلکی نے آہستہ سے کہا۔

"شاباش!"

آفاق وہاں سے چلا گیا۔

فلکی نے دوسرے دن ماش کی دال پکائی۔ پانی الگ اور دال الگ تیر رہی تھی۔

"اچھا تو آپ کے ہاں کبھی کبھار اس قسم کی دال پکا کرتی تھی۔"

"مجھے یاد نہیں۔" فلکی نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں' تو کل کیا پکائیں گی آپ؟"

"جو آپ کھائیں گے۔"

"میں کیا کھاؤں گا؟ میں تو صرف دیکھوں گا۔ حالات نے بہت مجبور کیا تو چکھ لوں گا ایک مہینے سے ایسا مزے دار کھانا پک رہا ہے کہ میں صرف چکھنے پر اکتفا کر رہا ہوں۔ نہیں رہیں۔ میرا فگر کیسا لاجواب ہو گیا ہے۔" وہ کھڑا ہو گیا۔

فلکی نے بے اختیار اس کی طرف دیکھا۔ سر سے پاؤں تک دیکھا۔

کیسا شاندار آدمی تھا۔ کسا کسایا۔ کسرتی جسم۔ جس طرح چیتا ہوتا ہے۔ کہیں ! گوشت نہ تھا۔ سفید پینٹ اور سفید قمیض میں وہ بے حد بھلا لگ رہا تھا۔ بال بکھر کر آ گئے تھے۔

فلکی اسے بے اختیار دیکھتی رہ گئی۔ بالکل اس طرح جس طرح ماں بچے کی بلائیں آنکھ آنکھوں میں لیتی ہے۔

"ہوں۔" آفاق نے گلا صاف کیا۔

"تو کچھ آپ کا ارادہ یا رائے۔ میرے بارے میں بدلی؟"

فلکی چونک گئی۔

کمینہ تھا۔ نظروں کی چوری پکڑتا تھا۔ اب اس نے زبان پر قابو پالیا تھا تاکہ وہ زبان کی غلطیاں نہ پکڑے لیکن اب اس نے نظر کی چوریاں پکڑنی شروع کر دی تھیں۔

خداوندا! وہ کیا کرے؟ کیا نظروں پر تالے لگا لے یا اسے دیکھ کر اپنی آنکھیں موند کرے۔ منہ بند کر کے تو گزارہ ہو رہا تھا۔ آنکھیں بند کر کے کیونکر جی سکے گی۔

ایک عذاب سا اس کے چہرے پر ابھرا۔ وہ جلدی جلدی میز پر سے برتن سمیٹنے لگی۔

آج آفاق ذرا جلدی سونے کے لیے آ گیا تھا ورنہ وہ تو ہمیشہ رات کے کسی پہر آتا تھا۔

سو چکی ہوتی تھی۔ اب وہ آ کر اپنے بستر پر بیٹھا تو فلکی کا دل دھڑکنے لگا۔

فلکی کو اپنے دل پر غصہ آیا۔ بھلا اس میں یوں دھڑ دھڑ کرنے کی کیا وجہ تھی؟

جوتے اتار کر وہ پلنگ پر لیٹ گیا اور لیٹے لیٹے سر اٹھا کر فلکی کی طرف دیکھا اور بولا۔

"کل آپ کوفتے پکائیں گی؟"

شکر ہے فلکی نے سب کتابوں کا اچھی طرح معاینہ کر لیا تھا۔ بولی۔

"نرگسی کوفتے یا کچے قیمے کے؟"

"جناب میں اتنا بدذوق نہیں ہوں کہ نرگسی کوفتے کھانے لگوں اور اگر کھانے ہی پڑے تو نرگسی آنکھوں والی محترمہ کے ہاتھوں سے کھانا پسند کروں گا۔"

"جی' دوسرے کوفتے میں بنا لوں گی۔" فلکی نے دبی دبی آواز میں کہا۔

"سوچ لیجئے۔ کام ذرا مشکل ہے۔ پہلے گوشت کا قیمہ بنانا' پھر قیمے کو گوشت کی شکل دینا۔ کھاتے وقت پھر قیمہ بنانا۔ بے ہودہ حرکت ہے نا؟"

فلکی چپ رہی۔

"اگر آپ پکالیں تو میں یہ بیہودہ حرکت کر لوں گا۔"

اس نے کمبل اوڑھا اور لیٹ گیا۔

چند منٹوں میں اس کی خراٹوں کی آوازیں آنے لگیں۔ کس قدر خوش قسمت آدمی ہے۔ فوراً سو جاتا ہے۔ فلکی نے دل میں سوچا۔ ایک وہ ہے کہ کتنے گھنٹے کروٹیں بدلتی رہتی ہے۔ تب کہیں جا کر نیند آتی ہے۔

فلکی نے دو تین امورِ خانہ داری کی کتابیں اٹھائیں اور بڑے غور سے کوفتوں کی ساری ترکیبیں نکال کر پڑھنے لگی۔

"یہ کوفتے ہیں' قیمہ ہے یا قیمے کا حلوہ ہے؟" آفاق نے ڈش کا ڈھکنا اٹھایا اور فلکی سے پوچھا۔

فلکی نظریں جھکائے بیٹھی رہی۔ کچھ بھی نہیں بولی۔

"بھئی بتایئے نا؟ اسے کھانے کا کیا طریقہ ہے؟"

"میں نے... میں نے بہت کوشش کی مگر یہ جڑتے ہی نہیں تھے۔ ہر بار بکھر جاتے تھے۔"

"تو آپ نے گوند استعمال کی ہوتی؟"

"گوند...؟" فلکی حیرت سے چیخی "گوند سے کوفتے جڑ جاتے ہیں؟"

"جی ہاں۔" آفاق سنجیدگی سے بولا۔

"مگر کسی کتاب میں گوند کا حوالہ نہیں تھا۔ میں کس طرح لگا لیتی۔"

"آفرین ہے تمہاری اماں پر۔" یہ کہہ کر آفاق اس قدر زور سے ہنسا کہ فلکی کو اپنا ہوا محسوس ہوا۔

ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "میں نے سن رکھا تھا کہ اکثر عورتیں ا ہیں مگر اس حد تک' یہ مجھے آج ہی معلوم ہوا..."

فلکی کے چہرے پر ناگوار سی شکنیں نمودار ہوئیں۔

ہنس ہنس کر جب وہ بے حال ہوگیا تو پھر اس نے تھوڑا سا سالن اپنی پلیٹ میں ڈال لیا "یہ آپ نے کوفتوں کا جلوس نکالا ہوا..." یہ کہہ کر اس نے نوالہ منہ میں رکھا۔

فلکی کا دل خوف کے مارے دھڑک رہا تھا کہ ابھی وہ نوالہ تھوک دے گا۔ مگر ا ہوئی۔ آفاق وہ نوالہ کھا گیا۔ اس نے ایک اور نوالہ کھایا... پھر ایک اور.... فلکی کو اپنی پر یقین نہیں آرہا تھا۔ آفاق نے دیکھتے دیکھتے ایک پھلکا ختم کرلیا تھا اور یہ پہلا موقع تھا کے ہاتھ کے پکے ہوئے سالن کے ساتھ اس نے ایک پھلکا کھالیا تھا۔

فلکی کو یوں حیرت سے اپنی طرف تکتا دیکھ کر آفاق رک گیا۔

"آپ مجھے نظر لگا رہی ہیں۔"

"نہیں۔" فلکی نے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا۔

"کیا کریں۔ پیٹ بڑا پاپی ہے۔ سب کچھ کھانے پر مجبور کرتا ہے۔ کب تک بھ جائے۔"

فلکی ہنسنے لگی۔ آفاق کھانے کے لیے کبھی مجبور نہیں ہوسکتا نہ اسے مجبور کیا جاسکتا ہے۔ پھر وہ خود ہی بولا۔

"سچ بات بتاؤں۔ سالن کا ذائقہ بہت اچھا ہے۔ میں نے کھا کر دیکھا۔ مجھے پسند آیا۔ ا مطلب ہے آپ نے خلوص سے کوشش کی تھی لیکن واقعی کوفتہ بنانا اور اسے سالم رکھنا آ نہیں آیا۔ آپ کا قصور نہیں۔ اکثر لوگ کوفتے بنانا نہیں جانتے۔ اس کے لیے بڑی مشاق ضرورت ہوتی ہے اور پریکٹس کی بھی۔ آپ پریکٹس کریں گی تو ایک دن بنالیں گی کیونکہ آپ کا ہاتھ رفتہ رفتہ ذائقے کی طرف آرہا ہے۔ گو سالن کی شکل خراب ہے مگر ذائقہ اچھا۔ آنکھیں بند کرکے کھایا جاسکتا ہے۔"

فلکی نے ٹھنڈی سانس چھوڑ کر نظریں جھکالیں۔

"میں سوچ رہا ہوں ویسے یہ کتنا خوب صورت تضاد ہے۔"

"کونسا...؟" فلکی چونکی۔

"آپ کی شکل خوب صورت ہے مگر ذائقہ بدمزہ ہے۔ سالن کی شکل اچھی نہیں مگر قہ..."

"اونہہ..."

فلکی کا جی جل گیا۔ اس کا جی چاہا کہہ دے تم نے مجھے چکھا ہی کب ہے۔ مگر چپ رہنا لاب تھا۔ پھر اُتر آیا تھا اپنی خباثتوں پر۔ ذلیل انسان ہے کچوکے لگانے سے باز نہیں آئے گا۔

آفاق کھڑا ہوگیا۔

"چھٹی کے روز میں آپ کو کوفتے بنانے کی ترکیب سمجھا دوں گا۔"

"آپ...؟"

"جی میں... آپ نے کیا سمجھ رکھا ہے۔ میری امی نے مجھے امورِ خانہ داری میں طاق کردیا ہے۔"

"کیوں؟"

"انھوں نے کہا تھا۔ آج کل زمانہ نازک ہے۔ پھوہڑ اور بدسلیقہ لڑکوں کو پڑھی لکھی' طبصورت اور امیر لڑکیاں نہیں ملتیں۔ اب تو اسی لڑکے کی قسمت جاگتی ہے جو امورِ خانہ داری' سلائی پروئی' صفائی اور کڑھائی میں ماہر ہو..."

اس بات پر غصہ کرنے کی بجائے فلکی کی ہنسی نکل گئی۔

آفاق نے اسے مزکر دیکھا۔

"جب میں آپ کے کام آؤں گا' تب آپ کو یقین آئے گا کہ میری امی ٹھیک کہتی تھیں۔"

"آپ کو اور کیا کیا پکانا آتا ہے؟" فلکی نے پوچھا۔

"سبھی کچھ آتا ہے۔ فرمائیں آپ کو کیا پکا کر کھلاؤں؟"

فلکی نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

"بدمزہ کھانے کھا کھا کر میں تھک گیا ہوں۔ اور میں جانتا ہوں آپ کو ایک اچھے استاد کی ضرورت ہے۔ یہ کتابیں اگر مددگار ہوتیں تو آج ساری دنیا کی عورتیں خانہ دار ہوتیں۔ اتنے زیادہ ہوٹل نہ کھلے ہوتے۔ خانہ داری میں سب سے اچھا استاد صرف اپنی ماں ہوتی ہے۔ ہر گھر

کا ایک طور طریقہ ہوتا ہے۔ ہر ماں اپنے ساتھ صدیوں کا تجربہ لاتی ہے جو ماں سے
سینہ چل رہا ہوتا ہے۔ ہر عورت کے ہاتھ کا ذائقہ الگ ہوتا ہے۔ ذائقے میں اس
نیت اور طہارتِ نفس شامل ہوتی ہے۔ محنتی اور دیانت دار عورت کے ہاتھ کی پکی
شے خراب نہیں ہوتی۔ سمجھیں...؟"

فلکی آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے آج تک ایسی باتیں نہیں سنی تھ
"جو خواتین یہ کہتی ہیں کہ انھیں امورِ خانہ داری سے نفرت ہے وہ یہ گندہ کا
کر سکتیں۔ وہ صرف دفتر کی رونق بڑھا سکتی ہیں یا میز کرسی پر بیٹھ کر کام کر سکتی ہیں۔ یہ
نقلی عورتیں کہتا ہوں۔ وہ ایک مصنوعی کام سے رغبت پیدا کرتی ہیں اور اپنے اصل م
ہٹ جاتی ہیں۔ عورت بنیادی طور پر ماں ہوتی ہے اور ماں باورچی خانے کی روح ہوتی
گھر کے باورچی خانے سے مختلف قسم کی خوشبوئیں نہ اٹھیں۔ اس گھر کے بچے اور
خوش نہیں رہ سکتے۔ وہ گھسا پٹا محاورہ تو تم نے بھی سنا ہوگا:

A way to man's heart is through his stomach

فلکی نے اثبات میں سر ہلایا۔

حقیقت میں ان کی سمجھ میں بھی یہ محاورہ آج ہی آیا تھا۔ ورنہ اس نے کئی بار سنا تھا
بار پڑھا تھا مگر وہ اکثر سوچتی بھلا مرد کے دل کا راستہ پیٹ سے ہو کر کیو نکر جاتا ہے۔ پیٹ
مراد ہے۔ اسے سمجھ نہ آتی تھی۔ وہ سمجھتی تھی۔ مرد کو جوانی مسخر کرلیتی ہے۔ اسے اچھ
بھاتی ہے۔ پڑھی لکھی لڑکی سے دبتا ہے۔ دولت مرعوب کرلیتی ہے اور جس عورت کے پ
سب کچھ ہو۔ وہ مرد کو اپنی انگلیوں پر نچا سکتی ہے۔ لیکن آج معلوم ہوا کہ مرد کو مسخر کر
اصل گُر کیا ہے اور یہ گُر ممی نے تو اسے نہیں بتایا تھا خود ممی کو بھی یہ گُر نہیں آتا تھا۔

پھر پتہ نہیں ممی ڈیڈی کو انگلیوں پر کیسے نچا رہی تھیں۔ آخر ممی نے مجھے وہ منتر کیو
بتایا۔

ہو سکتا ہے۔ ڈیڈی بنیادی طور پر کمزور مرد ہوں اور ممی نے ویسے ہی انھیں دبا لیا ہو۔
مگر یہ آفاق؟ یہ تو پتہ نہیں کس قسم کا مرد ہے اور کیسی پرانی پرانی زنگ آلود باتیں کرتا ہے
بہرحال یہ باتیں فلکی کے دل کو لگ رہی تھیں۔

آفاق اپنے کمرے میں چلا گیا اور اپنی نئی سوچوں سے الجھتے الجھتے اس نے سارے ب
اٹھائے۔ میز صاف کی اور اپنے کمرے میں آ گئی۔

صبح ناشتے کی میز پر اس نے آفاق سے پوچھا۔

"آج آپ کیا کھائیں گے؟"

"آپ کو بھی گوشت پکالیں گی؟"

"جی کوشش کروں گی۔"

چائے پیتے پیتے آفاق نے نظر اٹھا کر بڑے غور سے فلکی کی آنکھوں میں جھانکا۔

فلکی کپکپا گئی۔

جیسے پوچھ رہی ہو۔ "کیا بات ہے؟"

"آج آپ نے انتہائی مناسب فقرہ کہا ہے۔"

آفاق پھر چائے پینے لگا۔

"میں نے سوچا ہے۔ میں آپ کو سب کچھ سکھا دوں گا۔ جو لوگ کہتے ہیں' وہ کوشش کریں
گے' ان کے اندر جذبہ ہوتا ہے۔ جھوٹی اکڑ نہیں ہوتی۔"

آفاق نے اسے کاغذ پر ایک ہفتے کا مینو بنا کر دیا اور بولا۔

"آپ پورا ہفتہ ان چیزوں کی ٹرائی کریں۔ اس سے مجھے اندازہ ہو جائے گا کہ آپ کو کیا سمجھ
آ گیا ہے اور کیا کیا کچھ سمجھانا ہے۔"

فلکی نے وہ کاغذ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

آفاق دفتر چلا گیا۔

اگلا ہفتہ کافی سنسنی خیز اور تجرباتی تھا۔

صبح صبح دفتر جاکر آفاق گیارہ بجے آجاتا۔ پہلے دن تو فلکی اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ کچھ شاید کوئی چیز بھول گیا ہے۔ لینے آیا ہے۔

وہ جھاڑو اٹھائے برآمدے میں نکل آئی اور اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"کیا بات ہے؟" وہ اس کا ہونق چہرہ دیکھ کر بولا۔

"کچھ نہیں' میں تو آپ کو دیکھنے آئی تھی۔"

"میں نے سمجھا۔ جھاڑو سے میری مرمت کرنے آئی ہیں۔ ویسے استقبال کا یہ طریقہ بھی ہے۔"

فلکی نے شرمندہ ہو کر جھاڑو پیچھے چھپالیا۔

آفاق اندر چلا گیا۔ فلکی باورچی خانے میں چلی گئی۔ ابھی وہ صفائی کر رہی تھی کہ آفاق چڑھاتا ہوا آگیا۔

"آج آپ کو پہلا سبق ملے گا۔"

فلکی نے جلدی سے جھاڑو چھوڑ دی۔

"پہلے کام ختم کرو۔" آفاق نے جھاڑو کی طرف اشارہ کیا۔ "جھاڑو کبھی راستے میں نہیں چھوڑنی چاہیے۔ صفائی کر کے اسے الماری میں چھپا دینا چاہیے۔ یہ نظروں کو اچھی نہیں لگتی پھر ہاتھ دھو کر یہاں آجاؤ۔"

فلکی نے جیسے سب کچھ ایک تابعدار شاگرد کی طرح کیا اور باورچی خانے میں آگئی۔

"آج میں آپ کو ماش کی دال کے بارے میں بتاؤں گا کہ یہ کس طرح اور کتنے طریقوں سے بن سکتی ہے۔ دنیا میں چونکہ ذہین لوگ پیدا ہوتے رہتے ہیں' اس لیے کھانوں کی ترکیبیں بڑھتی رہتی ہیں۔ میری امی جن طریقوں سے پکاتی ہیں' وہ یہ ہیں: بھنی ہوئی ماش کی دال' بگھاری

ہوئی ماش کی دال' ماش کی دال اور گوشت' ماش کی دال اور قیمہ' ماش اور چنے کی دال ملا کر بھی پکائی جاتی ہے۔ ماش کی دال کی کھچڑی بھی پکتی ہے مگر کھچڑی میں عام طور پر سبز دال ہی اچھی لگتی ہے۔ ماش کی دال کو جس طرح بھی پکانا مقصود ہو' پہلے اسے صاف کر کے بھگو دینا چاہیے۔ پکانے میں آسانی ہو جاتی ہے۔"

پھر اس نے اتنی اچھی طرح سے دو تین مختلف طریقوں سے دال پکانا سکھایا کہ دل ہی دل میں فلکی عش عش کرتی رہ گئی۔

سارا کام دو گھنٹے میں ہو گیا۔

دوپہر کا کھانا بہت اچھا تھا۔ آفاق نے سلاد بھی بنایا اور اسے سکھایا کس طرح مختلف قسم کا سلاد بناتے ہیں۔

فلکی کی حیرت دور نہیں ہو رہی تھی۔

آفاق ہنس پڑا۔

"کیوں؟ اس قدر حیرت کی کیا بات ہے؟"

"میں حیران ہو رہی ہوں۔ اتنی مصروف زندگی میں بھلا آپ نے یہ سب کب اور کیسے سیکھا۔"

"آپ کو معلوم ہے نا؟ میں کافی عرصہ امریکہ میں رہا ہوں۔ جب میرے ابا جی زندہ تھے۔ وہ پاکستان میں رہتے تھے اور میری امی چھ مہینے ابا جی کے ساتھ رہتی تھیں اور چھ مہینے امریکہ میں میرے پاس رہتی تھیں۔ وہ اتنے اچھے اچھے کھانے بناتی تھیں کہ ان کے آنے کے بعد میں وہاں بھوکا رہا کرتا تھا۔ پھر میں نے اس کا یہی حل نکالا کہ جب وہ وہاں ہوں اور کھانا پکایا کریں تو میں ان کی مدد کیا کروں۔ اس طرح میں سیکھتا گیا۔ ان کے آنے کے بعد پکایا کرتا تھا۔ بلکہ خود امی جب میرا پکا ہوا کھانا کھایا کرتیں تو بے حد حیران ہوتیں کہ میں نے یہ سب کیسے سیکھ لیا۔"

"آپ کی بہن بھی ہے؟"

"ہاں ہے۔ ثوبیہ میری بہن بہت سگھڑ لڑکی ہے۔ اب وہ سولہ سال کی ہے۔ سینئر کیمرج میں پڑھتی ہے۔ اگلے سال میں اسے پاکستان لے آؤں گا۔ ہمارے ہاں لڑکیوں کی شادی جلد کر دیتے ہیں۔ میری بہن ابھی سے بہت اچھا کھانا پکاتی ہے۔ وہاں رہنے کے باوجود امی نے اسے ایک صحیح اور مسلمان عورت کی سی تربیت دی ہے۔"

"وہ لوگ وہاں کیوں رہتے ہیں؟" فلکی نے پوچھا۔

اسحٰق کو میں نے وہاں بلا لیا تھا۔ اس نے تعلیم وہیں مکمل کی۔ پھر ثوبیہ کو بھی بلا لیا تو نے امی کو بھی بھیج دیا۔ ان کا خیال تھا ماں کو بچوں کے ساتھ رہنا چاہیے۔ سال میں ایک بار وہ بھی جاتے تھے۔ ابا جی کے انتقال کے بعد مجھے یہاں کاروبار سنبھالنے کے لیے آنا اسحٰق وہاں پڑھتا بھی ہے اور میرا کاروبار بھی سنبھالتا ہے۔ اس واسطے میں نے امی کو وہیں دیا۔ ویسے وہ لوگ سال میں ایک بار یہاں آتے ہیں۔ آپ کی قسمت میں اگر ثوبیہ سے ملنا آپ اس سے بہت کچھ سیکھ سکیں گی۔"

فلکی کو اگرچہ آفاق کے فقرے کا مطلب سمجھ نہیں آیا۔ مگر اسے اس فقرے سے بہت آیا اور دل ہی دل میں اس کی بہن سے حسد محسوس ہوا۔ ہر بھائی کو اپنی بہن ساری دنیا اچھی لگتی ہے۔ کاش اس کا بھی کوئی بھائی ہوتا!

جلتی کڑھتی وہ سو گئی۔

پھر ایسا ہونے لگا کہ آفاق ہر روز دفتر سے جلدی آجاتا اور اسے کچھ نہ کچھ بتا کرتا تا۔ دوپہر کو آجاتا اور کبھی شام کو۔ دوپہر کا کھانا وہ برائے نام کھاتا تھا۔ ناشتہ خوب اچھی طرح کر جاتا تھا۔ شام کو دو چار کھانے پکانے سے فلکی کتراتی تھی۔

آفاق نے پوچھا تو بولی۔

"ہمارے ہاں تو دوپہر کے کھانے پر اہتمام کیا جاتا تھا۔ کیونکہ ڈیڈی بھی اور ممی کی سہیلیا بھی اکثر دوپہر کے کھانے پر آجاتے تھے۔ رات کا کھانا تو سب برائے نام کھاتے تھے۔"

"ایسے کہیے کہ ان گھروں میں رات کا کھانا پُرتکلف نہیں پکایا جاتا جہاں ممی اور پاپا کلب ڈنر لیتے ہیں اور بچے پڈنگ یا چیونگ گم چبا کر سو جاتے ہیں۔ باقی خانساماں لوگ اور آیا رہ جا ہیں۔ ہیں نا؟"

فلکی نے سوچا۔ ناحق بھڑوں کے چھتے کو چھیڑا۔ اب اس کے ماں باپ کے بخیے اُدھیڑ شروع کردے گا۔

وہ پھر بولا...

"مگر جن گھروں میں محنتی اور تھکے ہوئے شوہر یہ سوچ کر آتے ہیں کہ اطمینان سے اپنے با بچوں کے پاس بیٹھیں گے اور گھر کا رزقِ حلال کھا کر اللہ کا شکر ادا کریں گے۔ وہاں اچھی بیویا رات کے کھانے کا اہتمام کرتی ہیں۔"

فلکی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ایک دن آفاق نے اس سے پوچھا۔

"آپ کوئی سویٹ ڈش بھی بنانا جانتی ہیں یا نہیں؟ کیونکہ مجھے تو کھانے کے بعد میٹھا کھانے کی ات عادت ہے..."

"آپ کے لبوں سے میٹھا بول تو نکلتا نہیں۔ یہ خوب صورت ہاتھ میٹھا بنانا کیا جانتے ہوں گے؟"

"مجھے کسٹرڈ اور جیلی وغیرہ بنانی آتی ہے۔"

"یہ وغیرہ کس ڈش کا نام ہے۔"

فلکی چپ ہو گئی۔

"ویسے ہم پاکستانی لوگ کسٹرڈ اور جیلی کو میٹھا نہیں کہتے۔ نخرہ کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو بہت خوب صورت اور روایتی میٹھے موجود ہیں۔"

اس پر فلکی چپ ہو گئی۔

"کبھی کھیر پکائی ہے آپ نے؟"

"جی۔ شادیوں پر اکثر..."

"اسے کھیر نہیں کہتے۔ فرنی کہتے ہیں۔ کھیر دودھ اور چاول سے بنتی ہے اور بڑی نفیس چیز ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ شاہی ٹکڑے ہیں۔ پیٹھے کا حلوہ ہے' سوجی کا حلوہ ہے' بیسن کا حلوہ ہے' انڈوں کا حلوہ ہے' چاولوں کا زردہ' سویوں کا زردہ' سوجی کی کھیر' گاجر کا حلوہ ہے' گجریلا ہے' واہ میری امی بہت لذیذ گجریلا بناتی ہیں۔ سوچ کر ہی منہ میں پانی آرہا ہے۔"

"بس اور نام نہ گنوائیے' پہلے یہ تو پکانا سکھائیے۔"

"اچھا تو آپ نے مجھے باقاعدہ خانساماں تصور کرلیا ہے۔"

"خانساماں تو نہیں' استاد ضرور مان لیا ہے۔"

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔" آفاق نے فلکی کی نبض پر ہاتھ رکھ دیا۔

اتنا ذرا سا چھونے سے فلکی کے سارے جسم میں کرنٹ سا دوڑ گیا اور چہرے پر خون آگیا۔

رفتہ رفتہ آفاق نے اسے موسمی سبزیوں کے بارے میں بتا دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ کون سی سبزی کس طرح پکانی چاہیے اور دن میں کون سی سبزی پکائی جائے اور رات میں کون سی۔ اکثر لوگوں کو شعور نہیں ہوتا کہ رات کو کون سی سبزی بنائی جائے اور دن میں کون سی بنائی جائے۔

میٹھے بنانے کے طریقے بھی اس نے بتائے۔ تب فلکی کی سمجھ میں آیا کہ کتابوں میں پڑ
کھانا پکانا اور بات ہے اور کسی سے سیکھ کر تجربہ کرکے بنانا اور بات ہے۔

ان آٹھ دنوں میں اس نے اتنا کچھ سیکھا تھا کہ خود اپنے اوپر حیران ہوتی تھی اور د
تھی۔ وہ خاصی ذہین لڑکی ہے۔ کاش کسی نے اس پر توجہ دی ہوتی۔ کون سی بات ہے جو ا
سمجھ میں نہیں آئی۔ آخر آفاق بھی مرد ہی تھا۔ اس کا سمجھانے کا طریقہ بھی مردانہ تھا۔ بسا
تفاصیل وہ بھی نہیں سمجھا سکتا تھا۔ اس وقت وہ اپنے ذہن سے کام لیتی تھی اور جلد ہی سیکھ
تھی۔ اسے بات بات میں ڈانٹ کھانا پسند نہیں تھا۔

ایک ہفتے میں آفاق نے کوئی سو بار اپنی امی کا ذکر کیا تھا۔ اس کے سلیقے اور پکوان کی لذ
بھرا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ زمین پر اپنی ماں کو اپنا خدا سمجھتا تھا۔

"اگر کوئی عورت مرد کو جیتنا چاہتی ہے تو ماں کی طرح اسے کھانا کھلائے' طوائف کی ط
اس پر نثار ہو اور دوست کی طرح اس کا دکھ درد بٹائے۔"

تو فلکی کے تن میں آگ لگ جاتی۔

ایک واہیات سے مرد کے لیے عورت اتنے روپ دھارتی پھرے اور یہ کم بخت کچھ بھی
کرے۔ آخر عورت کو جیتنا بھی تو ایک کام ہے۔ اگر عورتیں صرف نکاح کے دو بول سے
ہو جاتیں تو اب تک فلکی آفاق کی غلام بن چکی ہوتی۔

مگر وہ تو اس سے نجات حاصل کرنے والے راستے پر اندھا دھند دوڑی چلی جا رہی تھی۔

کوئی کہتا نجات کا راستہ اُدھر ہے تو وہ اُدھر مڑ جاتی۔

کوئی کہتا نجات کا راستہ اِدھر ہے تو وہ اِدھر ہو جاتی۔

نجات....

نجات...

دن رات اس کا دل اسی ایک تال پر دھڑک رہا تھا۔

وہ تپتی ہوئی آگ تھی مگر اپنے وجود پر ضبط کے چھینٹے مار مار کر اسے بجھا رہی تھی۔

اس کی زبان پاگل کی تلوار تھی۔

تلوار کو اس نے میان میں بند کر دیا تھا۔

اس کی آنکھیں نفرت کے جلتے ہوئے دو شعلے تھے مگر اس نے اپنی آنکھوں پر متانت کی
باندھ لی تھی۔ وہ اس آفاق کے ساتھ اس کے اپنے انداز کے مطابق پورا اترنا چاہتی تھی

اس کے اپنے بنائے ہوئے تیروں سے اسے چھلنی کرنا چاہتی تھی۔

شیر کی طرح اس کے سکھائے ہوئے حربے استعمال کرکے اس پر وار کرنا چاہتی تھی اور
چاہتی تھی کہ جو پنجرہ آفاق نے اس کے گرد تعمیر کر دیا ہے ایک دن انجانے میں خود ہی اس کا
دروازہ کھول دے۔

اور فلکی پُھر کر کے اُڑ جائے۔

آہ کس قدر خوب صورت اور چمک دار ہو گا وہ دن۔

وہ اس دنیا کا پہلا خوب صورت ترین دن ہو گا...!

فلکی ایک گھنٹے سے برابر گھاس کاٹ رہی تھی اور اب پسینے میں شرابور ہو گئی تھی۔ گھاس کٹی ہوئی ڈھیریاں دور دور پڑی ہوئی تھیں اور گھاس کی مخصوص بساند سارے لان میں پھ ہوئی تھی۔ فلکی نے ہانپتے کانپتے ہوئے اپنے چہرے سے پسینہ پونچھا اور مشین ایک طرف ر دی اور خود بھی سائے میں بیٹھ گئی اور چاروں طرف لان کا جائزہ لینے لگی۔

جاتی بہاروں کی یہ آخر آنچ تھی۔ ہر طرف ہریالی تھی۔ وہ لان جو کچھ دن پہلے جنگل بن تھا۔ اب سنور رہا تھا۔

چندرہ دن سے فلکی ادھر ہی متوجہ تھی۔ پہلے تین مہینے اس نے کھانا پکانے اور گھر کی صفائی لگائے تھے۔ اب وہ کھانے پکانے میں مشاق ہو گئی تھی اور صفائیوں کی اسے عادت پڑ گئی تھی۔

لان کا مسئلہ باقی تھا جسے ہاتھ لگاتے ہوئے اسے ڈر لگ رہا تھا مگر یہ سب کچھ اس کی شرا میں شامل تھا۔

ایک دن خدا کا نام لے کر شروع ہو گئی۔ پہلے دو چار دن تو وہ لان کو جھاڑو سے صاف کر رہی مگر بڑھی ہوئی گھاس اور سرکنڈے بار بار اس کے ہاتھوں کو زخمی کر دیتے تھے اس لیے ا نے آفاق سے کہہ کر گھاس کاٹنے کی مشین منگوالی۔

ہر روز دو گھنٹے لگا کر وہ گھاس کاٹتی تھی۔ پہلے پہل تو یہ مشقت اسے بہت مہنگی پڑی ہاتھو میں چھالے پڑ گئے۔ پاؤں سے خون بہنے لگا۔ مگر جب اس نے تہیہ کر لیا تو سب کام آسا ہو گئے۔

اس نے گملے صاف کیے۔ خشک پتوں کو ایک جگہ جمع کیا۔ پھر انھیں آگ لگا دی۔ ان ہاں بابا مالی ایسے ہی کیا کرتا تھا۔ فوارہ اُٹھا کر سب گملوں کو پانی دیا۔ درختوں کے نیچے جتنا کوڑ کرکٹ جمع ہو گیا تھا وہ سارا سمیٹ کر ایک جگہ ڈھیر کر دیا۔ دن بہ دن گراؤنڈ کی صورت بہت ہو رہی تھی۔ اب صرف گھاس کا مسئلہ رہ گیا تھا۔

اسے آفاق کی بنیانیں اور قیمصیں بھی دھونی پڑتی تھیں۔ کیسا کراہیت انگیز کام تھا مگر اس

ا۔

ب وہ آفاق کی قیمصیں دھوتی تو ان میں سے قسم قسم کی خوشبوئیں نکلا کرتی تھیں۔ وہ بہت ہوتی کہ یہ آدمی اتنی خوشبوئیں استعمال کرتا ہے۔ اس کی کوئی چیز گندی اور غلیظ نہیں تھی حتیٰ کہ موزے بھی بدبودار نہیں ہوتے تھے۔ روز ایک موزہ بدل کر جاتا تھا اور موزہ ے پہلے بُوٹ کے اندر اور پاؤں پر ایک خوشبودار لوشن چھڑک لیا کرتا تھا۔ وہ اتنا صاف اور چمک دار ہوتا کہ فلکی کو اس پر رشک آتا۔

ں صرف بستر پر شکنیں بہت زیادہ ہوتی تھیں۔ تکیے سارے چڑ مڑ کر دیتا تھا اسی لیے اسے ہر چادر بدلنا پڑتی تھی۔ ورنہ تو اس کی عادتیں بہت اچھی تھیں۔ کھانا کھاتے ہوئے پلیٹ صاف کر دیتا۔ ذرا سا بھی سالن نہیں بچاتا تھا۔ اٹھ کر اپنی کرسی ٹھیک کر دیتا۔ کوئی چیز پر گری ہوتی تو اسے اٹھا کر اوپر رکھ دیتا۔ وہ گھر میں ترتیب اور سلیقے کو بہت پسند کرتا تھا سارا سلیقہ فلکی نے اسی سے سیکھا تھا۔

لکی کو اگر کسی چیز سے دلچسپی تھی تو وہ پھولوں کی سجاوٹ تھی۔ وہ اپنے گھر بھی کبھی کبھار سجایا کرتی تھی۔ یہاں جب اس نے سارے گھر کو سنوارنا شروع کیا تو پھر پھول سجانے کا بھی آیا مگر پھول تو بالکل جنگل کا سماں پیش کر رہے تھے حالانکہ اس گھر میں بے شمار ملکی و غیر پھول اور پودے تھے۔

وہ قینچی اٹھا کر لان میں نکل گئی۔ جب اس نے پہلے دن ہر کمرے میں خوبصورت پھول اور بی شاخیں سجا دیں اور رات کو آفاق نے آکر ان پھولوں کی تعریف کی تو اس کا سیروں خون کیا۔

"بھئی یہ پھول خود بخود اندر آگئے یا آپ انھیں لائی ہیں؟"

"میں نے سجائے ہیں۔" فلکی نے فخر سے کہا۔

"آپ کی اس خوبی کو سراہا جائے یا پھولوں کی ادا کو؟"

"جی!" فلکی نے حیرانی سے کہا۔

"میں نے عرض کیا کم از کم ایک کام آپ کو ضرور آتا ہے۔"

وہ چپ ہو گیا اور فلکی منتظر رہی کہ وہ اپنا فقرہ پورا کرے۔ حالانکہ وہ جان گئی تھی کہ اس کیا کہا ہے مگر تحسین بھرے فقرے پورے کرنے کے معاملے میں وہ پکا بخیل تھا۔

صبح جب فلکی نے باہر نکل کر اس کا بریف کیس اسے پکڑایا اور خدا حافظ کہا تو
نظر لان پر ڈالی اور گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے بولا۔
"اندر والی خوب صورتی باہر بھی پیدا کیجئے نا؟"
تب فلکی کو خیال آیا کہ اس نے خود ہی ایک اور پھندا گلے میں ڈال لیا ہے۔
چلتی ہوئی گراؤنڈ میں آگئی اور چار مہینے سے گراؤنڈ کا جو حشر ہو چکا تھا، دیکھنے لگی۔
اور کس طرح کرے گی مگر پھر اسے اپنے چیلنج کا خیال آگیا۔
سو وہ کوہ کن بن گئی اور پھاوڑا لے کر میدان میں کود گئی۔ جان جوکھوں کا
دلچسپ تھا۔
گراؤنڈ میں کام کرتے کرتے وہ ایک دم چونک جاتی اور اسے یوں محسوس ہو
فلم کی ہیروئن ہے اور اسکرین پر کام کر رہی ہے۔ حقیقت میں کبھی ایسی سچوایشن نہیں
یہ کتنی بڑی حقیقت تھی کہ یہ سچوایشن بالکل اصلی تھی اور فلکی سارا دن کدال لے
ٹھیک کرتی، پرانی جڑیں کاٹتی... پتّوں کے ڈھیر الگ کرتی اور پھر گھاس پر مشین چلایا
نے انگریزی فلموں اور رسالوں میں دیکھا تھا کہ گوریاں یہ کام اپنے ہاتھ سے کرتی
تصویروں میں وہ ہرے بھرے لان میں کھڑی ہوئی بہت خوب صورت لگا کرتی تھیں
کو اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ خوبصورتیاں صرف تصویروں تک ہی محدود تھیں۔ اصل
لیوا ہے اور کون اپنی خوشی سے کرتا ہے؟
رفتہ رفتہ وہ کچھ اذیت پسند سی ہو گئی۔ اپنے آپ کو تکلیف دے کر اسے خو
ہوتی۔ پھر یوں تھا کہ اسے مصروف رہنے کی عادت ہو گئی۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ قی
مشقت کیوں لی جاتی ہے۔ قیدِ تنہائی میں اگر یوں ہی چھوڑ دیا جائے تو آدمی پاگل ہو
ایک وقت آتا ہے جب سوچیں بھی ساتھ چھوڑ جاتی ہیں۔ مشقت اچھی چیز ہے۔ ج
ایک عضو مصروف رہتا ہے۔ بھوک بھی لگتی ہے اور پھر نیند....
واہ کیا مزے کی نیند آتی ہے۔
دنیا جہاں کا ہوش نہیں رہتا۔ آدمی ہر شے سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ پہلے تو وہ رات
کروٹیں لیا کرتی تھی۔ رشک سے دور پڑے آفاق کو دیکھا کرتی تھی۔ کس مزے سے
سو جاتا تھا اور اسے احساس بھی نہیں ہوتا تھا کہ کمرے میں ایک جوان اور خوب صور
سوئی ہوئی ہے جو اس کی منکوحہ بیوی ہے۔

کا آدمی ہے۔ وہ دل میں سوچتی۔
صورت حال سے تو اس کی راتوں کی نیند اڑ جانی چاہیے تھی مگر افسوس وہ گہری نیند
اور فلکی جلنے کُڑھنے کے لیے جاگتی رہتی تھی۔ کبھی کوئی کتاب پڑھتی رہتی اور کبھی یوں
میں بدلتی رہتی اور جب تک بتی جلتی رہتی فلکی کو نیند ہی نہ آتی اور آفاق چکاچوند
میں بھی سو جاتا تھا۔
فلکی کو احساس ہوا کہ آفاق اس قدر تھک کر آتا ہے کہ کھانا کھانے کے بعد بے سُدھ
جاتا ہے جیسے وہ خود سو جاتی تھی اور صبح یوں آنکھ کُھلتی جیسے ابھی تو پلک لگی تھی۔ صبح اُٹھ
میں جُت جاتی۔
وہ جیسے جیل میں اپنی میعاد کے دن پورے کر رہی تھی اور اچھی رپورٹ کی منتظر تھی۔
اس نے ہرے بھرے لان کو بالکل درست کر دیا تھا۔ پھول پودے ہر جگہ بڑے خوب
لگ رہے تھے اور وہ آم کے درخت کے تلے بیٹھی جائزہ لے رہی تھی۔ آم پر ننھا ننھا
رہا تھا اور اس بور کی خوشبو اسے بہت پسند تھی۔ وہ آم کے پتّوں کو توڑ کر ہتھیلی پر مسلتی
اس کی مہک کو سُونگھ کر لطف لیتی۔ بہت بڑا معرکہ مار لیا تھا اس نے... اور اس کے بعد تو
ہو گیا تھا۔ بس اب شام کو روزانہ گملوں کو پانی دیا کرے گی اور ہفتے میں ایک دن مشین
گی۔ ہر کام کا اس نے وقت مقرر کر لیا تھا۔
وقت جو اس کے اختیار میں نہیں رہا تھا۔
آج اس کی طبیعت ست ہو گئی تھی۔ اتنا تھک چکی تھی کہ درخت کی چھاؤں تلے سے اٹھنے
نہیں چاہا۔
تو یہ چاہ رہا تھا۔ یہیں سو جائے۔ اس درخت تلے۔ اس آسمان تلے آنکھیں موند کے۔
نہ اس کو جگائے نہ کوئی اسے بُلائے۔
بھی کہیں کھو جانے کو دل چاہتا تھا۔
ہواؤں کی طرح بکھر جانے کو...
اور زندگی چھوٹی شے لگنے لگتی تھی۔
سوچتے سوچتے وہ گھاس پر لیٹ گئی۔ گھاس کا بستر کتنا اچھا لگتا ہے یہ جو غریب لوگ گھاس
پر سو جاتے ہیں تو کچھ برا نہیں کرتے۔ واقعی یہ سب فرق ہماری سوچ کے ہیں۔ جب
کی انا نہ رہے تو کچھ بھی نہیں رہتا۔ یہ سخت زمین اور یہ نرم نرم گھاس کتنی اچھی لگ

رہی تھی۔

اس نے کروٹ لی... اور منہ کے بل اُلٹی ہوگئی۔ سر کے نیچے بازو رکھ لیا۔ بچپن جانے کون سا جھروکہ کھول کر اندر آ گئیں یا پھر کھردری زمین میں روشن دان کھلتے چلے کتنی پرانی... کتنی عجیب باتیں اسے یاد آنے لگیں۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں گرم قطرے گرنے لگے.... اور پھر وہ اس کے سامنے ہی زمین میں جذب ہوتے رہے۔

انسان جب اپنے آپ سے روٹھ جاتا ہے تو اسے کسی شے کی پرواہ نہیں رہتی۔

اس کو بھی کسی شے کی پرواہ نہ رہی تھی۔

سوچتے سوچتے وہ جانے کب سوگئی۔

نیند کو کیا' کوئی سیج پر ہے یا مخملیں گدّے پر... یا کھردرے فرش پر جب آنا ہو' آجاتی ہے اور بازوؤں میں چھپا لیتی ہے۔ وہ ہڑبڑا کر اس وقت اٹھی جب کوئی قریب جھنجھوڑ رہا تھا۔

چونک کر اٹھ بیٹھی۔ چاروں طرف دیکھا۔ وہ تو لان میں تھی۔ دھیمی دھیمی شام تھی۔ گھاس کی ڈھیری کے سامنے پڑی تھی۔ اس کے ساتھ مشین پڑی تھی اور آفاق سرہانے کھڑا اسے جگا رہا تھا۔

آنکھیں مل کر ایک دَم کھڑی ہوگئی۔ نہ جانے اس نے دوپٹہ کہاں اُتار کے رکھ دیا تھ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ خیال آیا پاؤں میں جُوتا بھی نہیں ہے۔ جانے وہ کس درخت رکھ بیٹھی تھی۔

کبھی ادھر جاتی' کبھی ادھر... کبھی جوتا ڈھونڈتی... کبھی دوپٹہ... اور آفاق کھڑا مسکرا رہ

"اِدھر آؤ۔"

وہ قریب آگئی۔

لٹیں کُھلی ہوئی' بالوں میں گھاس پھنسی ہوئی۔ چہرے پر اپنے ہی بازو کا نشان' منہ طرف مٹی لگی ہوئی... پلکوں میں چھوٹے چھوٹے تنکے پھنسے ہوئے۔

میلے چیکٹ کپڑے' ایک پائنچہ اُدھڑا ہوا' پاؤں پر میل... گورے گورے ہاتھوں پر داغ.... سوجھی سوجھی سوئی سوئی آنکھیں... بھرے بھرے ہونٹ نیند کی کھچاوٹ سے دوسرے میں پھنسے ہوئے۔ چہرے پر سوز' ادھ کھلی نیند کا چڑچڑاپن... تھوڑا تھوڑا غصّہ تھوڑی بوکھلاہٹ۔ آفاق اس کو دیکھتا رہا۔

وہ اس وقت گاؤں کی ایک انتہائی معمولی لڑکی لگ رہی تھی۔

اس نے اپنی سرخ آنکھوں سے آفاق کی طرف دیکھا۔ آفاق کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ ملگت تھی یا کچھ اور بھی تھا۔

کچھ اور بھی تھا۔

اس نے اپنی آنکھیں پوری طرح کھول کر دوبارہ دیکھنا چاہا۔

کہ آفاق نے اپنے دونوں ہاتھ آگے کر دیے۔ ایک ہاتھ میں اس کا دوپٹہ تھا اور دوسرے تھ میں اس کے جوتے۔

اس نے جلدی سے پہلے اپنے جوتے پکڑ لیے جیسے آفاق سے جوتے اُٹھوانا بے ادبی ہو۔ پھر پا دوپٹہ لیا۔ زمین پر رکھ کر جوتے پہن لیے اور دوپٹہ کندھوں پر ڈال لیا۔

"اندر چلنے کے ارادے ہیں؟" آفاق نے اس بے وقوف لڑکی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال ر کہا۔

"جی ہاں۔" اس نے سر ہلایا۔

"چلیے۔"

وہ آگے آگے اور آفاق پیچھے پیچھے... اندر کو لپکے۔ برآمدے کے قریب آکر آفاق اپنی موٹر ی طرف مڑ گیا اور وہ اندر آگئی۔ فلکی پہلے باورچی خانے میں گئی اور جلدی سے چائے کا پانی ولہے پر رکھ دیا۔ آج ہر کام کو دیر ہوگئی تھی کیونکہ وہ سوگئی تھی۔ کیسی بے وقوفی ہوگئی۔ جب ٹرالی پر چائے کے برتن لگا رہی تھی تو آفاق باورچی خانے میں آگیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں کچھ لفافے تھے اور دوسرے میں ٹرانسسٹر ریڈیو۔ فلکی نے ایک بار دیکھنے کے بعد دوسری بار پھر ورسے دیکھا۔ واقعی وہ ریڈیو تھا۔ مگر ریڈیو اس کے گھر میں کیسے آگیا؟"

ممکن ہے آفاق اپنے کمرے میں رکھنے کے لیے لایا ہو۔

آفاق ریڈیو اور لفافے وہیں چھوڑ کر چلا گیا۔ فلکی نے حسب معمول شام کی چائے اس کے کمرے میں پہنچا دی۔

"آپ کو کچھ اور تو نہیں چاہیے؟" اس نے جانے سے پہلے پوچھا۔

"چاہیے۔" آفاق نے بڑی گھمبیر آواز میں کہا۔

وہ سر تا پا انتظار بن گئی۔

"پہلے چائے بنائیے۔"

فلکی نے ہمیشہ کی طرح اس کی پیالی میں چائے بنا کر پیش کی۔

"ایک پیالی اور بنائیے۔"

فلکی نے چائے بنا دی۔

"وہاں کرسی پر بیٹھ کر یہ چائے پی لیں۔"

کرسی پر بیٹھ کر وہ چائے پینے لگی۔ فلکی کو پتہ چل گیا تھا کہ اس کے سامنے چوں چرا نہیں چاہیے۔ بس عافیت اسی میں ہے کہ "روبوٹ" کی طرح اس کا ہر حکم مانا جائے۔

سو وہ چائے پیتی رہی اور آفاق ایک رسالے کی ورق گردانی کرتا رہا۔ چائے ختم کر اٹھی اور اس نے اپنی پیالی ٹرالی کے نچلے خانے میں رکھ دی اور پھر کھڑی ہو گئی۔

آفاق نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھر پوچھا۔

"اپنے حلیے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

فلکی نے خوف زدہ نظروں سے اپنے سراپے کا جائزہ لیا۔ ابھی تک اس کے کپڑوں پر کے ذرّے لٹک رہے تھے۔ سامنے شیشے پر نظر گئی تو بالوں پر گھونسلے کا گماں ہو رہا تھا۔

فلکی نے سر جھکا لیا۔

"اور یہ آپ کے کپڑے کیوں پھٹے ہوئے ہیں؟"

"میں ابھی جا کر کپڑے بدل لیتی ہوں۔"

وہ جانے کو مڑی۔

"ٹھہریے۔ موسم بدل گیا ہے۔ کیا آپ کے پاس نئے موسم کے کپڑے ہیں؟"

"جی ... ہیں تو..... مگر میرے پاس ایسے کپڑے نہیں جنھیں پہن کر کام کیا جائے۔ کام کے وقت یہ لپٹ جاتے ہیں یا جل جاتے ہیں۔ میں کیا کروں؟"

"پھر آپ نے مجھ سے کیوں نہیں کہا؟"

"ڈر لگتا تھا۔"

"کہ میں کھا جاؤں گا؟"

"نہیں۔ آپ طعنے بہت زیادہ دیتے ہیں۔"

آفاق تھوڑی دیر کے لیے چپ رہا۔ پھر بولا۔

"کل آپ میرے ساتھ بازار چلئے گا اور اپنی پسند کے کپڑے لے آیئے گا۔"

فلکی کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔

وہ آنکھیں پھاڑ کر آفاق کی طرف دیکھنے لگی۔

"اگر میرے ساتھ نہیں جانا چاہتیں تو پھر ڈرائیور کے ساتھ چلی جایئے گا۔"

فلکی کو پھر بھی یقین نہیں آیا۔

وہ دَم سادھے کھڑی رہی۔

"کیا تحریری دستاویز دوں۔"

"نہیں۔"

"پھر؟"

"میں جا رہی ہوں۔" وہ جلدی سے باہر نکل گئی کہیں آفاق اپنی بات سے مکر نہ جائے۔

دوسری صبح جب آفاق ناشتہ کرکے جانے لگا تو فلکی نے کہا۔

"میں بازار نہیں جاؤں گی۔"

"میرے ساتھ جانا پسند نہیں یا..."

"ایسی کوئی بات نہیں۔ میرے پاس بازار جانے کا وقت نہیں ہے۔ آپ اپنی پسند کے کپڑے خرید لائیں۔"

"میری پسند کو آپ قبول کرلیں گی؟"

"جی ہاں۔" فلکی نے نظریں جھکالیں۔

آفاق تھوڑی دیر تک گھور کر اسے دیکھتا رہا۔ مگر فلکی نے نظریں نہیں اٹھائیں اسے معلوم تھا کہ آفاق اسے گھور رہا ہے۔ جب وہ نظریں اٹھائے گی تو وہ آنکھیں ملا کر اس بات کی تصدیق کرنی چاہے گا۔

اس واسطے وہ زمین کی طرف دیکھتی رہی۔

"عجیب ناقابلِ یقین واقعات رونما ہو رہے ہیں۔"

یہ کہہ کر آفاق باہر نکل گیا۔

فلکی کو بڑا مزہ آیا اور ہنسی بھی آئی۔ واقعی آفاق کو کہاں یقین آرہا ہوگا اور وہ کیوں جائے اس کے ساتھ بازار۔

اب بازار میں اسے رُسوا کرے گا۔ بات بات پر طعنہ دے گا۔ دکانداروں کے سامنے کچوکے لگائے گا اور جو اتفاقاً راستے میں کوئی واقف کار مل گیا تو اس کے سامنے بال کی کھال اتارے گا۔ ایسا نہ ہو بازار جاکر وہ کوئی اور آفت مول لے بیٹھے۔ بڑے سکون سے گزر رہا تھا۔ بمشکل تمام زندگی کا ایک چلن بنا تھا۔ اس آزمائشی راستے پر وہ اس طرح چل رہی تھی جس طرح کوئی شیشے کی کرچیوں پر چلتا ہے۔

اب تو مسافت بھی کافی طے ہوگئی تھی۔ پھر وہ کوئی نئی مصیبت کیوں مول لے؟

اور یہ بھی ممکن ہے آفاق اسے آزما رہا ہو۔ ہے تو بڑا چالباز۔ اب کئی دنوں سے اسے کوئی بات نہیں مل رہی تھی۔ لان کا مسئلہ حل ہوگیا ہے تو چاہتا ہوگا کوئی نیا جھگڑا شروع کردے۔ یہ سب سوچ کر اس نے بازار جانے سے صاف انکار کردیا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ کم از کم اس نے ایک تو دانش مندانہ حرکت کی ہے۔

پھر وہ کھانا پکانے کے لیے باورچی خانے میں چلی گئی۔

وہاں ابھی تک بڑا نسٹر ریڈیو پڑا ہوا تھا۔

اس نے ریڈیو کو اس طرح دیکھا جیسے یہ کوئی سانپ ہو۔ چھیڑنے سے ڈس لے گا۔ کتنے ہی دنوں سے ریڈیو کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ کوئی نغمہ نہیں گونجا تھا۔ یہ گھر نغموں اور آوازوں کے بغیر کتنا سرد اور سُونا تھا۔ اس کے کان بھی تو موسیقی سے ناآشنا ہوگئے تھے۔ جانے ریڈیو سننا کیسا لگتا ہوگا...

ڈرتے ڈرتے اس نے ریڈیو کی ناب کو ہاتھ لگایا۔ پھر جرأت کرکے سے گھما دیا۔ ایک دم سے کئی آوازیں بلند ہوئیں۔ ایک جگہ بلند آواز سے نغمہ گونج رہا تھا۔ اس کی موسیقی اتنی تیز تھی کہ فلکی نے ڈر کر ریڈیو بند کردیا۔ اسے یوں احساس ہوا جیسے در و دیوار چیخ رہے ہوں۔ ہر طرف طبلے اور سارنگیاں بج رہے ہوں۔

توبہ.....

موسیقی بھی اتنی خوفناک ہوسکتی ہے۔

وہ وہاں سے ہٹ گئی۔ کام میں لگ گئی۔ بارہ بجے کے قریب جب ذرا وہ فارغ ہوئی تو اسے خیال آیا ریڈیو لگانا چاہیے۔ ممکن ہے آفاق آج اسے یہاں بھول گیا ہو۔ کل اُٹھا کر اپنے کمرے میں لے جائے یا واپس دفتر ہی لے جائے۔ تھوڑے سے گیت سننے میں کیا حرج ہے؟

سو اس نے آواز کو آہستہ کرکے دھیمے دھیمے سُروں میں کوئی سٹیشن لگا لیا۔

ساز بجنے لگے۔ وہی اناؤنسر کی آواز تھی۔ وہی گیت تھے۔ تقریباً" سب کے سب سنے ہوئے۔ وہی پیش کش کا انداز تھا۔ سب ویسا ہی تھا لیکن اس کی زندگی بدل گئی تھی۔ چھ مہینے ہوگئے تھے اس کی شادی کو اور ان چھ مہینوں میں کیا سے کیا ہوگیا تھا۔

فلکی وہ فلکی نہ رہی تھی۔ دن رات وہ دن رات نہ تھے۔ آسمان وہ آسمان نہ تھا اور زمین وہ زمین نہ تھی۔

کوئی شے نہیں بدلتی۔ کچھ نہیں بدلتا مگر انسان بدلتا رہتا ہے۔ ٹوٹتا رہتا ہے۔ بنتا رہتا ہے۔ بجتا رہتا ہے۔

اور پھر بھی جیتا رہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس پوری کائنات میں سخت ترین چیز انسان ہے۔

انسان جو دنیا کی ہر شے سے زیادہ پائیدار ہے۔ دنیا میں ہر چیز کی ایک معیاد ہے۔ گھاس' پودے' درخت' دریا' سمندر' عمارات اور بھی بہت کچھ۔

مگر ان سب میں سب سے کم معیاد انسان کی ہے۔ انسان جس کے قبضۂ قدرت میں ان چیزوں کو بنانا ہے جس کی عقل نے دنیا کو عجوبہ بنا چھوڑا ہے۔ نت نئی ایجادات ہوتی ہیں۔ نت نئی راہیں نکلتی ہیں۔ انسان اپنی عقل کی بے شمار کرشمہ سازیاں دنیا میں چھوڑ جاتا ہے۔

مگر خود فانی ہے۔ زوال پذیر ہے۔ مٹ جانے والی شے ہے۔ حباب ہے۔ بلبلہ ہے۔ قطرہ ہے خاک ہے!

وہی انسان جب زندگی کے ساتھ نبرد آزما ہوتا ہے تو کتنا سخت جان بن جاتا ہے۔ جنگیں لڑتا ہے۔ بیماریوں کا مقابلہ کرتا ہے۔ دریاؤں کے رخ موڑ دیتا ہے۔ دنیا کو فتح کرنے کے منصوبے بناتا ہے۔ ایک دن تخت پر ہوتا ہے تو دوسرے دن تختے پر' اطلس و کمخواب میں بھی سوتا ہے اور جیل کی کال کوٹھڑی کا بھی مقابلہ کرتا ہے۔ شہنشاہ بھی ہوتا ہے اور گلیوں گلیوں گداگر بن کر بھی پھرتا ہے۔ ہر حال میں' ہر موسم میں' ہر بھیس میں اپنے آپ کو ڈھال لیتا ہے۔

واہ کیا چیز ہے انسان۔

یہی خود آگہی ہے۔

اس کا دل کہتا' کم از کم تمہیں اتنا تو پتہ چل گیا ہوگا ورنہ کوئی تمہیں شادی سے پہلے کہتا کہ تمہیں ایسے ماحول میں رکھا جائے گا تو تم صاف کہہ دیتیں میں تو مر جاؤں گی۔ ایک دن بھی زندہ نہ رہوں گی اور اب نہ صرف یہ کہ تم زندہ ہو' بلکہ تم نے حالات سے سمجھوتہ بھی کر رکھا ہے۔ جی رہی ہو۔ کھاتی پیتی ہو' اپنی مرضی کے خلاف بات کرتی ہو۔ پھر بھی یوں ظاہر کرتی ہو جیسے تم بہت خوش ہو۔

اور اگر حالات اس سے بھی زیادہ سنگین ہو جائیں تو تم پھر بھی زندہ رہو گی۔ کیونکہ نہ مرنا اپنے اختیار میں ہے نہ جینا۔

چلو فلکی بیگم اٹھو' چپاتیاں پکاؤ۔ کس خیال میں پڑ گئی ہو۔ اب تم فلسفی بھی بنتی جا رہی ہو۔

اللہ کی دین ہے۔

شام کو جب آفاق آیا تو اس نے بہت سے لفافے اٹھا رکھے تھے۔ آتے ہی اس نے وہ لفافے پلنگ پر ڈال دیے۔ پھر فلکی کو آواز دی اور بولا "اپنے کپڑے اٹھالو۔"

فلکی نے پہلے آفاق کی طرف دیکھا اور پھر پلنگ پر بکھرے ہوئے لفافوں کو۔ کچھ کپڑے باہر کھسک آئے تھے اور کچھ ابھی لفافے کے اندر تھے۔ اس نے لفافوں میں سے سب کچھ نکال لیا۔ آٹھ دس سوٹ پیس تھے۔ انتہائی خوبصورت پرنٹ میں' انتہائی نفیس کپڑے۔ ملائم کپڑا تھا جو کہ گرمیوں کے موسم کے لیے بہترین کپڑا ہو سکتا تھا۔

فلکی جب کپڑے کو چھو کر دیکھ رہی تھی تو آفاق نے پوچھا۔

"کہئے' کیا یہ کپڑا پسند آیا؟"

"بہت اچھا ہے۔" فلکی نے آہستہ سے کہا۔

"آپ کو سوتی کپڑا پہننا تو اچھا نہیں لگے گا لیکن میں کیا کروں۔ مجھے کسی شے میں بھی ملاوٹ پسند نہیں ہے نہ محبت میں' نہ شکل و صورت میں' نہ دوستی میں' نہ تعلقات میں اور نہ خوراک میں۔ میں یا تو پیور کاٹن Pure Cotton پسند کرتا ہوں یا پیور سلک Pure Silk یا پیور وولن Pure Woolen مجھے Synthetic چیزیں پسند نہیں اس لیے میں مصنوعی چیزوں سے متاثر نہیں ہوتا۔"

"باقی سب تو میری سمجھ میں آگیا۔ مگر یہ شکل و صورت میں ملاوٹ کیسے ہوتی ہے؟" فلکی نے جرأت کر کے پوچھا۔

"غیر ضروری میک اپ' مصنوعی پلکیں' مصنوعی بال' مصنوعی ناخن' وغیرہ وغیرہ... اب کہاں تک تفصیل گنواؤں... آپ تو عورت ہیں اور جانتی ہیں کہاں تک عورتیں اپنے حسن میں ملاوٹ کرتی ہیں اسی لیے تو آج کل کی لڑکیاں مجھے مرعوب نہیں کر سکتیں۔"

فلکی خاموش ہو گئی۔

کہنا یہ چاہتی تھی کہ ضروری نہیں آج کل کی سب لڑکیاں ملاوٹ کرتی ہوں۔ مگر وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ ممکن ہے اس سے وہ یہ سمجھ لے کہ وہ اپنی مدافعت کر رہی ہے۔

"کہئے' میں نے کچھ غلط کہا؟"

"میری یہ جرأت کہ میں ایسا سوچوں؟"

اس جواب پر آفاق قہقہہ لگا کر ہنسا۔

"کم از کم میں نے آپ کو سچ بولنا تو سکھا دیا۔"

"آپ نے مجھے اور بھی بہت کچھ سکھایا ہے۔" فلکی خوش دلی سے بولی۔

"لاؤ اسی بات پر ہاتھ ملا لیں۔"

آفاق نے اپنا ہاتھ باہر نکالا تو فلکی نے اپنا سرد ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

جلدی ہی آفاق کو احساس ہو گیا کہ اس نے غلط حرکت کی ہے۔

فلکی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں کانپ کر رہ گیا اور اس نے دبائے بغیر فلکی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

فلکی اپنے دھڑکتے دل پر قابو پاتے ہوئے سارے کپڑے تہہ کر کے اٹھانے لگی۔ کپڑوں کا بنڈل اٹھا کر اس نے آفاق کی طرف دیکھا اور بولی۔

"مگر انہیں سلواؤں گی کہاں سے؟"

"آپ خود سئیں گی۔"

"میں... مجھے تو سینا نہیں آتا۔"

"آپ جب یہاں آئی تھیں تو آپ کو کچھ بھی نہیں آتا تھا مگر اب یہ نہیں کہہ سکتیں کہ کچھ نہیں آتا۔ کم از کم اب آپ عورت ہونے کا دعویٰ تو کر سکتی ہیں۔"

"مگر سلائی میں اصل بات کٹائی کی ہوتی ہے نہ مجھے شلوار کاٹنی آتی ہے نہ قمیص۔"

"مشین تو چلانی آتی ہے؟"

"جی ہاں۔ میں مشین چلا لیا کرتی ہوں۔ کبھی کبھی اپنی قمیص تنگ کر لیا کرتی تھی۔"

"قمیصیں تنگ کرتے کرتے آپ ہمیں تنگ کرنے آ گئیں..."

وہ پھر شروع ہو گیا تھا۔

فلکی کے ماتھے پر شکنیں ابھریں۔

"آپ ایسا کریں۔" آفاق پھر بولا "اپنی ایک پرانی قمیص اور شلوار پوری اُدھیڑ لیں پھر اس کے اوپر رکھ کر ایک کاغذ کاٹ لیں۔ اس کاغذ کی مدد سے ایک نیا سوٹ کاٹ کر سی کر پھر پہن کر دیکھ لیں اگر وہ ٹھیک بنا تو اللہ کا نام لے کر سارے کپڑے سی لیں۔"

تجویز تو خوب تھی فلکی کو حیرت ہوئی کہ یہ آفاق کے ذہن میں کیونکر آ گئی حالانکہ فلکی کے ذہن میں آنی چاہیے تھی۔

"لیکن میں مشین کہاں سے لوں گی؟"

"اگر میں مشین مہیا کر دوں تو کیا انعام ملے گا؟"

"آپ کیسے؟"

"اگر اسی وقت پیش کروں تو کیا دیجئے گا؟"

"دینے کو میرے پاس کیا ہے؟" فلکی کا دل چاہا کہہ دے مگر وہ ہونقوں کی طرح اس کی شکل دیکھتی رہی۔

"آیئے میرے پیچھے پیچھے۔"

آفاق اسے ایک سٹور میں لے گیا۔ وہاں الماری میں بند ایک سنگر مشین پڑی ہوئی تھی۔

وہ اسے باہر نکال لایا۔ وہ کھول کر جھاڑی اور پھر میز پر رکھ دی۔

"یہ بجلی سے بھی چلتی ہے اور ہاتھ سے بھی جس طرح آپ چلانا پسند کریں۔"

"یہ کس کی مشین ہے؟" فلکی کی حیرت ابھی تک دور نہیں ہو رہی تھی۔

"ہے تو لوہے کی۔" آفاق نے سنجیدگی سے کہا۔ "مگر میری امی پچھلے سال جب آئی تھیں تو اپنی سلیقہ شعار بہو کے لیے یہ تحفہ لائی تھیں۔"

"بہو کے لیے۔"

"ہاں۔ ان کا خیال تھا پیشگی لا کر رکھ دینی چاہیے۔ ممکن ہے وہ کپڑوں کی سلائی میں ماہر ہو اور اسے آتے ہی ضرورت پڑے اور بھی بے شمار چیزیں لا چکی ہیں۔ میری امی مگر اس بہو کے لیے جو اس گھر میں رہنا پسند کرے۔ اگر آپ چاہیں تو یہ مشین استعمال کر سکتی ہیں۔ اس کے اندر قینچی' دھاگے' سوئی' فیتہ اور ضرورت کی سب چیزیں ہیں۔"

فلکی نے مشین اٹھا کر اپنے کمرے میں رکھ لی۔

دوسرے دن صبح کام سے فارغ ہو کر اس نے آفاق والی ترکیب پر عمل کیا۔ واقعی کارگر ثابت ہوئی۔ جب اس نے اپنا سوٹ کاٹ لیا تو پھر سینے کا شوق پیدا ہوا۔ سارا دن لگا کے اس نے سوٹ سی لیا اور شام کو جب پہنا تو حیران رہ گئی۔ سوٹ اسے فٹ آیا تھا۔ سوائے اس کے کہ گلا گول ہونے کے بجائے ذرا ٹیڑھا ہو گیا تھا اور ترپائی موٹی موٹی نظر آ رہی تھی۔ خیر یہ باتیں تو پریکٹس سے آ سکتی ہیں۔ کم از کم اس کو یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کپڑے سی سکتی ہے۔ آفاق کے آگے شرمندگی تو نہ اٹھانی پڑی۔

پھر اس کا دل نہ چاہا کہ سوٹ اتارے۔ وہی سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا۔ بھاگ بھاگ کے کام کرتی رہی۔ جان بوجھ کے آفاق کے آگے پیچھے پھرتی رہی مگر آفاق نے کوئی نوٹس ہی نہ لیا۔

تب اس کا دل بہت برا ہوا۔ کل خود ہی کپڑا لا کر دیا تھا اور آج اسے یاد بھی نہ تھا۔

رات تک وہ اس کی اردگرد چکر لگاتی رہی مگر بے سود...

پھر وہ سونے کے لیے اپنے کمرے میں آ گئی۔ آج کی کارکردگی کی وہ داد لینا چاہتی تھی لیے اس نے کپڑے نہیں بدلے تھے۔

تھوڑی دیر بعد جب آفاق کمرے میں آیا تو فلکی آئینے کے آگے کھڑی تھی۔

اپنے سراپے کی طرف دیکھ کر بولی۔

"کیسا ہے؟"

"جسم یا سوٹ؟"

(اب مزہ لے۔ فلکی نے اپنے آپ سے کہا۔)

"میں نے سوٹ کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ یہ میں نے آج ہی کر پہنا ہے۔"

"اچھا۔" آفاق نے اچھا کو بہت لمبا کر کے کہا۔ "اب سمجھا۔ میں نے سمجھا کہ آپ اپنے کی داد لینا چاہتی ہیں۔ یہ تو آپ بھی جانتی ہیں اور میں بھی کہ آپ ایک خوبصورت جسم کی ہیں مگر اس جسم کا کیا فائدہ جس کی کھوپڑی میں عقل نہ ہو۔"

فلکی کا دل جل گیا۔

آخر عورت تھی نا؟ ہر بار اس کو سمجھنے میں غلطی کر جاتی تھی۔ سوچ رہی تھی اس نے کا دل جیت لیا ہے تو یہ۔ آفاق کے پہلو میں دل تو تھا ہی نہیں پھر جیتنا نہ جیتنا کیا معنی؟

وہ ایک پتھر تھا اور اس کو ایک پتھر سے سر پھوڑنا تھا۔

وہ چپ چاپ جا کر اپنے پلنگ پر لیٹ گئی۔

آفاق لیٹ گیا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر فلکی کی طرف دیکھا اور پھر بولا۔

"اگر یہ سوٹ آپ نے سیا ہے تو حیرت انگیز بات ہے۔ واقعی کمال کر دیا ہے آپ نے بہت جچ رہا ہے آپ پر۔ کچھ میرے رنگوں کے انتخاب کی بھی داد دیں۔"

اب کیا فائدہ تھا تعریف کا۔

فلکی آنکھوں میں آنسو لیے لیٹ گئی۔

پہلے دل جلایا۔ اب چھینے مار رہا ہے۔ دل جلانا اسے خوب آتا ہے۔ شاید یہ دنیا میں توڑنے اور تکلیف پہنچانے کے لیے ہی آیا ہے۔

فلکی نے بتی بجھا دی۔

پھر وہ دنوں کا شمار کرنے لگی۔ نہ جانے اس کا امتحان کب ختم ہو گا۔ چھ مہینے ہو گئے تھے ا

اپنے میں اس نے ہر وہ کام کیا تھا جس سے اس کو نفرت تھی۔ غسل خانے صاف کیے تھے۔ ا سامان دھویا تھا۔ آفاق کی بنیانیں اور انڈرویر دھوئے تھے۔ آفاق کے جوتے پالش کیے ل چلایا تھا۔

لیا نہیں کیا تھا۔ پھر بھی اس کا دل نہیں پسیجا تھا۔ پتہ نہیں اور کتنی آزمائشیں باقی تھیں۔ اگر اس کی جان چھٹ جاتی تو اچھا تھا۔

ایسا نہ ہو آفاق اپنے وعدے سے مکر جائے... اس کا کیا ہے؟ اپنی مرضی کا خود مالک ہے۔ وہ ہی خاموش تھی۔ اس لیے کہ ابھی ممی اور ڈیڈی نہیں آئے تھے۔ ممی سے وہ ویسے بھی خفا اس لیے کہ انھوں نے اس کو کوئی خط نہیں لکھا تھا۔ پتہ نہیں ممی سے وہ کیوں ناراض تھی۔ ممی کے خط اس کو نہیں ملے تھے تو یہ ممی کا قصور نہیں تھا۔ سراسر آفاق کی چال تھی مگر وہ لقمہ ممی پر ہی نگل رہی تھی۔ ایک دن آفاق دفتر سے آیا تو اس کے ہاتھ میں کچھ لفافے اور رنگین کارڈ تھے۔ اس نے یہ سارے فلکی کے آگے ڈال دیے۔

"یہ کیا ہیں؟"

"یہ آپ کی ممی کے محبت نامے ہیں!"

"آپ کے نام آئے ہیں؟"

"کچھ آپ کے نام ہیں کچھ میرے نام۔"

"لیکن ممی نے مجھے دفتر کے پتے پر خط کیوں لکھے؟"

"یہ دفتر کے پتے پر نہیں گھر کے پتے پر ہیں۔"

"پھر مجھے پہلے کیوں نہیں ملے؟"

"یہ اپنے چوکیدار سے پوچھیں کہ وہ آپ کو روز کی ڈاک کیوں نہیں دیتا رہا۔"

"چوکیدار آپ کا ملازم ہے۔ وہ آپ کی ہدایات پر عمل کرتا ہے۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔" آفاق بولا۔

"اور اگر ماں کے خط بھی اس گھر میں سنسر کیے جاتے ہیں تو مجھے پڑھنے کی ضرورت نہیں ۔"

فلکی نے خلوں کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ وہیں پڑے رہے۔

"اور پھر اتنے دنوں کے جمع شدہ خلوط۔ مجھے آج دیے جا رہے ہیں۔" وہ غصے سے بولی۔

"بھئی میری گاڑی میں پڑے رہے۔ مجھے آپ کو دینا یاد ہی نہ رہے۔"

"تو اب بھی رکھ لیجئے گاڑی میں۔ میرا ان کے بغیر بھی گزارہ ہو رہا ہے۔"

"واقعی' ان کے بغیر آپ کا گزارہ ہو رہا ہے۔" آفاق نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

"جی ہاں۔ جسے گزارہ کہتے ہیں وہ ہو رہا ہے۔"

"پھر تو بڑی اچھی بات ہے۔ یہی دو لفظ آپ اپنی امی کو لکھ دیں۔"

"میری ممی مجھے جانتی ہیں۔ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"بہرحال انھیں خطوں کی رسید تو دینا ہے۔"

"جس کو یہ خط ملتے رہے ہیں۔ وہ اس کی رسید دیتا رہے۔"

"جی ہاں' میں نے تو ہر خط کا باقاعدہ جواب لکھا ہے۔"

"اور یہ بھی لکھا ہوگا کہ میں اور فلکی بہت خوش ہیں۔"

"واہ! میری محبت میں آپ خاصی عقل مند ہو گئی ہیں۔"

"اللہ تعالیٰ آپ کی محبت سے بچائے۔" فلکی کا دل چاہا بے اختیار کہہ دے مگر اس زبان کو روک لیا۔

اب وہ پہلے کی طرح بے اختیار زبان نہیں چلایا کرتی تھی۔ جب محسوس کرتی کہ رہی ہے تو خاموش ہو جاتی۔

"آپ یہ خط اٹھالیں اور پتہ نوٹ کرلیں۔ شاید ضرورت پڑ جائے۔ ویسے میں انھیں ایک خط لکھتا ہوں... اور..."

"اور مجھے معلوم ہے کیا لکھتے ہیں۔"

فلکی نے غصے سے وہ سب خط اٹھائے اور دراز میں بند کردیے۔ سارا دن وہ کھولتا اس کا دل چاہتا' ممی سامنے ہوں اور وہ سارے خط ان کے منہ پر دے مارے۔

شام کو جب اس کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو اسے خیال آیا کہ اس میں ممی کا کیا قصور تھا۔ جاری معمول کے مطابق لکھ رہی ہوں گی۔ یہ سب کینگی آفاق کی ہے۔ جس نے عرصہ ماں کے خط کے لیے تڑپایا۔ رفتہ رفتہ جب اس کا غصہ زائل ہو گیا تو اس نے پھر نکال کر پڑھنا شروع کردیے۔ چھ کارڈ تھے اور چار مفصل خط تھے۔ جس ملک میں چند تھا وہاں سے ممی نے مفصل خط لکھا تھا اور جہاں سے صرف گزرے تھے وہاں سے کا تھے۔

ہر خط آفاق اور فلکی کے نام تھا۔

سو آفاق کا بھی ان پر حق جتانا ٹھیک تھا۔

مگر پھر بھی وہ اسے معاف کرنے پر راضی نہ تھی۔

ممی نے بہت سی محبتیں بھیجی تھیں اور لکھا تھا کہ عنقریب وہ آفاق کی امی کی مہمان بننے والی ہیں۔ انھوں نے انھیں خاص طور پر نیویارک میں بلایا تھا۔ ممی کا خیال تھا کہ وہ ایک مہینہ وہاں رہیں گی۔

اُدھر

دونوں مائیں آپس میں گہرے تعلقات کی بنیاد ڈال رہی ہیں اور ان کو نہیں معلوم کہ فلکی کے جی میں کیا ہے؟

فلکی' آفاق کی غلامی سے آزاد ہونے کے لیے مشقت کر رہی ہے۔ کیسے کیسے پاپڑ بیل رہی ہے اور کیا کیا نہیں کر رہی ہے۔

کاش یہ بزرگ اس بات سے بے خبر نہ ہوتے۔

پھر بھی اس نے ممی کے کسی خط کا جواب نہیں دیا نہ اس کا جواب دینے کا ارادہ ہی تھا۔

ٹھیک ہے۔ جھوٹی سچی باتیں آفاق ہی لکھتا رہے تو بہتر ہے۔

کل کو جب وہ گھر واپس جائے گی تو اپنے ماں باپ کے سامنے شرمندہ نہ ہوگی۔ نہ اس نے کوئی جھوٹ بولا ہوگا نہ اس سے بازپرس ہوگی۔

فلکی نے چادر منہ پر تان کر سوچا۔ ممی آج کل امریکہ میں ہوں گی اور آفاق کی ممی کی مہمان بنی ہوں گی۔

آج کل آفاق کو اپنا وعدہ یاد دلانا کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ کچھ دن ٹھہر کے' جب ممی نیویارک سے چلی جائیں گی تو وہ اسے یاد دلائے گی۔ اس سے پہلے نہ کوئی غلطی کرنی ہے نہ کوئی جھگڑا کرنا ہے اور نہ منہ بسورنا ہے۔

یہ فیصلہ کرکے فلکی سو گئی۔

صبح صبح فلکی نے باورچی خانے میں ہلکی آواز سے ریڈیو لگا لیا تھا۔ ریڈیو کئی دنوں سے پڑا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کو یہاں رکھنے کا مقصد کیا ہے۔ کبھی کبھی وہ ر لیتی مگر اس نے ریڈیو کو اپنی جگہ سے ہلایا نہیں تھا۔

آفاق اندر تیار ہو رہا تھا اور وہ ناشتہ بنا رہی تھی۔ آواز اتنی ہلکی تھی کہ آفاق کے کمرے نہیں جا رہی تھی اور وہ انڈا تل رہی تھی نہ جانے کس وقت، قمیص ہاتھ میں پکڑے آ باورچی خانے میں آگیا۔ اس کی آہٹ پاکر فلکی نے مڑکر دیکھا تو اس کی جان نکل گئی۔ کفگیر سے چھوٹ گیا۔ اس کی بات نہیں سنی بلکہ بڑھ کر ریڈیو بند کر دیا۔

آفاق کے ایک ہاتھ میں نیلی دھاری دار قمیض تھی اور دوسرے ہاتھ میں بٹن۔

"یہ آپ نے ریڈیو کیوں بند کر دیا؟" آفاق نے پوچھا۔

"مجھے ریڈیو لگا کر کام کرنے کی عادت نہیں ہے۔ آج ویسے ہی لگا دیا تھا۔" فلکی نے لر ہوئے کہا۔

"آپ کو معلوم ہے، ریڈیو میں آپ ہی کے لیے لایا تھا۔ کمال ہے آپ نے ابھی باورچی خانے میں رکھا ہوا ہے؟"

"جی، میرے لیے....." وہ حیرت سے بولی۔

"ہاں آپ کے لیے تاکہ آپ اپنے من پسند گیت سن سکیں۔"

"مگر، میں نے تو نہیں کہا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔ آپ نے نہیں کہا تھا لیکن آپ کو شاید معلوم نہیں کہ ہر محکمے میں تر دینے کے کچھ رواج ہیں۔"

"ترقی دینے کے؟"

"ہاں ہاں، جب کارکن دیانت داری سے اپنا کام کرتے ہیں تو انھیں ترقی دی جاتی ہے یا کم

رعایتیں دی جاتی ہیں۔"

"میں اب بھی نہیں سمجھی؟"

"تو سمجھنے کی کیا ضرورت ہے۔ ریڈیو سے دل بہلا لیا کریں۔"

"اب تو مجھے عادت نہیں رہی۔"

"پھر سے پڑ جائے گی۔ چلئے میرے سامنے ہی ریڈیو آن کر دیجئے۔"

"جب فلکی بے یقینی انداز میں کھڑی رہی تو آفاق نے آگے بڑھ کر خود ہی ریڈیو آن کر دیا۔ مغنی اپنی پُرسوز آواز میں گا رہا تھا۔

تیرا ستم بھی گوارا تیری جفا بھی قبول
یہ اتفاق ہے میں تیرے اختیار میں ہوں

فلکی نے چونک کر آفاق کی طرف دیکھا۔ آفاق نے فلکی کی طرف... دونوں کی نظریں لمحہ بھر کو ملیں۔

فلکی کی نظریں صاف کہہ رہی تھیں۔

یہ اتفاق ہے میں تیرے اختیار میں ہوں
.... میں تیرے اختیار میں ہوں

یکایک آفاق اپنے حواس میں آگیا... اور بولا۔

"اگر تکلیف نہ ہو تو میری قمیض کا بٹن ٹانک دیجئے۔"

"لائیے۔" فلکی بھی ہوش میں آگئی تھی۔

اپنے صحت مند ہاتھوں کی پوروں میں پکڑا ہوا بٹن جب آفاق نے فلکی کے ہتھیلی میں لرزتے ہوئے ہاتھوں میں پکڑایا تو دونوں کی انگلیاں ٹکرائیں۔

یہ اتفاق ہے میں تیرے اختیار میں ہوں

جیسے فلکی کی پور پور کہہ رہی تھی۔

فلکی بٹن لگانے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

ناشتے کی میز پر جب آفاق آیا تو بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ سفید سوٹ کے اندر اس نے نیلی دھاری دار قمیض پہن رکھی تھی اور سرخ ٹائی لگائی ہوئی تھی۔ وہ جب بھی آکر بیٹھتا اس کے پاس خوشبوؤں کے بادل چھا جاتے۔

کبھی کبھی فلکی سوچا کرتی۔ کاش وہ خوشبو ہوتی، جو آفاق سے لپٹ جاتی۔

فلکی جب ناشتے کی ٹرے اٹھائے میز پر آئی تو اس نے سنا۔ آفاق اپنی گھمبیر اور پُرسوز میں گنگنا رہا تھا۔

تیرا ستم بھی گوارا تیری جفا بھی قبول
یہ اتفاق ہے میں تیرے اختیار میں ہوں

فلکی کا دل دھڑکنے لگا۔

کتنا الٹ گانا گا رہا تھا وہ... یہ تو فلکی پر ٹھیک بیٹھتا تھا۔

لیکن وہ کافی دیر تک اس مصرعے کی تکرار کیے گیا۔

جانے آفاق کی آواز میں کیا تھا۔

فلکی کے رات والے سارے گلے آپ ہی دور ہو گئے۔

وہ چلا گیا تو فلکی اس کے فقروں پر غور کرنے لگی۔

ہر محکمے میں ترقی دینے کے کچھ رواج ہیں۔ جب کارکن اپنا کام دیانت داری سے کرے تو انھیں کچھ رعایتیں دی جاتی ہیں۔

ہوں' تو اس کا مطلب ہے فلکی دیانت داری سے اپنا کام کر رہی ہے اور بہت اچھا کام کر رہی ہے۔ اس واسطے آفاق نے اسے ریڈیو کی سہولت فراہم کی ہے تاکہ اس قیدِ تنہائی میں موسیقی بھرا جھونکا آئے۔

فلکی کا دل خوش ہو گیا۔

رات والی عاری قنوطیت کہیں غائب ہو گئی۔

واہ' دل بھی عجیب چیز ہے۔ رات کو آفاق کی نفرت سے بھرا ہوا تھا اور اب اس کی مہربانی سے اس کی محبت کا طلب گار بن بیٹھا ہے۔ ویسے آفاق جیسے آدمی کا دل جیتنا کم مشکل ہے... اس سے اپنا آپ منوانا کتنا کٹھن ہے۔

پتہ نہیں اس کے پاس دل ہے بھی یا نہیں۔

لیکن کیوں؟ آج فلکی کے اندر گھومتے سے بجنے لگے۔ کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔

عورت کی جیت تو یہ ہوتی ہے کہ آدمی کا من موہ لے نہ کہ اس سے نجات حاصل کر بھاگ جائے۔

مگر آفاق کا من موہنے کا اسے کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ پتہ نہیں اس کی دُکھتی رگ کہاں تھی؟ کہاں پہ اسے چوٹ لگتی تھی؟ اور کہاں سے درد اٹھتا تھا؟ وہ تو اسے ایک فولادی

انسان معلوم ہوتا تھا جس سے جو چیز ٹکراتی ہے' واپس لوٹ آتی ہے۔

لیکن وہ دوسرے آدمیوں سے کتنا مختلف تھا... ایک دم مختلف.... یہی بات اگر قابلِ نفرت تھی تو قابلِ توجہ بھی تھی۔ اس کی زندگی میں جتنے آدمی بھی آئے۔ سب کے سب ایک جیسے تھے۔ عورت اور دولت ان کی کمزوری تھی۔ مگر آفاق ایسا نہ تھا۔

عورت اور دولت دونوں کو پاؤں تلے مسل رہا تھا۔

واقعی کتنا عجیب آدمی تھا۔

ایسے آدمی کو مسخر کرنا دنیا کی سب سے بڑی فتح تھی۔

... اور بعض اوقات لڑکیاں ایسے آدمیوں کو مسخر کرنے کے لیے جان کی بازی بھی لگا دیتی ہیں۔

"ہے نا...؟"

اس نے دل میں سوچا۔

پتہ نہیں' اس کے دل کو کُریدتی سی کیوں لگ گئی تھی۔ حالانکہ آفاق کی مہربانیوں پر اعتماد کرنا بے وقوفی تھی۔ اس کے مزاج کو بدلتے دیر نہیں لگتی تھی۔

ابھی تو دیکھنا تھا کہ وہ فلکی کے ساتھ اور کتنی مہربانیاں کرتا ہے اور کتنی ترقیاں دیتا ہے؟

ایک ہفتے بعد پھر عجیب و غریب بات ہوئی۔

شام کو آفاق جب گھر آیا تو اس کے پیچھے پیچھے نوکر نے ایک ٹی۔وی اٹھا رکھا تھا۔

آفاق نے اسے ٹی۔وی لاؤنج میں رکھوا دیا۔

نوکر چلا گیا تو آفاق نے ڈبہ کھولا۔ تاریں نکالیں اور اس کو اپنی جگہ پر فکس کرنے لگا۔ فلکی ہکا بکا سی دور صوفے پر بیٹھی دیکھتی رہی۔ انٹینا ٹھیک کرنے کے بعد جب آفاق نے ٹی۔وی چلایا تو اس پر رنگین تصویریں آنے لگیں۔ یہاں پہلے جو ٹی۔وی پڑا تھا وہ بلیک اینڈ وائٹ تھا اور اب رنگ دار فلم چلنی شروع ہوئی تو آفاق بھی دور جا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ گو فلکی حیران تھی... مگر کوئی سوال نہ کرنا چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ بغیر سوچے سمجھے آفاق سے کوئی بات نہیں کرنی چاہیے۔ وہ زیادہ تر اس موقعے کی تلاش میں رہتی تھی کہ خود آفاق بات کا آغاز کرے تاکہ اسے علم ہو جائے کہ وہ کس موڈ میں ہے۔

جب پروگرام ختم ہوا تو آفاق نے گھوم کر گم سم بیٹھی فلکی کو دیکھا اور پوچھا۔

"کیسے آپ کو ٹی۔وی پسند آیا؟"

"یہ ٹی۔وی کس کا ہے؟" وہ بے اختیار پوچھ بیٹھی۔

"یہ بھی سرکار' آپ ہی کا ہے۔"

"میرا مطلب تھا' کرائے کا ہے یا مانگ کرلائے ہیں؟"

اس بات پر آفاق اس قدر زور سے ہنسا کہ دیر تک ہنستا چلا گیا۔

"ویسے آپ کافی ذہین ہیں اور بات بھی یاد رکھتی ہیں۔ اتنا بتا دوں' ہے تو کرائے کا۔ اب یہاں سے نہیں جائے گا۔"

"کیوں؟"

"آپ اور میں شام کو دیکھا کریں گے۔"

فلکی کا دل دھڑک اٹھا۔

"آپ دیکھا کیجئے۔ مجھے تو اور بہت کام ہوتے ہیں۔"

"ارے' ارے۔ اب ایسی بھی کیا ناراضگی یوں تو آپ میرے ساتھ میٹھی میٹھی باتیں کر کی روادار نہیں ہیں۔ اسی بہانے ساتھ بیٹھ جایا کریں گے اور شام بیت جایا کرے گی۔

فلکی کو بڑی ہنسی آئی۔ روادار کون نہیں؟... میں یا آپ...؟" مگر اس نے کچھ نہیں کہا۔

"یہ دوسری ترقی ہے؟" فلکی نے آفاق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"آفاق کو ہنسی آگئی۔ اسے فلکی سے اس قسم کے سوال کی امید نہیں تھی۔

"خاصی ذہین ہوتی جارہی ہیں آپ۔" وہ مصنوعی حیرت سے بولا۔

"یہ بھی آپ کی عنایت ہے۔" فلکی نے برجستہ کہا۔

"خوب... بہت خوب...

"آپ نے تو آج مجھے خوش کردیا۔ اسی بات پر میں آپ کو ساری رعایتیں دے دوں گا۔"

دوسرے دن واقعی ایسا ہی ہوا۔ آفاق جب دفتر چلا گیا تو آدمی آئے۔ انھوں نے ٹیلی فون دیا۔ کیسٹ ریکارڈ' ٹیپ ریکارڈ' ہر شے اپنی جگہ پر پہنچ گئی۔ چاروں کونوں میں سپیکر لگ گئے گھر پھر بھرا بھرا اور یارونق نظر آنے لگا۔

سارا کام ختم کرچکنے کے بعد ان آدمیوں نے فلکی کو بلایا اور بڑے ادب سے جھک کر کہا۔

"بیگم صاحبہ! آپ کام چیک کرلیں اگر آپ کی تسلی ہوگئی ہو تو ہم جائیں۔"

کسی عزت دار آدمی کی بیگم ہونا کتنا سکون بخش ہے۔ فلکی نے دل میں سوچا۔

پھر اس نے جاکر برائے نام ہی ساری چیزوں کو چیک کیا اور بولی۔

"آپ لوگ جاسکتے ہیں۔"

وہ سلیوٹ مار کر چلے گئے۔

فلکی نے نئے سرے سے سارے گھر کو سنوارا۔ خاص طور پر ٹی وی لاؤنج کی ترتیب بدلی۔ وہاں پھول سجائے۔ اسے معلوم تھا۔ آج رات آفاق یہاں بیٹھ کر ٹی۔وی دیکھے گا اور پھر سب چیزوں کا جائزہ لے گا۔

ابھی وہ آفاق کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔

وہ ڈر گئی اور اچھل کر پیچھے ہٹ گئی۔ کتنی نامانوس اور ڈراؤنی لگی تھی یہ آواز۔ عرصہ دراز سے گھر میں کوئی گھنٹی نہیں بجی تھی۔ اب سونے گھر میں جیسے تاریں چیخ اٹھی تھیں۔

پہلے تو کتنی دیر وہ ڈری سہمی کھڑی رہی۔ پھر بڑھ کر اس نے ریسیور اٹھا لیا مگر کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑی۔

"ہیلو... ہیلو!"

ادھر سے ایک مردانہ آواز بول رہی تھی۔

وہ اتنی خوف زدہ تھی کہ آواز کو بھی نہیں پہچان رہی تھی۔

پتہ نہیں کون بول رہا ہے۔

اس کا دل دھڑ دھڑ بج رہا تھا۔ خواہ مخواہ یہ فون لگ گیا۔ ایک اور دھڑکا لگ گیا۔ ہزار نئے خوف جاگ اٹھے۔ کتنے لوگ اس کے واقف تھے اور جانے کون کون اسے جانتا تھا۔ کہیں وہ کم بخت بولی ہی نہ ہو؟

"ہیلو... ہیلو... ہیلو! بھئی کچھ تو بولو۔ میں آفاق بول رہا ہوں۔"

"آفاق..."

فلکی نے ایک طویل سانس لی اور لرزتی ہوئی آواز میں بولی "جی..."

"بھئی جی کون ہے؟"

"جی' میں ہوں۔"

"حضور! میں آپ کا خادم آفاق بول رہا ہوں۔ آپ اپنا نام لیتے ہوئے شرما کیوں رہی ہیں؟ کیا میں آپ کا منگیتر ہوں؟"

"جی میں فلکی ہوں' فلک..."

اسے فوراً" خیال آیا کہ آفاق اسے کبھی فلکی نہیں کہتا۔ ہمیشہ فلک کہتا ہے اور طنز کرنا مقصود

ہو تو پھر بیگم فلک ناز کہتا ہے۔

"اچھا تو فلک صاحبہ! عجیب اتفاق ہے۔ اس طرح فون پر آپ کی آواز سننے کا پہلا ہے... بڑی سُریلی اور سجی ہوئی آواز ہے آپ کی۔ اگر بہت عرصہ پہلے سن لی ہوتی تو آ عشق میں مبتلا ہو جاتا۔"

فلکی کا دل پہلو میں دھڑکنے لگا۔

اس سے کچھ بولا بھی نہیں گیا۔ شاید یہ کچوکے لگانے کا نیا انداز ہے...

"اجی کچھ تو بولیے نا؟ میں نے دفتر کا فون انگیج کر رکھا ہے۔"

"آپ... آپ عشق میں مبتلا ہونے والے نہیں ہیں... مجھے معلوم ہے۔" فلکی نے رک کر کہا۔

"چلیے' ایک بات تو آپ کو معلوم ہو گئی۔ رفتہ رفتہ سب معلوم ہو جائے گا۔"

"جی..." اس نے اتنا ہی کہا۔

"ویسے آپ بہت اچھا بول لیتی ہیں۔"

فلکی نے کچھ نہیں کہا۔

"یہ تو پوچھیے' میں نے فون کیوں کیا ہے؟"

"آپ خود ہی بتا دیں۔"

"آپ کے لیے دل اداس ہو رہا تھا۔ سوچا بات ہی کر لوں۔"

"جھوٹ۔" ایک دم فلکی کے منہ سے نکل گیا۔ پھر جلدی سے بولی "جب فون نہیں تھا کیا دل اداس نہیں ہوتا تھا۔"

"ہوتا تھا۔"

"تب کیا کرتے تھے؟"

"آپ کا پکایا ہوا بدمزہ کھانا یاد کر کے صبر کر لیتا تھا۔"

کمینہ' فلکی دانت پیس کر رہ گئی۔

"آپ کو کچھ کہنا ہے؟"

"نہیں۔" پھر جلدی سے بولی۔ "یہ آپ نے فون کیوں لگوا لیا ہے؟"

"بار بار میرے زخم نہ کریدیے۔" آفاق بولا "آپ نہیں جانتیں۔ دفتر میں میرا دل کے بغیر نہیں لگتا' تھوڑی تھوڑی دیر بعد آپ سے گفتگو کر کے دن گزار لیا کروں گا۔"

"یا یہ کہ..." فلکی بولی "فون کر کے اندازہ کرتے رہیں گے کہ میں گھر میں ہوں یا بھاگ گئی ہوں۔"

آفاق قہقہہ لگا کر بولا۔ "اس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ آپ کے بھاگنے کے بھی ارادے ہیں۔"

فلکی خاموش ہو گئی۔

پھر غلط بات کہہ دی تھی اس نے۔

"بتایئے نا' کب بھاگنے کا ارادہ ہے؟ اس دن میں فون نہیں کروں گا۔"

"اب بھاگنے کی کیا ضرورت ہے۔" فلکی بولی۔

"کیوں؟" آفاق کا دل دھڑک اٹھا۔

"اب تو ویسے بھی میری میعاد پوری ہونے والی ہے۔ آپ کو اپنا وعدہ یاد ہے نا؟"

"کون سا وعدہ... ہاں' ہاں... یاد ہے... جناب یاد ہے۔"

آفاق کا دل ایک دم سے بجھ گیا۔

لیکن پیشتر اس کے کہ آفاق کچھ کہتا' فلکی نے فون بند کر دیا۔

فون بند کرنے کے بعد فلکی سکون سے کام نہ کر سکی۔ جانے اس نے اسے بے سکون کیوں کر دیا تھا۔ وہ تو پُرسکون ندی کی طرح رَواں دَواں تھی۔ اب اس نے پھر کنکر پھینکنے شروع کر دیے تھے۔ حواسوں میں جب گرداب بننے تو اس کا سر چکرانے لگتا۔

ایک دن آفاق اور فلکی بیٹھے ٹی-وی دیکھ رہے تھے کہ آفاق نے اچانک ٹی-وی، اور بولا۔

"بیگم فلک ناز! آپ کا امتحان نہ ہو جائے؟"

"کس بات کا امتحان؟"

"جو ایک مکمل کورس پڑھنے کے بعد امتحان ہوتے ہیں نا؟"

"جی ہاں۔"

"پھر رزلٹ بھی آؤٹ ہوتے ہیں اور اگلا پروگرام رزلٹ پر منحصر ہوتا ہے۔"

"جی ہاں۔"

"پھر ہو جائے آپ کا امتحان؟"

"کس طرح کا؟"

"یعنی آپ کی خانہ داری وغیرہ کا۔"

"آپ صاف کہیں، کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"میں چاہتا ہوں اپنے سارے دوستوں کی دعوت کروں اور سارا کھانا آپ خود پکائیں۔"

"میں... اکیلی؟"

"جی ہاں۔"

"کتنے لوگ ہوں گے؟"

"اندازاً پچاس آدمی ہوں گے۔"

"پچاس آدمی... اور میں تنہا ان کے لیے کھانا پکاؤں؟"

"اب آپ کو سب کچھ پکانا آگیا ہے۔ کیوں گھبراتی ہیں!"

"مگر میں نے کبھی اتنے لوگوں کا کھانا نہیں پکایا۔"

"کوشش کریں۔ شاید پکا ہی لیں۔"

"اگر نہ پکا سکی تو...؟"

"امتحان کی بات ہے۔ امتحان نہ دیا تو سال ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہے۔"

ہاں۔ فلکی نے دل میں سوچا... ساری محنت ضائع ہو جائے گی۔ جہاں اتنے پاپڑ بیلے ہیں وہاں ایک اور سہی...

چلئے، جان کی بازی لگا لیتے ہیں۔ ہار جیت اللہ کے اختیار میں ہے۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد وہ بولی "جس طرح آپ کی مرضی۔"

"شاباش تو پھر کاغذ پنسل لے آؤ۔ دن مقرر کریں۔ لوگوں کی فہرست بنائیں اور مینو بھی بنا لیں۔"

"سب کچھ ایک دن میں پک جائے گا؟" مینو بن جانے کے بعد فلکی نے پوچھا۔

"تم ایسے کرنا، کچھ چیزیں بنا کر ایک دن پہلے فریزر میں رکھ لینا۔ ٹھیک ہے نا؟"

"جی ہاں۔" تف ہے اس کی عقل پر۔ بھلا ایسی باتیں اس کے ذہن میں کیوں نہیں آتیں جو ہمار آفاق سے نوالے بنوانے پڑتے ہیں۔

انھوں نے بیٹھ کر اپنے قریبی دوستوں کی فہرست بنائی اور آفاق نے کہا کہ وہ دفتر سے دعوت اے چھپوا کر ان کے گھر بھیج دے گا۔ پھر وہ فلکی سے بولا۔ "شادی کے بعد میرے گھر میں یہ ہلی دعوت ہوگی۔ اس سے پہلے دعوتوں کا انتظام میری امی کرتی رہی ہیں۔ ہمارے گھر کی ہدایت ہے کہ دعوت بہت شاندار ہوتی ہے اب اس روایت کو برقرار رکھنا آپ کا کام ہے۔"

"اللہ مالک ہے۔" فلکی نے آہستہ سے کہا۔

"ابھی درمیان میں ایک ہفتہ ہے۔ آپ مجھے سب چیزوں کی فہرستیں بنا دیں میں سودا سلف لگوا دوں گا۔"

فلکی دل میں بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ اتنے آدمیوں کا کھانا پکوانا ظلم تھا۔ وہ اکیلی جان... کیا کیا رے گی؟ اور کس طرح کرے گی۔ اس نے حامی بھر کر کہیں غلطی تو نہیں کی۔ سوچ سوچ کر ال ہوئی جا رہی تھی۔

دعوت سے دو دن پہلے اس نے سب چیزوں کی فہرستیں بنا کر آفاق کو دے دی تھیں۔

اگلے دن آفاق تمام سودا سلف لے آیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک باوردی آدمی بھی سبزی اور اشت کی ٹوکریاں اٹھائے ہوئے باورچی خانے تک آگیا۔

فلکی جب اِدھر اُدھر کا کام کر کے باورچی خانے میں آئی تو وہاں پر باوردی ملازم ابھی تھا۔ فلکی کا خیال تھا سودا سُلف رکھ کر وہ چلا جائے گا۔ جس طرح کہ عام طور پر ہوتا ہے۔

"کیا بات ہے؟" فلکی نے اندر آتے ہی پوچھا۔

"صاحب نے بولا تھا اِدھر ٹھہرنے کو۔"

"اچھا۔" فلکی نے سوچا کہ شاید کوئی کام ہو گا اس سے آفاق کو۔ وہ پھر کام میں مگن ہو جب دونوں بیٹھے ٹی۔وی دیکھ رہے تھے تو فلکی کو ایک دَم وہ آدمی یاد آگیا۔

"وہ آدمی آپ کا انتظار کر رہا ہے۔"

"کونسا آدمی؟" آفاق حیرت سے بولا۔

"وہی جو سودا لے کر اندر آیا تھا۔"

"ہاں۔" آفاق نے ہنستے ہوئے کہا۔ "وہ آپ کے ساتھ دعوت کا کام کروانے آیا ہے

"سچ مچ؟" فلکی نے حیرت سے کہا۔

"جی ہاں۔ میں نے سوچا لوگ زیادہ ہوں گے۔ کام بھی زیادہ ہو گا۔ برتن بھی زیاد ہگے۔ اب آپ نے شرافت سے ساری ذمہ داری اٹھالی ہے تو مجھے بھی شرافت کا ثبو چاہیے۔"

"اچھا... اسے شرافت کہتے ہیں۔" فلکی ہنس کر بولی۔

"آپ کی زبان میں کیا کہتے ہیں؟ آپ بھی بتا دیں؟"

"میری زبان میں تو اسے ترس کہتے ہیں۔"

"چلئے ترس ہی سمجھ لیجئے۔"

فلکی کو تسلّی ہو گئی۔ واقعی دوسرے آدمی کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اتنے کے لیے مصالحہ بنانا... ہزاروں کام... اور پھر برتنوں کا جو ڈھیر نکالا جائے گا' اس کا کیا ہو گا

فلکی نے دعوت سے ایک دن پہلے دعوت کا کام کرنا شروع کر دیا۔ عبدالکریم کو ساتھ عبدالکریم اتنا سمجھ دار نوکر تھا کہ فلکی اشارہ کرتی تو وہ کام مکمّل کر دیتا۔ مصالحے اور سلاد میں' چمچ چلانے میں' آنچ کم اور تیز کرنے میں اسے کچھ بھی سمجھانا نہ پڑا تو فلکی بولی۔

"عبدالکریم! کیا تم کھانا پکانا جانتے ہو؟"

"جی سر!"

"کہاں کام کرتے ہو؟"

"کام تو میں دفتر میں ہی کرتا ہوں مگر صاحب لوگ کا اکثر کھانا پکاتا رہا ہوں۔ کبھی صاحب جی ز میں بلا لیتے ہیں کبھی گھر پر..."

"اچھا' میں تو تمھیں بیرا ہی سمجھ رہی تھی۔"

"بیرا ہی سمجھو' سر جی! میں سب کام جانتا ہوں۔"

"اچھا' روسٹ بنا لیتے ہو؟"

"جی سر! بکرے کا بنوائیں۔ خالی ران کا.. یا مرغ کا۔"

"چانپیں بنا لیتے ہو؟"

"جی سر! آپ کس قسم کی پسند کرتے ہیں؟"

"اچھا۔ تم ایسا کرو' جو کچھ میں کہتی جاؤں' تم کرتے جاؤ۔ تم صرف میری مدد کرو۔ کھانا میں اؤں گی۔ تم جانتے ہو نا تمھارے صاحب کسی اور کے ہاتھ کا پکا نہیں کھاتے۔"

"جی سر۔" وہ ادب سے بولا۔

"اور پھر فلکی اسے اپنے طریقے کے مطابق مصالحے لگانے اور پکانے کے طریقے بتاتی رہی۔ کتنی آنچ پر کیا پکے گا اور کس صورت میں اتارا جائے گا۔ مختلف قسم کے سلادوں کے بارے یں بتایا اور یہ سب بتا کر فلکی کو بہت خوشی ہوئی۔ آج اس نے زندگی میں پہلی بار روحانی خوشی سوس کی۔ اسے اتنا کچھ پکانا آتا تھا کہ وہ ایک معمولی قسم کے خانساماں کے آگے شرمندہ نہیں تھی۔ اگر وہ کچھ بھی نہ جانتی ہوتی تو آج بیوقوفوں کی طرح اس کے آگے ہاتھ پھیلائے کھڑی ہوتی اور اس کا جو دل چاہتا پکا کر دے دیتا۔ بے شمار چیزیں ضائع کرتا۔ بہت سے پیسے خرچ کروا دیتا۔ چیزوں کی شکلیں بگاڑ دیتا اور پھر مُصر رہتا کہ ایسے ہی ٹھیک ہے۔ اب کم از کم وہ جان رہا تھا کہ بیگم صاحب کو عِلم ہے کہ کوفتوں کی شکل کیسی ہونی چاہیے۔ مرغی میں کتنا شوربہ رکھنا مناسب ہے۔ ساگ کو کتنا بُھوننا چاہیے۔ روسٹ کی رنگت کیسی ہو۔ چانپیں کتنی قسم کی ہوتی ہیں۔ روسٹ کے ساتھ کون سا سلاد رکھتے ہیں اور چانپوں کے ساتھ کس قسم کا۔ سوپ کیسا کیسا ہونا چاہیے۔ پُلاؤ کی رنگت کیسی ہونی چاہیے اور میٹھا...!

میٹھے اس نے دو قسم کے بنائے تھے اور عبدالکریم سے صاف کہہ دیا تھا کہ صاحب اس کے ہاتھ کا میٹھا پسند کرتے ہیں۔ کیونکہ اس نے سب میٹھے صاحب ہی سے تو سیکھے تھے۔

اس نے خانساماں کے سامنے گجریلا بنایا تھا۔ اس نے صرف اتنا کہا تھا۔ وہ گاجریں کش کر دے۔ باقی کام وہ خود کرے گی۔ دوسرا ولایتی میٹھا بنا لیا تھا۔ پڈنگ کسٹرڈ اور کیک ملا کر۔

عبدالکریم حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ یہ چھوٹی سی جان اتنے زیادہ کام جانتی ہے۔

اور اپنی اس جیت پر فلکی کو بے حد مسرّت ہو رہی تھی۔ بھاگ بھاگ کر کام کر رہی کبھی باورچی خانے میں ہوتی، کبھی ڈائننگ روم میں۔

"دیکھو... جل نہ جائے۔"

"کبابوں کا قیمہ بنا لیا۔ دکھاؤ تو ہاں ٹھیک ہے۔"

اسے ایک ایک بات کا پتہ تھا کہ یہ کس طرح ہوگی۔

تب گھریلے کے اوپر چاندی کے ورق لگاتے ہوئے اس نے سوچا۔ آفاق ٹھیک ہی کہ جس عورت کو خانہ داری نہیں آتی وہ عورت ہی نہیں ہوتی۔ جو عورتیں گھرداری کر سکتیں وہ صرف کٹھ پتلیاں ہوتی ہیں۔ گھر، گھر کا اور اک، گھر کا باورچی خانہ... یہی عورت کی جنت ہے اور جنت کسے کہتے ہیں؟ کیا بنے سنورنے اور کلبوں میں جانے کو؟

جن عورتوں کو اپنے گھر کا شعور نہیں ہوتا، وہ گھر کیوں بساتی ہیں! اللہ تعالیٰ نے دنیا کے لیے مرد کو بھیجا اور گھر بسانے کے لیے عورت کو۔ عورت کو تعلیم بھی حاصل کرنی چاہیے فیشن بھی کرنا چاہیے... لیکن عورت رہ کر...

اب... یہ سب کام کر کے اسے بے حد خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے اپنے آپ اضافے کا احساس ہو رہا تھا۔ کوئی جنت محسوس نہیں ہو رہی تھی اور نہ گھر کا کام گھٹیا کام ہو رہا تھا۔

اگر آج وہ یہ سب نہ کر رہی ہوتی تو کتنی ہلکی اور گھٹیا لگ رہی ہوتی۔

کچھ جاننا۔ اور پھر جان کر اوروں کو بتانا کتنا تسکین دہ امر ہے۔

کیا اس اور اک کے لیے اسے آفاق کا شکر گزار ہونا چاہیے؟

ات کا دن بھی آگیا۔ فلکی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون سے کپڑے پہنے۔ ایک سے اس نے گوٹے کناری والے کپڑے نہیں پہنے تھے۔ اپنی بھاری بھاری ساڑھیاں ں میں بند کر دی تھیں۔ زیوروں کو ہوا نہیں لگوائی تھی۔ آج ان کے گھر میں دعوت ر ظاہر ہے آج اچھے کپڑے پہننے تھے۔ پہنتے ہوئے ڈرتی بھی تھی۔ اگر آفاق نے کوئی ں کر دیا۔ عین وقت پر کوئی کچوکا لگا دیا تو کیا ہوگا۔ سب کیا کرایا خاک میں مل جائے گا۔ پھر اپنا دل جو اتنا برا ہوگا۔ آج کوئی ایسی حرکت نہیں کرنی چاہیے جس سے اس کا دل برا فاق باہر انتظامات میں اتنا مصروف تھا کہ ڈھنگ سے اندر آ کر بیٹھتا نہیں تھا جو وہ کسی اس سے پوچھ ہی لیتی۔ بہرحال وقت گزرا چلا جا رہا تھا اس لیے وہ اپنے کمرے میں آئی۔ ے کپڑے دیکھے۔ پھر اس نے ایک کالی ساڑھی کا انتخاب کیا۔ اس پر سنہری ہلکا سا باڈر لگا ۔ یہ ساڑھی اسے بالکل ٹھیک معلوم ہوئی۔ پھر رات کے فنکشن کے لیے رنگ بھی تھا۔ اس نے سوچا۔ وہ اس کے ساتھ کالے پتھروں والا چھوٹا سا لاکٹ اور ٹاپس پہن ۔ کلائی میں ایک طرف گھڑی ہوگی اور دوسری میں کالی چوڑیاں پہن لے گی۔

منہ ہاتھ دھو کر آئینے کے سامنے کھڑی کولڈ کریم لگا رہی تھی کہ آفاق آگیا۔ اس نے آتے پر پھیلی ہوئی سیاہ ساڑھی دیکھی۔ پھر فلکی کی طرف دیکھا۔

ی ڈر گئی۔

لا "آپ آج یہ ساڑھی پہن رہی ہیں؟"

ی ہاں۔" فلکی آہستہ سے بولی۔

آپ کے پاس کوئی اور مناسب کپڑے نہیں ہیں۔"

لی... وہ چیفنٹ کا پھولدار سوٹ پہن لوں۔" فلکی نے جلدی سے ان کپڑوں کی طرف کھا جو آفاق اس کے لیے لایا تھا۔ اسے ان سے زیادہ مناسب کوئی کپڑا نہیں لگ رہا تھا۔

"کچھ اور..." آفاق نے وہیں کھڑے کھڑے کہا۔

"باقی سب..." وہ رک گئی "میری شادی کے کپڑے ہیں۔"

"ذرا اپنی وارڈ روب کھولیے۔"

آفاق آگے بڑھ گیا۔ اس نے فلکی کی وارڈ روب کھول دی۔ جلدی جلدی سا دیکھ لیے اور ایک بہت بھاری سرخ ساڑھی نکال کر پلنگ پر رکھ دی۔

"آج کے فنکشن کے لیے یہ موزوں ہے اور اس کے ساتھ سرخ نگینوں کے خوشی کے موقعوں پر سرخ رنگ پہنتے ہیں۔"

یہ کہہ کر آفاق باہر نکل گیا۔

فلکی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

یہ سرخ ساڑھی فلکی نے ابھی تک نہیں پہنی تھی۔ بہت شوق سے بنوائی تھی۔ سے سرخ رنگ بہت پسند تھا' لیکن پہلی رات سرخ کپڑوں کا جو حشر ہوا تھا' اس سرخ رنگ سے نفرت ہو گئی تھی اس لیے اس نے سارے سرخ کپڑے اٹھا کر رکھ دے اور آج پھر وہی آفاق اسے سرخ کپڑے پہننے کا حکم دے گیا تھا۔

سرخ کپڑے تو سہاگ رات کی علامت ہوتے ہیں۔ جذبات کو جگاتے ہیں۔ ہیں۔ جس آگ کو اس نے پھونکیں مار مار کر بجھا دیا تھا اس کا تو پہلو سرد ہو چکا تھا۔

اور آج یہ ستمگر اسے کسی خوشی کی نوید دے رہا تھا۔

خوشی کیا ہوتی ہے؟

اور یہ تقریب کس خوشی میں منائی جا رہی ہے؟

یہ تو میرا امتحان ہے۔

امتحان کا آخری پرچہ۔

اس امتحان اور آزادی کے درمیان یہ سرخ رنگ کیوں حائل ہو رہا ہے؟

فلکی گم سم بیٹھی رہی۔

پھر اٹھ کر تیار ہونے لگی۔

اس نے بھی آج عرصہ دراز کے بعد جی کھول کر میک اپ کیا تھا۔ بہت خوب بنائے۔ اپنی خوب صورت آنکھوں کو سنوارا۔ ہائی ہیل کے سینڈل پہنے۔ سرخ ساتھ سرخ نگینے والا بھاری جڑاؤ سیٹ نکال کر پہنا تو واقعی فلکی چوتھی کی دلہن

دلہن ہی تو تھی وہ مگر ایسی دلہن جسے ستمگار راس نہ آیا ہو۔

وہ کلی جو کھل نہ سکی ہو۔

مگر کلی کا ایک اپنا حسن ہوتا ہے۔

فلکی باہر آتے ہوئے شرما رہی تھی۔ گھبرا رہی تھی.... آفاق کیا کہے گا اسے اتنے بھاری سنگھار میں دیکھ کر... اس نے تو آفاق کے ساتھ رہتے ہوئے لپ اسٹک تک لگانا چھوڑ دی تھی۔

وہ اندر کھڑی سوچ رہی تھی کہ اسے آفاق کی آواز آئی۔ شاید وہ نوکر سے کہہ رہا تھا۔

"بیگم صاحبہ کو بلاؤ۔ مہمان آنا شروع ہو گئے ہیں۔"

فلکی نوکر کے اندر آنے سے پہلے باہر نکلی اور لپک کر آفاق کے پاس پہنچ گئی۔ واقعی کچھ مہمان موٹر سے اتر رہے تھے اور آفاق ان کی پیشوائی کے لیے آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ جا کر آفاق کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

"آغا! دولہا دلہن تو آج چاند سورج کی جوڑی معلوم ہو رہے ہیں۔" آغا صاحب نے موٹر سے اترتے ہی کہا۔

آفاق نے بڑھ کر آغا صاحب سے ہاتھ ملایا جبکہ فلکی نے بیگم آغا سے ہاتھ ملایا۔

مسز آغا نے فلکی کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "واقعی مسز آفاق تو آج غضب ڈھا رہی ہیں۔"

تب آفاق نے نظر اٹھا کر فلکی کے سولہ سنگھار کو دیکھا۔ لمحہ بھر کو اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔

پھر ہنس کر بولا۔

"اچھا ہوا آپ لوگ وقت پر آ گئے۔ ورنہ آج ان کا یہ غضب مجھ پر ہی قیامتیں توڑتا۔"

اس پر ایک قہقہہ اٹھا۔ نہ معلوم کیا وجہ تھی۔ آج فلکی کو آفاق کی یہ تعریف بھیتی بالکل نہیں لگی۔ سب لوگ ہنستے مسکراتے ہال کمرے میں داخل ہوئے۔ پھر مہمانوں کا تانتا بندھ گیا۔ ایک کے بعد دوسرا... سب آتے گئے۔ فلکی اور آفاق ہر بار اٹھ کر جاتے' مہمانوں سے ہاتھ ملا کر انھیں لاتے اور اپنی اپنی جگہ بٹھاتے۔

خوب صورت فقروں میں حال چال کا تبادلہ ہوتا۔ آج فلکی مسکرا مسکرا کر ہر مہمان کا استقبال کر رہی تھی۔ بیرے کو اشارہ کرتی تو وہ مشروبات کی ٹرے اٹھا کر لے آتا۔ سوپ اور مشروبات ایک ہی وقت میں سرو ہو رہے تھے جس کا جو دل چاہتا' وہ اٹھا لیتا۔ آج آفاق نے دو

اور بیرے بھی منگوا لیے تھے جو سفید براق ایسی وردیوں میں ٹرے اٹھائے اِدھر سے اُدھر پھر رہے تھے لیکن آج فلکی صرف بیگم بن کر نہیں بیٹھی ہوئی تھی بلکہ مہمانوں کو بٹھانے جلدی سے ایک چکر باورچی خانے کا بھی لگا لیتی تھی۔ کھانے کو بھی دیکھ لیتی... ڈائننگ بھی نظر دوڑا لیتی... اور اس کے علاوہ ملازمین کو اگر کچھ اور ہدایات دینی ہوتیں تو وہ دیتی۔ آج احساس ہو رہا تھا جیسے وہ گھر کی مالکہ ہے... اس کے اندر نہ صرف مالکہ ہ صلاحیت پیدا ہو گئی تھی بلکہ وہی مالکانہ سا غرور اور خوشی بھی آ گئی تھی۔ بڑی تمکنت۔ اور بڑے اعتماد سے بات کرتی اور بڑے وقار سے مسکراتی تھی۔ آفاق اسے بازو سے پکڑ ایک طرف لے جاتا اور کبھی دوسری طرف... اور اس کے تعارف کرانے کا انداز بھی انوکھا تھا۔

"بھئی یہ میری فلک ہے۔"

"بس اب اس کو چھوڑو بھی۔" کوئی منچلی ہنس کر کہتی۔ "سب جانتے ہیں کہ یہ فلک ہے۔"

فلکی شرما کر ہنس پڑتی اور بازو چھڑا کر کسی اور کام میں مصروف ہو جاتی۔ آج لوگو ریمارکس بھی اسے بہت اچھے لگ رہے تھے۔

"آہا مسز آفاق! آپ تو پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت لگ رہی ہیں۔" ایک کہتی۔

"اور دیکھیے کس قدر اسمارٹ ہیں۔" دوسری کہتی "وہ شادی والی چربی تو ان پر چڑھ نہیں۔"

فلکی ان کو کیا بتاتی کہ اس پر چربی کیسے چڑھ سکتی تھی... کتنی مشقت کی ہے اس نے میں... اور پھر فلکی پہلے سے کمزور ہو گئی تھی اور رنگ بھی پہلے سا نہیں رہا تھا۔ پھر بھی لوگ کہہ رہے تھے وہ پہلے سے زیادہ خوب صورت ہو گئی ہے۔

عجیب الٹے دستور ہیں اس دنیا کے۔

فلکی جی ہی جی میں ہنس رہی تھی۔ جب پھلواری اپنے آپ کو پامال کر دیتی ہے تو لوگ ہیں... خوشنما ہو گئی ہے۔

"ارے یہ موئی کیسے ہوتیں؟ موٹاپا تو بچے کے بعد آتا ہے۔" ایک خاتون نے فلکی کی کمر گرد ہاتھ ڈال کر کہا۔

فلکی کا دل دھڑک اٹھا۔ اس نے گھبرا کر آفاق کی طرف دیکھا جو اِدھر ہی آ رہا تھا اور اس

اُن کا فقرہ سن لیا تھا۔

کہیں اب اس کا دل... اور آفاق کا چہرہ... اس کی زندگی کا یہ بھید نہ کھول دے۔ فلکی ڈر ی تھی۔

مگر آفاق قریب آ کر کھڑا ہو گیا اور فلکی کا ہاتھ تھام کر بولا۔

"خواتین و حضرات! میری چھوٹی موٹی سی فلکی کو ایمبریس Embarrace نہ کریں۔ میں خود غرض نہیں کہ اتنی خوب صورت بیوی کو اتنی جلدی بچوں میں پھنسا دوں... ابھی ہیں...." یہ کہہ کر اس نے ایک آنکھ بند کی۔ اس پر سارے ہال میں ہنسی کے فوارے چھوٹ ے۔

کاش یہ بات حقیقت ہوتی۔ فلکی نے دل میں سوچا۔

اور تو اور آج محفل کے سارے مرد بار بار فلکی کو دیکھ رہے تھے اس کو سراہ رہے تھے۔ ہر یک کی نظر کہہ رہی تھی کہ وہ آج کی رات کی ملکہ ہے اور اس محفل میں سب سے زیادہ خوب ورت لگ رہی ہے۔

جمال صاحب تو صاف کہہ رہے تھے۔

"یار تیری بیوی تو ابھی تک ترو تازہ ہے اور تم بھی بڑے خوش باش نظر آ رہے ہو۔ لگتا ہے ریر تم پر مہربان ہو گئی ہے۔"

آفاق ہنسا "تقدیر مجھ پر کب مہربان نہیں تھی جمال صاحب؟ اصل میں' میں دل کا اچھا آدمی ں اور بنیادی طور پر دیانت دار بھی ہوں۔ ہے نا فلک ناز۔" اس نے فلکی کی طرف دیکھا۔

آج فلکی بھی بار بار آفاق کو دیکھ رہی تھی۔ سیاہ ڈنر سوٹ۔ سفید قمیض اور سرخ پرنٹڈ ٹائی ادہ بہت خوب صورت اور کم عمر لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔ کہیں ں کرختگی کا عذاب نہ تھا۔

جب بھی کوئی فلکی کے حسن کی تعریف کرتا' وہ چاہتی کہ آفاق بھی اس کی تعریف کو سن لے۔ اسے اپنے اندر عجیب سی تبدیلی محسوس ہوئی۔ پہلے وہ بن ٹھن کر محفل میں اِدھر اُدھر لاتی رہتی تھی اور اگر کوئی مرد تعریف کر دیتا تو بار بار اس پر اپنے ناز و انداز سے بجلی گرایا تی تھی۔ مگر آج اسے مردوں کا بے باکانہ تعریف کرنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ ج صرف آفاق اس کی تعریف کرے۔ یہ حق صرف آفاق کو پہنچتا ہے اسی لیے وہ زیادہ تر آفاق پاس جا کھڑی ہوتی تاکہ لوگوں کو اس کی عدم موجودگی میں کچھ کہنے کا موقع بھی نہ ملے اور جو

کچھ وہ کہتے ہیں آفاق خود سن لے۔ آفاق کو احساس ہو جائے کہ آفاق کے مقابلے میں دا رائے کی پرواہ نہیں ہے۔

مگر آفاق بار بار ایک کالی ساڑھی والی محترمہ کے پاس جا کھڑا ہوتا تھا.... اور فلکی کی بھی تعاقب کرتی ہوئی وہیں پر جا کر رک جاتیں۔

یہ ایک نوجوان لڑکی تھی اور سب سے آخر میں آئی تھی۔ اس نے سیاہ ساڑھی پہ تھی۔ کافی چھوٹا بلاؤز پہنا ہوا تھا۔ بڑے قرینے سے میک اپ کیا گیا تھا اور اتنی خوب خاتون تھی کہ پہلی نظر میں اسے دیکھ کر فلکی کو دھچکا سا لگا۔ فلکی کو یوں محسوس ہوا کہ اس محفل میں شاید یہی خاتون اس سے زیادہ خوبصورت ہے۔ اگر اس سے زیادہ خوب صورت تھی تو اس کی فکر کی ضرور تھی یا ممکن ہے دونوں کے حسن کی ادا میں فرق ہو بہرحال دونوں اپنی جگہ پر خطرناک چیزیں تھیں۔ یہ خاتون جب محفل میں آئی تو فلکی کچن میں نوکروں کو دیئے گئی ہوئی تھی۔ وہ جب واپس آئی تو آفاق اس کالی ساڑھی والی خاتون سے گفتگو کر رہا فلکی جب پاس سے گزرنے لگی تو اس نے کہا۔

"فلک تم نوری کو جانتی ہو؟"

"نہیں۔" اس نے انکار میں سر ہلایا۔

"یہ امریکہ میں میری کلاس فیلو تھی۔"

"اچھا... بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" فلکی نے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا۔ پھر آفا اور مہمان سے مخاطب ہوا تو فلکی نے جھٹ اس سے پوچھ لیا۔

"آج کل آپ کہاں ہیں؟"

"آج کل تو میں پاکستان میں ہوں۔"

"یہاں مستقل آ گئی ہیں....؟"

"تقریباً" آ ہی گئی ہوں... یا آجاؤں گی۔"

"امریکہ کیوں چھوڑ دیا؟"

اس وقت آفاق ان کی طرف آ گیا۔ اس نے فلکی کے سوال کا خود جواب دے ڈالا۔

"کیونکہ ان کا دل پاکستان میں تھا۔"

اس پر نوری اتنے خوب صورت انداز میں ہنسی کہ فلکی کو پہلی بار محسوس ہوا جھرنا کیسے ہیں۔

ہاں واقعی آفو نے سچ کہا ہے۔ میرا دل پاکستان میں تھا۔ میں نے سوچا میں جسم امریکہ میں کیا کروں گی؟"

پھر کسی نے فلکی کو بلا لیا اور وہ کسی اور طرف متوجہ ہو گئی۔

لیکن ہر بار کسی سے بات کرتے ہوئے... کسی کو کچھ پیش کرتے ہوئے... آتے جاتے ہوئے اس کالی ساڑھی والی کو ضرور دیکھتی۔ وہ مسلسل مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہی تھی۔ اس کا رانا ہوا چہرہ اس کی کالی ساڑھی میں چاند کی طرح نمایاں ہو رہا تھا۔ ہر کوئی اس سے بات نے کو بے تاب تھا۔ ہر کوئی اٹھ کر اس کے پاس جا کھڑا ہوتا۔ جانے وہ بات بات میں چٹکلے چھوڑ ی تھی یا اس کی گفتگو میں اتنی خوشبو تھی کہ جو کوئی بھی اس کے پاس جا کھڑا ہوتا مسلسل ا رہتا۔ تب فلکی کو احساس ہوا کہ کسی عورت کے لیے صرف خوبصورت ہونا ہی ضروری ہے' اسے خوب صورت طرزِ تکلم بھی آنا چاہیے۔ اس کے الفاظ کا استعمال بھی موزوں اور ستہ ہونا چاہیے اور خاص طور پر اس کی ہنسی... اس کی ہنسی اس کی شخصیت کی جان ہونی ہیے۔ بے ہودہ انداز میں ہنسنے والی عورتوں کو مرد پسند نہیں کرتے۔ اگر گفتگو میں علم اور ح کی چاشنی نہ ہو تو کوئی متوجہ نہیں ہوتا۔

پتہ نہیں فلکی کس طرح باتیں کرتی تھی اور کس طرح مسکراتی تھی مگر اسے یقین تھا کہ وہ ری کی طرح عالمانہ اور شاعرانہ باتیں ہرگز نہ کر سکتی۔ اس کی ہریات اور ہر ادا میں غرور تھا۔ رف جوانی اور حسن کا غرور... ہاں واقعی....

وہ بچپن سے اب تک بڑی حقارت سے باتیں کرنے کی عادی تھی۔ یہی رویہ اس نے آفاق کے ساتھ بھی اختیار کیا تھا۔

بھلا کہیں شوہر بھی اس رویے سے مسخر ہوتے ہیں۔

درد کی کچھ لہریں فلکی کے اندر اٹھنے لگیں۔ کتنی غلطیاں ہوئیں اس سے۔

آج کی محفل میں وہ ہر خاتون کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ کوئی بھی خاتون محفل میں ناشائستہ رکتیں نہیں کر رہی تھی۔ نہ اپنے شوہر سے اونچی آواز میں بات کرتی تھی' نہ کسی کے قہقہے... بے ہودگی اور بے باکی کا انداز لیے ہوئے تھے۔

زندگی میں سیکھنے کے لیے کتنا کچھ ہے۔

اور اس نے کیا سیکھا ہے۔

اب کے' جب وہ آفاق اور نوری کے قریب سے گزری تو نوری نشے میں ڈوبی ہوئی آواز

میں کہہ رہی تھی۔

"او آفو! تم نے جب سے امریکہ چھوڑا' میں نے تو اس جھیل کے کنارے جانا دیا۔"

"اچھا..."

"ہاں' تمہیں تو پتہ ہے' کنول کے پھول میری جان ہیں۔"

"اس انداز سے مت کہو کہ لوگوں کو کنول کے پھولوں سے حسد ہو جائے۔"

اس پر نوری نے پھر وہی مترنم قہقہہ لگایا۔

فلکی یوں تو پاس سے گزر گئی مگر اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے پاؤں پر بچھو نے دیا ہو۔

نوری نے کوئی خاص بات نہیں کہی تھی۔ آفاق نے کوئی خاص اشارہ نہیں کیا تھا۔ مگر... نہ جانے فلکی یہ سب سننے کے لیے کیوں تیار نہ تھی۔ اسے تو آفاق کا بار بار نور پاس جاکر کھڑا ہونا بھی برا لگ رہا تھا... اسی لیے وہ بہانہ بنا کر بھی ان کے دائیں طرف۔ جاتی اور کبھی بائیں طرف سے۔

کبھی کوئی ادھورا فقرہ اس کے کان میں پڑ جاتا' کبھی کوئی مکمل فقرہ۔ ہر بار جلتی کڑھتی ان کے قریب سے گزر جاتی۔ نہ تو آفاق اسے بلاتا اور نہ نوری۔

وہ دونوں ایک دوسرے میں اس قدر مگن ہوتے۔

وہاں بیٹھے بیٹھے خواہ مخواہ فلکی کا جی جلنے لگا۔ وہ دور بیٹھ کر ان کا نظارہ کرنے لگی۔

آفاق کتنا خوش نظر آرہا تھا اور کتنے والہانہ انداز میں نوری کو دیکھ رہا تھا۔ ممکن ہے بچپن سے ایک دوسرے کو چاہتے ہوں تو پھر مجھ سے شادی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اکر لیتا۔ ہاں پتہ نہیں کیا مجبوری ہوگئی کہ شادی نہ ہو سکی... اور اب آگئی ہے دو سروں کو برباد کرنے کے لیے۔

مگر...!

مگر...!

فلکی کا دل قہقہہ لگا کر ہنسا۔ یہ تو کیا سوچ رہی ہے؟ تیری زندگی کا آفاق سے کیا واسطہ نے تیرے ساتھ محبت کا دعویٰ ہی کب کیا تھا اور تو کب اس کے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔ اُ وقت بوریا سمیٹنے کی فکر میں ہے۔

تیری بلا سے۔ وہ جس کے ساتھ چاہے رہے۔ محبت کرے یا عشق۔

ہاں...!

فلکی نے اپنے خیالات کو جھٹک دیا۔

اسے آفاق کی کیا پرواہ ہے۔

مگر پھر بھی بار بار اس کی نگاہ کالی ساڑھی پر جا اٹکتی۔ ہاں۔ مجھے تو کہہ دیا کالی ساڑھی مت پہنو... اور... اس پر نثار ہو رہا ہے۔

شاید اسی لیے کہا ہوگا۔ اس کی سہیلی جو کالی ساڑھی پہن کے آرہی تھی۔

بیٹھے بیٹھے اسے اپنی ساڑھی اور اپنے کپڑوں سے نفرت محسوس ہونے لگی۔ اس کا دل چاہا کہ سب کچھ نوچ کر پھینک دے۔ جانے کیوں اس کی آنکھوں میں آنسو آئے جارہے تھے۔

وہ بار بار اپنے آپ سے کہتی۔

مجھے کوئی پرواہ نہیں۔

مجھے ہرگز پرواہ نہیں۔

میرے جوتے کی نوک پر۔

مگر اس کا دل برابر کڑھ رہا تھا۔ وہ ایک عجیب و غریب کرب سے گزر رہی تھی۔ یہ کیسا کرب ہے۔

اسے خود سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ہاں اتنا وہ جان گئی تھی کہ اپنے چہرے یا گفتگو سے اپنے جذبات کا اظہار نہیں کرنا اسی لیے وہ بظاہر ہنس ہنس کر ہر ایک سے باتیں کر رہی تھی مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کے دل پر کیا بیت رہی ہے؟

اتنے میں کھانے کا وقت ہوگیا اور آفاق نے آکر اس سے کہا۔

"بھئی کھانا لگوا دو۔"

ہائے' آج اس نے کتنے ارمانوں سے سارا کھانا خود پکایا تھا۔ کتنی خوش تھی کہ آج وہ مکمل عورت بن گئی ہے۔ اس کا خیال تھا آج آفاق اس کا مشکور ہوگا۔ اس کے ساتھ رہے گا۔ اس کی ہر بات کی تعریف کرے گا۔ مہمانوں میں وہ یوں گھومیں پھریں گے... جیسے ان جیسا کوئی اور نہیں...

ہاں' شروع میں تو ہر کام ایسا ہی ہوا تھا مگر اس نوری کم بخت نے آکر سارے معاملے میں کھنڈت ڈال دی۔ نہیں' اس میں نوری کا کیا قصور ہے۔ اگر آفاق اس کو نہ بلاتا تو اچھا تھا۔

وہ کھانا بھی نکالتی جاتی اور سوچتی بھی جاتی... جب بیروں نے کھانا میز پر چن دیا تو ڈائیننگ میں آئی۔ ایک نظر سب میزوں کو دیکھا اور پھر آفاق کی طرف دیکھا۔ آفاق نے سب مہ سے درخواست کی اور وہ کھانے کی میز کی طرف چل پڑے۔

"واہ کتنی پیاری خوشبو آ رہی ہے۔"

"بھئی مجھے تو خوشبو سونگھتے ہی بھوک لگ جاتی ہے۔"

"شکل سے لگ رہا ہے کھانا لذیذ ہے۔"

"آفاق مجھے تم سے امید تھی کہ تم ہمیشہ اپنی روایات برقرار رکھو گے۔"

"خواتین و حضرات!" آفاق ایک دم بلند آواز سے بولا "جہاں جہاں آپ کے ہاتھ چمچ وہیں وہیں انھیں روک لیجیے۔ میں، آپ کو پہلے ایک خبر سنانا چاہتا ہوں۔"

کچھ لوگوں نے کھانا ڈال لیا تھا۔ کچھ ڈال رہے تھے.... کچھ چمچ منہ تک لے جانے وا تھے۔

واقعی سب اپنی اپنی جگہ پر رک گئے۔ عجیب منظر تھا۔

"اب یہ کیا کہنے والا ہے۔" فلکی کا دل دھڑک اٹھا۔

آفاق نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا رکھے تھے اور ہنس رہا تھا... جب اس نے دیکھا سب لو ٹھٹھک گئے ہیں۔ رک گئے ہیں اور منتظر ہیں تو وہ بولا۔

"آپ سب کی معلومات کے لیے میں اتنا عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ آج کی دعوت کا سا کھانا میری پیاری بیوی بیگم فلک ناز نے اپنے خوب صورت ہاتھوں سے تیار کیا ہے... اک چیز... اب آپ شروع کیجئے اور براہِ راست انھیں داد دیجئے۔" یہ کہہ کر وہ فلکی کی کمر میں ہا ڈال کر کھڑا ہو گیا۔

اس بات پر لوگوں نے باقاعدہ تالیاں بجائیں اور پھر نئے سرے سے چھری کانٹوں کا کھ شروع ہو گیا۔

لیکن اس کا نتیجہ خاطر خواہ ثابت ہوا۔ واقعی فلکی کو ہر نوالے کے ساتھ ڈھیروں داد لگی... کسی نے روسٹ پسند کیا، کسی نے چانپ، کسی نے قورمہ پسند کیا تو کسی نے ساگ۔ کو پلاؤ کی تعریف کرنے لگا، کوئی سلاد کو پسند کر رہا تھا۔ کسی نے میٹھے کو سراہا، کوئی کوفتوں کا دیوا نکلا۔ بلکہ عورتیں تو یقین ہی نہیں کر رہی تھیں کہ اتنی بے شمار چیزیں فلکی نے پکائی ہیں اور بھی تنہا۔

فلکی مسکرا مسکرا کر داد وصول کر رہی تھی... یہی اس نے چاہا تھا۔

.... مگر جانے جی اس طرح کیوں خوش نہ تھا۔ خوشی میں کہیں کانٹا سا چبھ گیا تھا۔

دل بیٹھا جاتا تھا۔ آنکھوں میں آنسو آئے جاتے تھے۔

سب کچھ اداس اداس سا لگ رہا تھا۔

تاہم فلکی بڑے وقار سے مہمانوں کو سنبھالے رہی اور ان کی داد وصول کرتی رہی۔

کھانے کے دوران بھی اور کھانے کے بعد بھی۔ کوئی فرد ایسا نہ تھا جو کھانے کی تعریف نہ کر رہا ہو۔

سب لوگ تعریف بھی کر رہے تھے اور بے یقینی سے فلکی کی طرف بھی دیکھتے جاتے تھے... گویا انھیں یقین نہ ہو کہ اتنی کومل سی، فیشن ایبل نک چڑھی لڑکی اتنا اچھا کھانا بھی پکا سکتی ہے؟

خود فلکی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنی بڑی دعوت کا انتظام اس اکیلی نے کیا ہے۔ دو دن جان مار کر اس نے کھانا پکایا تھا۔

پتہ نہیں کیوں اس نے اس کھانے کو اپنا مشکل ترین پیپر سمجھ لیا تھا۔ دعائیں مانگ کر کھانے بنائے تھی اور واقعی ہر ایک چیز رنگت سے لے کر ذائقے تک بہت عمدہ بنی تھی اور سب کے لبوں پر واہ واہ تھی۔

... تو فلکی کے جی سے آہ کیوں اُٹھ رہی تھی۔

فلکی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ فلکی بار بار آفاق کی طرف دیکھ رہی تھی۔

گو آفاق نے کھانے کی تعریف نہیں کی تھی مگر وہ بھی بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ ایک ایک سے داد وصول کر رہا تھا۔ کبھی کسی کو کچھ اُٹھا کر پیش کرنے لگ جاتا... اور پھر واپس جا کر نوری کے پاس کھڑا ہو جاتا۔

اور یہی بات فلکی کو کھٹک رہی تھی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی کوئی ڈش لے کر ان دونوں کے پاس چلی جاتی۔

"ارے، یہ کٹلس بھی آپ نے بنائے ہیں؟" نوری ادا سے پوچھتی۔

فلکی صرف اثبات میں سر ہلا دیتی۔

"اُف اللہ، کس قدر لذیذ ہیں۔ چار کھا چکی ہوں۔ آفو تم بہت خوش نصیب ہو۔ ایسی بیوی ملی ہے۔"

"میں خوش نصیب ہوں یا یہ؟" آفاق نے پلٹ کر پوچھا۔

جواب میں نوری نے ہنس کر چاندی کے گھنگرو بجا دیے اور فلکی کی آنکھوں میں آ
ڈال کر بولی۔

"اب تک تم آفو کے دل تک پہنچ گئی ہوں گی؟"

"تم جانتی ہو' وہاں ون وے ٹریفک ہے۔" آفاق نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔

"ہاں۔" نوری نے ہاں کو ذرا لمبا کیا "مجھ سے بہتر کون جان سکے گا۔" پھر ایک نوالہ
بولی۔

"بہرحال' فلکی ایک اچھی لڑکی ہے۔"

فلکی وہاں سے ہٹ گئی۔ اس کا وہاں کھڑا رہنا دوبھر ہو گیا تھا۔

نوری کی آنکھیں بڑی خوب صورت تھیں۔ بڑی بڑی سیاہ اور چمک دار آنکھیں۔
آنکھیں کھول کر بات کرتی تو ایسا لگتا کہ مخاطب ان آنکھوں میں ڈوبتا چلا جا رہا ہے۔

فلکی کو نوری کی آنکھیں کالے ناگ کی مانند محسوس ہوئیں جن کا ڈسا پانی نہیں مانگتا۔

پہلی بار... زندگی میں پہلی بار' فلکی کو نوری سے حسد محسوس ہوا۔ بے حد۔ بیکراں...
وہ تو اپنے مقابلے کا کسی کو سمجھتی ہی نہیں تھی.. اس نے اب تک اپنے مقابلے کی کوئی لڑکی
دیکھی تھی' نہ اپنے سے خوب صورت نہ اپنے سے طرح دار۔

..... اور پھر آفاق کا اس کے گرد یوں منڈلانا تو اسے ایک آنکھ نہیں بھا رہا تھا۔ ایسے لگ
جیسے اس کی کوئی عزیز ترین متاع چھیننے لیے جا رہا ہے۔

"خیر مجھے کیا...؟ اس نے دل میں سوچا۔ مجھے آفاق کی کیوں پرواہ ہو؟ میں اسے کیا سمجھتا
ہوں؟ میں نے کونسا اس کے پاس رہنا ہے۔ کیا خبر اس کی عادتیں ایسی ہی ہوں۔ اس کی اور
کئی دوست ہوں۔

مجھے کیا...

مجھے کیا....

وہ اپنے دل کو بہتیرا تسلی دیتی تھی مگر اس کا دل' جانے کیوں.... نیچے اور نیچے جا رہا تھا۔

کھانا ختم ہو گیا۔ سب لوگ خوش گپیوں میں مصروف ہو گئے۔ فلکی برتن اٹھوانے لگی۔

برتن اٹھواتے اٹھواتے اس کی ساڑھی الجھ گئی... اور اسے اپنی ساڑھی اتنی بری لگی کہ ا
کا دل چاہا' اسے آگ لگا دے۔ نہ جانے سرخ رنگ اس کے ستاروں سے کیوں نہیں ملتا تھا
حالانکہ اسے سرخ رنگ بہت پسند تھا۔ آج اس نے ناحق یہ ساڑھی باندھ لی تھی۔ کیا ہی ا

اگر وہ وہی کالی ساڑھی پہن لیتی۔ ممکن ہے اس ساڑھی میں وہ نوری سے اچھی نظر آتی۔
ں کے قدم سست ہو گئے تھے۔

ایک دم آفاق کی آواز آئی۔

"ارے بھئی فلک' کہاں ہو؟ مہمان اجازت چاہتے ہیں۔"

وہ دوڑ کر آئی۔ دیکھا کہ نوری دروازے کے بیچ کھڑی تھی۔

"بھئی' مجھے اجازت دو۔" نوری نے فلکی کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "بڑا مزے دار کھانا تھا۔ بڑی
ب صورت محفل تھی۔ تم سے مل کر بے پناہ خوشی ہوئی۔"

"مگر آپ اتنی جلدی کیوں جا رہی ہیں۔" فلکی نے سوئے سوئے لہجے میں کہا۔

"ہاں' میں بھی روک رہا ہوں۔" آفاق بولا "ابھی تو محفل جمے گی۔ گانا وانا ہو گا۔ یہ اتنی
ذوق ہے کہ جا رہی ہے۔"

"دیکھو آفو! تم سے وعدہ کیا تھا اس لیے آ گئی۔ ورنہ اتنے شارٹ نوٹس پر میرا آنا بہت مشکل
تھا۔ میری ایک کزن کی آج سالگرہ ہے۔ اب تھوڑی دیر کے لیے وہاں جاؤں گی' اگر نہ گئی تو
میری گت بنے گی۔"

"بھئی مجھے تو آج دوپہر کو ہی پتہ چلا تھا کہ تم امریکہ سے آ گئی ہو۔ اسی وقت فون کر دیا۔ تم
نے کون سا آ کر اطلاع دے دی تھی۔"

"آفو! تمہارا فون نمبر مجھ سے کھو گیا تھا۔ مجھے کسی نے بتایا تھا تمہاری شادی ہو گئی ہے۔ میں
مبارک باد دینا چاہتی تھی۔ مگر ابھی تو مجھے آئے مہینہ ہوا ہے۔ خیال تھا' تمہیں ڈھونڈھ نکالوں
گی۔"

"اور اس سے پہلے میں نے تمہیں ڈھونڈھ لیا۔"

"ایسا تم ہمیشہ کرتے ہو۔"

دونوں قہقہہ لگا کر ہنس دیے۔

نوری نے فلکی سے ہاتھ ملایا اور آفاق اسے دروازے تک چھوڑنے گیا۔ وہاں بھی اس کے
قہقہوں کی مسلسل آواز آتی رہی۔

بجھی بجھی فلکی آ کر مہمانوں میں بیٹھ گئی۔ آفاق بھی واپس آ گیا تھا۔

پھر گپ شپ اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ بہت سے خوب صورت ریکارڈ بجا کر سنے گئے۔ پرانی
فلمیں دہرائی گئیں۔ وہ سب ہوا جو ایسی محفلوں میں ہوتا ہے مگر فلکی خاموش رہی۔

رات کے تقریباً بارہ بجے سب مہمان رخصت ہونا شروع ہوگئے۔

ایک کھڑا ہوا تو اس کے پیچھے باری باری سب کھڑے ہوگئے۔

رخصت کرتے کرتے بھی ساڑھے بارہ بج گئے۔

ہال خالی ہوگیا تو فلکی نے نوکروں کو بتیاں بجھانے اور دروازے بند کرنے کی ہدایا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اس نے جلدی سے کپڑے بدلے۔ زیورات اسے مصیبت لگ رہے تھے۔

ہلکے پُھلکے رات کے کپڑے پہن کر اسے ذرا سکون آگیا۔ آفاق بھی شاید اپنے کمر کپڑے بدلنے چلا گیا تھا۔

تھوڑی دیر اپنے پلنگ پر بیٹھی رہی۔ پھر باہر نکل آئی۔

ہَوا میں کافی خنکی تھی۔ باہر رات کی رانی اور موتیا کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

نوکروں نے بتیاں بند کردی تھیں اور اب دروازے بند کر رہے تھے۔ فلکی نے ٹی وی میں بڑے شیشے کے آگے سے پردہ سرکا دیا۔ باہر پچھلی راتوں کا چاند طلوع ہو رہا تھا۔

فلکی کا دل اداس ہو رہا تھا۔

پتہ نہیں، آج اسے کیا ہوا تھا۔ رونے کو نہیں اداس ہونے کو دل چاہ رہا تھا... کبھی کبھ ہوجاتا ہے نا... کہ دل پر مَنوں برف گرنے لگتی ہے... جذبات شل ہوجاتے ہیں۔ آنکھیں سے انکار کردیتی ہیں۔ کان سننے سے انکار کردیتے ہیں اور لبوں پر مُہر لگ جاتی ہے۔ اس دل چاہتا ہے سناٹا ہو... خاموشی ہو... ویرانہ ہو... اور کوئی نہ ہو... کوئی نہ جانے کہ کیا ہو رہا ہے؟ صرف ایک دل کی دھڑکن ہو۔ پھر آدمی اپنے آپ سے بھی بے گانہ ہوجائے۔

اپنے آپ سے تو وہ کبھی کی بے گانہ ہوچکی تھی۔ پھر آج نہ جانے کون سی منزل تھی...؟

اِدراک و آگہی سے ماورا کوئی منزل تھی۔

ایسے میں فلکی کا دل چاہا... وہ کوئی گیت سنے۔ درد بھرا گیت۔

اس نے اُٹھ کر دیکھا۔ سب نوکر جا چکے تھے۔ باہر گُھپ اندھیرا تھا۔ اندر بھی سب رو گُل ہوچکی تھیں۔ ابھی ابھی آفاق سفید کُرتہ پاجامہ پہنے اس کے پاس سے گزر گیا تھا۔ اس کی مخصوص خوشبو محسوس ہوئی تھی۔ پتہ نہیں اس نے فلکی کو دیکھا نہیں تھا یا دیدہ نظرانداز کرگیا تھا۔

فلکی کو اضطراب سا محسوس ہونے لگا۔

ہوگی...

لے رات کا کون سا پہر تھا۔ اس نے گھبرا کر ٹیپ ریکارڈر بند کردیا۔

موشی چھا گئی مگر اس کے کانوں میں سناٹا بولنے لگا۔ "تم کسی اور کو چاہو گے تو..." وہ جدھر وہی آواز آتی۔

ں طرح چاندنی میں ہر جگہ سراب کی سفید ڈھیریاں نظر آتی ہیں، بالکل اسی طرح اندھیرے رجگہ اپنے خیال کے بُت نظر آتے ہیں، آوازیں آتی ہیں، سانسیں سنائی دیتی ہیں۔ کوئی الں چلتا ہوا قریب آتا ہے اس کی سانسیں گردن پر محسوس ہوتی ہیں، مگر کوئی نہیں ہوتا...

اپنا واہمہ ہوتا ہے۔

سارا گھر بار بار دہرا رہا تھا۔ "تم اگر ہم کو نہ چاہو تو کوئی بات نہیں.... تم کسی اور کو ے تو..."

لی ایک دَم گھبرا اٹھی۔ خاموشی سے وحشت ہونے لگی۔ اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔

ل میں ایک موہوم سا خیال تھا۔

مر قدم رکھا اور آفاق کے پلنگ کی طرف دیکھا۔ وہ اوندھے منہ سویا پڑا تھا۔

ہ سدھ، بے خبر...

لدی سے اس کی نظر کلاک پر پڑ گئی۔

ن بج رہے تھے۔

الی وقت ہوگیا تھا۔ پھر بھی جانے اسے کیوں امید تھی کہ آفاق اس کے انتظار میں جاگ رہا ...

وں جاگتا بھلا وہ...؟

س نے بتی بجھائی اور سو گئی۔

ادت بھی کیا بری شے ہے۔ تین بجے سوئی تھی۔ ٹھیک چھ بجے آنکھ کُھل گئی۔ سات بجے دفتر جاتا تھا۔ آفاق اس کے اٹھنے سے پہلے ہی اٹھ کر جا چکا تھا اس لیے وہ اٹھ گئی۔ پھر بھی خیال تھا کہ آج اس گھر میں دو تین نوکر بھی ہیں۔ اگر بیگم صاحبہ دیر سے اٹھیں گی تو سوچیں گے۔

ورچی خانے میں گئی تو عبدالکریم وردی پہنے ہوئے سٹول پر بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر کھڑا ہ سلیوٹ مارنے کے بعد بولا۔

"سرجی۔ صاحب کے لیے کیا ناشتہ بناؤں؟"

"ناشتہ میں خود بناؤں گی۔" یہ کہہ کر فلکی باہر نکل گئی۔ جھانک کر دیکھا۔ واقع
ہو رہا تھا۔

اس نے آکر ناشتہ بنایا۔ جب میز پر لے کر گئی تو آفاق کرسی کے پاس بیٹھے کیے کہ اپنی ٹائی کی ناٹ درست کر رہا تھا۔

فلکی ٹرے اٹھائے نزدیک گئی تو وہ گنگنا رہا تھا۔

تم اگر ہم کو نہ چاہو تو کوئی بات نہیں
تم کسی اور کو چاہو گی تو...

گاتے گاتے گھوم کر مڑا تو پیچھے ہی فلکی کھڑی تھی۔ زرد ہوتی ہوئی فلکی کی ٹکرائی تو وہ لڑکھڑا گئی۔ ذرا سا آفاق کا کندھا لگا تھا۔ اس کے ہاتھ سے ٹرے چھوٹ سب کچھ بکھر گیا۔ ٹوٹ پھوٹ گیا۔

وہ ابھی تک آفاق کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ چونک کر جلدی سے بیٹھ گئی ناشتہ اور ٹوٹے ہوئے برتن اٹھانے لگی۔ آفاق بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا اور بٹانے لگا۔ فلکی کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تھے۔

آفاق ابھی تک سیٹی پر وہی دھن بجا رہا تھا اور فلکی کا دل کٹا جا رہا تھا۔

"کوئی بات نہیں۔" اس نے فلکی کا لرزتا ہوا ہاتھ پکڑ لیا۔

فلکی نے نظر بھر کر اس کی طرف دیکھا... اور دو چھپے ہوئے آنسو اس کی پلکوں کی رخساروں پر آ رہے۔

آفاق بڑی محبت سے ہنسا۔

دونوں ایک ساتھ کھڑے ہو گئے۔

"عبدالکریم اور ناشتہ بنا لائے گا۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"نہیں، میں خود بنا لاتی ہوں۔" وہ باہر دوڑ گئی۔ اس کے دل کی جو حالت تھی وہ نہیں سکتی تھی۔

باورچی خانے میں جا کر اس نے عبدالکریم کو بھیجا۔ وہ جھاڑن ہاتھ میں لیے دو اس نے باقی کرچیاں اٹھائیں اور گیلے کپڑے سے قالین کو صاف کیا۔

اتنے میں فلکی دوبارہ ناشتہ اٹھائے میز پر آ گئی۔

آفاق اب بھی دھیمی دھیمی آواز میں گنگنا رہا تھا

تم اگر مجھ کو نہ چاہو تو کوئی بات نہیں

فلکی چپ چاپ آکر میز پر بیٹھ گئی۔

"کیا بات ہے۔ آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟" آفاق نے بڑی آہستگی سے پوچھا۔

"جی، میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"آپ بالکل زرد ہو رہی ہیں۔ میرا خیال ہے تھک بہت گئی ہوں گی۔ کل آپ نے کام بھی تو بہت کیا تھا۔"

"نہیں۔ تھکاوٹ کی تو کوئی بات نہیں۔"

"ہاں۔" وہ ایک دم یاد کرتے ہوئے بولا۔ "کل میں آپ کو داد دینا تو بھول ہی گیا تھا۔ واقعی شاندار دعوت تھی اور میری توقع کے خلاف سب کچھ اتنا اچھا تھا کہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح تعریف کروں۔"

فلکی خاموش بیٹھی رہی۔

"رات دیر تک آپ کا انتظار کرتا رہا۔ پھر جانے آپ کس وقت اندر آئیں' میں سو چکا تھا۔"

فلکی اب بھی چپ بیٹھی رہی۔ اسے آفاق کی تعریف سے ذرا بھی خوشی نہیں ہو رہی تھی۔ کاش! اس نے یہ سب رات کو کہا ہوتا۔

"میرا خیال ہے، رات بھی آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی؟"

"نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں تھی۔"

"شاید آپ کو نظر لگ گئی؟"

"جی..." فلکی نے چونک کر اس کی طرف بے یقینی سے دیکھا۔

"آپ سرخ کپڑے نہ پہنا کریں۔"

"آپ ہی نے کہا تھا۔" فلکی نے ذرا چڑ کر کہا۔

"ہاں، مجھے اچھے لگتے ہیں۔" پھر اس نے پیالی کی طرف اشارہ کیا۔

فلکی ہر روز چائے بنا کر رکھا کرتی تھی۔ آج بے خیالی میں بھول گئی تھی۔

فلکی جلدی سے چائے بنانے لگی۔

"شکریہ!" اس نے چائے کی پیالی لیتے ہوئے کہا۔ چائے پینے کے بعد بولا۔ "آج آپ آرام

کریں۔ بیمار لگ رہی ہیں۔"
میں آرام کروں گی تو کام کون کرے گا؟"
"عبدالکریم جو ہے۔"
"عبدالکریم..."
"ہاں۔ اب عبدالکریم اسی گھر میں رہے گا۔ یہ میرا پرانا خانساماں ہے۔"
فلکی کا دل چاہا کہ پوچھے۔ یہ اب تک کہاں تھا؟ مگر وہ صرف سوگواری سے مسکرا کر
اب اسے آفاق کی اداؤں کی سمجھ آ رہی تھی۔
آفاق کھڑا ہو گیا۔ فلکی بھی کھڑی ہو گئی۔ دوڑ کر اس کا بریف کیس اٹھا لائی۔ وہ پھر گنگ

تم اگر ہم کو نہ چاہو تو...
تو اس نے رات کو سب کچھ سنا تھا
فلکی گم صم کھڑی تھی۔
"اچھا جی۔"... وہ مڑا "خدا حافظ!"
کوشش کے باوجود فلکی کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔ جیسے اس کا روّاں روّاں ایک
تال پر محوِ رقص تھا۔
تم اگر ہم کو نہ چاہو... تم اگر...

یہ کیا ہوا کہ رہائی کے دن قریب آئے
بلند ہو گئی دیوار قید خانے کی
فلکی نے گھبرا کر کتاب ہاتھ سے چھوڑ دی اور کھڑی ہو گئی۔
"بلند ہو گئی دیوار قید خانے کی..."
قید خانہ...
بھلا کون سا قید خانہ...؟
اب تو کوئی قید نہ تھی۔ اب تو ساری دیواریں گر گئی تھیں۔ پردے اٹھ گئے تھے۔ اس
اس میں وہ آزاد تھی۔
آزاد چھوڑ دی گئی تھی۔
مگر پھر یہ کیسی دیوار تھی جو لاشعور میں کھڑی ہو رہی تھی۔ دل کے آس پاس تعمیر ہو رہی

یہ دیوار کون تعمیر کر رہا ہے؟
رہائی کے دن تو واقعی قریب آتے جا رہے تھے۔ امتحان تو ختم ہونے والا تھا۔ آزمائش میں تو
ری اتری تھی۔
یہ مٹھا مٹھا درد کہاں سے دل میں اتر آیا تھا۔
اور یک بہ یک یہ درد اسے دنیا کی ہر شے میں کیوں نظر آنے لگا تھا۔ وہ درد بھرے گیت سنتی

پہلے درد بھرے گیتوں سے اسے نفرت تھی۔ اسے تیز طرار لہو کو گرم کر دینے والے میوزک
تھے جس کی لے پر سارا جسم خود بخود تھرکنے لگے۔ چاچا چا' رمبا سمبا' جانے... پوپ میوزک'
شور' ہیجان خیزی... ترنگ... ہاؤ ہو... ہنگامہ' چیخ و پکار مگر اب جانے کیا ہوا تھا۔

درد بھرے گیت لگا کر وہ دور کونے میں جا بیٹھتی اور آنکھیں موندے سنا کرتی۔

انجانے میں' میں بانوریا
لکھ بیٹھی تیرے نام عمریا

یہ بھی کوئی گیت ہیں۔ کسی زمانے میں وہ گایا کرتی تھی۔ یہ جو لوگ سلوموشن میں گاتے یہ تو جذبات کو سلا دیتے ہیں' اور اب یہی سست رفتار گانے اس کے جذبات کو جگا رہے محبت کے مفہوم سے آشنا کر رہے تھے۔

اسے شعر وشاعری سے ذرا بھی دلچسپی نہیں تھی۔ نہ اردو کی شاعری اچھی لگتی تھ انگریزی کی۔ شیلے' کیٹس' بائرن... سب ہی خبطی تھے۔ محبت کو درد کہتے تھے اور درد کو کہتے تھے۔

درد بھلا خوشی کس طرح ہو سکتا ہے؟

اور ادھر مرزا غالب' اقبال' میر' ذوق جانے کیوں لوگ ان پر مرمٹ رہے تھے۔ محبت راگ تھا جو انھوں نے اپنی اپنی ڈفلی پر بجایا تھا۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

واہ یہ بھی کوئی شعر ہے؟ وہ یہ غزل سن کر کہا کرتی تھی۔ اگر دل ناداں ہی ہے تو اس۔ پوچھنا کیا معنی کہ تجھے کیا ہوا ہے؟ اور درد کی کیا دوا ہے۔ یہ بات تو ڈاکٹر سے پوچھنی چاہیے اور اب غالب کی یہ غزل وہ بیسیوں بار سن چکی تھی۔

ہم ہیں مشتاق اور وہ بے زار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

وہ دل میں سوچا کرتی کہ ہر شعر اور ہر لفظ کا مفہوم اسے کیونکر سمجھ میں آنے لگا ہے۔ آ کی لائبریری میں شعر و شاعری کی بے شمار کتابیں رکھی تھیں۔ وہ ہر روز وہاں سے ایک کتاب لاتی اور ورق ورق پڑھتی جو شعر اچھا لگتا' اس پر نشان لگا دیتی۔ بار بار پڑھتی اور پھر ا شاعروں کی الہامی قوت پر ایمان لانا پڑتا۔ جو وارداتیں ایک عام انسان کے دل پر گزرتی انھیں بھلا ایک شاعر کیسے سمجھ لیتا ہے۔ سمجھ لیتا ہے تو پھر ہر شخص کے احساسات کے مطا بیان کیسے کر سکتا ہے؟

شاعر نہ ہو گیا۔ ولی ہو گیا۔

اسی واسطے لوگ کہتے ہیں۔ شاعروں کو الہام ہوتا ہے۔ ان پر شعر نازل ہوتے ہیں۔ وہ تو ٹی شاعری کو بک بک سمجھتی تھی۔

جنھیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں' زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلم خانہ دل کے کمینوں میں

جانے کیسے چپکے سے اتنا مشکل شعر اس کے دل میں آ کر بیٹھ گیا۔ وہ تو مگر مگر جانے کیا تلاش لرتی پھرتی تھی۔ اپنے دل میں جھانک کر دیکھا ہی نہ تھا۔

محبت میں نہیں کچھ فرق مرنے اور جینے میں
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

واہ کیا بات کہی ہے... جو اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود میں خود نہ کہہ سکی۔

ہوتا ہے راز عشق و محبت انہی سے فاش
آنکھیں زباں نہیں ہیں مگر بے زباں نہیں

اب تو وہ آنکھوں کی زبان سمجھنے لگ گئی تھی کیونکہ اس کی اپنی آنکھیں بولنے لگی تھیں۔ ب سے اس کی زبان بند ہوئی تھی اور آنکھیں بولنے لگی تھیں اسے اپنی آنکھوں سے ڈر آنے گا تھا۔ وہ آفاق کی طرف دیکھتے ہوئے ڈرتی تھی اور اس سے نظر ملا کر بات نہیں کرتی تھی۔ یہی بے باک نگاہیں جن سے ہمیشہ اس نے بڑے سے بڑا کام لیا۔ آفاق کو بھی شروع میں پھاڑ پھاڑ دیکھا کرتی تھی۔ شرماتی نہیں تھی' جھجکتی نہیں تھی۔ اب وہی نگاہ اٹھتی نہیں تھی۔ اس نگاہ سے اسے ڈر لگتا تھا۔ وہ نگاہ چغل خور ہو گئی تھی اور چغل خور کا بھید کبھی نہ کبھی کھل جاتا ہے اس لیے وہ ڈرتی رہتی تھی۔ سہمی رہتی تھی۔

اور پھر انہی شعروں نے اس پر اس کی بدلتی ہوئی ساری کیفیت عیاں کر دی۔

محبت کیا ہے دل کا بے کس و مجبور ہو جانا!
سکون و ضبط کی منزل سے کوسوں دور ہو جانا

ہوں... تو وہ جو یوں بیکل بیکل.. غول سے بچھڑی ہوئی ہرنی کی طرح ماری ماری پھر رہی تھی تو اس کی یہ وجہ تھی... جانے دل کیوں ہر وقت اڑا اڑا سا رہتا تھا۔ نہ جانے کیوں نبض مدھم چلتی تھی مگر دل تیز دھڑکتا تھا۔ جانے کیوں بیٹھے بیٹھے وہ چونک جاتی تھی۔ جانے کیوں ہر آہٹ پر ڈر جاتی تھی۔ رات کو نیند نہیں آتی تھی۔ دن کو چین نہیں آتا تھا۔ سارے گھر میں پاؤں جلی بلی کی

مانند بولائی بولائی پھرتی تھی۔

کچھ تو گھر کا کام بھی کم ہو گیا تھا۔ عبدالکریم کھانا پکانے پر معمور ہو گیا تھا اوپر کا کام کر لیے ایک بیرا طفیل آگیا تھا۔ جمعدارنی کی بیٹی سلیمہ بڑی اچھی لڑکی تھی اور صفائی کا سارا نے سنبھال لیا تھا۔ پودوں کی دیکھ بھال کے لیے پھر سلامت علی آنے لگا تھا اور یکایک کام کرتے کرتے فلکی کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے کسی نے اس کے ہاتھ پاؤں توڑ کر ا طرف ڈال دیا ہو۔

پورے نو مہینے اس نے گھر میں مشقت کی تھی اور اب اسے کام کرنے کی عادت پڑ گئی ایک دو دن تو وہ مضحمل سی بستر پر پڑی رہی اور دیکھتی رہی۔ پھر اسے محسوس ہوا کہ اسے کیا ہوا کام پسند نہیں آتا۔

گو عبدالکریم کھانا اچھا پکاتا تھا مگر مصالحہ ضرورت سے زیادہ بھون دیتا تھا جس سے سا رنگ سیاہ ہو جاتا تھا اور سیاہ رنگ کا سالن کتنا بھی لذیذ کیوں نہ ہو' کوئی بھی کھانا پسند نہیں کر طفیل جھاڑ پونچھ کرتے وقت چھوٹی چھوٹی چیزیں اپنی جگہ سے نہیں ہٹاتا تھا' سو ان کے گرد ارہ جاتا تھا۔

سلیمہ غسل خانوں کو شیشے کی طرح نہیں چمکاتی تھی۔ دیواروں پر اور ٹائلوں پر پانی قطرے ویسے ہی رہ جاتے تھے۔ بستر کی چادریں بھی ٹھیک نہیں ہوتی تھیں۔ آفاق کے ج صاف ہوتے تھے مگر ان کی پالش میں وہ چمک نہ تھی۔

ویسے تو ہر کام ہونے لگا تھا۔

مگر کسی کام میں اسے سلیقہ نظر نہ آتا۔ اب شاید اسے نظر مل گئی تھی۔ تب اسے خیال کہ نوکر کبھی گھر کو نہیں بسا سکتے۔ جتنے زیادہ نوکر گھر میں ہوتے ہیں' اتنی گڑبڑ زیادہ ہوتی کام زیادہ بگڑتا ہے کہ ہر کوئی ذمے داری دوسرے پر ڈال دیتا ہے۔

کبھی کبھی اس کا دل چاہتا' وہ سارے نوکر نکال دے لیکن اس کو یہ حق کس نے دیا تھا؟

اور اس گھر پر اس کا استحقاق تھا ہی کیا؟

اس نے کبھی سمجھا ہی نہیں اور آفاق کو ہمیشہ یہی امپریشن دیا کہ وہ یہاں خوش نہیں ہے نہ اس گھر کو اپنا گھر سمجھتی ہے۔

تو پھر کیا کیا جائے.... سارے کاموں کا ایک اسٹینڈرڈ اس نے بنا لیا تھا اور اب بناوٹی بیگما کی طرح وہ محض حکم چلانے پر زندگی نہیں گزار سکتی تھی جب کہ اس کا کوئی اور مشغلہ بھی نہ

تھا۔ تب اس نے سوچا وہ ان سب کے ساتھ مل کر کام کروایا کرے گی۔

نوکروں کے ساتھ مل کر کام کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ جسم بھی چُست رہتا ہے اور وقت بھی کٹ جاتا ہے اور پھر نوکر بھی ٹھیک طرح سے کام کرتے ہیں۔

ایک اور تبدیلی بھی اس میں آگئی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ آفاق کا کام کوئی اور کرے۔ آفاق کا ہر کام وہ خود اپنے ہاتھوں سے کرنا چاہتی تھی اور یہ بات اس نے نوکروں سے کہہ دی تھی۔ شاید لاشعوری طور پر وہ چاہتی تھی کہ آفاق کو کبھی بھی نوکروں کی عادت نہ پڑے۔ صبح اٹھ کر وہ خود باورچی خانے سے آفاق کے لیے چائے بنا کر لاتی۔ پھر اس کا ناشتہ بھی خود بناتی۔ پاس بیٹھ کر اسے کھلاتی۔ جاتے وقت اس کا بریف کیس اسے پکڑاتی اور جب وہ خدا حافظ کہہ کر چلا جاتا تو دوبارہ میز پر آکر بیٹھ جاتی۔ صبح کا اخبار دیکھ کر وہ یوں ہی میز پر پھیلا جایا کرتا تھا۔ وہ اخبار میں گم ہو جاتی۔ پھر عبدالکریم اس کے لیے ناشتہ بنا کر لاتا۔ وہ آہستہ آہستہ ناشتہ کرتی۔

ناشتہ کرنے کے بعد کچن میں جاتی۔ عبدالکریم کو سودے سلف کے بارے میں سمجھاتی۔ اس روز کا مینو بتاتی۔ آفاق کے لیے ایک سالن خود بناتی۔ پھر سارا کام سمجھا کر ڈرائنگ روم میں آجاتی۔ وہاں بہت سے کام وہ طفیل کو سمجھاتی بلکہ اپنے سامنے ساری جھاڑ پونچھ کرواتی۔ گیارہ بجے کے قریب سلیمہ آجاتی۔ سلیمہ چودہ پندرہ سالہ جوان لڑکی تھی مگر بڑی صاف ستھری تھی اور اتنی ہی باتونی بھی تھی۔

سلیمہ کے سوا وہ کسی کو اپنے کمرے میں نہیں آنے دیتی تھی۔ پھر وہ سلیمہ کے ساتھ مل کر بستر کی چادریں بدلتی' نئے پھول لگاتی۔ کمرے اور غسل خانے چمکاتی۔ بارہ ایک بجے تک وہ کام سے بالکل فارغ ہو جاتی۔ ہاتھ منہ دھو کر صاف کپڑے بدل لیتی۔

ایک بجے آفاق دفتر سے گھر آجاتا تھا۔ اب اس نے دوپہر کا کھانا گھر پر کھانا شروع کر دیا تھا۔ کھانے کی میز پر ہر روز پھول سجائے' برتن لگائے فلکی آفاق کا انتظار کیا کرتی۔ دھیمے دھیمے سُروں میں ریڈیو بھی لگا لیتی۔ گھر کو صاف ستھرا کرنے کے بعد اسے یوں محسوس ہوتا جیسے گھر میں ایک زندگی آگئی ہے... سکون آگیا ہے۔ گھر مسکرا رہا ہے... بول رہا ہے... اور ایسا ہنستا مسکراتا گھر اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ ریڈیو سے نغمے بلند ہونا شروع ہوتے تو وہ کوئی کتاب لے کر ریڈیو کے پاس بیٹھ جاتی۔ کبھی اس کی نگاہ صفحے پر ہوتی' کبھی کان ریڈیو کی سمت ہوتے۔ ایک لمحے کے لیے اگر وہ اس شعر پر رک جاتی۔

آہٹ پہ کان دَر پہ نظر دل میں اشتیاق

کچھ ایسی بے خودی ہے ہمیں انتظار کی!

تو دوسرے ہی لمحے مغنّیہ کی آواز اس کی توجّہ کھینچ لیتی۔

تم میرے پاس رہو

میرے قاتل میرے دلبر' تم میرے پاس رہو۔

لیکن اس کا دل...!

اس کا دل محو رہتا... منتظر رہتا... دل گیٹ کے آس پاس منڈلاتا رہتا... دل دوڑ دوڑ کر جا جاتا۔

جانے اس شور میں اسے کار کے ہارن کی آواز کیسے سنائی دیتی۔ جونہی گیٹ میں داخل ہو آفاق ایک مخصوص انداز میں ہارن بجاتا۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آجاتا۔ چہرہ سر ہو جاتا۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہو جاتی۔ کس قدر بے چینی سے وہ روز آفاق کا انتظار کیا کرتی تھی' اس کے آجانے سے گھبراہٹ طاری ہو جاتی تھی۔ ہاتھوں کو پسینہ آجاتا' دل دھڑکنے لگتا۔ کچ سمجھ میں نہ آتا۔ وہ دوڑی دوڑی باورچی خانے میں کھانا نکالنے چلی جاتی۔ واپس آتی تو آفا کھانے کی میز کے سرے پر بیٹھا کوئی انگریزی رسالہ دیکھ رہا تھا۔ شروع سے ہی فلکی کو اس کی عادت بری لگتی تھی۔ بھلا یہ بھی کوئی تہذیب ہے کہ دو شخص کھانا کھا رہے ہوں۔ ان میں سے ایک مسلسل پڑھتا رہتا ہے۔ مگر اب رفتہ رفتہ اسے پتہ چل گیا تھا کہ یوں پڑھنا آفاق کی عادت ہے اور آج کل تو شکر کرتی کہ آفاق کی یہ عادت ہے کیونکہ وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہتی... اس کی جھکی جھکی پلکیں... اس کی وہ آنکھیں جو کبھی مہربان نہ ہوئی تھیں۔ آفاق کی پلیٹ میں سالن ہو جاتا تو وہ سالن ڈال دیتی۔ پھلکا ختم ہو جاتا تو پلیٹ میں دوسرا پھلکا رکھ دیتی۔

آفاق بس مشینی انداز میں کھاتا رہتا۔

... اور فلکی مشینی انداز میں ہر چیز بڑھاتی رہتی۔

کیا وہ دونوں مشینی انسان تھے؟

کھانا کھانے کے بعد آفاق اٹھ کر ہاتھ دھوتا۔ اگر شام کا کوئی خاص پروگرام ہوتا یا کسی آنا ہوتا تو فلکی کو بتا دیتا ورنہ خدا حافظ کہہ کر چلا جاتا۔ جب تک اس کی کار گیٹ سے باہر نہ جاتی' فلکی یونہی گم صم بیٹھی رہتی۔ آفاق چلا جاتا اور اس کی خوشبو' اس کے سگریٹ کی خو کمرے میں رہ جاتی۔ فلکی برائے نام سا کھانا پلیٹ میں ڈال کر اس کا رسالہ اٹھا لیتی۔ رسالہ کے اوپر جا بجا سالن والی انگلیوں کے نشان ہوتے۔ کتنی لاپرواہی سے آفاق رسالہ پڑھتا تھا!

صاف پتہ چل جاتا تھا کہ اس نے کہاں کہاں سے رسالہ پڑھا ہے۔ فلکی اس کے چھوڑے ہوئے صفحے پڑھتی جاتی اور سوچتی رہتی کہ آفاق اس کے ساتھ بھی غالباً" رسالے والا سلوک کر رہا ہے۔ پڑھا اور پھینک دیا... لیکن... رسالے پر تو وہ اپنے نشان چھوڑ جاتا تھا جبکہ فلکی پر اس کی زندگی کا کوئی نشان نہ تھا۔

فلکی اس کی ضرورت نہ تھی۔

خواہش نہ تھی۔

اس کا حاصل نہ تھی۔

فلکی زبردستی اس کی زندگی میں گھس آئی تھی اور اب وہ بڑی شرافت سے اسے گوارا کر رہا تھا۔

فلکی کو اپنی پھیلی زندگی پر بہت افسوس ہوتا۔ اپنی نادانی پر رنج ہوتا تھا۔ وہ کتنی بے وقوف تھی۔ بھلا یوں بھی مرد کو جیتا جا سکتا ہے۔ اس نے کتنا غلط قدم اٹھایا۔ اپنی زندگی برباد کی اور آفاق کا بھی سکون لوٹ لیا۔ اسے آفاق سے ہمدردی محسوس ہونے لگی تھی۔

ہمدردی...؟

اس کا دل اس سے پوچھا کرتا۔ کیا یہ صرف ہمدردی ہے؟ اس کے پیچھے کوئی اور جذبہ نہیں۔

کیوں ہاؤلی ہوئی سارے گھر میں پھرتی ہے۔ اس کی موٹر کا ہارن تیرے اندر ہیجان پیدا کر دیتا ہے۔ اس کی آہٹ سے تیرا دل دھڑک اٹھتا ہے۔ جب بھی فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے کوئی تیرے دل کو کھینچ رہا ہو۔ تو سارا دن اسی کے بارے میں سوچتی ہے جب وہ سامنے بیٹھا ہو تو تیری زبان گنگ ہو جاتی ہے۔ جب وہ اوجھل ہو تو اس سے ہزار ہا شکوے اور گلے کرتی ہے۔

بے چینی سے رات کا انتظار کرتی ہے۔ رات آتی ہے تو کروٹیں بدل بدل کر صبح کی دعائیں کرتی ہے۔

"مجھے آخر کیا ہوا ہے؟"

"کیا ہوا ہے مجھے؟"

وہ اپنے دل سے پوچھتی... اور پھر گھبرا کر باہر نکل جاتی' گیٹ تک چلی جاتی۔ پھر گیٹ سے باہر نکل جاتی۔ اسٹول پر بیٹھا ہوا چوکیدار ایک دم کھڑا ہو جاتا اور پھر اسے سلیوٹ مارتا۔ وہ سر

کے اشارے سے اسے جواب دے کر... اور آگے نکل جاتی۔ سڑک پر کھڑی ہو کر دور دور تک دیکھتی۔ باہر کتنی بڑی دنیا تھی... ایک اور ہی دنیا تھی... گویہ اتنی بڑی دنیا ہے مگر ہر گھر کی کہانی مختلف ہے۔

اب فلکی آزاد تھی۔ گیٹ سے باہر آسکتی تھی۔ اب کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ ہر دروازہ کھلا رہتا تھا۔ کوئی پہرہ نہ تھا۔

مگر نہ جانے اسے اپنے پاؤں میں ایک وزنی زنجیر کا احساس کیوں ہوتا تھا۔ اسے ایسا لگتا جیسے اس کے پاؤں میں بیڑیاں ہیں۔ اب اسے ہر جگہ آنے جانے کی آزادی تھی مگر اب اس کا کہیں جانے کو دل نہ چاہتا۔ اب اس کا دل چاہتا' اسی گھر کے کسی کونے میں منہ چھپا کر سو جائے... کچھ نہ اٹھنے کے لیے....

وہ سڑک پر زیادہ دیر کھڑی نہ ہوتی۔ اس واسطے کہ جب تک وہ سڑک کے کنارے کھڑی رہتی' چوکیدار اپنی جگہ پر کھڑا رہتا۔ ایک آدمی کو وہ اتنی تکلیف نہیں دینا چاہتی تھی۔ وہ اندر آجاتی تاکہ چوکیدار اپنی سیٹ پر بیٹھ جائے۔

پھر لان میں چلی جاتی اور درختوں کے تلے ننگے پاؤں یوں گھومتی جیسے کوئی نا آسودہ روح ہو اور اپنا جسم تلاش کرتی پھر رہی ہو۔ وہ ایسا پرندہ بن گئی تھی جس کے پر کاٹ کر کھلی فضاؤں میں چھوڑ دیا گیا ہو۔ کس نے کاٹے تھے اس کے پر... اس نے تو کسی کے ہاتھ میں مقراض نہیں دیکھی تھی۔ اس کے اپنے احساس نے اس کے پر کاٹ دیے تھے۔

ایک عجیب سا سودا سر میں سمایا تھا۔ وہ کسی سے حالِ دل کہنا چاہتی تھی مگر کون تھا سننے والا...؟

تصوّر ہی تصوّر میں آفاق سے بے شمار باتیں کرلیتی مگر جب وہ سامنے ہوتا تو فلکی کی زبان کو تالے لگ جاتے۔ کیا وہ اس سے ڈرتی تھی...؟ نہیں۔

ڈرنے کا موسم تو بیت گیا تھا۔

کیا وہ اس سے نفرت کرتی تھی؟

نفرتیں تو اپنے لبادے پھاڑ چکی تھیں۔

تو پھر کیا تھا...؟ کیا تھا....؟

جو اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

بعض اوقات ایسا ہوتا کہ آفاق کے پاس بیٹھے ہوئے وہ اپنے خیالات کی دنیا میں اس طرح

کھو جاتی کہ اسے احساس ہی نہ رہتا... کہاں ہے۔ کیا کر رہی ہے۔ کس کے پاس ہے۔ آفاق اسے بلاتا رہ جاتا اور پھر حیرت سے اس کی صورت دیکھنے لگتا۔ ایک روز اسے یونہی اپنے خیالات میں غلطاں و پیچاں دیکھ کر آفاق نے پوچھ ڈالا تھا۔

"کیا بات ہے فلک... آج کل آپ بہت کھوئی کھوئی سی رہتی ہیں؟"

"جی...!" فلکی یوں چونکی جیسے اس کے پاؤں پر لوہا آن گرا ہو۔

"میں نے پوچھا تھا کیا بات ہے؟ آپ بہت چپ چپ رہتی ہیں؟"

"جی کچھ بھی تو نہیں... کچھ بھی تو نہیں..." فلکی نے سرا سیمہ ہوتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات تو ضرور ہے۔"

"جی آپ یقین کریں' کوئی بات نہیں۔"

میں اتنی دیر سے آپ سے کہہ رہا ہوں۔ ایک گلاس پانی پلا دیجئے مگر آپ نہ جانے کس جہاں میں گم ہیں۔"

"اچھا جی...!" فلکی ایک دم کھڑی ہو گئی۔ "آپ نے پانی مانگا تھا۔ میں ابھی لاتی ہوں..." وہ اٹھ کر بے تحاشا دوڑی... آفاق کو ہنسی آگئی۔

جب وہ پلیٹ میں پانی کا گلاس رکھے اندر آئی تو آفاق ابھی تک ہنس رہا تھا۔ فلکی نے ہاتھ آگے بڑھایا تو اس نے صاف محسوس کیا فلکی کا ہاتھ کانپ رہا تھا اور گلاس میں پانی چھلک رہا تھا۔ آفاق نے آہستہ سے گلاس سمیت پلیٹ پکڑلی... اور دوسرے ہاتھ سے فلکی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

فلکی ایک دم اُچھل پڑی۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔ آپ کا ہاتھ کیوں کانپ رہا ہے؟ اور یہ اس قدر ٹھنڈا کیوں ہو رہا ہے؟"

"جی... کچھ بھی تو نہیں ہوا... میں... میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔"

فلکی نے اپنا ہاتھ اس طرح چھڑا لیا جیسے اس کی چوری پکڑی جانے والی ہو۔

"آپ کی طبیعت ناساز ہو تو آپ ڈاکٹر کو دکھالیں۔"

"آپ کو وہم ہو گیا ہے۔ میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔" فلکی ذرا دور جا کر بیٹھ گئی۔ آفاق نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ اس کا جسم ابھی تک لرز رہا تھا۔

"آپ اپنی امی کے لیے اداس تو نہیں ہو گئیں؟"

"جی نہیں..."

فلکی نے نظریں جھکا کر کہا۔
"ان کا خط آیا تھا؟"
"جی!"
"آپ نے جواب دے دیا تھا؟"
"جی میں نے جواب دے دیا تھا۔"
"آج کل کہاں ہیں وہ؟"
"وہ امریکہ سے کینیڈا اپنی ایک سہیلی کے پاس چلی گئی ہیں۔"
"کب تک آئیں گی؟"
"انھوں نے لکھا تھا۔ دو تین مہینوں کے بعد آجائیں گی یعنی سردی کے شروع ہوتے ہی
"اور ڈیڈی کہاں ہیں آج کل؟"
"وہ تو نائجیریا میں ہیں۔ ممی نے لکھا تھا' ان کا کام مزید چھ مہینے کے لیے بڑھا دیا گیا ہے
لیے ممی بھی وہیں رک گئی ہیں۔ اب دونوں اکٹھے آئیں گے۔"
"امی کا... میرا مطلب ہے آپ کی امی کا خط بھی آیا تھا۔"
"پھر آپ نے مجھے کیوں نہیں دیا؟ بدلہ اتارنے کے لیے...؟"
"نہیں... وہ تو میرے نام تھا۔ آپ کے نام نہیں تھا۔"
"اچھا...!" آفاق نے تعجب سے کہا۔ "کیا لکھا تھا انھوں نے؟"
"میں آپ کو لا دیتی ہوں۔ آپ پڑھ لیں۔"
فلکی اٹھ کر خط لے آئی۔ آفاق نے پڑھ لیا۔ امی نے تو لکھا ہے کہ امید ہے تم دونوں
باش ہوگے۔"
"جی...!"
"پھر اس کے جواب میں کیا لکھا جائے گا؟"
"جواب تو میں نے لکھ بھی دیا ہے۔"
"لکھ دیا ہے...؟" آفاق نے حیرت سے کہا "کب؟"
"جس دن خط آیا تھا۔"
"واہ... کیا لکھا ہے؟"
"بس جو لکھنا تھا لکھ دیا۔"

"تو گویا آپ کا خط پڑھنے کے لیے مجھے امریکہ جانا پڑے گا۔"
"اتنا اہم نہیں ہے میرا خط..."
"آپ کو کیا معلوم کتنا اہم ہے۔"
جب فلکی نے حیران ہو کر نظر اٹھائی تو آفاق نے جلدی سے کتاب اٹھالی تھی اور پڑھنے لگا
تھا۔

فلکی سونے کی بجائے اپنے بستر پر بیٹھی حیرت سے آفاق کو دیکھ رہی تھی۔ نہ معلوم دیکھے جا رہی تھی؟

اسے معلوم تھا اس طرح ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا انتہائی غیر شریفانہ حرکت ہے۔ مگر نہ اسے کیا ہوا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ آفاق کی طرف دیکھتی رہے... دیکھتی رہے... اس کے نقش و نگار میں کھو جائے۔

مرد کے لیے دنیا نے حسن کے خاص معیار مقرر نہیں کیے۔ مرد کا مرد ہونا... بہادر ہونا جیالا ہونا ہی اس کا سب سے بڑا حسن ہوتا ہے۔ گورا ہو' کالا ہو' لمبا ہو' چھوٹا ہو... کوئی ا نہیں رکھتا۔ ہاں' اگر وہ کام بڑے بڑے کر رہا ہو تو وہ سب مَردوں سے قد آور اور خوب صو نظر آتا ہے۔ گویا خوب صورت مرد وہ ہے جو خوب صورت اور عظیم کام کرے۔ عزتِ نفس قائم رکھ کر روزی کمائے' اپنی آن بان کو گھٹیا مشغلوں میں ضائع نہ کرے۔

آفاق کا دفتر فلکی دیکھ چکی تھی اور اسے اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ آفاق بڑا اصول پر آدمی ہے۔ لڑکیاں تو کیا... وہ دفتر میں مَردوں سے بھی ضرورت سے زیادہ بات نہیں کرتا تھ خود وقت کا پابند تھا' محنتی تھا..... اور دوسروں سے پابندیٔ وقت اور محنت کی توقع رکھتا تھ فضول باتیں نہیں کرتا تھا اور نہ اس قسم کی بڑیں ہانکتا تھا کہ میں نے دنیا کو اپنے کندھوں پر ا رکھا ہے۔ میں فلاں ابنِ فلاں ہوں۔ حالانکہ اس ملک میں اس نے اپنے کاروبار کی دھاک ب رکھی تھی اور باپ کے مرنے کے بعد دن بہ دن کاروبار کو پھیلا رہا تھا۔

گھر میں بھی اس کی عادتیں بڑی اچھی تھیں۔

ان کشیدگیوں کے علاوہ جو ابتدا میں دونوں کے درمیان ہوئیں' فلکی نے آفاق میں کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں دیکھی تھی۔

وہ مرد تھا۔ کوئی کاٹھ کا پُتلا نہیں تھا..... اور مرد بھی ایسا جس نے ایک دنیا سے رابطہ قائم کر

ا۔ بھلا وہ ایک معمولی سی لڑکی سے شکست کیوں کھا جاتا۔ ہاں فلکی نے اس طرح اسے اپنے کی کوشش کی تھی۔ اگر وہ اسے محبت سے مسخر کرنے کی تمنا کرتی تو حالات بالکل ہ تے۔ ایسے آدمی اعصابی طور پر مضبوط ہوتے ہیں اور اپنی ننھی ننھی خواہشوں کے پنے دل اور جسم کو جھکاتے نہیں۔

ہی بات... فلکی اس کے چہرے پر ڈھونڈھ رہی تھی۔ جوں جوں فلکی اسے غور سے توں توں وہ فلکی کو اچھا لگتا' پیارا لگتا۔ وہ بے نیاز سا بن کر اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ معمول آگے ایک انگریزی میگزین کھلا تھا۔ اس نے رات کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ ک کی بش شرٹ کے ادھ کھلے گلے میں سے اس کی چھاتی کے بال صاف نظر آ رہے تھے ہ وہ سانس لیتا تو وہ بال اس طرح ہلتے جیسے کسی نے ان پر ہلکی سی پھونک ماری ہے۔ بیٹھے ل کا دل چاہا' وہ یہ حرکت کرے وہ آفاق کے قریب جائے... بہت قریب... اور آفاق کے پھونک مار دے۔

ں...!

ں کا دل چیخا اور... اس نے خود ہی اس کی تصدیق کر دی۔ آفاق اسے کبھی نہیں اپنا سکے آفاق کے قریب کبھی نہ جا سکے گی... کبھی نہیں' آفاق اس کے ماضی کے بارے میں سب تا ہے۔ اس نے تو اسے محض سبق سکھانے کے لیے یہاں رکھ چھوڑا ہے۔ وہ بھی تو اپنی ت کاٹ رہی تھی۔

یہ سب کیسے ہوا۔ رہائی کے دن قریب آئے تو

بلند ہو گئی دیوار قید خانے کی۔

ب... کس وقت... کیسے؟ یہ سب کیسے ہوا آفو...!

تم نے کوشش کی... اور نہ میں نے چاہا۔

م آرام سے میرے تن میں چلے آئے۔ ایک دیوتا کی طرح اندر آ کر بیٹھ گئے۔ یوں میری گ میں سما گئے کہ تمہیں اپنے آپ سے الگ کرنا میرے لیے مشکل ہو گیا ہے۔

ل کٹھن منزلوں سے گزر کر مجھے پتہ چلا کہ عشق کیا چیز ہے۔ محبت کیا ہوتی ہے؟

ائی منزل کہاں ہے؟

ا طریقہ کونسا ہے؟

ل فضول جذبوں کو محبت کہتی رہی۔ عشق سے مجھے نفرت تھی کیونکہ عشق فنا کے گھاٹ

اتار دیتا ہے۔

لیکن اب مجھے معلوم ہوا... عشق اور محبت کے درمیان جسم کوئی پڑاؤ نہیں نہیں۔

عشق جسمانی قُرب سے ماورئی ہوتا ہے۔ وصال محبّت کو فنا کردیتا ہے۔

عشق تو مرجانے کا، مٹ جانے کا، گھل جانے کا نام ہے.. عشق تو ایک آنچ ہے دور سے تن و من کو پھونکتی رہتی ہے۔ تم نے کتنا اچھا کیا آفو...!

مجھے اپنے سے دور رکھا.. ایک فاصلہ رکھا... اس فاصلے نے مجھے نئے جذبوں سے میں نے محبت اور جسم کو الگ دیکھ لیا... سمجھ... اور پرکھ لیا اور مجھے پتہ چلا... محبت فنا..

یہ سب جسموں کے کھیل سے ماورئی ہیں۔ بہت اونچے... بہت عظیم جذبے! ایک بھوک ہے۔ بھوک ایک ضرورت ہے اور ضرورت کو پورا کرلینا کسی مقصد کی ہوتی اور ضرورتیں بعض اوقات انسان کو بہت گھٹیا مخلوق بنا دیتی ہیں۔ ضرورتوں کے غلام ہوجاتے ہیں... ضرورتوں کو شکست دینے والے وقت کی لگام اپنے ہاتھ میں ہیں۔ عشق ایسی سب ضرورتوں سے ماورئی ہوتا ہے اور تم نے یہ کیسے مقدس جذبے میں جگائے ہیں آفو! تمہارا کس منہ سے شکریہ ادا کروں آفو! تم کبھی ضرورت بن کر نہیں آئے۔

حالانکہ تم بھی ایک مرد ہو...

تم نے کبھی سفلی جذبات کی خاطر جھولی نہیں پھیلائی...

حالانکہ تم فرشتہ نہیں ہو....

تم جس لڑکی سے نفرت کرتے تھے۔ تم نے اس لڑکی کو پامال نہیں کیا حالانکہ تم چا کرسکتے تھے۔ تمہیں قانون اور شریعت نے یہ حق دیا تھا...

اور... اور...

میں نے بھی تمہیں یہ حق دیا تھا...

میں نے بھی ایسا چاہا تھا....

تمہارا ہونے کے لیے مجھے سب گوارا تھا...

مگر تم دیکھو آج تمہارے نام سے میرے اردگرد کتنے چراغ روشن ہوجاتے ہیں۔

، تم ان سب مردوں سے کتنے مختلف ہو... کتنے عظیم ہو... اور ظالم بھی ہو...

تمہارے جیسے مرد کو ظالم بھی ہونا چاہیے....

جو شخص اپنے آپ پر ظلم کرسکتا ہو اپنے نفس پر جبر کرسکتا ہو۔ اسے دوسروں پر ظلم کرنے کا حق حاصل ہے اور یہ دوسروں کے حق میں ظلم نہیں ہوگا' مہربانی ہوگی جس طرح مجھ پر یہ مہربانی ہوئی....

میں کیا سے کیا ہوگئی....

کل تک میں جسم ہی جسم تھی اور آج میں روح ہوں... اور عشق بھی روحوں کا ملاپ ہے۔ روح کسی سے کوئی توقع نہیں رکھتی' وہ توقعات سے بالا ہوتی ہے.... میں بھی روح بن کر تمہارے بدن میں تحلیل ہوجانا چاہتی ہوں....

یہ سب سوچتے سوچتے فلکی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کسی جذبے نے اسے رُلا دیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنے بہتے ہوئے آنسو خود ہی صاف کرلیے۔ مبادا آفاق دیکھ لے۔ آنکھیں صاف کرنے کے بعد بھی وہ مسلسل آفاق کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔

آفاق کئی بار نظر اٹھا کر فلکی کی طرف دیکھ چکا تھا۔ پڑھتے پڑھتے وہ چونک جاتا اور یک دم فلکی کی جانب دیکھتا' جیسے پوچھ رہا ہو۔ یوں ٹک ٹک مجھے کیوں دیکھ رہی ہو۔ فلکی چور بن کر جلدی سے نظریں چُرا لیتی اور خواہ مخواہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگتی۔ وہ دوبارہ کتاب پڑھنے لگ جاتا۔

فلکی دل میں سوچتی۔ وہ اب اس طرح آفاق کی جانب نہیں دیکھے گی۔ مگر پھر سوچتے سوچتے وہ اسی طرف آنکلتی اس کی بھٹکتی نگاہ اور کراہتا خیال اس کے چہرے پر آکر رک جاتا... پتہ نہیں یہ روشن چہرہ اس کی کل کائنات کیوں بن رہا تھا... وہ ہر بار پکّا تہیہ کرتی کہ اب آفاق کی طرف نہیں دیکھے گی....

.....مگر پھر اس کی بھٹکتی بھٹکتی نگاہ وہیں پر جاکر رک جاتی جیسے اس کا آخری مرکز آفاق کا چہرہ ہو....

آفاق کا رنگ سانولا تھا مگر چہرے پر ایک چمک اور ایک سرخی تھی۔ چمک شاید اس کے اچھے کردار کی تھی اور سرخی اس کی صحت مندی کی علامت تھی۔ جب اس میں کوئی بری عادتیں نہیں تھیں تو اس کی صحت کو گھن کیوں لگتا...

فلکی نے اسے کبھی شراب پیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا حالانکہ اس کا تجربہ یہی کہتا تھا کہ ہر وہ آدمی جس کے پاس کھانے پینے کو ذرا سا بھی فالتو ہے وہ شراب نوشی اور عیّاشی کو اپنی ہابی بنا لیتا

ہے... اس کے بہت سے بوائے فرینڈ پیتے تھے۔ اور تو اور... اس کے حلقے میں کچھ ایسی تھیں جو پکے مذہبی گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں مگر کھانے سے پہلے شغلاً "بیئر ضرور پیتی جس ماحول میں فلکی رہتی تھی وہاں کسی نے ان باتوں کا برا نہ جانا۔ اس واسطے فلکی کو تعجب تھا کہ آفاق کی عادتیں کتنی الگ تھلگ تھیں۔ سگریٹ بھی زیادہ نہیں پیتا تھا۔ جب کوئی ہوتی۔ پھر اتنے وقت سگریٹ پیتا رہتا... اور سگریٹ پوری ختم ہونے سے پہلے پھینکا کرتا....

وہ گھر سے صبح کی نماز پڑھ کر ضرور جایا کرتا تھا... گویا وہ اپنے دن کی ابتدا تو اللہ کے نا ہی کرتا تھا...

لباس بہت اچھا پہنتا تھا' کھانا بہت نفیس کھاتا تھا... گھر کی ہر چیز اور ہر بات میں نفاست کرتا تھا...

اور یہ ساری نفاست فلکی نے اس سے سیکھی تھی۔

اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں بلا کی جاذبیت تھی۔ اتنی صحت مند اور چمک دار آ فلکی نے بہت کم دیکھی تھیں۔ اب اسے احساس ہوتا تھا کہ آنکھوں میں ڈوب جانا کیا ہے.... اس کے کرخت ہونٹ جو مسکرانا نہیں جانتے تھے... وہ فلکی کے دل میں کھب گئے ایسے ہونٹوں پر وہ سو بار فدا ہونے کے لیے تیار تھی۔

آفاق کا سیدھا سادا چہرہ... اس کے لیے بھول بھلیاں بن گیا تھا... وہ جب بھی اس کی طر دیکھتی' اس میں کھو جاتی... کبھی اس کا جی چاہتا وہ اس کے چہرے کو اپنے آنسوؤں سے کردے... اپنے آنسوؤں سے دھو ڈالے... اور کبھی اس کا جی چاہتا... ایک بچے کی مانند ا چہرہ دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اپنے سینے میں چھپا لے... وہ سینہ جس میں عورت کے پیار کی ترو وسعتیں تھیں...

لیکن نہیں... وہ لرز جاتی... وہ تو آفاق کے اہل نہیں ہے۔ اس کے قابل نہیں ہے۔ جانے اس نے مینار کی طرح اتنے بلند شخص سے اتنی بڑی ٹکر کیوں لی؟ مگر وہ یہ بدیانتی کر تھی...

اور اس کی تلافی بھی کسی طرح ممکن نہیں تھی۔ اس کا یہاں سے چلے جانا ہی ٹھیک تھا...

"کیا بات ہے فلک...؟"

اچانک آفاق نے نظر اٹھائی اور اسے اپنی طرف دیکھتے پاکر پوچھ لیا۔

"کچھ نہیں... کچھ بھی تو نہیں۔"

فلکی بوکھلا گئی اور نظریں چرانا چاہیں...

"آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہیں؟"

"نہیں تو۔" وہ جلدی سے بولی۔

"پھر آپ اس طرح کیوں بیٹھی ہیں..."

فلکی نے اپنی طرف دیکھا۔

اس نے اپنا بستر نہیں لگایا تھا۔ بستر کے ایک کنارے پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ پاؤں میں بھی تک جوتے تھے... دوپٹہ گود میں پڑا ہوا تھا... پاؤں ہلائے جا رہی تھی اور آفاق کی طرف یکھتی جاتی تھی...

"آج سونے کا ارادہ نہیں ہے..."

"بس سونے جا رہی ہوں۔" وہ جلدی سے کھڑی ہو گئی اور بیڈ کور اٹھا کر بستر ٹھیک کرنے لگی۔

آفاق پھر پڑھنے لگا۔ بستر لگا کر فلکی بستر پر بیٹھ گئی اور بظاہر اس نے ایک کتاب اٹھالی.. ورق گردانی کرنے کے لیے... مگر وہ ورق گردانی بھی برائے نام کر رہی تھی آج اس کا دل دوڑ دوڑ کر آفاق کے قدموں سے لپٹ رہا تھا اور وہ ڈر رہی تھی... کہیں اس سے کوئی انہونی نہ ہو جائے اور سوچتے سوچتے پھر اس کی نگاہ جا کر آفاق پر ٹک گئی...

آفاق اس طرح اسے کیوں اچھا لگنے لگا تھا؟

وہ سوچ رہی تھی۔

حالانکہ اس نے اور بھی بہت سے مرد دیکھے تھے مگر آفاق ان سب سے جدا تھا۔ کتنا اچھا ہوتا اگر وہ آفاق کا من جیت لیتی۔

اس نے دل میں سوچا....

لیکن آفاق کو جیت لینا گویا ایک دنیا کو جیت لینا تھا

اور یہ کام اسے کٹھن ترین اور مشکل ترین لگ رہا تھا...

اسی واسطے ساری دنیا سے اس کی دلچسپی ختم ہو گئی تھی۔ کسی کام میں جی نہیں لگتا تھا۔

ٹوٹے ہوئے جذبوں کے ساتھ یونہی ادھر ادھر ڈولتی پھرا کرتی۔

جب سامنے گہرا سمندر رہو' انسان تیرنا نہ جانتا ہو... کنارہ بھی دور ہو' تو پھر وہ کیا کر سکتا ہے؟

صبر تو کر سکتا ہے؟

بے خطر سمندر میں کُود پڑے اور خود کو موجوں کے حوالے کردے جو قسمت میں ہو جائے گا۔ کنارا یا کھویا۔۔

کنارہ یا کھویا۔۔۔

اس کا دل بے چین ہونے لگا۔ کرب کے سائے اس کے چہرے پر لہرائے۔ اسی وقت نے کتاب رکھ دی اور بولا۔

"کیا بات ہے فلک آج آپ کچھ اداس سی لگ رہی ہیں۔"

"کچھ نہیں جی۔۔۔" اس نے اپنی نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک رہتی ہے نا؟"

"جی ہاں۔۔۔ میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔"

"شاید یہاں رہتے رہتے آپ اداس ہو گئی ہیں۔"

فلکی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کیا کہتی؟

"ممی کا کوئی خط آیا تھا۔۔۔"

"جی آیا تھا۔۔۔"

"انھوں نے اپنے پروگرام کے بارے میں کیا لکھا ہے؟"

"صحیح پروگرام تو اگلے خط میں لکھیں گی۔"

"آپ اپنی ممی کے لیے اداس ہو گئی ہیں؟ ہے نا؟ اتنا عرصہ تو آپ ممی سے کبھی دور رہیں نا؟"

فلکی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ جیسے کہ وہ رونے کا بہانہ ڈھونڈ رہی ہو۔

حالانکہ وہ ممی کے لیے ہرگز اداس نہیں تھی۔ رونا اسے اس بات پر آیا کہ آفاق کبھی جان سکے گا کہ وہ کیوں اداس ہے۔۔۔؟

اس کو روتا دیکھ کر آفاق نے کہا۔

"میرا خیال ہے وہ جلدی آجائیں گی۔"

فلکی نے کوئی جواب نہیں دیا۔۔۔

فلکی کو اچانک کچھ شعر یاد آگئے۔ اس کا دل چاہا وہ یہ شعر اپنی ہتھیلی پر لکھ دے اور پھر آفاق کے حوالے کردے۔

ایک دن جو اُنھیں خیال آیا
پوچھ بیٹھے کہ کیوں اُداس ہو تم
کچھ نہیں مسکرا کے میں نے کہا
دیکھتے دیکھتے سرِ مژگاں
ایک آنسو مگر ڈھلک آیا
درد بے وقت ہو گیا رُسوا
ایک آنسو تھا پی لیا ہوتا

ہاں ایک آنسو تھا پی لیا ہوتا۔۔۔؟ مگر اس ایک آنسو کو پینا کس قدر مشکل لگ رہا تھا۔۔۔ ایک سو پھانس بن گیا تھا۔۔۔۔ قہر بن گیا تھا۔۔۔۔ گلے میں اٹک گیا تھا۔

"ایسے لگتا ہے جیسے آپ کچھ کہنا چاہتی ہیں۔" آفاق نے اپنا تکیہ درست کرتے ہوئے کہا کیا کچھ کہنا ہے آپ کو۔۔۔؟"

فلکی نے اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں دیکھا اور پھر سوچا۔۔۔ کہنا تو بہت کچھ ہے۔ جانے کہہ سکوں گی یا نہیں۔۔۔

تھوڑی دیر انتظار کر کے آفاق نے تکیے پر اپنا سر رکھ دیا۔۔۔ اسی وقت فلکی چونک اٹھی۔۔۔ یہ سو جائے گا۔ آج رات بھی گزر جائے گی۔۔۔ روز ایک رات گر جاتی ہے۔ روز ایک دیا جلا کہ وہ سرہانے رکھ دیتی ہے۔۔۔۔ صبح کو دیا بجھ جاتا ہے۔۔۔۔

"ہاں مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔۔۔"

اچانک فلکی کی آواز ابھری جسے خود فلکی نے بھی نہیں پہچانا۔

"پوچھیے۔۔۔۔" آفاق لیٹ چکا تھا۔۔۔ وہ الٹا ہو گیا۔ اس نے اپنا سر اٹھا کر ٹھوڑی کے نیچے تکیہ رکھ لیا اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"اس طرح لیٹو گے تو میں کہاں پوچھ سکوں گی۔"

فلکی نے دل میں سوچا لیکن پھر ہمت کر کے بولی۔

"مجھے پوچھنا تھا کہ۔۔۔ مرد۔ مرد کس قسم کی عورت کو پسند کرتا ہے۔"

"ارے۔۔۔۔" آفاق اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ "میں سمجھتا تھا کہ آپ کوئی معقول سی بات پوچھیں گی۔"

فلکی سوگواری سے ہنسی۔۔۔

"میں تمہارے سب انداز جان گئی ہوں' مسٹر آفاق..."

جواب نہ پا کر وہ پھر بولی۔

"چلئے' نامعقول بات سمجھ کر ہی جواب دے دیجئے۔"

"اس بات کا جواب جتنا طویل ہے' اتنا مختصر بھی ہے.... کیونکہ عام طور پر تو جوا دولت سبھوں کو لبھاتے ہیں۔ جوانی میں ایک خاص کشش ہوتی ہے۔ اب پتہ نہیں آپ کس کو کہتی ہیں؟"

"جوانی' حسن اور دولت کو یا..."

"میں تو یقیناً چینی کی مورتی کو عورت نہیں کہتا۔"

"آپ کے معیار کے مطابق عورت کیسی ہونی چاہیے؟"

"فلک بیگم' مرد خاک ہو جانے والی عورت کو پسند کرتا ہے... ایسی عورت جس کے ایثار اور وفا ہو.... اور ایثار کیا ہوتا ہے' آپ اور آپ جیسی دوسری لڑکیاں بالکا جانتیں..."

فلکی خاموش ہو گئی۔

کیا خاک ہو جانے کی کچھ اور منزلیں بھی ہیں... ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں بیگم' اس کے دل نے کہا۔ اب تک تُو نے جو کچھ بھی کیا۔ اپنے لیے کیا۔ اپنی ذات کے کسی اور کے لیے کچھ نہیں کیا... ہر بات اور ہر کام کو تم بامرِ مجبوری سمجھ کر کرتی رہیں۔ موج تمہارے من سے اُٹھی... اور نہ کسی جنون نے تمہیں یہ سب کرنے پر مجبور کیا... فلکی کا دل چاہا وہ آفاق سے پوچھے کہ فنا کی منزلیں کیسی ہوتی ہیں اور خاک کیسے ہیں...؟

جب اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو آفاق سو چکا تھا... کتنی جلدی آفاق سو جاتا تھا۔ اُف کر رہا تھا۔ اِدھر آنکھیں بند کیں۔ اُدھر خرّاٹوں کی آوازیں آنے لگیں۔

فلکی نے اُٹھ کر بتی بجھا دی۔ کمرے میں زیرو کی سبز روشنی پھیل گئی۔ فلکی اپنے بستر گئی۔

خاک ہو جانا چاہیے۔ فلکی نے اپنے دل سے کہا۔ انا' پندار' خودداری' جو کچھ بھی ہے' اس پر سے وار دے... تاکہ "من تو شدی تو من شدم" جیسا کوئی جھگڑا ہی باقی نہ رہ

عشق دی منزل اوکھی اے

سکھے سوکھی دیکھ نہ بھل پودیں

سو کوہاں دے پینڈے ہن
سکھے پا پیادہ بھل پودیں

(عشق کی منزل بڑی کٹھن منزل ہے۔ تو اسے سہل سمجھ کر اس وادی میں قدم نہ رکھنا یہاں سکوں کے کوس پیدل چل کر طے کرنے پڑتے ہیں اور تو پا پیادہ چل کھڑی ہوئی ہے)۔

بابا بلھے شاہ کے مصرعے فلکی کے کانوں میں گونجنے لگے۔ عشق کی منزل مشکل سہی' ناممکن تو نہیں ہے نا؟...

ایک بار اس ستمگر کے ظلم نے مجھے مجبور کیا تھا...

ایک بار میں اپنے دل کے ہاتھوں خود مجبور ہو جاؤں گی۔

آفاق جب غسل خانے سے باہر نکلا تو فلکی نے اس کے کپڑے نکال دیے تھے۔ کئی دنوں سے فلکی نے اس کے وہ سارے کام بھی اپنے ذمے لے لیے تھے جو پہلے نہیں کرتی تھی۔ پہلے اس نے کبھی اس کے کمرے میں جاکر اس کے لیے کپڑے نہیں نکالے تھے۔ مگر اب وہ اٹھ کر پہلے باورچی خانے میں جاتی۔ عبدالکریم کو ضروری باتیں سمجھا کر' آفاق کے کمرے میں آجاتی۔ اس کی شیو کے لیے پانی غسل خانے میں رکھ دیتی۔ جب وہ غسل خانے میں چلا جاتا تو اس کی وارڈروب کھول کر اس کے لیے کپڑوں کا انتخاب کرتی۔ آفاق کی پسند بہت اچھی تھی۔ اس کے پاس ہر قسم کے مردانہ رنگوں کے کپڑے موجود تھے اور ہر کپڑے میں وہ بہت اچھا لگتا تھا۔ سوائے سفید سوٹ کے... پتہ نہیں سفید سوٹ میں وہ فلکی کو کیوں اچھا نہیں لگتا تھا۔ شاید کچھ زیادہ سوبر یا کرخت معلوم ہونے لگتا تھا... البتہ سفید سپورٹس شرٹ اور سفید پتلون میں وہ بالکل کھلنڈرا سا لڑکا لگا کرتا تھا۔

پہلے دن جب اس نے ہلکے زرد رنگ کا دھاری دار سوٹ نکال کر اس کے ساتھ کاسنی رنگ کی قمیض اور جامنی ٹائی پلنگ پر جمادی اور اس کی جرابوں والی دراز کھول کر اس میں سے کوئی جامنی اور پیلی پرنٹڈ جرابیں ڈھونڈھ رہی تھی تو وہ سر کو تولیے سے پونچھتا ہوا باہر نکل آیا۔

فلکی چونک کر اٹھی تو الماری کا دروازہ اس کی پیشانی پر لگ گیا۔

"اوہ... تو آپ نے میرے کپڑے نکال دیے..."

آفاق نے کپڑوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "آپ تکلیف کیوں کررہی ہیں؟"

"بس میرا دل چاہتا ہے۔ آپ کا ہر کام اپنے ہاتھ سے کروں۔"

"میں تو یہی سمجھتا رہا ہوں کہ آپ میرا ہر کام اپنے "ہاتھ" سے ہی کرتی ہیں۔" اس نے ہاتھ پر زور دیا "کیا آپ اب تک "پاؤں" سے کررہی تھیں سارے کام۔"

"نہیں۔" فلکی ہنس پڑی۔ "میرا خیال ہے۔ مجھے آپ کے سب کام کرنے چاہئیں۔"

"تو اس کا مطلب ہے میں اپنی مرضی سے کپڑے بھی نہیں پہن سکتا۔ گھر پر تو آپ نے قبضہ رکھا ہے۔ اب میرے کپڑوں پر بھی قبضہ کرنا چاہتی ہیں۔"

"کاش تمہارے دل پر بھی میرا قبضہ ہوجائے۔" فلکی نے دل میں ڈوب کر دعا کی "گھر کا کام نے سے گھر پر قبضہ نہیں ہوجاتا اور کپڑے نکال کر دینے سے کوئی کپڑوں کا مالک نہیں بن تا۔"

"مرضی کا مالک تو بن جاتا ہے۔" آفاق نے برجستہ کہا۔

فلکی کا دل دھڑک اٹھا۔ اے کاش! ایسا ہوجائے۔

"یہ کام تو کوئی نوکر بھی کرسکتا ہے۔"

"اب تک میں نے کسی نوکر کو اس کی اجازت نہیں دی۔"

"میں تو۔" فلکی نے دانتوں تلے دوپٹہ دبا کر کہا۔ "میرا تو آپ کی شرعی نوکر ہوں اس لیے مجھے یہ حق خواہ مخواہ ملتا ہے۔"

"واہ۔" آفاق نے قمیض اٹھا کر اس کے بٹن کھولتے ہوئے کہا۔ "باتیں تو آپ خوب صورت کرنے لگی ہیں۔"

"صحبت کا اثر ہو ہی جاتا ہے۔" فلکی نے اس کے سیاہ جوتوں کو کپڑے سے چمکاتے ہوئے کہا۔

آفاق ہنسنے لگا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ڈریسنگ روم سے کپڑے بدل کر باہر نکل آیا اور آئینہ کے آگے کھڑے ہوکر ٹائی باندھنے لگا... ٹائی باندھتے ہوئے بھی وہ مسکرا رہا تھا۔

"ویسے یہ آپ کو کس نے بتا دیا تھا کہ آج میں یہ کپڑے پہننے والا ہوں۔"

"آپ ہی نے بتایا ہوگا۔" فلکی نے منہ موڑے بغیر کہا۔

"شکر ہے آپ نے خالص عورتوں والا جواب نہیں دیا۔"

"وہ کیا ہوتا ہے؟"

"جی میرے دل نے مجھے بتایا تھا۔" آفاق نے باریک آواز بنا کر عورتوں والی ادا سے کہا۔

فلکی کو ہنسی تو آئی مگر اس نے آواز بلند نہیں کی۔ برابر بُوٹ چمکاتی رہی۔

"ویسے آپ نے اس رنگ کا آج انتخاب کیوں کیا؟"

"موسم بدل رہا ہے نا؟"... یہ اکتوبر اور نومبر کے مہینے بڑے اداس اداس ہوتے ہیں۔ اس موسم میں زرد رنگ اچھا لگتا ہے اور کاسنی رنگ ہلکے جاڑوں میں بہار کا سماں پیدا کردیتا ہے۔"

"ایک طرف خزاں دوسری طرف بہار۔ یہ کیا فلسفہ ہے۔" آفاق مڑا تو فلکی نے بڑھ کے جوتے اس کے آگے کردیے...

"دیکھیے۔ آپ میرے جوتوں کو پالش نہ کیجئے۔"

"کیوں؟"

"بس میں نہیں چاہتا۔ گھر میں نوکر بھی ہیں۔ ان سے کروالیا کریں۔"

"لیکن میں جو چاہتی ہوں۔ مجھے یہ سب کام کرکے خوشی ہوتی ہے۔"

"بہرحال اگر آپ جوتوں کو ہاتھ نہ ہی لگائیں تو اچھا ہے۔"

فلکی وہیں زمین پر بیٹھی تھی۔ جب آفاق نے جوتے پہن لیے تو اس نے ہاتھ بڑھا کر تسمے لیے۔ "میں بند کروں گی۔" پہلے ہی اس کے ہاتھ آفاق کے ہاتھوں سے ٹکرا گئے تھے اور وہ کو یوں محسوس ہوا جیسے زلزلے کا جھٹکا لگا ہو اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی آفاق نے اپنے پیچھے کرلیے۔

فلکی نے بڑی مہارت اور محبت سے اس کے بوٹ کے تسمے باندھے۔ ذرا سا بوٹ کو لگ گیا تھا۔ اپنی اوڑھنی پکڑ کر اس کو بھی صاف کردیا۔

"شکریہ بہت بہت۔" واقعی اس وقت آفاق شکرگزار اور الجھا ہوا نظر آرہا تھا۔ "آپ واقعی بوٹ چمک رہے ہیں۔ یہ آپ نے کیسے چمکائے ہیں۔"

"جب تک میرا چہرہ ان میں سے نظر نہ آجائے۔ میں کپڑے سے رگڑتی رہتی ہوں۔"

آفاق ایک سیکنڈ کے لیے کھڑا ہوگیا اور حیرت سے فلکی کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ فلکی زمین پر بیٹھی ٹکر ٹکر اس کی طرف دیکھتی رہی۔ نہ جانے آفاق کی آنکھوں میں کیا تھا کہ فلکی سی گئی۔ جیسے اس پر کسی نے سمیریزم کردیا ہو۔ اسی وقت آفاق چونک کر باہر نکل گیا۔ فلکی باورچی خانے میں چلی گئی۔

اس دن کے بعد سے فلکی نے آفاق کے کپڑے نکالنے شروع کردیے تھے۔ وہ جو کپڑے نکال کر رکھ دیتی۔ آفاق پہن لیتا۔ اس نے کبھی اعتراض نہیں کیا تھا۔ البتہ جوتے پالش کر اور پہنانے سے بار بار اسے منع کیا تھا اور فلکی نے ہر بار کہا تھا۔

"عجیب ہیں آپ بھی۔ جب کام نہیں کرتی تھی تو طعنے دیتے تھے۔ اب کام کرتی ہوں ڈانٹتے ہیں۔" اور ہر بار آفاق لاجواب ہوگیا تھا۔ فلکی کو اس کا کام کرکے اس کو جوتے پہنا خوشی ہوتی... جب وہ رومال دینے کے لیے ... پرفیوم پکڑانے کے لیے ذرا سی اس کے قریب

ہوتی تو اسے ایک گرم اور خوب صورت سی مہک آفاق میں سے آتی۔ کبھی پرفیوم کی، کبھی کریم کی، کبھی آفٹرشیو کی اور کبھی آفاق کی سانس کی مہک۔

اس جوگن کے لیے بس اتنی سی مہک کافی تھی۔ اس میں وہ سارا دن ڈولی رہتی۔ کوئی چیز پکڑاتے وقت کبھی جو آفاق کی ذرا سی انگلی لگ جاتی تو سارا دن اس ایک جگہ انگارا سا دہکتا رہتا۔ اسی اگن کو وہ حاصلِ زندگی کہتی تھی۔

اس روز بھی اس نے آفاق کے لیے براؤن چیک سوٹ نکالا۔ اس کی ساری چیزیں ترتیب سے کر رکھیں۔ کوٹ کی جیب میں زرد رومال لٹکایا۔ اس پر "جوائے پرفیوم" لگائی اور باہر نکل گئی تاکہ چھوٹی سی زرد رنگ کی گلاب کی کلی توڑ لائے۔ جب وہ کلی توڑ کر اندر آئی تو آفاق کوٹ پہن کر تسمے باندھ رہا تھا۔ فلکی دوڑ کر اندر آئی۔ جھک کر اس نے تسمے چھینے اور خود باندھنے بیٹھ گئی۔ اس کشمکش میں کلی نیچے گر گئی۔ جب آفاق جھک کر کلی اٹھانے لگا تو فلکی بھی ادھر کو لپکی۔ دونوں کے سر ٹکرا گئے تھے۔

"سوری!" آفاق نے کہا۔

فلکی نے کلی بڑھائی۔ وہ پکڑ رہا تھا کہ فلکی کو خیال آگیا کہ اسے تو اس کے کوٹ میں لگانا چاہیے تھا۔ اس نے کلی اس سے چھین لی اور آگے بڑھ کر کوٹ کے کاج میں لگا دی۔ اس کشمکش میں کئی بار اس کے ہاتھ آفاق کے ہاتھ سے ٹکرائے۔

حالانکہ وہ چاہتی تھی ایسا نہ ہو۔ اس ذرا سے ٹکراؤ کے بعد اس کے اندر طوفان سر اٹھا لیتے تھے۔ آندھیاں چلتی تھیں، بگولے اٹھتے تھے اور وہ سارا دن اپنے اندھے جذبوں کے آگے ہاتھ باندھے پھرتی تھی۔ کسی دن مجھے رسوا نہ کردینا بھرے بازار میں۔

ناشتہ کے بعد جب آفاق جانے لگا تو فلکی نے بریف کیس پکڑاتے ہوئے کہا۔ "اس رات آپ نے کیا کہا تھا، خاک ہوجانے والی عورت کو مرد پسند کرتا ہے۔"

"جی۔"..... وہ جاتے جاتے رکا۔

"عورت کو کس طرح خاک ہوجانا چاہیے... میرا مطلب ہے کس طرح... کیسے وہ اپنے آپ کو خاک کرے۔"

"جس طرح آپ کر رہی ہیں۔"

یہ کہہ کر آفاق تو چلا گیا مگر فلکی کے من میں ایک اور آگ روشن کرگیا۔

ایک دن دوپہر کو آفاق نے دفتر سے فون کیا اور بولا۔

"آج آپ پکچر دیکھنے جائیں گی؟"

"جی۔" فلکی حیران ہو گئی۔

"میں نے یہ پوچھا ہے آپ پکچر دیکھنے جائیں گی؟"

"مگر کیسے... کس کے ساتھ...؟"

"جی جی... پتہ نہیں۔"

"یہ پتہ نہیں کیا ہوتا ہے بھئی۔ میں نے تو دو ٹکٹ منگوا بھی لیے ہیں۔"

"اچھا تو چلی چلوں گی۔"

"چھ بجے چلیں گے۔ آپ تیار رہیں۔"

فون رکھ کر فلکی کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ آفاق سے کسی مہربانی کی توقع نہیں رکھتی تھی۔ جب خودبخود کسی مہربانی پر آمادہ نظر آتا تو اس کا دل ڈوبنے لگتا تھا۔ پتہ نہیں کیوں؟... پہلے وہ آفا کے ظلم و ستم سے ڈرا کرتی تھی اور اب اس کی مہربانیوں سے ڈر آنے لگا تھا۔ اسے سمجھ نہ آتی تھی کہ آخر وہ کیا چاہتی ہے۔ کیا وہ آفاق کو مہرباں دیکھنا چاہتی ہے یا نامہرباں۔ بہرحال تیار ہو گئی۔

کسی زمانے میں فلم دیکھنا اس کی زندگی کا محبوب مشغلہ ہوتا تھا۔ شہر میں اردو یا انگریزی کوئی بھی فلم چل رہی ہو۔ وہ ضرور دیکھا کرتی تھی اور اب... یہ بات نہیں کہ اس نے تو دو مہینے سے کوئی پکچر نہیں دیکھی تھی تو اس کو عادت نہیں رہی تھی بلکہ اسے معلوم دیتا تھا۔ اس نے کوئی جوگ لے لیا ہے۔ ہجوم سے اسے خوف آنے لگا تھا۔ رش والی جگہوں پر وہ جانا نہیں چاہتی تھی۔ لوگوں میں بیٹھتے ہوئے کتراتی تھی۔ تنہائی اچھی لگتی تھی۔ سوچنا۔ کبھی آہ بھر لیتا کبھی رو دینا اسے اچھا لگتا تھا۔ ساری دنیا میں اسے صرف ایک ہی چہرہ نظر آتا تھا۔ ایک

احساس اس کے آس پاس دھڑکا کرتا تھا اور یہ آفاق تھا۔ وہ آفاق سے دور ہو یا نزدیک... وہ کچھ بھی کر رہی ہوتی، ہمیشہ آفاق کے بارے میں سوچتی رہتی۔

آفاق جب چھ بجے گھر آیا تو وہ تیار ہی تھی۔

تیاری کیسی...؟

وہ جس طرح بیٹھی تھی، اسی طرح چل دی۔ راستہ بھر آفاق خاموش رہا اور ایک ہی ریکارڈ بجاتا رہا۔

تم آئے ہو نہ شب انتظار گزری ہے
تلاش میں ہے سحر بار بار گزری ہے

وہ بھی گم سم بیٹھی رہی۔ جب سنیما کے گیٹ کے اندر موٹر داخل ہوئی تو اسے پتہ چلا کہ وہ لوگ تو انگلش فلم دیکھنے آئے تھے... اس نے تو راستہ میں آفاق سے نام بھی نہیں پوچھا تھا۔ جب وہ موٹر سے اترنے لگی تو اس نے سامنے لگے ہوئے بڑے بڑے پوسٹر دیکھے Moment to Moment پکچر لگی ہوئی تھی۔

پہلے وہ عام لڑکیوں کی طرح ہر پوسٹر کو غور سے دیکھا کرتی تھی۔ کندھے اُچکاتی تھی۔ بال جھلاتی تھی اور حشر برپا کرتی ہوئی سنیما کے اندر جاتی تھی۔ اب نہ جانے اسے کیا ہوا۔ باہر نکلتے ہی دوپٹہ کھول کر اپنا سر ڈھکا اور کندھوں پر پھیلا دیا۔ پھر نظریں جھکا کر ایک کونے میں جاکر کھڑی ہوئی۔ جب آفاق موٹر کھڑی کر کے آیا تو وہ دیوار کی طرف منہ کیے کھڑی تھی جیسے وہ اس شہر میں بالکل اجنبی ہو۔ نہ صرف اجنبی بلکہ نیم خواندہ بھی۔

آفاق آگے آگے اور فلکی پیچھے پیچھے... دونوں گیلری میں جاکر بیٹھ گئے۔ لوگ آ رہے تھے۔ بیٹھ رہے تھے۔ کچھ جوڑے تھے۔ کچھ دوست تھے۔ کچھ سہیلیاں تھیں۔ قہقہے تھے۔ چہچہے تھے۔ رنگینیاں تھیں۔ زندہ دلی تھی اور کیا نہیں تھا۔ یہی کچھ اسے بھایا کرتا تھا۔ سنیما ہال کے اندر دنیا ہی مختلف ہوتی ہے۔ جب ہر فرد خوابوں کے گھوڑے پر سوار ہو جاتا ہے اور اپنا ہر دکھ، ہر الجھن تھوڑی دیر کے لیے اس دروازے سے باہر چھوڑ کر آجاتا ہے۔

مگر فلکی کا حال ان سب سے مختلف تھا۔ پہلے وہ مطمئن مسرور و مغرور ہوا کرتی تھی۔ آج وہ بکل تھی... زندگی میں محبتیں اور چاہتیں بھی دیکھی تھیں... نفرتوں کا مزا بھی چکھا تھا... شبِ تنہائی بھی کاٹی تھی.. صعوبتیں بھی سہی تھیں... اور ایک نئے دوراہے پر آکھڑی ہوئی تھی اور یہ دوراہا اور یہ مرحلہ سب سے کٹھن تھا۔ انجام کا اسے پتہ نہیں تھا۔ آفاق کے دل میں کیا ہے، وہ

بالکل نہ جانتی تھی اور بعض اوقات دوسروں کے دل کا حال جاننا ہی زندگی کی تمنا بن جاتی۔ بلا سے اس کی مرضی ہمارے حق میں جاتی ہو یا نہیں مگر وہ زندگی کا سوال ضرور بن جاتی ہے۔

پکچر شروع ہو گئی تھی۔ ہال میں اندھیرا ہو گیا تھا۔

ہال میں اندھیرا ہو گیا تھا۔ سیٹیاں اور سرگوشیاں بند ہو گئی تھیں۔ ماحول رومانوی ہوتا جا رہا تھا۔ ایک دوسرے کے قرب کا احساس جاگنے لگا تھا مگر فلکی سمٹی جا رہی تھی اور وہ بھی سمٹ پرے ہوتی جا رہی تھی۔ شکر ہے وہ سب سے آخری کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ورنہ اِدھر اُدھر کوئی اور ہوتا تو ضرور اسے ٹوک دیتا۔ وہ یوں اندھیرے میں آفاق کے اتنا قریب کبھی نہ بیٹھی تھی اور نہ کبھی اس نے اس طرح بیٹھنے کا سوچا تھا۔ آفاق کی خوشبو بہت قریب سے آ رہی تھی اس کا احساس فلکی کے وجود پر چھایا جا رہا تھا۔ وہ ڈر رہی تھی۔ جانے عشق کیا کر بیٹھے۔ عشق مجنوں ہے۔ دیوانہ ہے۔ گھر نہیں دیکھتا' جنگل نہیں دیکھتا' صحرا نہیں دیکھتا۔ عشق گریباں چاک کر دیتا ہے' جو کچھ بھی تھی۔ گریباں چاک کرنے سے وہ بہت ڈرتی تھی۔ آفاق نے کتنا ظلم کیا اس کو ساتھ لے آیا۔ جانے اور کتنے امتحان لینا چاہتا ہے اس کے...

وہ کھینچ کر فلم کی طرف دھیان مبذول کرتی اور دھیان پلٹ پلٹ کر آفاق کی جانب آتا اور آفاق یوں بیٹھا تھا جیسے وہ تنہا آیا ہے۔ یہاں اس کے ساتھ اور کوئی بھی نہیں آیا ہے۔

اس اندھیرے میں ایک موہوم سی روشنی کے زیرِ اثر اس نے کتنی ہی دفعہ آفاق کے سپاٹ چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ اسے پکچر میں یوں ڈوبے دیکھ کر اسے خیال آیا کہ اسے بھی فلم دھیان سے دیکھنی چاہیے۔ اس فلم میں ضرور کوئی بات ہوگی۔ وہ بھی فلم کو غور سے دیکھنے لگی اور جب فلم ختم ہوئی تو اسے بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔

آخر آفاق اسے ایک ہرجائی بیوی کی فلم دکھانے کیوں لایا ہے؟

اس کی قوطیت دوچند ہونے لگی۔

کیا آفاق اسے ایسی بیوی سمجھتا ہے۔

کاش آفاق جان سکے کہ وہ کیا سے کیا ہو گئی ہے۔

اس کی زندگی بدل گئی ہے۔

اعتقاد بدل گئے ہیں۔

زندگی کے سارے فلسفے بدل گئے ہیں۔

لیکن کیا آفاق اسے معاف کر سکے گا...

گناہ تو خدا بھی معاف کر دیتا ہے۔

ونوں جب موٹر میں آکر بیٹھے تو آفاق نے دوسرا گیت چھیڑ دیا۔

تو خدا ہے نہ میرا عشق فرشتوں جیسا!
دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

ی نے ہاتھ بڑھا کر ٹیپ بند کر دی۔

یوں کیا بات ہے؟" آفاق نے پوچھا "پکچر پسند نہیں آئی؟"

اچھی تھی! آج عرصۂ دراز بعد فلم دیکھی تو میرے سر میں درد ہونے لگا ہے۔"

یا خیال ہے کہیں سے کھانا نہ کھا لیں؟" آفاق نے پوچھا۔

ھانا تو گھر میں بھی تیار ہے۔" فلکی نے جلدی سے کہا۔

بھی کبھی باہر بھی کھا لینا چاہیے۔"

یسے آپ کی مرضی۔"

ہاں کھانا پسند کریں گی آپ؟"

جہاں آپ پسند کریں۔"

فلکی کو اپنی اس حالت پر بہت تعجب ہوا۔ ہوٹلوں میں کھانا اس کی ایک اور ہابی تھی اور طور پر چائنیز کھانا تو اس کی جان تھا۔ ہفتے میں ایک بار وہ ضرور کسی نہ کسی چائنیز وران میں جایا کرتی۔ کبھی سہیلیوں کے ساتھ' کبھی دوستوں کے ساتھ اور اب اس نے کتنے ے سے کہہ دیا تھا۔ جہاں آپ پسند کریں اور آفاق نے چلتے چلتے موٹر ایک ریستوران کی موڑ دی تو وہ اور پریشان ہو گئی۔ یہ وہی چائنیز ریستوران تھا جہاں وہ اپنے دوستوں کے بارہا آ چکی تھی۔ ریستوران کا مالک اسے اچھی طرح پہچانتا تھا اور اب وہ اندر جاتے ہوئے ر رہی تھی۔

لیکن آفاق نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔ آگے بڑھتا ہی چلا گیا۔ پھر ہال میں جا کر ایک نے والی میز پر بیٹھ گیا۔

فلکی بھی اس کے پیچھے چلتی گئی اور دانستہ ہال کے دروازے کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گئی۔

آج ہوٹل کے مالک نے اسے پہچان کر سر جھکا کر سلام کیا تو اسے ذرا تسلی ہوئی کہ اب وہ باعزت آدمی کی بیوی ہے۔ لیکن پھر بھی وہ مسلسل ڈر رہی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس ستوران میں کوئی پرانی واقف یا کوئی بھی شناسا ملے۔ یہ بات نہیں کہ وہ آفاق سے اپنا ماضی

چھپانا چاہتی تھی۔

آفاق سے وہ کچھ بھی چھپانا نہیں چاہتی تھی مگر آفاق کے علاوہ' وہ کسی اور کا سامنا ا
ہی نہ کرتی تھی۔ آفاق کے آگے ہر چہرہ ہیچ لگتا تھا۔

"پھر کیسی لگی پکچر آپ کو؟" کھانے کا آرڈر دینے کے بعد اس نے پوچھا۔

"کہانی کیسی لگی؟"

"مجھے کہانی کی کوئی خاص سمجھ نہیں ہے۔"

"اس کا مطلب ہے پکچر آپ کو اچھی نہیں لگی۔"

"... کہہ سکتے ہیں۔"

"مجھے تو بہت پسند آئی ہے۔"

فلکی یہ نہ پوچھ سکی کہ اسے کیوں پسند آئی تھی۔ ایسے ہی جیسے فلکی کے من میں کوئی چو
اس کی ساری بھوک مٹ گئی تھی اور وہ دل میں سوچ رہی تھی کہ آفاق کیا جانے... کہ وہ
کے لیے کیا کر سکتی ہے۔

کھانے کے دوران بھی اس نے بہت کم باتیں کیں۔

سڑک پر آکر آفاق نے پوچھا۔

"پان کھائیں گی۔"

"کھلا دیجئے۔"

"آفاق نے موٹر مارکیٹ کی طرف موڑی۔ جب وہ پان کی دکان پر پہنچے تو دکاندار کا م
اونچی آواز میں چنگھاڑ رہا تھا۔

رانجھا رانجھا کردی وے میں آپے رانجھا ہوئی

اس وقت چیختا ہوا یہ ریکارڈ فلکی کو اتنا اچھا لگا کہ اس کا دل چاہا۔ آفاق ساری رات
گزار رہے اور وہ یہ گیت سنتی رہے۔

جب چھوٹے لڑکے سے پان پکڑ کر آفاق نے کار اسٹارٹ کر دی تو اس کے ہاتھ سے
پکڑتے ہوئے کہا۔

"یہ کون سا اسٹیشن لگا ہوا تھا؟"

"کہاں؟"

"پان کی دکان پر۔"

وہ رانجھا رانجھا والا۔"

"جی۔"

"یہ پان کی دکان والا گیت ہے۔"

تو آفاق نے ریڈیو آن کیا اور نہ ہاتھ بڑھا کر سوئی گھمانے کی فلکی میں ہمت ہوئی۔

واہ واہ۔ یہ کیا جذبہ ہے؟"

لکی نے سوچا۔ جن کے کارن یہ جوگ لیا ہے۔ وہ پوچھتے ہیں کیوں جوگن بنی۔

وہ چپ بیٹھی رہی۔ سامنے گھر آگیا۔

یٹ کے باہر گھر کا نام "رازداں" روشنی میں چمک رہا تھا۔ پہلے بھی کئی بار اس نے اس نام
ر کیا تھا۔ جس طرح آفاق انوکھا نرالا تھا۔ اسی طرح اس کی ہر بات نرالی تھی اور گھر کا نام
کتنا اچھوتا تھا۔

"رازداں۔"

"آپ کے گھر کا نام بہت خوب صورت ہے۔" ایک دم فلکی نے کہا۔

"کیا یہ آپ کا گھر نہیں ہے؟" آفاق نے مڑ کر دیکھا اور اس انداز میں پوچھا کہ فلکی بوکھلا

"

اف۔ کس قدر غلط سوال کر دیا تھا اس نے....

وہ کیا جواب دیتی۔ کیا کہتی۔ کیا یہ کہتی کہ وہ تو اس گھر میں رہنے کے اہل نہیں ہے... یا یہ
ں کہ میرا اس گھر میں کیا مقام ہے... یا... اعتراف کر لیتی... کہ یہی گھر تو میری جنت ہے۔
یہ جنت آباد کرنے کی اجازت دو۔ میرا من قبول کر لو۔ میرا تن قبول کر لو۔ یہ عمر قید میرے
ر میں لکھ دو۔ تمہارا کیا جاتا ہے مگر اس کے گلے میں جیسے پھندے پڑ گئے۔

"میرا خیال تھا کہ محبت کی رازداں بیوی ہوتی ہے اور میاں بیوی کا رازداں گھر ہوتا ہے۔
ی واسطے میں نے اپنے گھر کا نام "رازداں" رکھ دیا تھا۔

"بہت موزوں نام ہے۔" فلکی نے جیسے آنسوؤں کے درمیان کہا۔ "گو آپ کی قسمت میں
ہی بیوی نہیں تھی مگر پھر بھی آپ کا گھر تو رازداں ہی ثابت ہوا ہے۔"

"بھئی یہ بات تو میں آپ کے بارے میں بھی کہہ سکتا ہوں نا؟"

"کیا۔" وہ اس کی وضاحت چاہتی تھی مگر گاڑی پورچ میں آکر رک چکی تھی اور چوکیدار
وازہ کھول رہا تھا۔

فلکی باہر نکل آئی۔ باہر نکل کر وہ سیدھی باورچی خانے میں گئی۔ عبدالکریم ابھی تک
انتظار میں جاگ رہا تھا۔ اس نے عبدالکریم سے کہا۔ وہ کھانا کھا کر سو جائے۔ وہ لوگ
کھانا کھا کر آئے ہیں۔

آدھی رات کو فلکی کی آنکھ کھلی تو دل دھک سے رہ گیا۔ آفاق اس کے اوپر جھکا ہوا تھا اور
ت سے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

"کیا ہوا ہے... کیا بات ہے؟" وہ گڑبڑا کر بیٹھ گئی۔

"کچھ نہیں۔" وہ سکون سے بولا اور ذرا پرے ہٹ گیا۔

"پھر... پھر...؟" فلکی اسے بے اعتباری سے دیکھتی ہوئی بولی۔ اس سے پہلے وہ اس کے بستر
، قریب بھی نہیں آیا تھا اور آج بستر پر بیٹھا بھی تھا اور اس کے چہرے پر جھکا بھی تھا۔

اس کو یوں بے اعتبار دیکھ کر آفاق ذرا اور پرے کھسک گیا۔

"آپ مجھے پکار رہی تھیں؟"

"میں... میں... نہیں... میں نے تو کسی کو نہیں پکارا۔ کبھی نہیں پکارا۔

"ممکن ہے' خواب میں آپ ڈر گئی ہوں۔"

"خواب میں...!" فلکی کھو سی گئی۔ "ہاں شاید خواب دیکھا ہو۔" کئی دنوں سے وہ ایک
یانک خواب دیکھ رہی تھی۔ کئی دنوں سے اس کے لاشعور میں آندھیاں سی اٹھ رہی تھیں۔
ئی دنوں سے ماضی اسے کچوکے لگا رہا تھا۔ وہ خواب میں اکثر ڈر جاتی تھی۔ آج بھی غالباً اس
نے کوئی خواب دیکھا تھا۔ مگر خواب میں تو وہ اپنی ممی کو پکار رہی تھی۔ لیکن آفاق کا تو اس نے
بھی نہیں لیا تھا۔ اس نے پھر شک کی نظر سے آفاق کو دیکھا۔

"میں تو ممی اور ڈیڈی کو پکار رہی تھی۔"

"ہاں' ان کو بھی پکارا ہو گا مگر جب میں نے سنا' آپ کہہ رہی تھیں... آفاق... آفاق...
نو... مجھے بچاؤ... مجھے بچاؤ۔"

"میں نے کہا... آفو۔"

"ہاں...!"

فلکی سوگواری سے مسکرا دی۔ دل میں تو وہ ہمیشہ اسے آفو ہی کہتی تھی۔ زبان سے گیا ہوگا۔ کچھ بعید نہیں۔

"کیا آپ کو کوئی ذہنی پریشانی ہے۔ اگر آپ مجھے اس قابل سمجھیں تو بتا دیں۔ شاید کرسکوں۔"

آفاق نے اتنے پیار سے کہا کہ فلکی نے نظریں اُٹھا کر اس کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔

"آپ مجھ پر اعتماد کر سکتی ہیں!"

"نہیں..." فلکی ایک دَم رونے لگی۔ "مجھے پریشانی نہیں۔ میں بہت خوش ہوں۔ کسی کو نہیں پکارا کرتی۔ میں اب نہیں ڈرتی۔ اب میں عادی ہوگئی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" آفاق کھڑا ہوگیا۔ مجھے ہی غلط فہمی ہوگئی ہوگی۔ ویسے میری نیند بڑ ہے۔ جب تک کوئی جھنجھوڑ کر نہ جگائے' میں جاگتا نہیں۔ آپ اتنی زور سے چِلّا چِلّا کر رہی تھیں کہ میں اٹھ کر آپ کے پاس آگیا۔ یہ میرا اخلاقی فرض تھا۔ اسے آپ میری محمول نہ کیجے گا۔ میں کئی دنوں سے آپ کو پریشان دیکھ رہا ہوں۔ اس لیے پوچھ لیا تھا کوئی بوجھ آپ ذہن پر لیے پھرتی ہیں تو میرے حوالے کردیں۔ ورنہ مجھے آپ کی ذاتیا دخل انداز ہونے کا کوئی حق نہیں... ہم جن شرائط پر زندگی گزار رہے ہیں' وہاں اس انڈر سٹینڈنگ کی ضرورت تو نہیں ہے... پھر بھی..."

"اچھا اب سو جایئے۔"

آفاق اپنے بستر پر چلا گیا۔

شاید اس کی نیند بھی اُڑ گئی تھی اسی لیے سونے کی بجائے سرہانے والا ٹیبل لیمپ آن اور ایک رسالہ کھول کر پڑھنے لگا۔

فلکی ابھی تک بال پھیلائے اپنے پلنگ پر بیٹھی تھی۔ اس کے حلیے سے ہی لگ رہا تھا بڑی وحشت زدہ ہے۔ اس نے خواب ہی ایسا دیکھا تھا۔ وہ خواب میں تو ہر روز چِلّاتی آج شاید اس کی آواز خواب کا دائرہ توڑ کر باہر نکل گئی تھی۔

وہ بھلا کیوں آفاق کی نیت پر شک کرتی۔ اسے ہنسی آگئی۔ آفاق تو کئی مہینوں سے اِ کمرے میں سو رہا تھا اور وہ تو یہاں اس لیے سوتا تھا کہ فلکی کو ڈر لگتا تھا۔ محبّت درمیان میاں' بیوی کے درمیان ہزاروں میلوں کے فاصلے پیدا ہوجاتے ہیں... وہ ایک کمرے سوئیں... یا ایک بستر پر....

وہ جانتی تھی کہ آفاق کو اس سے بالکل محبّت نہیں ہے جس طرح اس نے آفاق کو شکار کرنا تھا اسی طرح آفاق نے اسے مزہ چکھانے کے لیے یہاں رکھ چھوڑا تھا۔

پھر وہ قفس میں رہتے رہتے قفس سے مانوس ہوگئی۔ اسے پنجرے سے عشق ہوگیا... پاؤں کی نجیر مانگ کا سیندور بن گئی۔ نئے جذبوں نے اسے خود اپنے دل کا قیدی بنا دیا مگر ضروری تو نہیں کہ آفاق بھی ان جذبوں سے دوچار ہوا ہو۔ یہ ضرور ہے کہ اس کے رویّے میں تبدیلی آگئی ی مگر اس تبدیلی کو مروّت تو کہہ سکتے ہیں' محبّت نہیں کہہ سکتے۔

آفاق کا دل شاید محبت سے بالکل عاری تھا۔

یا وہ عورتوں سے نفرت کرتا تھا یا پھر وہ ایک خاص طبقے کی عورتوں سے نفرت کرتا تھا۔

آفاق کا دل جیتنا کس قدر مشکل تھا؟ اور وہ کون سی خوش قسمت عورت ہوگی جس کی رسائی س کے دل تک ہوگی۔ وہ سوچا کرتی۔ اس کے مقدر میں تو یہ خوشی ہرگز نہیں تھی۔ اس نے ثانی المحبوب کی منزل میں قدم رکھ دیا تھا۔ اندھا دُھند اپنے آپ کو روندتی چلی جارہی تھی کہ اسے ایک دَم ٹھوکر سی لگی اور گر پڑی۔ گو اس کا ماضی داغدار تھا۔ مگر اس نے ابھی تک اپنا اضی آفاق سے چُھپا رکھا تھا۔ اس نے ایک دن بھی آفاق کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف نہ لیا تھا۔ جب تک وہ پچھلے گناہوں کا اعتراف نہ کرتی' اسے اپنی آیندہ زندگی کے بارے میں کچھ بھی پتہ نہیں چل سکتا تھا۔

گو اس نے اپنے آپ کو بالکل بدل لیا تھا۔ آفاق کے رنگ میں ڈھال لیا تھا مگر... مگر...!

میلے اور داغ داغ کپڑے کو پہلے دھوتے ہیں۔ پھر استری کرتے ہیں پھر خوشبو لگاتے ہیں... تب وہ کہیں جا کر نماز پڑھنے کے قابل ہوتا ہے۔

اس کے اوپر ایک اور سفید کپڑا بچھا دینے سے اس کی غلاظت دور نہیں ہوجاتی۔ کئی دنوں سے وہ اس آگ میں جل رہی تھی۔

الاؤ جب بھڑک اٹھتے تو اس کو اس میں کئی واقعات دکھائی دینے لگتے۔ ایسے واقعات جنھیں وہ پہلے ہرگز بھیانک واقعات نہیں کہتی تھی۔ صرف اتّفاقات کہتی تھی۔ مگر اب...؟ اب اس کا دل چاہتا... آفاق کو بتائے... آفاق سے پوچھے...!

آفاق نے جی بھر کر اس کے ساتھ نفرت کی تھی۔ اب اس سے زیادہ اور کیا نفرت کرے گا؟ اور اگر اس کے بارے میں زیادہ جان لینے کے بعد وہ اس سے اور زیادہ گھناؤنی نفرت کرنے لگے گا تو بھی فلکی برداشت کرلے گی۔

کیونکہ اب وہ جس منزل میں تھی' وہاں عشق بے طلب ہو جاتا ہے اور محبت مانگتی۔

عشق کیے جانا ہی عشق کی معراج ہے۔

عشق نہ ہو تو شرع و دیں تبکدۂ تصورات۔

مگر پھر... نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ الجھتی ہی جا رہی تھی اور سوتے میں بھی بھیانک دیکھنے لگی تھی اور خواب اس کا بھید کھولنے لگے تھے۔

اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ آفاق ابھی تک پڑھ رہا تھا۔ گھڑی کی طرف دیکھا پچھلے پہر بج رہا تھا۔ آدی رات اِدھر تھی... آدھی اُدھر... اس نے آفاق کو بے آرام کر دیا تھا۔ پانچ بجے اٹھنے کا عادی تھا۔ اب بقایا رات اسے نیند نہیں آئے گی۔

پھر میں کیا کروں؟

اس کا دل چاہا۔ چیخے۔ چلّائے... آفاق کے گلے سے لپٹ جائے اور خوب روئے۔ ایک عجیب سے لمحے پر آکر اٹک گئی تھی اور رات کا ہر لمحہ جادوگر ہوتا ہے۔ خطرناک ہے... بھاری ہوتا ہے.... اور شیطان ہوتا ہے۔ اسی واسطے تو رات کے شر سے پناہ ہے...

رات کا شرفنا کر ڈالتا ہے.... کچل دیتا ہے پھونک دیتا ہے۔ رات کا شر قبا چاک ہے۔ دامن تار تار کر دیتا ہے۔ نگاہ کو جھکا دیتا ہے۔

اس شر سے پناہ مانگنی چاہیے... پیشتر اس کے کہ.... وہ اس شر کے قریب میں آئے اپنے محبوب کے سامنے گھٹنے ٹیک کر اپنے گناہوں کا اعتراف کرنا چاہیے۔ جتنی زیادہ آفاق اس سے کرے گا' اتنا ہی وہ اس شر سے محفوظ رہے گی۔

جیسے وہ ایک دم بہادر لڑکی بن گئی۔

"آفاق...!" ایک آواز کمرے میں گونجی جسے آفاق نے صرف واہمہ جانا۔

"آفو...!"

آفاق چونک اُٹھا' سر اُٹھا کر دیکھا تو فلکی اس کی جانب ملتجیانہ نظروں سے دیکھ رہی تھی

"آپ نے مجھے بلایا ہے؟"

"جی... لیکن اب خواب میں نہیں بلکہ ہوش و حواس میں پکارا ہے۔"

"فرمایئے!"

"آپ نے کبھی مجھ سے میرے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔"

آفاق تھوڑی دیر تک اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا... اور پھر بولا۔

"شاید میرا خیال ہو کہ میں آپ کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں۔"

"ممکن ہے آپ کا خیال درست ہو لیکن پھر بھی کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو کبھی کسی کے علم میں نہیں آسکتیں۔"

"آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟"

"آپ نے مجھ سے ٹوٹ کر نفرت کی۔ میری عادتوں کا مذاق اڑایا۔ میری ہر بے ہودگی کا مجھی کو ذمّے دار ٹھہرایا مگر... مگر... آپ نے کبھی یہ نہ سوچا... کہ یہ غلطی... کب... اور کہاں سے ہوئی؟ گناہگار تو میں ہوں... میں اپنی صفائی پیش نہیں کر رہی مگر... ممکن ہے حالات نے مجھے ایسا کر دیا ہو۔"

"میں جانتا ہوں۔ سمجھتا ہوں۔ میں آپ کو دوش نہیں دیتا..."

"میں جب سے یہاں آئی ہوں' مجھے سوچنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ سوچنے سے پرانی باتیں اس طرح یاد آنے لگی ہیں جس طرح کھدائی کرنے سے پرانے زمانے کی تہذیب کا سُراغ ملتا ہے... مجھے بچپن کی ایک کہانی یاد آکر پریشان کرتی رہتی ہے۔ میں یہ کہانی آپ کو سنانا چاہتی ہوں۔ اگر..."

"ضرور.... ضرور.. سنایئے۔"

آفاق نے رسالہ بند کر دیا اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

فلکی نے ایک طویل سانس چھوڑی اور آنکھیں بند کر لیں۔

ایسے لگا جیسے وہ وہم و گمان میں کھو گئی ہو۔ بہت دور نکل گئی ہو۔ اتنی دور کہ اب اس کا لوٹ کر آنا مشکل ہو۔

آفاق حیرت سے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا اور اسے محسوس ہو رہا تھا کہ فلکی اب اس کشمکش میں مبتلا ہے... آیا وہ کہانی سنائے یا نہیں؟ لیکن آفاق نے اسے بُلایا نہیں... اس کے بولنے کا انتظار کیا۔

کافی دیر بعد جب فلکی بولی تو اس کے لہجے کے ساتھ اس کی آواز بھی بدلی ہوئی تھی۔

"بیگم صدرالدین اپنے وقت اور زمانے کی انتہائی حسین اور طرح دار خاتون تھی۔ خوش قسمت لوگوں میں سے تھی جو سونے کا چمچ لے کر چاندی کے پالنے میں پیدا ہوتے ماں' باپ دولت مند تھے۔ انھوں نے تو ناز اٹھانے ہی تھے... اٹھائے... علی گڑھ سے بی۔ کرنے کے بعد وہ فائن آرٹس کی تعلیم کے لیے پیرس چلی گئیں۔ پیرس میں انھوں نے ملبوسات' سدا بہار حسن اور طویل جوانی کی تعلیم پر زیادہ توجہ دی اور فائن آرٹس کو خیرباد کہہ دیا۔ وہیں پر ان کی ملاقات صدرالدین سے ہوگئی۔ امارت میں ان کے ہم پلّہ تھے۔ دونو شادی ہوگئی۔

صدرالدین کا سارا کاروبار لاہور میں تھا اس لیے وہ شادی کے بعد پاکستان آگئے۔

نازلی صدرالدین کو گو پاکستان میں رہنا پسند نہیں تھا مگر آنا تو پڑا... پھر یوں ہونے لگا کہ سردیوں کے تین مہینے پاکستان میں گزارتیں اور باقی نو مہینے دوسرے ملکوں کی سیاحت کیا کرتیں۔ صدرالدین منع نہیں کرسکتے تھے کیونکہ وہ اپنے باپ سے اتنی زیادہ دولت لائی تھیں' جو زندگی بھر کی سیاحت کے لیے کافی تھی۔

صدرالدین کو اولاد کا بہت شوق تھا اور نازلی صدرالدین اولاد کے نام سے گھبراتی تھی نہ صرف معمولات میں زنجیر بن جاتے ہیں بلکہ حسن و جوانی بھی وقت سے پہلے وداع ہوتے ہیں اور نازلی صدرالدین ہمیشہ خوب صورت اور ہمیشہ جوان رہنا چاہتی تھی۔

نازلی صدرالدین بلا کی حسین عورت تھی۔ اس کی کمر اتنی پتلی تھی کہ لوگ اس کی کمر کہا کرتے تھے۔ اس کو ہمیشہ یہ فکر لگا رہتا کہ اگر بچّہ پیدا ہوگیا تو اس کی کمر کا سائز بدل جا اور پھر وہ ڈھیروں ڈھیر قیمتی ملبوسات ضائع چلے جائیں گے جو ہر سال پیرس' امریکہ اور ا سے لاتی ہیں۔ بہرحال صدرالدین صاحب کی خواہش پوری ہوئی اور وہ امید سے ہوگئیں پہلے تو انھوں نے بہت واویلا کیا۔ شور مچایا کہ وہ بے ہودگی ہرگز برداشت نہ کریں گی

کردیں گی' وہ کردیں گی۔ پھر صدرالدین صاحب کی منت سماجت آڑے آئی اور انھوں نے صدرالدین صاحب سے وعدہ لے لیا کہ وہ آیندہ ماں بننا ہرگز پسند نہ کریں گی۔ نہ وہ اس بچّے کو پالنے کی ذمّہ داری لیں گی... اور نہ ہی یہ بچّہ ان کی سیاحت میں حائل ہوگا؟ صدرالدین صاحب نے نہ صرف یہ کہ ان کی ساری شرائط مان لیں بلکہ زندگی بھر ممنون رہنے کا بھی وعدہ کیا۔

سو ان کے ہاں ایک چاند سی بیٹی نے جنم لیا جس کا نام فلک ناز رکھا گیا۔ فلک ناز کے لیے ایک نرس اور ایک آیا کا بندوبست کیا گیا۔ آیا دن کو اس کا خیال رکھتی تھی اور نرس رات کی ڈیوٹی دیتی۔

نازلی صدرالدین نے فلک کو اپنا دودھ نہیں پلایا۔

انھوں نے صاف کہہ دیا تھا... بچّے کو دودھ پلانے سے عورت کا جسمانی حسن غارت ہوجاتا ہے... اور پھر دودھ کی وجہ سے بچّہ ماں سے اس قدر مانوس ہوجاتا ہے کہ اس کی جان نہیں چھوڑتا....!

ڈبّے کا دودھ....

امپورٹڈ کپڑے' جھولے' گاڑیاں...

دو دو مصنوعی مائیں' یعنی آیا اور گورنس....

بے شمار نوکر...

پیدا ہوتے ہی یہ سب فلک ناز کا مقدّر بن گیا۔ لوگ فلک ناز کی قسمت پر رشک کرتے تھے۔

اور ممی... ممی تو اس وقت پیرس چل دیں جب وہ تین مہینے کی تھی' ان کو اپنے لگے ہوئے فگر کا بہت فکر تھا اور ہر روز یہ وہم ستاتا کہ شاید ان کے چہرے پر ایک دو فالتو لکیریں نمودار ہوگئی ہیں۔ ڈیڈی نے ان کو پیرس جانے کی اجازت دیدی۔

پھر اس کے بعد یہ معمول بن گیا۔

موسم بہار میں چلی جایا کرتیں۔ کبھی فرانس' کبھی جرمنی' کبھی امریکہ' کبھی یورپ... کبھی کبھی ڈیڈی بھی ان کے ہمراہ جاتے۔ کبھی کاروبار کے لیے' کبھی ممی کی خوشنودی کی خاطر...

اتنی بڑی کوٹھی میں جہاں ہر کمرے میں اٹیچی اور ہالینڈ کے بڑے بڑے فانوس جلا کرتے تھے۔ بے شمار نوکروں کے ساتھ فلک پاؤں چلنا سیکھتی تھی۔ سب لوگ کھاتے تھے۔ عیش کرتے تھے۔ وہ ایک دودھ کی بوتل منہ میں ڈالے سب کو ٹپر ٹپر دیکھا کرتی۔ ذرا سا روتی تو سارے نوکر اکٹھے

ہو جاتے... نوکر کے چہرے میں وہ چہرہ نظر نہ آتا جو اس کے لیے سکون کا سامان تھا۔
کرنیں کسی سمت سے نہ پھوٹتیں۔ گو اس گھر میں دودھ کی نہریں بہتی تھیں۔
وہ ایک نغمہ ریز آواز کو سننے کے لیے ترس جاتی۔ گو ہر کمرے میں ریڈیو چیختا رہتا...
اگر وہ ڈیڈی کی تحویل میں ہوتی... تو انھیں کہاں اس کا مکھڑا چومنے کی فرصت ہو
اپنی کاروباری مصروفیات میں سارا دن باہر رہتے اور رات کو جب' وہ سسک سسک کر
چوسنی ڈالے ننھے تکیے کو بازو میں لیے سو جاتی تو ڈیڈی گھر آتے۔

آتے ہی دبی زبان میں نوکروں سے پوچھتے۔

"بے بی سو گئی کیا...؟"

"جی سر!"

"روئی تو نہیں تھی؟"

"نہیں سر!"

"اس کی طبیعت ٹھیک ہے نا؟"

"جی سر!"

"اس مہینے اسے ڈاکٹر علوی کے پاس لے گئے تھے؟"

"جی سر!"

"وزن بڑھ رہا ہے نا؟"

"جی سر!"

"اور بھی سب ٹھیک ہے نا؟"

"ٹھیک ہے سر!"

کبھی کبھی ڈیڈی دبے پاؤں اس کے کمرے میں آجاتے۔ وہ جھالروں والے گلابی رنگ
پلنگ میں سو رہی ہوتی۔ اس کے لبوں پر ارتعاش ہوتا اور معصوم پیشانی پر ایک ننھی سی مو
شکن ہوتی۔

ڈیڈی جالی والا پردہ اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھتے اور پھر اسے چومے بغیر ہی واپس آجاتے۔
مبادا وہ جاگ جائے۔

ڈیڈی... ڈیڈی... اس کی سانسیں واویلا کرنے لگتیں.. میرا منہ چوم لیجیے۔ اس جا
بلائیں لے لیجیے۔ میں آپ کے ہونٹوں کے لمس کو ترس گئی ہوں۔

آپ کی بجائے جب یہ نوکر لوگ میرا منہ چومتے ہیں تو مجھے گھن آتی ہے۔ نفرت ہوتی ہے۔
مگر ڈیڈی دبے پاؤں کمرے سے نکل جاتے۔

می دوسرے ملکوں میں جا کر باقاعدہ فون کیا کرتی تھیں اور آیا سے فون پر بار بار پوچھا کرتیں۔

"بے بی کیسی ہے؟"

"بے بی کا خیال رکھا کرو۔"

اور جب واپس آتیں تو بے بی کے لیے بے شمار کھلونے' فراک' گاڑیاں اور جانے کیا کیا لاتیں۔

اس لیے جب بے بی نے آنکھ کھولی تو اس کے اِردگرد دنیا بھر کے خوبصورت اور خوش رنگ کھلونے تھے۔ دیدہ زیب' بیش قیمت ملبوسات تھے۔ کھانے کو ہر نعمت تھی اور حکم بجالانے کو خادم تھے... کیونکہ انھیں حکم بجالانے کی زیادہ سے زیادہ تنخواہ ملتی تھی۔

جن چیزوں کی بہتات ہوتی ہے' وہی چیزیں ڈسنے لگتی ہیں۔ احتیاج' زندگی کی ایک زبردست حقیقت ہے۔

مگر وہاں احتیاج کس چیز کی تھی؟

سچے پیار کی....

سچی لگن کی....

ماں کی مامتا کی....

باپ کی سرپرستی کی....

می کہتی تھیں' بچوں کو والدین سے دور رکھ کر پروان چڑھانا چاہیے۔ وہ غیر ضروری جذبوں اور بے وقوفانہ سی عادتوں سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ خود اعتماد ہو جاتے ہیں۔ بہادر ہو جاتے ہیں۔ اپنے فیصلے خود کر سکتے ہیں۔

لیکن فلکی خود سر ہو گئی تھی۔

بہت سے بن مانگے کھلونے آسیب کی طرح اس کے کمرے میں بکھرے رہتے اور وہ بڑی بے دردی سے انھیں توڑتی پھوڑتی رہتی۔

ٹوٹے ہوئے کھلونوں کی جگہ آیا' اندر سے نئے کھلونے لا کر رکھ دیتی۔

یہ دیکھو فلکی بی بی! یہ آپ کا می پیرس سے لایا تھا۔ اس میں سیل ڈالو۔ اس بڈھے کا منہ لال

ہو جائے گا۔ پیگ بھرے گا... پئے گا پھر ہچکی لگائے گا۔ دو تین بار فلکی اس لال منہ والے بڈھے کو پیگ بھر کے پیتے دیکھتی رہتی۔ پھر پلٹ کر اس کی گردن مروڑ دیتی۔

"او مائی گاڈ... یہ کیا کردیا بے بی! دو سو ڈالر کا کھلونا کباڑا کردیا۔"

"میں بھی پیوں گی... میں بھی پیوں گی... پیگ پیوں گی..."

فلکی زمین پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر چلّانے لگتی۔

اگر ممی کی آواز سن لیتیں تو دیکھنے آجاتیں۔ فلکی کی ضد سن کر ہنس پڑتیں... پھر کہتیں۔

"آیا' تھوڑا سا کوکا کولا چھوٹے گلاس میں ڈال کر بے بی کو دے دو۔ وہ پیگ سمجھ کر جائے گی۔ اس کی بات جلدی سے مان لیا کرو۔ بچّوں کو سمجھانے سے بچے ضدّی ہو جاتے ہیں۔

آیا کو بیگم صاحبہ کا حکم بہرحال ماننا ہوتا تھا۔

مگر آیا جتنا زیادہ فلکی کا حکم مانتی' وہ اتنی زیادہ چڑچڑی' ضدّی اور خود سر ہو جاتی۔

آیا کے بال نوچ لیتی۔ نوکروں کے منہ پر برتن توڑ دیتی اور اپنے خوب صورت فراک الماری سے نکال کر چولہے میں ڈال دیتی۔

بعض اوقات آیا اسے بہت ہی بیش قیمت فراک پہنا کر تیار کرتی اور کہتی۔

"دیکھو بے بی! آپ کا یہ فراک ممی واشنگٹن سے لائی تھیں۔ بہت قیمتی ہے۔ یہاں کسی کے پاس ایسا فراک نہیں ہوگا۔ یہ جرابیں لندن کی ہیں۔ بوٹ اٹلی کے ہیں اور یہ کلپ... ممی نے ہانگ کانگ کے ایرپورٹ سے خریدے تھے۔

فلکی اتنے ملکوں کا نام سنتے ہی سخ پا ہو جاتی۔ شاید دوسرے ملک اسے اپنے رقیب لگتے تھے اور پھر جب آیا اسے تیار کرا کے باہر نکل جاتی تو وہ کیس سے قینچی ڈھونڈھ کر لے آتی اور ا سارا فراک کتر کتر کر اتار ڈالتی۔ موزے کاٹ ڈالتی۔ بوٹ کاٹ ڈالتی... اور جب آیا کمر میں آتی... تو وہ ننگی ہو کر ٹب میں بیٹھی ہوتی اور صابن کا سارا جھاگ قالین پر پھیلا ہوتا۔

کسی کو اسے مارنے یا ڈانٹنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ جو بھی کرے' اس کو حق تھا... لیکن کبھی فلکی کا مار کھانے کو دل چاہتا' اس کے کومل رخسار تھپتھپانے لگتے۔ اس کو مار میں ہی محبت' شدت نظر آتی تھی۔ جب وہ دیکھتی کہ نوکروں کی مائیں اپنے بچّوں کو مار کر دھن دیتی ہیں اور اسی شدّت سے کلیجے سے لگا لیتی ہیں گویا مائیں بچّوں کو مارتی نہیں بلکہ حقِ ملکیت جتاتی ہیں۔

اس پر کوئی حقِ ملکیت نہیں جتاتا تھا۔

جس طرح مانگا ہوا کپڑا پہنا جاتا ہے۔ سنبھال سنبھال کر...

جس طرح مانگی ہوئی چیز برتی جاتی ہے۔ بڑی احتیاط سے... ٹوٹ نہ جائے... واپس کرنا ہوگی۔

کیا وہ کسی کو واپس کرنے کے لیے ہے۔

ممی کا رویّہ تو ہمیشہ مہمان دارانہ ہوتا تھا۔

"او' ڈارلنگ' او ڈیئر... جاؤ اب سو بھی جاؤ۔"

سوئٹی ذرا پرے ہٹو' میری ساڑھی کو گندے ہاتھ نہ لگاؤ۔"

" فلکو جانی... آج گھر میں کچھ آنٹیاں اور انکل آرہے ہیں۔ جان ڈرائنگ روم میں مت آنا۔ لوگ کہیں گے گندی بچّی ہے۔"

"ہائے سویٹ ہارٹ! تم نے اتنا قیمتی گلدان توڑ دیا۔ میں نے میونخ سے خریدا تھا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ آیا اسے پرے ہٹا۔ کہیں کانچ کا کوئی ٹکڑا اس کی ہتھیلی میں نہ لگ جائے... اور سارے ٹکڑے اٹھا کر باہر پھینک دو۔"

آخر وہ ایک تھپّڑ تو مجھے مار سکتی تھیں۔ ممی کو تھپّڑ مارنے کی بھی فرصت نہیں ہے۔

فلکی قیمتی سے قیمتی شے کا جان بوجھ کر نقصان کردیتی تھی۔ وہ ممی کو ستانا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی اس کی ای بھی ایسے چیخیں' چلّائیں جس طرح دوسرے بچّوں کی مائیں اپنے بچّوں پر چلّاتی تھیں... وہ فیشن بھی کرتی تھیں۔ انگریزی بھی بولتی تھیں۔ میک اپ بھی کرتی تھیں... پڑھی لکھی بھی تھیں... پھر بھی غصّہ آنے پر اپنے بچّوں پر خوب چلّایا کرتی تھیں اور چلّانے سے ایک دم وہ مائیں لگا کرتی تھیں۔ ممی تو کبھی نہیں چلّاتی تھیں۔ ممی کہتی تھیں' غصّہ کرنے سے اعصاب سکڑ جاتے ہیں... چہرے پر شکنیں پڑ جاتی ہیں۔ موڈ بھی خراب ہو جاتا ہے' جلد کی تازگی اور چہرے کی شگفتگی زائل ہو جاتی ہے اس لیے وہ غصّے کو زیادہ سے زیادہ دور رکھا کرتی تھیں۔ انھیں اپنے چہرے کا بہت خیال تھا۔ وہ ہر وقت مسکرایا کرتیں تاکہ تازہ دم نظر آئیں اور ان کی مسکراہٹ کے آگے ڈیڈی کچھ بھی نہ بول سکتے تھے۔

ممی رات کو سونے سے پہلے اپنے چہرے اور جسم پر مساج کیا کرتی تھیں۔ وہ فلکی کو پیار کرنا بھول جاتیں مگر مساج کرنا نہ بھولتی تھیں۔ وہ آیا کو حکم دیتی تھیں کہ بچّی کو سات بجے نہلا دیا کرے۔ کیونکہ سب ترقی پسند ملکوں میں بچّے سات بجے سو جایا کرتے ہیں۔ صبح اٹھ کر ممی نہار منہ ایک گلاس پانی میں لیموں کا رس ملا کر پیتی تھیں۔ سردیوں میں ایک چمچ شہد ملا لیتی تھیں۔ اس کے بعد وہ اپنی ایکسر سائیل پر بیٹھ کر ورزش کیا کرتیں۔ ان کے پاس ورزش کرنے کی بہت

سی مشینیں تھیں۔ کبھی ہاتھ اُلٹے چلاتیں' کبھی سیدھے۔ کبھی ٹانگیں اوپر کبھی نیچے.. دروازوں کے پیچھے چھپ کر ممی کے کرتب دیکھا کرتی تھی۔ ڈیڈی بیچارے اٹھ کر نوکرول کر دفتر چلے جاتے... ان کے جانے کے بعد ممی اپنے چہرے پر ایک ماسک لگا لیا کرتیں۔ با رولرز لگا لیتیں اور گرم پانی کے ٹب میں بیٹھ جاتیں۔ کبھی کبھی کافی بھی وہیں سِپ کرتیں۔

گیارہ بجے دن تک وہ بالکل تیار ہو جاتیں... کیونکہ ان کے حلقۂ احباب میں کہیں نہ "کافی پارٹی" یا "برج پارٹی" ہوتی تھی۔ جس دن ایسی کوئی پارٹی نہیں ہوتی تھی اس روز و سلیپ لیتی تھیں۔

شام کو جب ڈیڈی گھر آتے وہ نئے سِرے سے تیار ہوتیں۔ شام کو دونوں کلب جا اور ڈنر باہر ہی ہوتا تھا۔

کبھی کبھی اگر کسی نے آنا ہوتا تو وہ دونوں گھر رہ جاتے۔

ورنہ اس اتنے بڑے محل میں جس کا نام "فلک بوس" تھا فلکی باولوں کی طرح پھرتی ر چیزیں توڑتی رہتی... نوکروں کو مارتی رہتی۔

کہیں نہ کہیں سے چیخنے چلّانے کی آوازیں آتی رہتیں... اور نہیں تو ہر کمرے میں جا کر اونچی آواز میں لگا لیتی۔

اور جب ممی ملک سے باہر چلی جاتیں... اور اس گھر کے شب و روز اور بھی بے ہو جاتے۔ ممی کے دَم سے پھر بھی کچھ بہار تھی۔ یہاں کچھ لوگ آتے رہتے... جاتے ر آوازیں آتی رہتیں.... فون آتے رہتے... شاپنگ ہوتی رہتی.. ممی کو خوب صورت ملبوسا بھی شوق تھا۔

ممی کو ہر شے کی ہوس تھی... سوائے اولاد کے... اور ایک بیٹی کی ماں بننے کے بعد ا نے جیسے ڈیڈی کی سات پشتوں پر احسان کر دیا تھا۔

سارا وقت کہتیں "دیکھو' میری کمر میں دو انچ کا فرق پڑ گیا ہے۔"

"کہاں....؟" ڈیڈی ان کی کمر میں بازو حمائل کر کے کہتے۔ "ابھی تک تو تمہاری کمر ا ایک ہی ہاتھ میں آجاتی ہے۔ تم تو اس دنیا کی لاجواب عورت ہو۔"

اس پر ممی بہت اِترا جاتیں۔

ویسے ممی کا دل چاہتا تھا۔ دنیا کے سارے مرد بس ہر وقت ان ہی کی تعریف کرتے ر اگر شاعر ہوں تو وہ ان کے قصیدے لکھتے رہیں۔ اگر ادیب ہوں تو ان پر کتابیں لکھتے رہیں،

ر ہوں تو ان کی صورت بناتے رہیں۔ اگر موسیقار ہوں تو ان کی مدح سرائی میں راگ تے رہیں۔ ممی چاہتی تھیں' ان کے حلقۂ احباب میں ہر شخص ان کا دیوانہ ہو۔ ان کا تذکرہ ا ہر زبان پر ہو... اور پھر ان کے روبرو اس کا اظہار بھی کیا جائے۔ ان کے دوست و احباب ں اس کمزوری سے واقف تھے' اس لیے ممی کی تعریف کرنا نہیں بھولتے تھے۔ ممی حَسین ،۔ طرح دار تھیں.... دولت مند تھیں مگر ذہانت کا کونہ بالکل خالی تھا اور وہ اس وقت بڑی ۔ خیز لگتیں' جب انٹلیکچوئل بننے کی کوشش کرتیں۔ اپنے آپ کو فن کار ظاہر کرنے کے وہ انتہائی بے ہودہ پینٹنگز مہنگے داموں خرید لیتیں۔ شاعروں' ادیبوں کے جلسے کرواتیں' قی بھری پارٹیاں دیا کرتیں۔ مصوّروں کی تصویروں کا افتتاح کرتیں دل کھول کر چندہ ،۔ دل کھول کر خرچ کرتیں۔ جہاں ان کا نام ہو رہا ہو' اسی طرف کو اُلٹ جاتیں۔

یسے لوگوں نے ان کا نام سدا بہار رکھ چھوڑا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا جسم اور سدا بہار تھا۔ اس قدر دھیان رکھتی تھیں وہ اپنا...

ہت عرصہ تک وہ اکیس بائیس سال کی ہی نظر آتی رہیں۔ اس میں ان کی کوششوں کا بھی دخل تھا۔

فلکی بڑی ہو گئی مگر اس کے ساتھ ہمیشہ ایک آیا رہتی تھی۔ آیا کے جانے کے بعد ممی کو بہت ۔ ہوتی تھی۔ اس واسطے وہ آیا کے بہت نخرے اٹھاتی تھیں۔ ایک آیا کے جانے سے پہلے سری آیا کا بندوبست کر دیتی تھیں... وہ جمبوجٹ میں بیٹھ کر ساری دنیا کا سفر تو کر سکتی تھیں پی بچی کو پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں سنبھال سکتی تھیں۔

رفتہ رفتہ فلکی نے اسکول جانا شروع کر دیا۔ وہی کار' شوفر اور آیا اس کے ساتھ اسکول ۔ اسکول میں وہ کوئی خاص اچھی بچی نہیں تھی۔ بچوں پر ویسے ہی اس کی موٹر کا رعب پڑ تھا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے۔ جب فلکی نو سال کی تھی اور چوتھی جماعت میں پڑھتی تھی۔ فلکی ا کا داماد مر گیا اور اس کو اچانک چھٹی لے کر جانا پڑا۔ گو ممی نے کہہ دیا تھا کہ وہ دو دن کے ضرور واپس آجائے مگر وہ واپس نہ آسکی۔ اس کا خط آگیا کہ "داماد کے مرنے سے اس کی بیٹی اغ الٹ گیا ہے اور جب تک اس کی بیٹی ٹھیک نہیں ہو جاتی' وہ نہ آسکے گی۔"

می عجیب سی الجھن میں گرفتار ہو گئیں۔ "کم بخت نے نہ تو آنے کے بارے میں صحیح بتایا تھا ، نوکری چھوڑنے کے متعلق صاف الفاظ میں کچھ لکھا تھا۔" تاہم انھوں نے دو چار دن

انتظار کرکے اِدھر اُدھر دوسری آیا کے لیے کہنا شروع کیا۔

انھی دنوں انھوں نے نیا اور نوجوان ملازم رکھا تھا جو ممی کے کپڑے استری کرتا
برتن لگاتا تھا اور باقی سارا بیروں والا کام کرتا تھا۔ فلکی کو صبح صبح آیا سے تیار ہونے
تھی۔ صبح صبح خوب چِلّایا کرتی تھی، اس سے ممی کی نیند خراب ہوتی تھی کیونکہ ممی را
ایک بجے سوتی تھیں اور نہیں چاہتی تھیں کہ انھیں ڈسٹرب کیا جائے۔

انھوں نے شیر خان کی ڈیوٹی فلکی کے کمرے میں لگا دی۔ فلکی کو جانے کیوں شیر
نہیں لگتا تھا۔ وہ اس طرح فلکی کو دیکھتا کہ فلکی کو ایکدم غصہ آجاتا۔ اسے شیر خان
بری لگتیں تھیں مگر چِلّانا فضول تھا۔ ممی نے فلکی کے سارے چھوٹے چھوٹے کام اسی
لگا دیے تھے۔

اس رات کلب میں نیو ایئر پارٹی تھی۔ ڈیڈی کو اچانک ایک کاروباری میٹنگ
کراچی جانا پڑ گیا تھا۔ گو وہ ممی سے بہت معذرتیں کرتے گئے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ا
وعدہ بھی کیا تھا کہ شام تک لَوٹنے کی کوشش کریں گے مگر انھوں نے ممی سے کہہ د
انتظار میں اپنی پارٹی برباد نہ کریں۔ اگر ڈیڈی واپس آگئے تو خود ہی کلب پہنچ جائیں گے
اس پارٹی کے لیے ممی نے نہایت شاندار ساڑھی منگوائی تھی۔ نیو یارک سے وہ
کوٹ لائی تھیں۔ دوپہر کے کئی گھنٹے انھوں نے بیوٹی ٹریٹ منٹ میں صرف کیے تھے ا
چھ بجے وہ جب نئی طرز کے بال کٹوا کر گھر میں داخل ہوئیں تو فلکی مچلنے لگی۔ اس کی
نے بتا دیا تھا کہ آج پھر ممی رات بھر کے لیے باہر جانے والی ہیں۔ شیر خان نے ج
ساڑھی استری کرکے پلنگ پر پھیلائی تو فلکی نے سارا غصہ اس ساڑھی پر نکالا۔ ا
ہاتھوں سے مسل مسل دیا۔ اس پر ممی نے پہلی بار اس کے بال نوچے اور برا بھلا کہا۔
دھمکایا بھی۔ ممی تیار ہوتی رہیں اور فلکی سسک سسک کر روتی رہی۔ ممی کریمیں لگا
اتارتی رہیں... فلکی اپنی بھیگی آنکھوں سے انھیں دیکھتی رہی۔

اس نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ وہ ممی کو آج جانے نہ دے گی یا خود ان کے ساتھ
گی۔ ممی نے میک اپ کرنے میں اتنی دیر لگائی کہ روتی روتی فلکی سسک سسک کر ا
پر ہی سو گئی۔

ممی نے جب تیار ہو کر اس کی جانب مڑ کر دیکھا تو اطمینان کی سانس لی۔ بالآخر
تھی۔ ٹھیک آٹھ بجے پارٹی شروع ہونا تھی اور پونے آٹھ بجے ممی گھر سے نکل پڑیں

انھوں نے شیر خان سے کہا۔
شیر خان! بے بی کو میرے کمرے سے اٹھا کر اس کے کمرے میں لٹا دو، اس کا ہیٹر آن کر دینا
بے بی کو کمبل اچھی طرح اوڑھا دینا۔ میرے آنے تک تم بے بی کے کمرے میں رہو۔ نیند
آئے تو وہیں قالین پر سو جانا...
اور ہاں... اگر صاحب آجائیں تو انھیں کلب بھیج دینا۔"

"بہت اچھا حضور۔" یہ کہہ کر شیر خان نے تابعداری سے سر جھکا دیا۔

موٹر گیٹ سے باہر نکل گئی۔ پھر چوکیدار نے گیٹ بند کر لیا۔ شیر خان بیگم صاحبہ کے کمرے
آگیا۔ کمرے میں بے شمار خوشبوئیں پھیلی ہوئی تھیں۔ جیسے ابھی دلہن یہاں سے تیار ہو کر
ہو۔ اس نے اس خوشبو میں ایک مستی بھرا سانس لیا۔ پھر صاحب کی دراز سے ولایتی
یٹ نکالے، لائٹر اٹھایا۔ ایک سگریٹ سلگایا اور لمبے لمبے کش لینے لگا۔ سگریٹ پینے کے بعد،
نے بیگم صاحبہ کی بکھری ہوئی چیزیں سمیٹیں ان کے کپڑے اٹھائے۔ نائٹی اور پاجامہ نکال کر
پر لٹکا دیا۔ کمرے کو بالکل ٹھیک ٹھاک کر دیا۔

پھر ٹی وی لگا کر ایک طرف بیٹھ رہا۔

ٹی وی دیکھ کر جب اس کا دل بھر گیا اور انگریزی فلم میں اسے سوائے ننگی ٹانگوں کے اور کچھ
ر نہیں آیا تو اس نے ٹی وی بند کر دیا۔ دس بجنے والے تھے لیکن صاحب ابھی نہیں آئے تھے۔
اٹھ کر فلکی کے کمرے میں گیا۔ وہاں اس کا ہیٹر آن کیا۔ بستر ٹھیک سے لگایا۔ اس کے بکھرے
ئے کھلونے جمع کر کے الماری میں رکھے۔ بے بی نے رات کے کپڑے بھی نہیں بدلے تھے
ر اگر بیگم صاحبہ نے صبح ناشتے پر اسے رات کے کپڑوں میں دیکھ لیا تو قیامت برپا کر دیں گی۔

اس نے بے بی کی نائٹی نکالی اور پلنگ پر رکھ دی۔ روز ہی وہ اس کو کپڑے بدلوایا کرتا تھا۔
ج سوتے میں بدلوا دے گا۔ بس ذرا سا مچلے گی۔

یہ سوچ کر وہ پھر بیگم صاحبہ کے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں کیسٹ ریکارڈ پڑا تھا۔ ذرا گانے سننے
ی چاہا... وہ لگا دیا... دو چار اور سگریٹ پیے۔

گیارہ بج گئے۔ اب تو صاحب کے آنے کی بالکل امید نہیں تھی۔ اس نے فلکی کو اٹھایا اور
س کے کمرے میں لے آیا۔

فلکی کے رخساروں پر ابھی تک آنسوؤں کے داغ تھے۔ سوتے میں ایسا منہ بنایا ہوا تھا جیسے
اری دنیا سے رُوٹھ چکی ہو۔ ماشاء اللہ صحت مند بچی تھی۔ ایک گبھرو نوجوان سے اٹھائی

نہیں جارہی تھی۔ کہنے کو نو سال کی تھی۔ مگر اٹھان سے بارہ سال کی لگتی تھی۔ ا
خوب صورت' سڈول ٹانگیں... صحت مند گول چہرہ' آنکھوں میں ظالم چمک' ہونٹ
وہ کاٹ کاٹ کر اور سرخ کردیتی تھی۔ سوتے میں اور وزنی ہوگئی تھی اور جانے کہ
سے شیر خان اسے اٹھا کر لایا تھا۔ دھپ سے بستر پر پٹخ دیا۔

سالی جتنی ضدی ہے اتنی بھاری بھی ہے... مگر نرم بھی ہے... ڈبل روٹی کی طرح۔

شیر خان نے بستر پر بے سدھ کری ہوئی لگی کو دیکھا۔ سنہری بال بکھر گئے تھے۔ او
چہرہ چھپ گیا تھا۔ فراک ٹانگوں سے اوپر ہوگیا تھا۔ ایک ٹانگ بند تھی... اور ایک
پھولوں والا جانگیہ ٹانگوں کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ لمبی لمبی جرابیں اس کی پنڈلیوں تک ا
تھیں۔ سانسوں میں سے کچے دودھ کی مہک آرہی تھی۔

شیر خان نے جلدی سے اس کے موزے کھولے... بُوٹ اتارے اور پھر جرابیں
لگا۔ جرابیں اتارتے وقت وہ اس کی ٹانگوں پر ہاتھ پھیرتا جارہا تھا۔ ملائم گداز ٹانگیں
ہوگئیں۔

شیر خاں نے اٹھ کر باہر دیکھا۔ باہر کوئی نہ تھا۔ اس نے جاکر انٹرنس کا دروازہ اندر
کردیا۔

پھر ٹائی اٹھالایا تاکہ بے بی کو بدلوادے۔

بڑی ہی مشکل اور کش مکش کے بعد اس نے لگی کا فراک اتار دیا۔ وہ سوتے میں
رہی۔ کبھی ہاتھ چھڑا لیتی۔ کبھی گردن پھنسا لیتی... کبھی اس کے منہ کو نوچ لیتی... تھی
زبردست طاقت رکھتی تھی۔ یہ بچی ہے' یہ تو آفت' قیامت ہے۔ گلابی گلابی گوشت کی
ملائمتیں بستر پر بکھری ہوئی تھیں۔

رات سنسان اور خاموش ہوچکی تھی۔ گیٹ کا پہرے دار اپنے کیبن میں جا بیٹھا تھا
صاحبہ اپنے ایک غیر ملکی مہمان کی بانہوں میں بانہیں ڈالے رقص کا دوسرا دور مکمل
تھیں۔

جب لگی کی دلخراش چیخوں نے محل کے در و دیوار ہلا دیے...

شیر خاں نے لگی کے منہ پر اتنے زور سے ہاتھ رکھا کہ اس کی سانس رک گئی اور
ہوش ہوگئی۔

تین بجے شب ممی جھومتی جھامتی' پرس جھلاتی گھر میں داخل ہوئیں۔ باہر چوکیدار نے گیٹ
ول کر انھیں سلیوٹ مارا تھا۔ ڈرائیور نے گاڑی کا دروازہ کھول کر انھیں نہایت تکریم سے
رنکالا تھا۔

"اب تم جاکر آرام کرو۔"

"نہایت شاہانہ انداز میں ان پر لطف و عنایات کی بارش کرکے جب ممی نے انٹرنس کے
دازے کو ہاتھ لگایا تو وہ خود بخود کھل گیا۔

لاؤنج میں کھڑے ہوکر انھوں نے شیر خان کو دو تین آوازیں دیں۔ جب اس نے کوئی
اب نہیں دیا تو وہ تک تک کرتی اور گنگناتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔ کمرہ اپنے
ول کے مطابق بالکل ٹھیک تھا۔ ہوٹلوں کی طرح بستر پر سفید چادروں کے ساتھ کمبل لگے
ے۔ ان کی گلابی نائٹی اور پاجامہ ہینگر پر لٹک رہا تھا۔ گلابی سوفٹ سلیپر بیڈ کے ساتھ پڑے تھے۔
ینک ٹیبل صاف ہوچکی تھی۔ اس کا مطلب ہے شیر خان نے بی بی کو اپنے کمرے میں بُلا
...ویری گڈ...

آج کس غضب کی پارٹی تھی۔ یوں تو ڈیڈی کبھی بھی ممی کے کسی مشغلے میں حائل نہیں
تے تھے مگر ان کی موجودگی میں خود ممی کو ہی خیال آجاتا تھا۔

آج انھوں نے جی کھول کر اپنے حسن اور جسم کی داد لی تھی۔ پارٹی خوب انجوائے کی تھی۔
ت خوش تھیں... بے حد مسرور...!

حد درجہ تھک چکی تھیں۔

کپڑے بدلتے ہی بستر میں گھس گئیں۔ گرم گرم بستر میں بڑا سکون ملا۔ اسی وقت انھیں لگی
خیال آیا۔ رو رو کر سو گئی تھی' جانے اب کیسی ہوگی؟ شیر خان بھی نہیں آیا تھا۔ وہ کم بخت
ں سو گیا ہوگا۔ اٹھ کر ایک نظر بچی کو دیکھ لیں تو اچھا ہے۔

جی تو نہیں چاہ رہا تھا۔ نہ ان کی عادت میں یہ شامل تھا کہ رات کو اٹھ کر بچی کو دیکھ جیسے کسی غیبی قوت نے انھیں اٹھ کر جانے پر مجبور کردیا۔

فلکی کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔

اندر داخل ہوگئیں تو ان کی چیخ نکل گئی۔

خون میں لتھڑی ہوئی فلکی کو دیکھ کر انھیں فوراً یہی خیال گزرا کہ ان کی فلکی مرچکی ذرا حواس بجا کر کے قریب گئیں۔ ماتھا چھوا... نبض دیکھی تو صورتِ حال کچھ کچھ کھلی حواس باختہ تھیں' اتنی ہی ہوشیار بننے کی کوشش بھی کررہی تھیں۔

اس وقت صبح کے چار بج رہے تھے اور ڈیڈی کے آنے سے پہلے ہر معاملہ ٹھیک چاہیے تھا۔ انھوں نے اسی وقت اپنی ایک ڈاکٹر سہیلی کو فون کرکے بلایا۔ فلکی کو اٹھا کمرے میں لے گئیں۔

شیر خان کیوں غائب ہوگیا؟ یہ بات ممی کی سمجھ میں آگئی تھی۔ انھوں نے باقی تو کرو روبرو اس بات کو کوئی زیادہ اہمیت نہ دی۔ انھیں خوشی تھی کہ اس رات گھر میں اور کو نہیں تھا۔ آیا بھی نہیں تھی اور ڈیڈی بھی نہیں تھے۔ ڈیڈی اتفاق سے دو دن بعد آئے۔

فلکی اسی طرح بیمار تھی اور ممی کے کمرے میں لیٹی رہا کرتی تھی۔ ممی زیادہ تر اسے س دوا دے کر سلا دیا کرتی تھیں مگر جب وہ جاگتی تو چیخنے چلّانے لگتی۔

وہ اپنے کپڑے پھاڑتی اور چیخ کر کہتی۔

"مجھے بچاؤ.... مجھے بچاؤ... ممی مجھے بچاؤ...."

"ممی اسے کہہ دو' مجھے نہ چھوئے۔"

"ممی' مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"ممی' مجھے اپنے پاس سُلالو۔"

ڈیڈی اس کی اس حالت سے پریشان ہوگئے تو ممی نے انھیں سمجھا دیا۔

"آیا کے ساتھ بہت بلی ہوئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد اداس ہوگئی ہے۔ ایک سوتے میں ڈر گئی تھی اس لیے میں اسے اپنے کمرے میں لے آئی ہوں.... آہستہ آہستہ ہو جائے گی۔"

"تم اس کے لیے جلدی کسی آیا کا بندوبست کرو نا۔"

"دیکھ رہی ہوں۔ اب اس زمانے میں بغیر سوچے سمجھے نوکر نہیں رکھے جاسکتے۔"

"اور وہ کم بخت شیر خان کیوں بھاگ گیا۔ کچھ پتہ چلا... گھر کی دیکھ بھال کرتیں۔ کہیں کوئی چیز تو خراب نہ بھاگ گیا ہو۔"

"میں نے سب کچھ دیکھ لیا ہے۔" ممی سوچتے ہوئے کہتیں۔ کم بخت کو جانا تھا' چلا گیا۔"

حالانکہ ممی جانتی تھیں کہ وہ اس گھر کی سب سے قیمتی چیز خراب بھاگ گیا ہے... لیکن فلکی ستہ آہستہ ٹھیک ہونے کے بجائے اور خراب ہوتی گئی۔

اس نے کھیل کُود میں حصّہ لینا چھوڑ دیا۔

وہ اسکول جانے سے گھبراتی' جب کسی نئے آدمی کو دیکھتی' چلّانے لگتی۔ اپنے کمرے میں ل نہ بیٹھتی۔ اگر کوئی پاس سے بھی گزر جاتا تو چلّانے لگتی۔ کوئی بلا کر پیار کرنے لگتا تو اس کے نوچ لیتی۔ سارا وقت چپ چاپ بیٹھی خلا میں گھورتی رہتی۔ رنگ مُرجھا کر زرد ہوگیا تھا۔ ادہ تر ممی کے کمرے میں سہمی رہتی۔ بات بات میں روتی کسی سے بات نہ کرتی اور خاص طور لوکروں کے تو قریب ہی نہ جاتی۔ اس کی آنکھوں میں جیسے کوئی ہیبت ناک واقعہ آکر ٹھہر گیا تھا ں لیے اس کی خوب صورت آنکھیں وحشت زدہ ہوگئی تھیں۔ پھٹی پھٹی اور دیوانہ سی بھیں... ڈیڈی کہتے۔

"یہ بیٹھی خلاؤں میں کیا دیکھا کرتی ہے کہ آنکھیں جھپکنا بھی بھول جاتی ہے۔"

ممی کہتیں۔

"بچّوں پر مختلف سنیچر آتی ہیں۔ ان کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔"

ممی اسے باقاعدہ ماہرِ نفسیات کے پاس لے جایا کرتیں۔ اس کو پھر ایک نارمل بچّی بنانے پر روپیہ پانی کی طرح بہا رہی تھیں بلکہ اپنی طبیعت کے خلاف اسے زیادہ تر اپنے ساتھ بھی رکھتی تھیں۔ مگر اس کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

ڈر پوک تو اس قدر ہوگئی تھی کہ بلّی بھی قریب سے گزر جاتی تو ڈر کر چلّانے لگتی۔ سکول کی استانیاں شکایتیں لکھ کر بھیجا کرتیں کہ یہ وہ بچّی نہیں' خوش باش' خوش لباس' اور Aggressive ہر وقت ڈری سہمی ایک کونے میں بیٹھی رہتی۔ چھٹی کے وقت روڈ کراس گاڑی میں آبیٹھتی۔ اگر ڈرائیور بازو سے پکڑ کر اتارنے لگتا تو چلّانے لگتی۔ کہتی:

"اس نے مجھے چھوا کیوں ہے؟"

شام کو ممی گھمانے کے لیے لے جاتیں تو وہ کار کے شیشے چڑھا لیتی۔ کوئی فقیر بھی شیشے پر دستک دیتا تو چیخنے لگتی۔

بار بار خواب میں ڈر جاتی۔ مہینے میں ایک بار بخار آجاتا۔

نتیجۃً وہ اپنی کلاس میں فیل ہوگئی۔ سکول سے بددل ہوگئی۔ انسانوں سے منہ موا
الماریوں کے پیچھے چھپ چھپ کر بیٹھی رہتی۔ موسم بہار میں ممی اسے اپنے ساتھ یور
گئیں۔ اس بار ممی نے یہ ٹرپ فلکی کے لیے پلین کیا تھا۔

بچے فرشتے ہوتے ہیں اور فرشتوں کی روح داغدار کردی جائے تو ان کے پنکھ ٹوٹ
ہیں۔

فلکی کے پنکھ ٹوٹ گئے تھے۔

وہاں کوئی حجاب نہ تھا اور وہاں ایسے واقعات اکثر سننے میں آتے تھے۔

ڈاکٹروں نے ممی کو مشورہ دیا کہ کچھ عرصہ فلکی کو اپنے گھر اور اپنے ماحول سے دو
جائے۔ اور ہر ممکن کوشش کی جائے کہ وہ اپنی زندگی کا یہ دلخراش واقعہ بھول جائے۔ بچے
ذہن میں گرہ پڑ جاتی ہے اور آپ لوگ ذرا جذباتی قسم کے ہوتے ہیں۔ اس واقعے کو زیادہ
نہ دیں اور یوں اظہار کریں جیسے کوئی خاص بات رونما نہیں ہوئی۔

ممی نے وہ ایک سال ملک سے باہر گزارا۔ فلکی کو خوب سیریں کرائیں۔ خوب
دکھائیں۔ سمندر پر بھی لے جایا کرتیں۔ کاسٹیوم پہن کر خود بھی نہایا کرتیں اور اسے
طریقے طریقے سے بتاتیں کہ عورت چونکہ خوب صورت چیز ہے اس لیے اس کا بے نقاب
بے حجاب ہو جانا ہی بہتر ہے۔

گو فلکی کا معصوم اور کچا ذہن ممی کا فلسفہ نہیں سمجھ سکتا تھا مگر اس کا دل بہلتا جا
دنیائے رنگ و بُو میں' وہ اپنی مسلی ہوئی صورت بھولتی جارہی تھی۔ ممی اس کے چہ
مسکراہٹوں کی نئی لَو دیکھ کر پھولی نہ سماتی تھیں۔

پورے ڈیڑھ سال بعد ممی واپس آئیں تو فلکی پہلے سے زیادہ تنومند اور بڑی لگتی تھی
کے لمبے سنہرے بال اس کے گلے میں جھول رہے تھے اور وہ آسٹریلیا کے ساحلوں کی خوش
اور خوش ادا بے فکری سی حسینہ لگتی۔

واپس آکر ممی نے اسے ایک نئے اسکول میں داخل کردیا۔ نئی لڑکیاں' نیا ماحول
اسکول... اور اسکول بھی امریکن تھا۔ فلکی کا دل لگ گیا۔ ویسے ممی نے ایک اور کام بھی کیا
شام کو فلکی کو باقاعدہ کلب لے جاتیں۔

وہاں سب لوگ اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے۔ ایک تو نازلی صدرالدین کی بیٹی... اس پر اتنی

صورت اور شوخ...

کبھی ڈیڈی گولف کھیلتے رہتے اور وہ اپنے سنہرے بال جھلاتی گیند کے پیچھے دور دور تک جاتی۔

کبھی ممی کارڈز کھیلتی رہتیں اور وہ ممی کے دوستوں کے کندھوں پر... یا گھٹنوں پر سوار رہتی۔

اس کلب میں گھوڑ سواری کا بھی بندوبست تھا۔ شام کو باقاعدہ ایک سائیس اسے گھوڑ سواری کرانے لے جاتا۔ کبھی کبھی ممی کسی انکل کو ساتھ کردیتیں۔

اس کلب میں بے شمار انکل اور بے شمار آنٹیاں تھیں۔ کلب کی دنیا فلکی کو بہت پسند آئی۔ کوئی کسی بات کو برا یا معیوب نہیں سمجھتا تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ کلب خوش باش اور خوش فکروں کی ایک البیلی دنیا ہے۔

ممی کسی انکل سے کہہ دیتیں۔

"بھئی ذرا بے بی کو ڈانس سکھا دو۔"

کسی سے کہتیں۔

"اسے وائلن بجانا سکھا دو۔"

کوئی انکل اسے گاڑی چلانا سکھاتا۔

کوئی کیرم بورڈ کے داؤ پیچ سکھاتا۔

کوئی کوک پلانے لے جاتا۔

بے شمار انکلوں کی گودیوں میں ہنستی کھیلتی فلکی جوان ہوگئی تھی۔

اس نے آنکھ ہی کلب میں کھولی تھی۔ میٹرک کرتے ہی کالج میں داخل ہوگئی۔

مگر دوسری سب لڑکیوں سے مختلف رہی۔

ممی نے اس کے ذہن میں ڈال دیا تھا کہ

عصمت کا تصور ایک فرسودہ روایت ہے۔ عصمت کوئی شے نہیں ہوتی۔ زندگی کی بہت سی خوشیاں حاصل کرنے کے لیے اس حد کو جلد توڑ دینا چاہیے۔ اتنا کچھ حاصل کرنے کے لیے کچھ تھوڑا بہت گنوانا بھی پڑتا ہے۔ اس روشن زمانے کے ساتھ چلنے کے لیے روشنی کو اپنے ساتھ لے کر چلنا چاہیے۔ اندھیرے پیچھے چھوڑنے چاہئیں۔

فرسودہ روایات...

فرسودہ تصورات...

سنی سنائی باتیں' ممی نے اسے ان سب سے نفرت کرنا سکھایا تھا۔ انھوں نے بچپن کا داغ دھونے کے لیے فلکی کا سارا فلسفۂ حیات ہی بدل دیا تھا۔

"محبت کرو اور محبت کراؤ۔"

"امنگوں کے ساتھ جیو۔"

"جس چیز سے جی بھر جائے اسے چھوڑ دو۔"

"اس کے لیے اپنی زندگی دوبھر نہ کرو۔"

یہ ممی کے اصول تھے۔ ممی کے کئی دوست فلکی کو بہت پسند کرتے تھے۔ انھوں نے و سے بہت پہلے فلکی کو بتا دیا تھا کہ وہ کون سی قیامت اٹھانے والی ہے۔ کئی لوگ تو ممی کے سا ہی اس سے اظہارِ عشق کرتے مگر کبھی ممی نے برا نہیں مانا بلکہ جب لوگ کہتے۔

"سسز صدرالدین! ہمیں تو ابھی تک سمجھ نہیں آئی۔ آپ دونوں میں سے کون زیادہ حَ ہے؟"

تو نازلی صدرالدین بڑی ادا سے قہقہہ لگاتیں۔ انھیں یقین تھا وہ ہمیشہ فلکی سے زیادہ حَ اور طرحدار رہیں گی۔ اس لیے وہ فلکی سے حسد محسوس نہیں کرتی تھیں۔ کالج میں بھی فلکِ بہت آزاد قسم کا ماحول ملا۔ ایک موٹر' بے شمار ملبوسات' فالتو پیسے' پارٹیاں' دوستیں' فلمیں بوائے فرینڈز۔

زیادہ سے زیادہ لڑکوں کو اپنے عشق میں مبتلا کرنا اور تڑپانا فلکی کا محبوب مشغلہ بن چکا تھا۔ جب ممی نے کوئی روک ٹوک ہی نہ رکھی اور صاف کہہ دیا کہ عصمت کوئی چیز نہیں تو پھر اپنے سلگتے جذبات کے منہ پر ہاتھ کیوں رکھتی؟ انگریزی ناولوں اور انگریزی فلموں نے سونے سہاگے کا کام کیا۔

تن کی دولت لٹاتے ہوئے اسے کبھی دکھ نہ ہوا اور من کی آنکھیں کھول کر دیکھنے کی ا آرزو نہ تھی۔

وہ حسین تھی...

جوان تھی...

دولت مند تھی...

لائف انجوائے کرنے کے لیے تھی اور ممی نے کہا تھا' جوانی کے درخت پر بار بار ثمر آتا اور بار بار اس سے لطف اندوز ہونا چاہیے۔

یوں...

لاعلمی میں...

جہالت میں...

یا بے محابا آزادی کے نشے میں...

وہ ہوتا رہا جو نہ ہونا تھا...

اسے کیا پتہ تھا' محبت کیا شے ہے؟ شوہر کسے کہتے ہیں؟ شادی کا پھندا کیوں بنایا گیا ہے؟

شادی کا مقصد کیا ہے؟

گھربار کسے کہتے ہیں؟

بچے کیوں ضروری ہیں؟

اور یہ گھرداری...!

اور یہ آگہی... ادراک... عرفان...

یہ سب... سارے راز اس پر "رازداں" میں آکر کھلے... "رازداں" نے اسے زندگی کی آگہی دی... تو پھر اس کے لاشعور کے بند روزن خود بخود کھل گئے۔

یہاں وہ تنہا رہتی تھی اور سوچتی تھی۔

تنہائی میں ذہن ایک ایسی مشعل بن جاتا ہے جس کی روشنی دور تک جاتی ہے۔ جہاں جہاں وہ اس روشنی کو ڈالتی' واقعات چھپے ہوئے ملتے۔ وہ انھیں کریدتی' آگے بڑھ جاتی۔

اس نے اپنے بارے میں اس قدر سوچ لیا تھا کہ اس کے ذہن میں اس کی گزشتہ زندگی کی ایک مربوط کہانی بن گئی تھی۔ تب اسے اپنا آپ بڑا گھٹیا اور پست نظر آنے لگا تھا۔ آفاق ایک عظیم دیوتا نظر آتا... اور وہ ایک حقیر ذرّہ... پاؤں کی جوتی... شاید وہ سب کچھ اپنے دل میں رکھتی...

مگر ایک دن...

ایک تیز ہوا کا جھونکا آیا...

ساتھ بہت سی خوشبو لایا...

اس جھونکے نے پَرے سے ایک نیا دروازہ کھولا۔

اسے آواز آئی۔

جن کو عزیز جانتے ہیں... جن کے آگے سجدے کرتے ہیں۔ جن کو اپنا دین و ایمان سمجھتے

ہیں۔ ان سے کچھ نہیں چھپاتے۔ داغ داغ دل اور تار تار دامن ان کے آگے پھیلا دیتے ہ
ان سے رحم کی بھیک نہیں مانگتے... ان کے فیصلے پر اپنی زندگی کا رخ موڑ لیتے ہیں...

یہ تو ضرور ہے کہ وہ آفاق کے قابل نہیں تھی مگر آفاق کا دل کتنا عظیم تھا... یہ جانے بہت ضرورت تھی۔

اور پھر محبت میں حاصل کرنا ہی معراج نہیں ہے۔ اپنے ہاتھوں لُٹ جانا بھی ایک ہ ہے۔ خدا سے کوئی پردہ نہیں... پھر ناخدا سے پردہ کیوں ہو۔

جب خدا کے آگے گناہوں کا اعتراف کرلیتے ہیں تو پھر ناخدا کے آگے لغزشوں کا اعترا کیوں نہ کیا جائے؟

پہلی بار ٹھوکر کیا کھائی تھی؟
پہلی بار وہ کہاں گری تھی؟
پہلی چوٹ کا ردِ عمل کیا تھا؟

آخر ایک دن اسے سِرا مل ہی گیا... اور پھر اس نے من و عن سب کچھ آفاق کو بتا دیا ایک ایک بات... ایک ایک لفظ...

جب اس کی بات ختم ہوئی تو صبح کی اذان ہو رہی تھی۔

آفاق اپنی سُوجی سُوجی آنکھوں سے اس کے روتے روتے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ اسے ا بالکل نئی اور بدلی بدلی سی لڑکی لگ رہی تھی۔

آج اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس بدلی ہوئی لڑکی کو وہ اپنے کلیجے سے لگا لے... مگر... وہ ا بستر سے اٹھ کھڑا ہوا اور آکر اس کے پلنگ پر بیٹھ گیا اور بولا....

"آپ نے کبھی نماز پڑھی ہے؟"

حیرت سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے فلکی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"نماز پڑھنے سے بھی اتنا سکون ملتا ہے' جتنا گناہوں کا اعتراف کرنے سے۔"

"مگر میں نے تو کبھی نماز نہیں پڑھی... اب اللہ میاں کیا کہیں گے؟"

"اللہ میاں کچھ نہیں کہتے... اللہ کا دَر ہمیشہ کُھلا رہتا ہے.. وہ کبھی اپنے بندوں سے مایو نہیں ہوتا... اور چاہتا ہے بندے اس کو پکاریں۔ نماز آتی ہے؟"

"جی...!" اس نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

"اٹھیے' آج میرے ساتھ نماز پڑھیے۔"

فلکی جب وضو کر کے لاؤنج میں آئی تو سنہری اور کاسنی پَو پھٹ رہی تھی۔ آسمان کے سُرمئی کناروں سے پُرنور بادل چھٹتے اور بکھرتے جا رہے تھے۔

تب یکایک اس کے دل میں درد سا ہونے لگا۔

"کیا.. کیا.. خدا اس نورانی صبح میں پوشیدہ ہے۔ کیا... کیا... خدا یہیں آس پاس ہے.. دل میں ہے... کہاں ہے...؟"

فبای الاء ربکما تکذبن"

جب فلکی نماز پڑھ کے لاؤنج میں آئی تو آفاق کے کمرے سے تلاوت کی بڑی دلسوز آواز آ رہی تھی۔

فلکی کی آنکھ کھلی تو اس نے اِردگرد دیکھا اور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ دوپہر کا سماں تھا۔ دھوپ صحن کو پار کر گئی تھی۔ دن بھی معمول کے مطابق معروف سا دکھائی دے رہا تھا... مگر ابھی تک سو رہی تھی بلکہ ابھی ابھی اٹھی تھی۔ وہ جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ اپنے کمرے میں بجائے ٹی وی لاؤنج میں سو رہی تھی۔

لاؤنج میں وہ کیسے پہنچ گئی... کیا رات پھر کوئی لڑائی ہوئی تھی؟

نظر اِدھر اُدھر گھمانے لگی تو اس کی نظر سرہانے پر پڑی جائے نماز پر ٹک گئی۔ جسے اس نے خود ہی تہ کر کے سرہانے کی طرف رکھ دیا تھا۔

تب... سب کچھ اسے یاد آگیا۔

علی الصباح اس نے یہاں نماز پڑھی تھی۔

شاید اس نے زندگی میں پہلی بار نماز پڑھی تھی۔

یا غالباً" اس طرح پہلی بار پڑھی تھی... خشوع و خضوع کے ساتھ... سر تا پا التجا بن کے خطاکار بن کے... معافی کی خواستگار بن کے۔

اور اسے نماز پڑھنے میں لطف بھی آیا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا... وہ شے' جو بندے کو دے سکتے' اللہ کے ہاں مل جاتی ہے۔

دل کو سکون ملا تھا۔ روح ہلکی پھلکی ہوگئی تھی۔

ہوسٹل میں لڑکیوں کی دیکھا دیکھی' کبھی کبھار وہ نماز پڑھ لیتی تھی۔ نماز اس نے کلب کے ساتھ والی مسجد کے مولوی صاحب سے سیکھی تھی' جو عام طور پر کلب میں آنے والی خواتین بچّوں کو وہیں' کلب کے ایک کمرے میں نماز سکھانے آیا کرتے تھے۔ بچّے اُنھیں بہت ستاتے تھے مگر مولوی صاحب نے جیسے اپنے اندر سے غصّے کا عنصر نکال ہی دیا تھا۔

کبھی کسی بدتمیزی یا گستاخی کا برا نہیں مانتے تھے۔

وہ تو بچوں کو قرآن بھی پڑھاتے تھے مگر زیادہ تر بچے پہلے سیپارے سے آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔ جب ان کی دلچسپیاں بڑھتیں تو وہ مولوی صاحب کو چھوڑ کر چلے جاتے... مولوی صاحب کو چونکہ بیگمات کی طرف سے ایک باقاعدہ رقم ملتی تھی اس لیے وہ بچّوں کی خوشنودی کو ملحوظ رکھتے تھے۔

فلکی نے بھی پہلے سیپارے کے بعد پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ اسے سیپارہ پڑھنے سے زیادہ رائیڈنگ Riding اچھی لگتی تھی۔

کہاں گھوڑے کی باگیں پکڑ کر فراٹے بھرنا.. اور کہاں بل بل کر سیپارہ پڑھنا اس لیے سائیس کے آتے ہی وہ اٹھ کر بھاگ جاتی تھی۔

اور پھر جب اس کی ایک سہیلی نے ممی سے شکایت کی کہ فلکی مولوی صاحب کو دیکھ کر بھاگ جاتی ہے تو ممی نے اُٹھلا کر کہا تھا۔

"کوئی بات نہیں۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ بہت وقت پڑا ہے قرآن شریف پڑھنے کو۔ میری بیٹی کو Childhood انجوائے کرنے دو۔"

پھر اس کے بعد تو فلکی نے کبھی سیپارے کو ہاتھ ہی نہ لگایا۔

ہاں' لڑکیوں کی ریس میں ہاتھ ہلا دینے اور اٹھک بیٹھک کرنے سے اسے کبھی اندازہ نہ ہوا کہ نماز کیا ہے؟ اور اس کا مقصد کیا ہے؟... یہ تو اچھی خاصی ایکسرسائز ہے۔ وہ سوچتی اس سے بہتر ہے کہ پی ٹی کرلی جائے... یا "سی سو" Sea-Saw پر جھولے لیے جائیں۔

آج جب اس نے نئے جذبے کے ساتھ نماز پڑھی تو وہ جائے نماز پر کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اللہ میاں اسے دیکھ رہا ہے۔

اللہ میاں کا خیال آتے ہی وہ آبدیدہ ہوگئی۔

بھلا وہ' ممی کا بدلہ ہمیشہ اللہ میاں سے کیوں لیتی رہی... خدا تو مہربان ہے۔ ہر ایک کے لیے ہر وقت موجود ہے... فریاد سنتا ہے.. تسلّی دیتا ہے... وہ ممی کی طرح نہیں ہے۔

اس نے خدا کو کیوں بھلائے رکھا؟

بھلا ہو' آفاق کا..... بالآخر اس نے اسے خدا سے ملا دیا۔

نماز پڑھ کر وہ بہت روئی تھی۔ اللہ کے آگے اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا۔ اس سے روشنی مانگی تھی... آخری سہارا مانگا تھا..... اور کہا تھا..... "مجھے سمجھ نہیں آتی... مجھے اپنی عقل پر بھروسہ نہیں۔ اب تک میں نے غلطیاں کی ہیں' اب مجھے صحیح راستہ دکھا۔"

اور اسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے اللہ میاں نے اسے تسلّی دے دی ہو... اس کے د
سکون بخش دیا ہو' اس کی الجھنوں کا حل پیش کیا ہو۔

یہ آخری مشعل تھی جسے اس نے مضبوطی سے تھام لیا تھا۔

اسی وقت جب وہ زاروقطار رو رہی تھی اور ہاتھ پھیلائے بیٹھی تھی۔ اس کی ہتھیلی پر
کے آنسو' تسبیح کے دانوں کی طرح گر رہے تھے۔

آفاق کے کمرے سے تلاوت کی آواز آ رہی تھی۔

فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ (پس تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے)

یہ آواز سن کر وہ ٹھٹھک گئی۔

نور کے تڑکے قرآن کی تلاوت اتنی اثر انگیز اور خوب صورت لگتی ہے۔ اسے پہلی م
اندازہ ہوا' دنیا کی کسی موسیقی میں یہ لوچ اور یہ سوز نہیں تھا۔

آواز نہیں تھی... بادلوں کے ننھے ننھے گالے تھے.. جو پتیوں اور پھولوں کی صورت میں
پر گر رہے تھے۔

یکایک اسے خیال آیا کہ اسے بھی قرآن پڑھنا چاہیے مگر وہ پہلے سیپارے سے آگے نہ
بڑھی تھی... اور وہ بھی غالباً" بھول ہی گیا ہو گا... کبھی کھول کر جو نہیں دیکھا تھا۔ اب اسے کو
پڑھائے گا۔

آفاق سے کہے گی۔

نہیں آفاق سے کہتے ہوئے شرم آئے گی۔ وہ کہے گا' یہ کیسی مسلمان لڑکی ہے جس کو کلا
پاک پڑھنا بھی نہیں آتا۔

ہے تو شرم کی بات... اس نے دل میں سوچا۔ مگر اب آفاق سے کیا پردہ... جب اس
اپنی زندگی کا ہر بھید اسے بتا دیا تھا۔

اس کے سامنے اعترافِ گناہ کر لیا تھا۔

... تو پھر اپنے نیک ارادے بتانے میں کیا قباحت ہے؟

سوچتی سوچتی وہ شیشے کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ اس نے باہر دیکھا... عجیب منظر تھا۔ پو پھوٹ
رہی تھی.. سُرمئی اندھیرے کا گریبان دھیرے دھیرے چاک ہو رہا تھا... دیکھتے ہی دیکھتے صبح کا
رنگ کی ہوئی... پھر نوخیز لڑکی کی طرح گلابی ہو گئی اور آخر میں دودھیا سفید۔ کنواری صبح نے
سورج کے آنے سے پہلے اس طرح رنگ بدلے تھے جس طرح کوئی الھڑ مٹیار پہلی بار اپنے

ہ کا سامنا کرتی ہے اور ہر ادا پر رنگ بدلتی ہے۔

لی کو زندگی کی یہ صبح بھی بڑی حسین معلوم ہوئی۔

اہر کا نظارہ کر کے وہ پھر صوفے پر بیٹھ گئی۔ آج ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس نے نیا جنم لیا
بڑی ہلکی پھلکی اور مسرور لگ رہی تھی۔

وہ وہیں صوفے پر ٹیک لگا کر لیٹ گئی۔

ساری رات نہیں سوئی تھی۔ رونے سے آنکھوں میں جلن سی ہو رہی تھی۔ اس نے اپنی
آنکھوں پر بازو رکھ لیا اور سوچنے لگی۔

خدا کا احساس کتنا خوب صورت ہے اور وہ ماں سے بھی زیادہ گداز بن جاتا ہے۔

خدا تو ماں سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔

اس واسطے کہ ماں اور بچے کے درمیان پردے حائل ہو جاتے ہیں۔

جبکہ خدا اور بندے کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہوتا۔

ماں سے دردِ دل کہنا پڑتا ہے۔

خدا بن کہے جان جاتا ہے۔

ماں آنسوؤں سے بے نیاز ہوتی ہے۔

خدا آنسوؤں کی زبان سمجھتا ہے۔

ماں بچے کو مایوس کر دیتی ہے۔

جبکہ خدا' بندے کو مایوس نہیں کرتا۔

سوچتے سوچتے جانے کب وہ سو گئی' اور اب اٹھی تھی۔ اس نے کلائی پر بندھی گھڑی
ھی۔ دوپہر کے بارہ بج رہے تھے۔

آفاق تو دفتر چلا گیا ہو گا... جانے کس نے ناشتہ کرایا ہو گا۔ اس نے عبدالکریم کو آواز دی۔

موں کے چلنے پھرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

عبدالکریم دوڑ کر اس کے قریب آ گیا۔

"جی سر!"

"صاحب کو ناشتہ کرا دیا تھا؟"

"جی سر... میں آپ کو جگانے آ رہا تھا' جی۔ میں نے صاحب کو بول دیا تھا کہ "بیگم صاحب کا
م ہے کہ آپ کا ناشتہ ان کے سوا اور کوئی نہ بنائے مگر انھوں نے حکم بولا کہ بیگم صاحب کو نہ

جگاؤ' سونے دو۔ رات ان کی طبیعت خراب تھی... جب تک وہ خود نہ جاگیں جگائے۔"

فلکی کا دل دھڑکنے لگا۔ اسے آفاق پر بے حد پیار آیا... ساتھ ہی آنکھوں میں نمی آ
کیا یہ نمی محبّت کی میراث ہے؟... کہ محبت کے احساس پر آنکھ ہمیشہ تر ہو جاتی ہے...

"سر جی' آپ کے لیے چائے لاؤں؟"

ہاں' عبدالکریم۔" فلکی اپنے خیالوں سے چونک گئی۔

"میرا ناشتہ بنا کر یہیں لے آؤ۔"

"بہت اچھا سر۔" کاندھے پر جھاڑن رکھ کر عبدالکریم باورچی خانے کی طرف چلا گیا
فلکی اٹھ کر غسل خانے میں چلی گئی۔ دانت صاف کیے۔ منہ دھویا اور ڈریسنگ سامنے کھڑی ہو کر بال درست کرنے لگی۔ پھر واپس آ کر لاؤنج میں بیٹھ گئی۔

عبدالکریم ٹرالی پر ناشتہ لگا کر لے آیا تھا۔

فرائی انڈے کی گرم گرم بھاپ نکل رہی تھی... سِنکے ہوئے توسوں کی خوشبو اس بڑھا رہی تھی۔

اس نے ٹکوزی اٹھائی اور چائے دانی میں سے قہوہ اپنی پیالی میں انڈیلنے لگی۔

"اب تم جاؤ عبدالکریم...... اور دوپہر کا کھانا تیار کرو۔"

"دوپہر کا کھانا تو' سر جی! میں نے تیار کر لیا ہے۔"

"تیار کر لیا ہے؟"

فلکی نے ہنس کر پوچھا... پھر سامنے دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھا۔ ایک بجنے کو تھا۔

"اچھا' تم جاؤ اب۔"

عبدالکریم چلا گیا۔

اور فلکی گرم گرم چائے کے ساتھ ہلچل مچاتی سوچوں میں گم ہو گئی۔

اسے رات کی ساری باتیں یاد آنے لگیں۔

پتہ نہیں' جو کچھ رات کو ہوا تھا۔ سچ تھا یا جھوٹ... لیکن خواب تو نہیں تھا۔ بھا بہادر کیسے ہو گئی کہ اس نے آفاق کو اپنی زندگی کی ایک ایک بات بتا دی... یعنی ناممکن ہو گیا تھا۔

اگر وہ دیر سے نہ اٹھتی تو اسے کبھی یقین نہ آتا کہ وہ اتنا بڑا جرأت مندانہ قدم اٹھا

یکن اسے پچھتاوا نہیں تھا... ہاں آفاق کا ردِّعمل جاننے کی بے چینی ضرور تھی۔

یا تو آفاق سے رحم کی بھیک مانگنا چاہتی ہے؟

چہ... ہرگز نہیں... اس کے دل نے احتجاج کیا۔ عشق رحم کی بھیک نہیں مانگتا۔ عشق ے سے بالاتر ہوتا ہے... رحم اور محبت میں بہت فرق ہے... کوئی عورت محبّت کے بدلے نہیں لینا چاہتی.. رحم کے سہارے زندگی گزر تو سکتی ہے مگر جیا نہیں جا سکتا۔

خدا کی قسم اس نے رحم کی خاطر یہ کہانی آفاق کو نہیں سنائی تھی۔ وہ تو چاہتی تھی کہ سارے ے' سارے حجاب اٹھ جائیں۔

وہ آفاق کو بتا دے کہ واقعی وہ اچھی لڑکی نہیں ہے۔ اس کا ماضی داغدار ہے۔ اس کا دامن نار ہے۔

اور اگر آفاق اس سے اور بھی نفرت کرے تو وہ برداشت کر سکتی ہے۔

اگر آفاق کی نفرت کچھ اور دل جلانے والے انداز اختیار کرے تو وہ بھی سہ لے گی۔

وہ آفاق کو بتا دینا چاہتی تھی... کہ وہ ایک بالکل نئی لڑکی بن گئی ہے۔

نفرتوں کی فصیل پر وہ محبت کی شمع بن کر جلے گی... اور جلتی ہی رہے گی۔

عشق بے طلب ہوتا ہے۔ عشق بے خوف ہوتا ہے۔ عشق کا مطالبہ نہیں ہوتا۔ جلنا اور نہ کرنا' اس کا مسلک ہوتا ہے۔

اور پھر ایک بڑی حقیقت اس پر عیاں ہوئی تھی جسے وہ زندگی کا حاصل سمجھتی تھی... وہ جان تھی...

کہ مرد کے ساتھ رہنے کے لیے مرد کو جیتنا پڑتا ہے۔

مرد چاہتا ہے کہ مسلسل جدوجہد سے عورت' اس میدان میں اس کو جیتے وہ مالِ غنیمت کی ح کسی بھی عورت کی جھولی میں گرنے کو تیار نہیں ہوتا... وہ ایک کوہ گراں ہے۔

عورت کو کوہ پیما بننا پڑتا ہے۔

راستے کی صعوبتیں اور موسموں کے مقابلے کرنا پڑتے ہیں۔

مرد ایک قلعہ ہے۔

اور عورت کو ایک زیرک جنرل کی طرح اس قلعے کو تسخیر کرنا پڑتا ہے۔

قلعے صرف محاصرہ کرنے سے فتح نہیں ہو جاتے۔

جنگ کرنے کے لیے تحمّل کی ضرورت ہوتی ہے۔

اور اسے مرد کی خاطر جذبات اور عقل کی بے شمار جنگیں لڑنا پڑتی ہیں۔
کبھی عورت پسپا ہوتی ہے۔
کبھی شہید ہوتی ہے۔
کبھی غازی بنتی ہے۔
تب کہیں جا کر وہ اس قلعے کی مالک بنتی ہے۔
مرد ایک سلطنت ہے... ایک راجدھانی ہے۔
بغیر قربانی دیے کوئی عورت اس تخت و تاج کی وارث نہیں بن سکتی۔ اس مرد کو [مسخر] کرنے کے لیے عورت کو سیاست، مصلحت، فراست، خدمت، اطاعت اور محبت کی فو[ج لے] کر میدان میں اترنا پڑتا ہے... جہاں کہیں غلط منصوبہ بندی کی، وہیں پر شکست زندگی کا [مقدر بن] جاتی ہے۔

مرد چاہتا ہے۔
اسے باقاعدہ فتح کیا جائے، تسخیر کیا جائے، اس کے لیے آگ کے دریا پار کیے جائیں۔
اس کے لیے جیا جائے اس کے لیے مرا جائے۔
صرف نکاح کے دو بولوں کے عوض وہ اپنا آپ کسی عورت کے حوالے نہیں کرتا۔
اور اب فلکی، آفاق کو تسخیر کرنا چاہتی تھی۔
کشمکش کا دور گزر گیا تھا۔
انا اور پندار کے بت ٹوٹ گئے تھے۔
جھوٹی آن بان اور جوانی کی اکڑفوں رخصت ہو گئی تھی۔
بے عقلی اور بے ہودگی کے دن بیت گئے تھے۔
فلکی کے ذہن کے سارے گوشے روشن ہو چکے تھے۔ وہ ایک دم سیانی ہو گئی تھی۔
اسے حُسن کی چوکھٹ پر عشق کی لبیک نہیں چاہیے تھی۔
وہ آفاق کی ضرورت بن جانا چاہتی تھی۔
ایسی ضرورت جس کے بغیر زندگی گزر نہیں سکتی۔
کوئی سگریٹ پیتا ہے، کوئی پان کھاتا ہے، کسی کو شراب لگ جاتی ہے، کسی کے دن [کا آغاز] اخبار کے بغیر نہیں ہوتی۔
کتنے فضول فضول نشے ہیں... جن کو انسان نے اپنی کمزوریاں بنا رکھا ہے۔ کہتے ہیں

د ثانیہ بن جاتی ہے۔
لکی، آفاق کی فطرت ثانیہ بن جانا چاہتی تھی اور وہ جانتی تھی کہ۔
"اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ"
نت سے وہ گھبراتی نہیں تھی بلکہ اس نے کمر ہمت باندھ لی تھی اور ایسا لگ رہا تھا۔ آج ہی نے طویل سفر کا ارادہ کیا ہے۔
اہستہ آہستہ اس نے سارا ناشتہ ختم کیا۔
پھر بھی جیسے اس کے دل میں کُھد بد لگی ہوئی تھی ممکن ہے آفاق دوپہر کے کھانے پر ے۔
در... اور وہ اس کا ردِ عمل دیکھ سکے۔
ناشتے کے بعد فلکی نے سوچا، وہ نہا دھو کر کپڑے بدل لے۔ زرا آج ڈھنگ سے اپنا آپ ر لے۔

مسلسل بجتی ہوئی فون کی گھنٹی نے فلکی کو جگا دیا۔ دوپہر کو جب نہا دھو کر وہ تازہ دم گیلے بالوں سمیت بستر پر لیٹ گئی تھی۔ جانے کب جھپکی آ گئی...

اب جو نیند کھلی تو دوڑ کر لاؤنج میں گئی۔ فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی... اور کوئی قریب نہیں تھا۔

"ہیلو!"

اس نے نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا تو آفاق بولا۔

"فلک کیا بات ہے؟ کیا آپ کی طبیعت خراب ہے؟"

"نہیں تو..."

"پھر آپ کی آواز بھاری کیوں ہے؟"

"میں سو رہی تھی۔"

"کیا صبح سے اب تک...؟"

"جی نہیں۔" فلکی نے ہنس کر کہا۔

"دوپہر کے کھانے پر آپ کا انتظار کرتی رہی.... آپ نہیں آئے تو پھر سو گئی۔"

"ہاں' مجھے افسوس ہے۔ میں آج دوپہر کو کھانے پر نہیں آ سکا۔ اب اطلاع دے رہا ہوں۔"

فلکی نے کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھا۔

شام کے پانچ بج رہے تھے... دو بجے تک آفاق نہیں آیا تو اسے طرح طرح کے وسوسے ستانے لگے۔

"آج ہمارا ایک کاروباری لنچ تھا۔ صبح جب میں آیا تو آپ سو رہی تھیں' اس لیے جگا نہ سکا... اور اب اپنی میٹنگ سے فارغ ہو کر ابھی آیا ہوں۔ سوچا آپ کو اطلاع دے دوں

"کوئی بات نہیں۔" فلکی نے آہستہ سے کہا۔

"مجھے معلوم نہیں تھا اس لیے میں دیر تک آپ کا انتظار کرتی رہی۔"

"آپ نے کھانا کھا لیا؟"

"جی نہیں۔"

"کیوں؟"

"جی... وہ... ایک بات تو یہ ہے کہ میں نے ناشتہ ہی ایک بجے کیا تھا۔ پھر سوچا' جب آپ آئیں گے تو کھانا کھالوں گی... اور... پھر سو گئی۔"

"اب بھی آپ کو میرا انتظار ہے یا نہیں؟"

"انتظار تو آخری سانس تک رہتا ہے۔ آپ جانتے ہیں۔"

"اور کسی کے آجانے سے یہ خوب صورت کیفیت ختم ہو جاتی ہے.... ہے نا؟"

"نہیں۔" فلکی ہنس پڑی۔

"بعض اوقات کوئی پاس بھی بیٹھا ہو تو یوں لگتا ہے... اس کا انتظار ہے۔"

"کون سی کیفیت اچھی لگتی ہے آپ کو؟"

"جس میں بیتابی ہو۔"

"یعنی کوئی پاس بھی ہو اور دور بھی ہو۔"

فلکی تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئی اس کا رواں رواں جاگ اٹھا۔ دل بولنے لگا۔ زبان تنگ ہو گئی۔

"کوئی دور ہی کب ہوتا ہے۔"

یہ کہہ کر فلکی نے جلدی سے فون رکھ دیا۔

جو کچھ اس نے کہہ دیا تھا' اس کا ردِعمل نہیں جاننا چاہتی تھی۔ اپنے آپ سے ڈرتی تھی۔ ریسیور رکھ کر وہیں گم صم کھڑی رہی... یہ میں نے کیا کہہ دیا۔ آفاق سوچے گا' میں نے بھی ان لڑکیوں کی طرح غلط انداز اختیار کر لیا ہے۔

اسی وقت گھنٹی دوبارہ بجی۔

اس نے آہستگی سے ریسیور اٹھا لیا۔

"بھئی' میں نے آپ کو یہ بتانا تھا کہ آج رات کی فلائٹ سے اسحاق آ رہا ہے۔"

"اسحاق... یعنی آپ کا بھائی؟"

"ہاں' ہاں..." آفاق نے کہا۔ "آج ہی اس کی فیکس آئی ہے۔ کیا آپ ا
ایئرپورٹ جاسکیں گی؟"

"میں تو اسے پہچانتی بھی نہیں۔"

"وہ آپ کو پہچان لے گا۔"

"مگر میں کیسے جاؤں گی؟"

"ڈرائیور کے ساتھ۔"

"کتنے بجے جہاز آئے گا؟"

"رات ساڑھے نو بجے۔"

"نہیں۔" وہ ایک دَم بولی "آپ خود ہی لے آئیں۔ میں گھر پر رہوں گی اور
بندوبست کروں گی۔"

"میں آجاؤں آپ کو لینے؟"

"جی نہیں۔ میرا گھر پر رہنا ضروری ہے۔ اس کے لیے کمرہ ٹھیک کرانا ہوگا۔ آ
لے آئیں جاکر۔"

"اچھا..." آفاق کچھ سوچتا ہوا بولا۔

"میں نو بجے دفتر سے اٹھوں گا' پھر ایئرپورٹ چلا جاؤں گا۔ ہمیں ذرا آنے میں دیر
گی لیکن ہم کھانا گھر پر کھائیں گے۔"

"جی بہت اچھا۔"

"خدا حافظ۔"

آفاق نے فون بند کردیا۔

فلکی نے عبدالکریم کو آواز دی... لیکن پھر خود ہی باورچی خانے کی طرف چل دی۔

ساڑھے دس بجے کے قریب آفاق کی گاڑی کے ہارن کی آواز آئی۔ فلکی نے ٹی۔
کردیا اور کھڑی ہوگئی۔

آج وہ بطورِ خاص تیار ہوئی تھی۔ گلاب کے اَدھ کِھلے پھولوں والا گلابی سوٹ اس۔
تھا۔ اس کے بال کافی لمبے ہوگئے تھے۔ ان کی ایک ڈھیلی سی چُٹیا باندھ لی تھی۔ ایک چُٹیا
بہت کم سِن اور معصوم دکھائی دیتی تھی۔ ہلکا ہلکا میک اپ کیا' پیاری سی خوشبو لگائی۔ آ
میں ذرا سا کاجل بھی لگالیا۔

یہ اہتمام اس نے اس لیے کیا تھا کہ اسحاق ان کے اندرونی حالات بالکل نہیں جانتا تھا اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی سادگی سے کوئی غلط قسم کا اندازہ لگائے۔

انٹرنس کا دروازہ کھول کر وہ پورچ میں آئی تو دونوں کار سے اتر آئے تھے اور چلتے ہوئے اسی کی طرف آرہے تھے۔

ان دونوں کے قد برابر تھے لیکن حلیے میں واضح فرق تھا۔

اسحاق اکہرے بدن کا دُبلا پتلا لمبا سا لڑکا تھا۔ چہرہ بھی آفاق سے زیادہ گورا تھا۔ غالباً" امریکہ میں رہنے کا اثر تھا۔ مگر سر کے بال لمبے لمبے... لمبی لمبی قلمیں' بڑی بڑی مونچھیں۔ وہی امریکہ پلٹ لڑکوں والا حلیہ تھا۔ شوخ رنگوں کی دھاری دار شرٹ پر اس نے گلے میں ایک لاکٹ پہنا ہوا تھا۔ نیلے کھدر کی اُبھرتی ہوئی سِلوٹوں والی پینٹ تھی جس کے گھٹنوں اور جیبوں پر چمڑے کے ٹکڑے لگے ہوئے تھے۔

اس حلیے کے لڑکے اس نے پاکستان میں بھی دیکھے تھے... بلکہ اس کے حلقۂ احباب میں بھی تھے۔

آفاق کے ساتھ اسے دیکھ کر فلکی کو جدید اور قدیم کا مطلب سمجھ میں آگیا۔

حالانکہ آفاق اور اسحاق میں صرف پانچ سال کا فرق تھا۔ یہ اسے ایک دن آفاق نے بتایا تھا لیکن حلیے سے پوری ایک نسل کا فرق لگ رہا تھا۔

آفاق اس کے سامنے بہت سنجیدہ اور بُردبار لگ رہا تھا۔

رنگت بھی اسحاق کے مقابلے میں سانولائی ہوئی تھی۔

مگر وہ پھر بھی فلکی کو اچھا لگ رہا تھا۔

حالانکہ کچھ عرصہ پہلے وہ اسحاق کے حلیے والے لڑکوں کو پسند کرتی تھی۔

مگر اب....

مدبّر' سنجیدہ' باوقار اور آفاق کی طرح لیے دیے رہنے والے لوگ اس کا آئیڈیل بن چکے تھے۔

اسحاق اسے دیکھ کر فوراً" پیشوائی کو بڑھا... اور پھر دونوں ایڑیاں جوڑ کر بڑی شوخی سے اس نے ایک عدد سلیوٹ کھینچ مارا۔

فلکی ہنسنے لگی۔

"بھئی سلیوٹ کا جواب تو دیں۔"

اسحاق نے جُھک کر کہا "میرے سر پر ہاتھ پھیریں۔ کمر سہلائیں۔ پوتوں' نواسوں کی دعا دیں۔ کیسی بھابی ہیں آپ؟"

فلکی نے سر جھکا لیا اور ہنسنے لگی... ہنسے گئی... وہ ہنستی جاتی اور شرم سے دہری ہوئی جاتی۔

آفاق نے دروازہ کھول دیا اور سب اندر چلے۔ ملازم نے اسحاق کا سامان اٹھا لیا اور اس کے کمرے میں لے گیا۔

"آپ پہلے چائے پئیں گے یا کھانا..."

"بھئی پہلے کھانا لگوا دو۔ دوپہر میں بھی میں ٹھیک سے کھانا نہیں کھا سکا تھا۔" آفاق نے کہا۔

"اب ہوٹلوں کی دعوتیں کھائی نہیں جاتیں۔ آپ نے گھر پر کھانے کی عادت ڈال دی ہے۔ کھانے کے بعد کافی پئیں گے۔"

فلکی کا دل دھڑک اٹھا۔ وہ باورچی خانے کی طرف چل دی۔

آج اس نے پھر کھانے پر خوب اہتمام کیا تھا۔ اسحاق اس کا دیور تھا اور پہلی بار اس کے گھر آیا تھا... پھر یہاں کے سب حالات وہ اپنی ماں کو جا کر بتائے گا۔ فلکی نہیں چاہتی تھی کہ کسی بات میں کوئی کسر رہ جائے۔

جب سب کھانے کی میز پر بیٹھے۔

تو اسحاق نے کٹلس کی پلیٹ اٹھا کر کانٹے سے ایک کٹلس اپنی پلیٹ میں ڈالا اور کہا۔

"بھیّا! تم ہر روز اسی اہتمام سے کھانا کھاتے ہو؟"

"کیوں...؟" آفاق نے نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"بھئی' بھابی تمہیں ایسے عمدہ عمدہ کھانے ہر روز کھلاتی ہیں؟"

آفاق کچھ نہ بولا۔

"تبھی میں کہوں... آپ گھر میں کیوں مگن ہو گئے ہیں۔ ہر تیسرے مہینے امریکہ کا چکر لگایا کرتے تھے اور... امی سے فرمائشیں کر کر کے چیزیں پکواتے تھے۔"

آفاق مسکراتا رہا۔ کچھ نہیں بولا۔

فلکی بھی زیرِ لب مسکراتی رہی۔

"بھیّا' یہ تو بالکل بھابی نہیں لگتیں۔" اس نے فلکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بالکل چھوئی مُوئی کا پھول ہیں۔ اتنی شرمیلی لڑکی کو میں بھابی نہیں کہہ سکتا۔ میں تو فلک ہی کہوں گا۔"

فلکی ایک دَم اندر سے تھرا گئی۔

فلک تو اسے آفاق کہتا تھا... اب تک ساری دنیا نے اسے فلکی کہا تھا لیکن آفاق نے اسے فلک کہہ کرنیا انداز اختیار کیا تھا۔ اس میں کو بیگانگی اور رُکھائی تھی... مگر یہ اس کے آفاق کا انداز تھا... جب وہ فلک کہہ کر بُلاتا تو فلکی کا رُواں رُواں آواز بن جاتا... کتنی الگ... کتنی جدا تھی یہ آواز... اس نام سے اسے کوئی اور کیوں بلائے۔

جلدی سے بولی۔

"نہیں' نہیں اسحاق! تم مجھے بھابی کہہ کر بلاؤ گے۔ کیونکہ مجھے شوق ہے کہ کوئی مجھے بھابی کہے۔" اس نے جان بوجھ کر تم کہا تاکہ رشتے کی بڑائی ظاہر کر سکے۔

"اچھی! بھیّا کے سب دوست آپ کو بھابی ہی کہتے ہوں گے۔"

"ان میں اور تم میں فرق ہے۔ تم میرے اصلی دیور ہو... اور پھر میرا تو کوئی بھائی ہی نہیں ہے۔"

"اچھا ابھی فیصلہ کر لیں۔ مجھے بھائی بنانا ہے یا دیور؟"

"دیور۔" فلکی نے بے ساختہ کہا۔

"ذرا روشنی ڈالیں۔ میرا خیال ہے بھائی کا رشتہ زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔"

"بھائی بن کر تم اس گھر میں سر جُھکا کر چلو گے اور دیور بن کر اپنی ہرنّات منواؤ گے۔"

"واہ وا... واہ وا... بھئی' کمال کی بات کہہ دی بھابی نے۔ بھیا' ذرا داد تو دونا... لوگ کہتے ہیں' عورتیں خود غرض ہوتی ہیں۔ ہمیشہ اپنی ذات کے بارے میں سوچتی ہیں۔"

آفاق خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔

پھر اسحاق بولا۔

"میں تو سمجھا تھا کہ یہ بے زبان ہیں۔ ان کی زبان ہی نہیں ہے... یا پھر بولنا نہیں جانتیں۔"

"زبان تو ان کی بہت لمبی تھی۔ میں نے ہی داغ دی۔"

آفاق پہلی بار بولا۔

فلکی کو اس کا جملہ برا نہیں لگا بلکہ اس نے مسکرا کر آفاق کی طرف دیکھا... پھر پانی کا گھونٹ بھرا اور بولی۔

"داغنے سے میری زبان زیادہ شائستہ ہو گئی ہے۔"

"اچھا... تو آپ لوگ آپس میں ڈائیلاگ بھی بولتے ہیں..."

اسحاق نے مسکرا کر کہا۔ "یہ میٹھا کس نے بنایا ہے؟"

فلکی مسکرائی۔

"شاید میں نے..."

"واہ' اتنے لذیذ شاہی ٹکڑے... اور پھر زعفران کی خوشبو... کس کو داد دوں۔"

"میرے استاد کو...."

فلکی نے ہنس کر آفاق کی طرف دیکھا۔

"بھابی' آپ کا استاد کون ہو سکتا ہے.. آپ تو استادوں کی استاد معلوم ہوتی ہیں۔"

فلکی کھڑی ہو گئی۔

"میں ذرا کافی کے لیے کہہ آؤں۔"

پھر ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ان لوگوں نے کافی پی... تھوڑی دیر تک گپ شپ ہوتی رہی۔ پھر وہ خالعتاً" کاروباری گفتگو کرنے لگے۔

بارہ بجے تک تو فلکی وہاں بیٹھی جمائیاں لیتی رہی۔ پھر معذرت کر کے اٹھ آئی۔ جانے وہ کتنی دیر تک بیٹھے گفتگو کرتے رہے تھے۔

کیونکہ ایک بار جب فلکی کی آنکھ کھلی تو آفاق اپنے بستر پر نہیں تھا اور ان کے کمرے سے باتوں کی آواز برابر آ رہی تھی۔

اگلا ایک ہفتہ کچھ ایسی ہی مصروفیات میں گزرا۔ اسحاق کے آجانے سے آفاق بہت مصروف ہو گیا تھا۔ صبح کو اسحاق اس کے ساتھ ہی دفتر چلا جاتا۔

دوپہر کا کھانا وہ لوگ دفتر میں منگوا لیتے۔

رات کا کھانا گھر پر کھاتے... اور کھانے کے بعد وہی کھاتے وہی فائلیں' وہی چٹھیاں اور بحث و مباحثہ۔

نہ وہ فلکی کو ان باتوں میں شامل کرتے... نہ فلکی اپنی اہمیت جتاتی۔

وہ ایک بوجھل دل لیے اپنے کمرے میں چلی جاتی۔

نہ جانے رات کے کون سے پہر آفاق آ کر سو جاتا.... اور پھر صبح صبح اٹھ کر چلا جاتا۔

فلکی ایک اضطرابی کیفیت میں مبتلا ہو گئی تھی۔

اس رات کے بعد' جب اس نے آفاق پر اپنی زندگی کے راز کھولے تھے' آفاق کا رویہ مبہم سا ہو گیا تھا۔ شاید اسحاق کے آجانے کی وجہ سے ایسا ہوا تھا۔ کاش اسحاق ایک ہفتے بعد آتا۔ وہ اپنے دل میں سوچتی... بھلا یہ کیوں آ گیا۔ اسحاق کے آجانے سے آفاق بہت مصروف ہو گیا تھا۔ چوبیس گھنٹے دونوں بھائی ساتھ رہتے۔ فلکی آفاق سے بات کرنے کو ترس گئی تھی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

آفاق کی بے توجہی صرف کاروباری مصروفیت ہے یا...

وہ ذہنی طور پر اس سے کچھ اور دور ہو گیا ہے۔

یہ سوچتے سوچتے وہ گھبرا سی جاتی۔ دل چاہتا' دفتر فون کر کے آفاق کا حال معلوم کرے... اس سے کھل کر باتیں کرے..

کیا کرے...؟

یونہی اوویئر بن میں بیٹھی تھی کہ آفاق کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ وہ اچھل پڑی۔ آفاق اور

اس وقت۔ اس نے کلائی پر نظر ڈالی۔ اس وقت دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ آفاق تو کھانے کے وقت آیا کرتا۔ آج جلدی کیسے آگیا... دل میں عجیب و غریب خیالات سر اٹھانے لگے۔

ابھی وہ کہہ ہی رہی تھی کہ وہ اندر آگیا۔

اس کے ہاتھ میں کپڑوں کا بنڈل تھا۔

فلکی اس کے پیچھے پیچھے اس کے کمرے میں چلی آئی۔

"فلک! یہ ذرا ڈرائی کلینرز سے لے آیا ہوں۔ اگر تکلیف نہ ہو تو میرا سامان پیک کر دیں۔"

"جی..." حیرت زدہ کھڑی اس کا منہ دیکھتی رہ گئی۔

وہ بڑھ کر ڈرائنگ روم میں گیا۔ وہاں سے اپنا ایک ہوائی بکسا اٹھا لایا۔

اسے میز پر رکھ کر کھولا... پھر مڑ کر حیرت زدہ فلکی کی طرف دیکھا اور بولا۔

"میں نے کہا... آپ ذرا میرا سامان پیک کر دیں۔ کیا یہ اتنی اچنبھے کی بات تھی؟"

فلکی چونک پڑی۔

بڑھ کر بکسے کے پاس آئی اور بولی "آپ مجھے بتا دیں... کیا کیا پیک کرنا ہے۔"

آفاق نے وارڈ روب سے اپنے کپڑے اور دوسری چیزیں نکال نکال کر پلنگ پر رکھنا شروع کر دیں۔"

"مگر... آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"میں ذرا امریکہ جا رہا ہوں۔"

"ذرا..." فلکی کہتے کہتے بچی۔

آفاق نے اسے دیکھا... بولتا گیا۔

"میں نے اسحاق کو اسی لیے بلایا تھا۔ مجھے ایک ضروری کام سے امریکہ جانا ہے۔ وہاں والے دفتر کو بھی دیکھنا ہے۔ میری عدم موجودگی میں اسحاق یہاں دفتر کا کام سنبھالے گا۔ میں نے اس کو سب سمجھا دیا ہے۔"

فلکی کا دل جیسے بجھنے لگا... آفاق نے اسے اس قابل بھی نہ سمجھا کہ پہلے سے اپنا پروگرام بتاتا۔

"آپ کتنے عرصے کے لیے جا رہے ہیں؟"

"یہی کوئی پانچ چھ مہینے کے لیے۔"

"پانچ چھ مہینے" فلکی کا دل جیسے رونے لگا... پانچ' چھ مہینے میں چاہے کوئی جان سے گزر

جائے۔

"کب جا رہے ہیں؟"

"آج رات... نو تیس پر جہاز روانہ ہوتا ہے۔ میں گھر آٹھ بجے چلا جاؤں گا۔ آٹھ بجے آپ کھانا کھلا دیں گی؟"

"ضرور..." فلکی نے مرے ہوئے دل سے کہا۔

"اچھا... اب میں چلتا ہوں۔ ابھی دفتر میں کچھ ضروری کام نمٹانے ہیں۔"

آفاق اس کی زرد رنگت کی پرواہ کیے بغیر باہر چلا گیا۔

تقدیر کی گردش کیا کم تھی۔

فلکی نے سارا سامان پیک کر لیا۔ اس کی ضرورت کی اک اک چیز رکھ دی۔

...اور پھر صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔ غالباً ریڈیو پر پرانے گیت بج رہے تھے۔

تقدیر کی گردش کیا کم تھی' اس پر یہ قیامت کر بیٹھے
بیتابیٔ دل جب حد سے بڑھی گھبرا کر محبت کر بیٹھے

محبت کرنے کو کس نے کہا تھا؟

کیا محبت کے بغیر زندگی نہیں گزر سکتی تھی؟

فلکی کی آنکھوں میں آنسو آئے جاتے تھے۔

وہ اس ستمگر کے بغیر اس گھر میں کیسے رہے گی؟

اور پھر جانے کب آئے گا...؟

آئے گا بھی یا نہیں...؟

اسے فلکی کی کیا پرواہ ہے.... اور وہ کس کے لیے جلدی آئے گا؟

اے کاش' وہ فلکی کو بھی ساتھ لے جاتا... اے کاش...!

رات کا کھانا انھوں نے جلدی کھا لیا۔ فلکی کی آنکھوں میں آنسو آئے جاتے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ آفاق نے اپنا سامان موٹر میں رکھوا دیا اور اس کے کمرے میں چلا آیا...

فلکی نے جلدی سے پوچھا۔ "آپ کس کام سے جا رہے ہیں؟"

"اوہ..." وہ ہنس کر بولا "میں نے آپ سے کہا تھا نا... شاید مجھے آپ کا خط پڑھنے کے لیے امریکہ جانا پڑے۔"

فلکی نے اپنی گیلی گیلی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹ لرز کر رہ گئے... اس

نے چاہا۔ وہ کچھ کہے... مگر اس کے دل نے ساتھ نہ دیا۔ کاش! وہ کہہ سکتی کہ بناوٹ کی ہوتی ہے۔

"آپ مجھے چھوڑنے ایئرپورٹ تک جائیں گی؟... کیا مجھے خدا حافظ نہ کہیں گی؟"

(کیا تمہارے جانے کا منظر میں دیکھ سکوں گی؟)

"اگر آپ چاہتے ہیں تو چلی جاؤں گی۔" اس نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"ویسے آپ کا دل نہیں چاہتا..."

میرا دل کیا چاہتا ہے... کاش آپ نے پوچھا ہوتا۔ اس کے ہونٹ ہل کر رہ گئے۔

"اچھا اچھا جلدی چلو۔ دیر نہ ہو جائے۔"

آفاق باہر چلا گیا۔

اپنے آنسو خشک کرتی فلکی باہر آئی۔ اسحاق اسٹیرنگ پر بیٹھ چکا تھا۔

اس لیے فلکی کو پیچھے بیٹھنا پڑا۔ اس نے دیکھا دوسری طرف سے دروازہ کھول کر آفاق پچھلی سیٹ پر ہی بیٹھ گیا ہے۔

بالکل اس کے قریب... آفاق کی خوشبو نے اس کے دل میں ہلچل مچانی شروع کر دی۔

اس کا دل چاہا... وہ اس خوشبو سے لپٹ لپٹ کر روئے۔

آفاق کے زانو پر اپنا سر رکھ دے اور کہے۔

آفو ابھی نہ جاؤ... نہ جاؤ... اتنی دور نہ جاؤ۔ ابھی تو میں نے کچھ کہا ہی نہیں... ابھی تو تمہارے قدموں کو نہیں چھوا۔ محبت کا پہلا سجدہ بھی نہیں کیا اور تم جا رہے ہو۔ جانے کب آؤ گے؟ جانے میں اتنا طویل انتظار کر بھی سکوں گی یا نہیں۔

تمہارے ستم کے بغیر رہ بھی سکوں گی یا نہیں۔

اس تنہا گھر میں مجھے تمہاری جفائیں یاد آئیں گی... تمہاری سرد مہری آٹھ آٹھ آنسو رلائے گی۔ تمہاری بے پروائیاں کچوکے لگائیں گی۔

نہ جاؤ... یوں چھوڑ کر نہ جاؤ۔

جانے کب آنسو کا ایک قطرہ اس کے رخسار پر ڈھلک آیا۔ اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر فلکی نے جلدی سے وہ آنسو اپنی ہتھیلی میں چھپا لیا۔

وہ دونوں خالص کاروباری گفتگو کر رہے تھے۔

یہ کرنا... وہ نہ کرنا۔

فلاں فرم کو خط لکھوا دینا۔

فلاں آرڈر کو ترکوا دینا۔

وہاں سے بل وصول کر لینا۔

اس طرح پنے منٹ کروانا وغیرہ وغیرہ۔

اچانک اسحاق بولا۔

"بھابی بڑی اداس لگ رہی ہیں۔"

"کیوں فلک...؟" آفاق نے جھک کر اس کا چہرہ دیکھا۔

"مجھے تو ایسے لگ رہا ہے جیسے ابھی رو پڑیں گی... کیوں بھابی؟" اسحاق نے شیشے میں نگاہ اس جمادی۔

فلکی تھر تھر کانپنے لگی۔

"ارے، اس موقع کے لیے بہت سے گیت گائے گئے ہیں۔ اگر زبان سے کچھ کہنا مشکل ہے گا کر بھیا پر اپنے جذبات کا اظہار کر دیں... وہ کیا گانا ہے بھیا!"

اسحاق نے میں گاتا ہوا بولا

"تو جہاں کہیں بھی جائے، میرا پیار یاد رکھنا۔"

فلکی کو ہنسی آ گئی۔ آفاق بھی ہنس پڑا۔

"فلک بہت بہادر لڑکی ہے۔" آفاق نے جانے کس لہجے میں کہا۔ فلکی کو سمجھ نہیں آئی۔

"آپ کی ممی کب آ رہی ہیں فلک؟" آفاق نے پوچھا۔

"دو مہینے کے بعد۔"

"میں ویسے ان سے ملوں گا وہاں۔" آفاق نے پھر کہا۔

"کوئی پیغام دینا ہو تو بتائیں۔"

"آپ جو مناسب سمجھیں، کہہ دیں۔"

"یعنی کہہ دوں کہ آپ کی بیٹی کے پاس آپ کے لیے کوئی پیغام نہیں تھا۔"

"اگر یہ جواب آپ کو مناسب لگتا ہے تو یہی کہہ دیں۔"

"تو وہ مجھے برا بھلا کہیں گی۔"

"کیوں...؟"

"وہ کہیں گی کہ تم نے ہم سے ہماری بیٹی چھین لی ہے..." پھر وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

فلکی کا دل چاہا' اسے کہے... اور بھی کہو... جو کہنا چاہتے ہو کہو.... مگر پھر خاموشی ہو گئی۔

"میں آپ کے لیے کیا لاؤں وہاں سے؟"

"کیا کہوں...؟" فلکی سوچ میں پڑ گئی۔ اس کی طلب بے قیمت تھی... مگر پھر بھی الفضل "ممی نے بتایا تھا آپ کو چاکلیٹ بہت پسند ہے۔"

فلکی سوگواری سے ہنس پڑی۔

ممی تو ابھی تک اسے بچی سمجھتی ہی تھیں... مگر اس کے ارادوں کا مالک بھی اسے کم ہی رہا تھا۔

ایئرپورٹ آگیا۔

روشنیاں ہی روشنیاں ہر سو بکھری ہوئی تھیں۔ مسافر' سامان... عزیز و اقارب۔

ایئرپورٹ بھی اسے حشر کا میدان لگا۔

جیسے ہر کوئی اپنا اعمال نامہ اٹھائے کھڑا اپنی باری کا انتظار کر رہا ہو۔

جانا ہے... چلنا ہے...

وقت ہوا جاتا ہے۔

جلدی کرو... جلدی کرو....

یہی زندگی ہے۔ اس نے سوچا... کسی کو لانے کی جلدی... کسی کو جانے کی جلدی....

کسی کے آنے کی خوشی... کسی کے جانے کا ملال۔

کوئی پھول پہن رہا ہے... کوئی آنسو بہا رہا ہے۔

دنیا ایک پگڈنڈی ہی تو ہے۔

جسے آنے والے مسلسل پامال کیے جا رہے ہیں۔

آفاق اپنا سامان چیک ان کرا کے آگیا تھا۔

مسافر اندر جانا شروع ہو گئے تھے۔

"اوکے!" اس نے ایک دم اپنا ٹکٹوں والا ہاتھ خالی کر کے فلکی کی طرف بڑھایا۔

اس خوب صورت صحت مند ہاتھ کو فلکی اس طرح دیکھنے لگی... جیسے اس نے چاند کو پہلی بار دیکھ لیا ہو۔

یہ ہاتھ میری امانت ہیں.....

ہاں نہیں' میری ہیں....

اس گوشت پوست میں میرا دل دھڑکتا ہے....

اس نے آہستہ سے اپنا زرد اور ٹھنڈا ہاتھ آگے کر دیا۔

آفاق کی گرفت اس کے ہاتھ پر سخت ہو گئی... جیسے بچے نے کھیلتے کھیلتے شیشے کی گولی ڈھونڈ لی اور گر جانے کے خوف سے اسے مٹھی میں چھپا لیا ہو۔

آفاق کا ہاتھ اس کے ہاتھ پر حاوی ہو چکا تھا۔

لمحے جاوداں ہو گئے تھے۔

سارا ایئرپورٹ جیسے نور بن گیا تھا۔

اور بس.. فلکی اور آفاق وہاں کھڑے رہ گئے۔

"میں جلدی آجاؤں گا۔ گھبرایئے گا نہیں... اسحاق آپ کو اچھی کمپنی دے گا۔"

آفاق نے اسحاق کی طرف دیکھا۔

"اس میں کیا شک ہے۔" اسحاق نے شوخی سے سگریٹ کا دھواں چھوڑا۔

آفاق نے ہاتھ چھڑا لیا۔

فلکی کا ہاتھ وہیں معلق رہ گیا۔

تھوڑی دیر پہلے اس کا ہاتھ کتنا وزنی تھا۔

اور اب کتنا ہلکا اور بے مول لگ رہا تھا۔

"خدا حافظ!"

آفاق مڑنے لگا۔

"بھیا!" اسحاق ادھر کو لپکا۔

"میرے ساتھ آپ ایکسٹینشن کر گئے ہیں... ہاتھ کیوں نہیں ملایا؟"

آفاق ہنسا "اب یہ ہاتھ نہیں۔" اس نے سیدھے ہاتھ میں ٹکٹ پکڑ لیے اور الٹا ہاتھ اسحاق کی طرف بڑھایا۔

"یہ بات ہے۔" اسحاق ایک آنکھ بند کر کے ہنسا۔ پھر آفاق کا ہاتھ تھام لیا۔ دونوں ہنسنے لگے۔

آفاق نے جاتے جاتے پھر ایک نگاہ فلکی پر ڈالی۔

وہ نگاہ اتنی بھرپور تھی کہ فلکی بت بن گئی۔ جیسے اس پر سمریزم کر دیا گیا ہو۔

"اچھا... خدا حافظ...!"

"خدا حافظ۔" فلکی نے زیرِ لب کہا جسے اس کے کانوں نے بھی نہیں سنا۔

اسحاق اس کا ہوائی بیگ پکڑ کر دروازے تک گیا۔

اور فلکی کھڑی سوچتی رہی۔

تیرے آنے کا تصوّر' تیرے جانے کا خیال
اِک تصویرِ مسرّت اِک تصویرِ ملال

راتیں اور دن بستر کے ہوگئے۔

اس کے دن' رات ہر رُت میں بدلے تھے... شادی کے بعد سے یہی کچھ ہو رہا تھا۔ پہلے ان دونوں میں دوریاں تھیں۔ پھر آفاق قریب رہتے ہوئے بھی دور تھا۔ اور اب...

اب وہ ظالم ہزاروں میل دور بیٹھا ہوا بھی قریب تھا... رگِ جاں سے بھی قریب۔ اس کی مہک فلکی نے سانسوں میں بسالی تھی۔ اس کی تصویر اپنے کمرے میں رکھ لی تھی۔ آنکھیں بند کر کے تصوّر میں بے شمار باتیں کرتی تھی۔

گلے شکوے کرتی تھی۔

مگر... مگر اسے پیار کرنے کی ہمت تصوّر میں بھی نہ ہوتی تھی۔

آفاق کو گئے ہوئے آٹھ دن ہوگئے تھے۔ دفتر میں اس کی ٹیلکس آگئی تھی۔ اور اسحاق نے فلکی کو اس کی خیریت سے آگاہ کر دیا تھا۔

فلکی کو اس کے خط کا انتظار تھا مگر جب دفتر میں اطلاع کا اچھا انتظام تھا تو بھلا وہ خط لکھنے میں وقت کیوں ضائع کرتا۔

دن گزرنے میں نہ آتا۔

رات کاٹے نہ کٹتی۔

ایک دن فلکی علی الصباح چہل قدمی کرتی ہوئی کوارٹروں کی طرف نکل گئی۔

ایک عورت کے چلّانے کی آواز آرہی تھی۔

باہر چوکیدار بیٹھا مسواک کر رہا تھا۔

فلکی کو دیکھ کر کھڑا ہوگیا۔

"سلام' سر...!" اس نے سلیوٹ مارا۔

"یہ بچّہ کیوں رو رہا ہے' چوکیدار؟" فلکی نے پوچھا۔

"بیگم صاب جی! یہ امارا بچّہ ہے۔"
"مگر روتا کیوں ہے؟"
"ہر روز روتا ہے' اس وقت۔" چوکیدار نے ہنس کر کہا۔
"مگر کیوں..؟ اس کی ماں کیوں چلا رہی ہے؟"
"بیگم صاب جی! امارا بی بی روز صبح کو اس کو قرآن پاک پڑھاتا ہے مگر جب یہ ضد
مار بھی کھاتا ہے... پر بیگم صاب! اس کا ضد تو نہیں دیکھنا۔ آگے جا کر اللہ کو جواب ا
ہے۔
فلکی آگے بڑھ گئی۔
"تماری بیوی قرآن شریف پڑھی ہوئی ہے؟"
"اللہ کا فضل ہے..." پٹھان چوکیدار نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
اس کی بیوی نے فلکی کو دیکھا تو ایک دم کھڑی ہو گئی... اور سلام کیا۔
"بیٹھو... بیٹھو۔" فلکی نے اسے پکڑ کر بٹھا دیا۔
"جب کلام پاک سامنے رکھا ہو تو کسی کے لیے نہیں کھڑے ہوتے۔ یہ تو دونوں ج
بادشاہ ہے۔"
یہ کہہ کر فلکی خود اس کی چارپائی پر بیٹھ گئی۔
ایک' چار' پانچ سال کا صاف ستھرا بچّہ رزار و قطار رو رہا تھا اور ہل ہل کر پڑھ رہا تھا۔
"واقیموالصلواۃ واتوالزکواۃ..."
فلکی نے سر کو دوپٹے سے ڈھانپ لیا اور سنتی رہی۔ بچّہ کا لب و لہجہ اسے بہت پیارا ا
پھر اس کی ماں سے بولی۔
"تمارا نام کیا ہے؟"
"جی' امارا نام گل چہرہ ہے۔"
"بڑا اچھا نام ہے... گل چہرہ! کیا تم مجھے بھی قرآن شریف پڑھا دو گی؟"
"جی آپ کو....؟" اس نے اس طرح چونک کر پوچھا جیسے کوئی انہونی بات ہو گئی ہو۔
"ہاں' ہاں' مجھے..."
"بیگم صاب! مذاق کرتی ہو... سب مسلمان کا بچّہ کلام پاک پڑھا ہوتا ہے۔"
"نہیں گل چہرہ! میں نے نہیں پڑھا اگر میری امی تماری طرح مجھے بھی بچپن میں ما

ماتیں تو میں ضرور پڑھ لیتی لیکن خیر! اب بھی وقت ہے۔ جب خیال آئے پڑھ لینا چاہیے۔
ٹھیک ہے نا؟"
گل چہرہ نے سر جھکا لیا۔
"تم مجھے پڑھاؤ گی یا نہیں؟"
گل چہرہ نے بے یقینی سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔
"ضرور پڑھائے گا بیگم صاب! یہ تو نوکر ہے آپ کا۔"
"اچھا... گل چہرہ! تم کب فارغ ہوتی ہو؟"
"یہ تو جی' سارا دن فارغ ہوتا ہے۔"
"نہیں۔" فلکی نے کہا "مجھے معلوم ہے' بچّوں والی ماں کو بہت کام ہوتا ہے۔ اچھا ایسا کرو'
دن کے گیارہ بجے تم آ سکتی ہو؟"
"ہاں بیگم صاب! ام ناشتہ کر کے ڈیوٹی پر چلا جاتا ہے... تو پھر یہ آجائے گا۔"
"اچھا یوں کرتے ہیں' دس گیارہ بجے کے درمیان جب بھی میں فارغ ہوں گی' تمہیں بلا
بھیجوں گی... ٹھیک ہے؟"
"بالکل ٹھیک ہے' بیگم صاب!" گل چہرہ نے کہا۔
فلکی اٹھ کر گھر آ گئی۔
راستہ بھر وہ سوچتی رہی۔ آفاق کے پیچھے وہ قرآن پڑھ لے گی... اور پھر اسحاق بھی روزانہ
آٹھ بجے دفتر چلا جاتا تھا۔ گھر پر کوئی نہ ہوگا اور وہ اپنی ایک دیرینہ خواہش پوری کر سکے گی۔
اچھا ہوا' گھر ہی میں ایک پڑھانے والی مل گئی۔

اسحاق نے لات مار کر اس کے بیڈ روم کا دروازہ کھول دیا۔ فلکی لیٹی پڑھ رہی تھی... دم چونک کر اٹھ بیٹھی۔

پل ہی میں اسحاق اس کے سرہانے پہنچ چکا تھا۔

"یہ کیا بورت ہے بھابی! تم سرِ شام ہی دروازہ بند کر کے سو جاتی ہو۔ مجھے اس اتنے بڑے گھر سے وحشت ہوتی ہے۔"

"تو میں کیا کروں..." فلکی نے ناگواری سے کہا۔

"بھئی! ذرا باہر نکل کر ہنگھو گپ لگائیں' میوزک سنیں' ناچیں کودیں..."

فلکی کو اس کا اپنے سر پر کھڑے رہنا ذرا بھی اچھا نہیں لگا۔ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ جلدی دوپٹہ اٹھایا اور باہر کو چل دی۔

لاؤنج میں جا کر وہ رک گئی۔

ابھی رات کے نو بجے تھے۔ ٹی وی پروگرام چل رہے تھے۔ سردیوں کی رات جلدی سیاہ سنسان ہو جاتی ہے۔ ملازم کھانا کھلا کر جا چکے تھے اور فلکی کا دل خواہ مخواہ ڈرنے لگا تھا۔

اسحاق جب سے آیا تھا' اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ گو اسے رشتے احترام ملحوظ تھا... مگر فلکی کو اس کی حد سے بڑھی ہوئی بے تکلفی بالکل پسند نہ تھی۔

پتہ نہیں اسے کیا ہو گیا تھا۔

وہ بچپن سے ایسے لڑکوں میں رہی تھی۔

اور شرمانے والی لڑکیوں کو احساسِ کمتری کی ماری ہوئی مریض لڑکیاں کہتی تھی۔

اب حیا ہی اس کا اوڑھنا بچھونا بن گیا تھا۔

اسحاق نے ٹی وی بند کر دیا اور کیسٹ ریکارڈر پر ایک انگریزی دھن لگا دی۔ فلکی ابھی تک کھڑی ہوئی تھی۔

دھن ایسی ہیجان انگیز تھی کہ اسحاق آپ ہی آپ تھرکنے لگا۔ پھر آگے بڑھ کر اس نے فلکی کی کمر میں بازو ڈال دیا۔

"چلو' بھابی! رقص کرتے ہیں۔"

فلکی نے اس طرح اپنے آپ کو چھڑایا جیسے کسی اچھوت کا ہاتھ لگ گیا ہو۔

"نہیں' اسحاق!" وہ ناراضگی سے بولی۔

"مجھے ڈانس نہیں آتا۔"

"بھیا تو کہتے تھے کہ تم ہر قسم کے رقص کی ماہر ہو۔"

"وہ بہت پرانی بات ہے۔"

"کتنی پرانی..؟"

"بچپن کی۔"

"ہاں تو ایک سال میں ہی تمہارا بچپن بیت گیا۔"

بچپن کا کیا ہے۔ وہ تو ایک دن میں بھی بیت سکتا ہے۔

"اچھا' سچ سچ بتاؤ بھابی! تم اتنی سنجیدہ کیوں رہتی ہو؟"

"نہیں تو... میری صورت ہی ایسی ہے۔"

اسحاق قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"یہ چاند سی صورت بغیر وجہ کے اتنی سنجیدہ نہیں ہو سکتی..... کہیں بھیا تو سختی نہیں کرتے' تم پر؟"

"نہیں' آفاق تو آئیڈیل شوہر ہیں۔"

"ہاں... ہاں' جب لڑکیاں دل کی بات چھپانا چاہتی ہیں تو ہمیشہ لفظ آئیڈیل کا سہارا لیتی ہیں۔ میں جانتا ہوں۔ دنیا میں کوئی آئیڈیل نہیں ہوتا۔"

"میں بھی جانتی ہوں کہ آئیڈیل ہوتے نہیں۔ بنائے جاتے ہیں۔ ڈھالے جاتے ہیں۔"

"تو گویا تم نے بھیا کو ڈھال لیا ہے؟"

"نہیں میں ڈھل گئی ہوں۔"

"ہائے قربان جاؤں۔" اسحاق نے ایک سیٹی بجائی۔

"کاش' ہمیں بھی کوئی ایسی لڑکی مل جائے!"

"ہر لڑکی جو اپنے شوہر سے محبت کرتی ہی' ایسی ہو سکتی ہے۔"

"بھابی! آج کل کی لڑکیاں بڑی خبیث ہوتی ہیں۔ شادی کے بعد بھی ایک آدھ بوائے فرینڈ رکھ چھوڑتی ہیں تاکہ بوقتِ ضرورت کام آئے۔"

"یہ بوقتِ ضرورت کیا ہوتا ہے" فلکی ہنس پڑی۔

"بھئی' ایک سے چھٹکارا حاصل کر کے دوسرا..."

"توبہ... توبہ..." فلکی لرز گئی۔ پھر بالکل اچانک اسے بوبی کا خیال آگیا۔

اس نے بوبی کو اسی طرح استعمال کرنا چاہا تھا۔

لیکن اب...

...اب تو وہ آفاق پر ایک سو زندگیاں قربان کر سکتی تھی۔

"دس بجنے والے ہیں' اسحاق! جاؤ' سو جاؤ... تم نے صبح دفتر بھی جانا ہے۔"

"میں اتنی جلدی سونے کا عادی نہیں ہوں۔"

"تو پھر تمہارا کوئی انتظام کیا جائے۔"

"ہاں' ہاں' بھابی! گھر میں ذرا رونق لگاؤ... بلکہ کرو' اپنی سہیلیوں کو' اپنی کزنوں کو بُلا نا... آخر تمہارا بھی تو حلقۂ احباب ہوگا۔

"پاگل..." فلکی کھڑی ہو گئی۔

"میں تو تمہاری شادی کی بات کر رہی تھی۔ شادی کر لو۔ ساری بوریت دور ہو جائے گی

"کیا شادی سے واقعی بوریت دور ہو جائے گی۔"

"ہاں' بھئی! رات کو جو یوں بوکھلائے بوکھلائے پھرتے ہو۔"

"اچھا جی... تو ایک رات کے لیے اپنا سالم دن تباہ کر لوں۔"

فلکی ہنسنے لگی۔

"اچھا بھابی! تم میری شادی کرا ہی دو... ہے کوئی لڑکی نظر میں؟"

"یہ تو میں تم سے پوچھنے والی تھی... دل میں کوئی ہو تو بتاؤ۔"

"بھئی' نہ کوئی دل میں ہے' نہ نظر میں۔"

"امریکہ میں بھی نہیں...؟"

"امریکہ میں تو ویسے بھی..." اس نے ایک آنکھ بند کر کے کہا "لمحوں کا سودا ہوتا ہے میرے دل میں تو چھید ہے۔ جو لڑکی دل میں رکھتا ہوں گر جاتی ہے۔"

فلکی ہنستی ہوئی اپنے کمرے کی طرف لپکی۔

اسحاق' اس کے پیچھے بھاگا ہوا آیا۔

پھر اس کے منہ کے بالکل قریب چہرہ کرتا ہوا بولا۔

"صورت ایسی ہو' جیسی تمہاری ہے... تو میں حاضر ہوں۔"

"بے ہودہ۔"

فلکی دوڑ کر اپنے کمرے میں چلی گئی... اور اندر سے چٹخنی لگالی۔ کافی دیر تک اسے اسحاق کے قہقہے سنائی دیتے رہے۔

"بھابی او بھابی۔"

اسحاق چیختا ہوا سیدھا باورچی خانے میں آگیا اور اس کی پتلی سی کمر کو دونوں ہاتھوں سے
لیا۔ فلکی چونک کر یوں اُچھلی جیسے بچھو نے ڈس لیا۔ چھچہ اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ "کیا
رہے ہو؟"

اس نے ناگواری سے کہا۔

"تو گانا گا کر بُلایا کروں۔"

"افسوس تمہاری آواز بھونڈی ہے۔ اگر کوشش کرو گے تو محلّے کے گدھے ہی تمہارا
دیں گے۔"

"اچھا۔" اسحاق نے مصنوعی حیرت سے کہا۔ "تو کیا اس محلّے میں گدھے بھی رہتے ہیں؟"

فلکی بوکھلا کر چپ ہو گئی۔ ہنڈیا جلنے لگی تھی۔ جلدی سے اس کے قریب جا کر اس میں
ہلانے لگی۔

"آج کا کیا پروگرام ہے بھابی۔" اسحاق نے چھری اٹھائی اور آلو کاٹنے لگا۔

"کٹے ہوئے آلو خراب نہ کرو۔" فلکی نے اس کے ہاتھ سے چھری لے لی۔ "جو کام
ہو وہ نہیں کرنا چاہیے۔"

"مجھے دنیا کا ہر کام آتا ہے بھابی۔"

"ہاں دنیا میں ہر کام مَردوں کے کرنے کے نہیں ہوتے۔ کچھ کام خالصتاً" عورتوں کے
ہیں۔"

"مثلاً۔"

"مثلاً کھانا پکانا' بچے.. بچّوں... بچّوں کو پالنا.."

جہاں تک کھانا پکانے کا تعلق ہے تو میں تم سے اچھا پکا سکتا ہوں' پوچھ لو میری امی سے...

"ہاں مجھے معلوم ہے۔" فلکی ایک دَم بولنے لگی اور پھر رک گئی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ
آفاق سب کچھ جانتا ہے۔ مگر اسے بتانا نہیں چاہتی تھی کہ اس نے کیسے جانا۔

"ہم دونوں بھائی امورِ خانہ داری میں ماہر ہیں بھابی۔" اس نے اس طرح کہا کہ فلکی کو ہنسی
آگئی۔ "اصل میں ہمارے ابا جی بہت سخت تھے۔ بچپن میں ہی انھوں نے ہمیں گھر سے نکال دیا
تھا۔ اپنے سے دور رکھ کے پڑھایا اور پھر امریکہ میں رہ کر تو ہر کام اپنے ہاتھ سے کرنا پڑتا تھا۔
تمہیں بھیّا نے بتایا نہیں۔"

"بتایا ہوگا۔" فلکی نے بے نیازی سے کہا۔ "مجھے اب یاد نہیں۔"

"ہاں جب تم جیسی خدمت گزار اور وفا شعار بیوی مل گئی ہوگی تو بھیّا نے جان بُوجھ کر نہیں
بتایا۔"

فلکی خاموش رہی۔

"اور وہ دوسری بات جو آپ کہہ رہی تھیں۔"

"کون سی؟"

"وہ بچّے... پالنا وغیرہ... وہ کام ابھی تم نے کر کے تو نہیں دکھایا۔ کیسے مان لیں۔"

"اسحاق میں تمہارے منہ پر گرم گرم چمچ دے ماروں گی۔ اب تم اسی وقت یہاں سے چلے
جاؤ۔"

"بھئی یہ کس کا غصّہ نکل رہا ہے؟"

"بس اب خدا کے لیے یہاں سے چلے جاؤ۔"

"چلا جاتا ہوں مگر پہلے آج کا پروگرام تو بتا دو۔"

"بس وہی جو روز ہوتا ہے۔"

"یعنی کھانا پینا اور سو جانا۔"

"ہاں... ہاں... فلکی بے زاری سے بولی۔

"اس قوم کا کیا بنے گا بھابی' جسے صرف کھانے پینے اور سونے سے ہی فرصت نہ ہو۔" پھر وہ
بھونڈی آواز بنا کے گانے لگا۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

"یہ یکایک قوم کا درد کیوں جاگنے لگا ہے دل میں۔"

"خدا کی قسم بھابی' جب بھی میں یہاں آتا ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے' یہاں زندگی ا
گئی ہے۔ وقت رینگ رینگ کر گزر رہا ہے اور لوگ اتنے سست رفتار ہیں کہ اپنی زندگی ض
کر رہے ہیں۔"

"ہر آدمی جو امریکہ میں رہ کر آتا ہے اسے ایسے ہی لگتا ہے۔"

"لگتا نہیں۔ ایسا ہوتا ہے۔ وہاں تمہیں معلوم ہے کہ لوگ گھڑی کی سوئیوں کے پیچھے بھا
ہیں۔ ایک لمحہ بھی کوئی ضائع نہیں کرتا۔ کام... کام... اور کام۔ یہاں کے لوگ کام کیوں نہ
کرتے۔ دکانوں پر جاؤ تو بیٹھے گپ لگا رہے ہیں۔ دفتر جاتے جاتے راستے میں کوئی مل جائے
قصے شروع کر دیتے ہیں۔ سڑک پر کوئی حادثہ ہو جائے تو چاروں طرف سے لوگ چیونٹیوں
مانند نکل آتے ہیں۔ حادثہ کو سانحہ بنا دیتے ہیں۔ پولیس کار اور زخمی کو اپنی تحویل میں لے
چلی بھی جاتی ہے مگر لوگ تبصرہ کرنے کو وہاں یوں رہ جاتے ہیں جیسے گڑ کے ڈھیر پر مکھیاں۔ ان
یہ بھی بھول جاتا ہے کہ وہ اپنی بیمار بیوی کے لیے دوا لینے چلے تھے۔ بچّہ کو سکول سے لینا تھ
مالک کا کھانا پہنچانا تھا اور بیوی انتظار کر رہی ہوگی وغیرہ وغیرہ۔ یہاں کے لوگوں کے پاس ضا
کرنے کے لیے بہت وقت ہے۔ اس طرح ہم کب زمانے کی دوڑ میں شامل ہو سکیں گے۔"

"وہاں صرف پیسے کے لیے کام کرتے ہیں۔" فلکی بولی "مجھے معلوم ہے امریکن ایک ایک
ڈالر کے پیچھے جان دیتے ہیں۔ یہ سارا ڈالر کا چکّر ہے جو انھیں بھگا رہا ہے اور پھر جو لوگ
طرح مفلس ملکوں سے وہاں جاتے ہیں وہ بھی ڈالر کی اس دوڑ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ یو
بلی چوہے کی دوڑ بھی جاری رہتی ہے۔ وہاں تو پیسہ کمانے کی ایک ریس لگی ہوئی ہے۔ میں
طرح جانتی ہوں۔"

"لیکن وہ لوگ جس محنت اور دیانت سے کماتے ہیں۔ اتنی ہی فراخ دلی سے لٹاتے بھی
عیش بھی کرتے ہیں۔ زندگی اچھی طرح بسر کرتے ہیں۔"

"ہاں جب محنت کا پورا پورا صلہ مل رہا ہو اور ہر ہفتے ایک خطیر رقم ہاتھ آجائے تو ہر آد
زندگی گزارنے کا ڈھنگ آجاتا ہے۔ اسی لیے تو ہمارے ہاں کے لوگ وہاں جا کر واپس آ
نام نہیں لیتے۔"

"کیا کریں یہاں آکر' نہ ویسا کام نہ اتنا پیسہ۔"

"ہاں' مگر اپنے ملک میں اپنی شناخت تو ہوتی ہے نا؟ ڈالر کی دنیا میں وہ اپنی شناخت کھو
ہیں۔"

"شناخت کس کام کی بھابی۔ زندگی تو آرام سے گزر جاتی ہے۔"

"تو تمہیں کس نے کہا ہے کہ اس رینگتے' سسکتے ہوئے ملک میں آجاؤ۔ تمہارے بغیر بھی
ں سب امن ہی تھا۔"

"اوہو! بھابی تم تو جذباتی ہو جاتی ہو۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا کہ تمہاری جیسی لڑکی اتنی
ب الوطن بھی ہو سکتی ہے۔"

"کیوں؟ میرے جیسی لڑکی سے۔ تمہاری کیا مراد ہے؟"

"بھئی سب ماڈرن لڑکیاں تو امریکہ میں رہنے کے خواب دیکھا کرتی ہیں۔"

"معاف کرنا میں ماڈرن لڑکی نہیں ہوں۔" اپنے ان الفاظ پر فلکی کو تعجب ہوا۔

"تو کیا ہو تم' ہمیں بھی بتا دو۔" اسحاق نے قریب آکر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"میں ایک مسلمان لڑکی ہوں اور ایک شریف آدمی کی بیوی ہوں۔"

اسحاق نے اثبات میں سر ہلایا۔

"قائل ہونا ہی پڑے گا' واقعی۔ لیکن وہ بھیّا جی جو امریکہ گئے ہوئے ہیں' ان کے بارے
ا کیا خیال ہے؟"

"وہ لوٹ آئیں گے۔"

"فرض کرو اگر وہ لوٹ کر نہ آئے تو...؟"

"نہ آئے تو۔" ٹماٹر کاٹتے ہوئے چھری فلکی کے ہاتھ سے نیچے گر گئی۔ کبھی کبھی اس کے دل
ں بھی یہ وہم آتا تھا۔ یہ سوچ کر وہ لرز جاتی تھی کہ اگر آفاق اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ گیا تو...
ظالم پلٹ کر نہ آیا تو... فلکی کا دل ایک دَم ڈوبنے لگا۔

"فرض کرو بھابی! بھیّا وہیں اپنی دنیا بسا لیں تو..." اسحاق نے پھر ایک چُوکا لگایا "تو... کیا
گا۔ تم ان کے پیچھے امریکہ نہ جاؤ گی؟"

"میں فرض نہیں کیا کرتی۔" فلکی نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اس لیے کہ تم ایک بزدل لڑکی ہو۔ کہو تری ہو۔ آنکھیں بند کر لیتی ہو یا کر لینا چاہتی ہو۔"

فلکی کا دل چاہا وہ اسحاق کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑ دے اور پوچھے کہ صاف صاف بتا دو تم
نوں بھائی مل کر کیا سازش کر رہے ہو۔ اس نے اپنی آنکھوں میں آنے والے آنسو پی کر کہا
میں زندگی کے حقائق کا سامنا کرتی ہوں۔"

"بھیّا کے ذکر پر تمہاری آنکھوں میں آنسو آگئے ہیں۔ اتنی سی بات پر نازک دل کو

ٹھیس لگ گئی ہے اور اب ان آنسوؤں کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔"

"اسحاق اب دفعان ہو جاؤ یہاں سے۔ ورنہ میں تمہیں مار بیٹھوں گی۔" فلکی نے اٹھالی۔

"پنجابی زبان میں اسے کہتے ہیں گدھے کا غصہ کمہار پر..."

مگر وہ ڈر کے مارے دور چلا گیا۔ فلکی ابھی تک اسے غصے سے گھور رہی تھی۔ ا لئے دور ہوتا گیا اور ہنس کر بولا۔

گھبراؤ نہیں اگر بھیا نہ آئے تو... میں جو ہوں یہاں۔ تمہاری خاطر پاکستان میں ٹِک گا۔"

فلکی کے چہرے پر ناگواری اور غیض و غضب کی کیفیت نمودار ہوتے دیکھ کر بولا۔ "برا بھی نہیں ہوں میں، بلکہ بھیا سے زیادہ زندہ دل ہوں۔"

جب فلکی اسے مارنے کو دوڑی تو وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا اور جب موٹر اسٹارٹ کی آواز آئی تو فلکی کی جان میں جان آئی۔ مگر کم بخت جاتے جاتے اسے سوچوں کے کر دوراہے پر چھوڑ گیا تھا۔

ارہ بجے فارغ ہو کر فلکی سامنے پورچ تلے بڑے بڑے سیمنٹ کے گملوں کے پاس آ کر بیٹھ
۔ دھوپ اور سائے کا حسین امتزاج تھا۔ وہاں پودوں اور پھولوں سے چھن چھن کر گرم
م دھوپ اس کے ٹھنڈے ٹھنڈے پاؤں چھو رہی تھی۔ دھوپ کا یوں قدم بوسی کرنا اسے
ا اچھا لگ رہا تھا۔ اچھا تو اسے سیڑھیوں پر بیٹھنا بھی لگتا تھا۔ اپنے گھٹنوں پر اپنی ٹھوڑی جما
وہ سوچوں میں غرق ہو گئی۔ اس ظالم نے عرش اور فرش کی تمیز مٹا دی تھی۔ اس کی ہستی کو
ب کر دیا تھا اسی لیے تو جہاں من میں آتا، وہیں بیٹھ جاتی۔

ہوا چلتی تو پودے ہلنے لگتے اور ان کا سایہ دھوپ میں سے چھن چھن کر سامنے دیوار پر پڑتا۔
ا پرچھائیوں کے سوا فلکی کے پاس تھا ہی کیا۔ یہی پرچھائیاں اس کی مونس و غم خوار تھیں اور
ا پرچھائیاں راز دار تھیں۔ کسی سے وہ کہے بھی تو کیا کہے۔ آخر کہنے کو ہے کیا۔ پھر وہ دھیرے
رے منہ ہی منہ میں کچھ گنگنانے لگی۔

یہ اداسی، یہ پھیلتے سائے
ہم تجھے یاد کر کے پچھتائے

اس وقت گھنٹی بجی اور ڈاکیہ اپنی سائیکل پر سوار گیٹ کے اندر نمودار ہوا۔ فلکی کا دل
ک کر حلق تک آگیا۔ تب اسے یاد آیا کہ وہ یہاں کیوں آ کر بیٹھ گئی تھی۔ شاید اسے بھی
کچھ کا انتظار تھا۔ اسے معلوم تھا روزانہ اسی وقت ڈاک آتی ہے۔ روزانہ وہ سارا کام کر کے
ی وقت یہاں سیڑھیوں میں آ کر بیٹھ جاتی تھی۔ ایک انجانا سا انتظار رہتا تھا۔ کبھی گھنٹی سنائی
ی۔ کبھی نہیں۔ کبھی کوئی خط آجاتا۔ کبھی صرف آہٹیں ہوتیں۔ کیا اسے کسی خط کا انتظار تھا۔
خط کا انتظار کیا ہوتا ہے؟ اس درد سے تو وہ آشنا ہی نہ تھی۔ پھر کون ہے بھری دنیا میں اسے
لکھے۔ ہاں اب کبھی کبھار ممی اور ڈیڈی کا مشترکہ خط آجاتا تھا۔ ممی کے خط میں ہی ڈیڈی چند
لفظ لکھ دیتے تھے اور بس...

ڈاکیے نے ایک نیلے رنگ کا ہوائی لفافہ تھیلے میں سے نکالا تو فلکی کا سارا خون چہرے پر ا
دوڑ کر گئی اور جھپٹ کر خط ڈاکیے کے ہاتھ سے لے لیا۔ ڈاکیہ بھی اس بے تابی پر مم
ششدر رہ اسے دیکھتا ہوا مڑ گیا۔

"بیگم صاحبہ نے آج بالکل بچوں والی حرکت کی تھی۔"

فلکی نے الٹ پلٹ کر لفافہ دیکھا... پھر دیکھا... پھر دیکھا اور مایوسی سے آ کر بیٹھ گئی۔

یہ ممی کا خط تھا

لیکن کاش یہ ممی کا خط نہ ہوتا۔ یہ وہ خط ہوتا جس کا اسے انتظار تھا۔ پل پل گھڑی گھڑ
افسوس جس خط کا انتظار تھا' وہ خط جانے کہاں کھو گیا تھا۔

دل میں درد سا ہونے لگا۔ آنکھوں میں کڑوا کڑوا پانی جمع ہونے لگا۔ فلکی کے سارے و
مایوسی چھا گئی۔

وہ پھر دھوپ اور سائے میں بیٹھ گئی۔ ایک ٹھنڈی سانس کھینچی تو ہوا کے ساتھ
لرزنے لگے جیسے کہہ رہے ہوں۔

یہ اداسی یہ پھیلتے سائے!
ہم تجھے یاد کر کے پچھتائے
ہم جو آئے تو رہ گزر نہ ملی
وہ جو آئے تو منزلیں لائے

پتہ نہیں اس کی منزل کہاں تھی؟

سرِ راہ بیٹھی تھی۔ نہ آگے کوئی نشان تھا نہ پیچھے کوئی راستہ۔ کسی راستے پر خود ا
قدموں کے نشان بھی نہیں بنتے تھے۔

اللہ کرے لُٹا پٹا کوئی ایسا مسافر بھی نہ ہو۔

اور آفاق اسے کیوں خط لکھتا۔ کیا اس نے وعدہ کیا ہے۔ کیا اس کا رویّہ ایسا عاشقا
اس نے تو جاتے وقت مشورہ بھی نہ کیا پتہ نہیں کہاں ہوگا؟ کیا کر رہا ہوگا؟ خدا جانے ا
محبوبہ کو ملنے چلا گیا ہو۔

آخر مرد جو ہے۔

یہ سوچ کر فلکی کے دل میں آہ اٹھی۔

اور بالکل اچانک اسے نوری کا خیال آگیا۔ پتہ نہیں کون تھی وہ مگر وہ بھی تو امریکہ م

ہو سکتا ہے آفاق اس کے لیے امریکہ گیا ہو۔

سوچ کر اسے غصّہ آگیا۔ وہ خواہ مخواہ ایک ہرجائی مرد کے لیے ہلکان ہو رہی تھی۔ جلدی
ھی میں پکڑا ہوا خط اس نے آنکھوں کے آگے کر لیا۔ بالوں میں سے ایک پن اتاری اور
کو بڑے سلیقے سے کھولنے لگی۔

ی کا محبت بھرا خط تھا۔

ی نے لکھا تھا یہ ان کا آخری خط ہے اور یہ خط پہنچنے تک وہ پاکستان پہنچ جائیں گی۔
لے جب ممی کی اِطّلاع آتی تھی تو وہ پھولے نہ سماتی تھی۔ کئی دن پہلے تیاریاں شروع کر دیتی
جشن مناتی تھی۔ زیادہ خوشی اسے اس بات کی ہوتی تھی کہ ممی اس کے لیے ملک ملک کی
ی ڈھیر چیزیں لائیں گی جنھیں وہ اِترا اِترا کر اپنی سہیلیوں اور دوستوں کو دکھائے گی۔ ممی
لے خاص خاص دوستوں کے لیے بھی تحفے لایا کرتی تھیں اس لیے اس کے سارے احباب
بے چینی سے انتظار کیا کرتے تھے۔

اب سیڑھیوں پر بیٹھی سوچ رہی تھی۔

ی اتنی جلدی کیوں آ رہی ہیں بھلا؟ اگر کچھ دن اور رک جاتیں تو کیا تھا۔

ں آکر مجھے کس قدر بور کریں گی۔

یہ محویت ٹوٹ جائے گی۔

رے انتظار میں خلل ہوں گی۔

ں جو جنم جنم کا جوگ لیے بیٹھی ہوں۔

لے پاؤں تپیا کے جنگل میں۔ آس و نراش کا چمٹا بجاتی چلی جا رہی ہوں کہیں وہ مجھ سے
ا یہ چمٹا چھین نہ لیں۔ میری آبلہ پائی کا مذاق نہ اڑائیں۔ میرے جوگ کو بے وقوفی نہ
۔ میرے سنسان' بے رنگ صبح و شام میں دخل اندازی نہ کریں۔

ں یہ صبحیں اور یہ شامیں یونہی رہیں۔

ی یونہی سلگتی رہوں۔

ٹ چاپ...

وش....

"بھابی او بھابی فلک ناز!" اسحاق نے شور مچادیا "کہاں ہو بھئی۔ تیار ہو یا نہیں؟"

کوئی آواز نہیں آئی تو فلکی کے کمرے میں چلا گیا۔ قالین پر سبز جائے نماز بچھائے فلکی ما
کی نماز پڑھ رہی تھی۔

"اُف خدایا... اُف خدایا... میری آنکھیں یہ سب دیکھ رہی ہیں مگر مجھے پھر بھی یقین
آرہا... آخر کیسے یقین کرلوں۔ یعنی... یعنی یہ بی جن باقاعدہ نماز پڑھ رہی ہیں۔" وہ بڑبڑا
کبھی کمرے کے اندر جاتا اور کبھی کمرے کے باہر۔

اتنے میں فلکی نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا لیے۔

"آمین... آمین..." وہ شیشے کے آگے کھڑا ہو کر' اس کا اسپرے اپنے کپڑوں پر چھڑکنے لگا
فلکی نے نماز پڑھنے کے بعد جائے نماز کو تہہ کیا اور سٹول پر رکھ دیا۔

"تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ تم بغیر اجازت میرے کمرے میں نہ آیا کرو اسحاق۔"
فلکی نے ناگواری سے کہا۔

"واہ۔" وہ مڑ گیا۔ "ذرا اپنی شکل تو دیکھو۔ کیسی خوفناک بنالی ہے۔ کیا میں تمہارے کمر
میں دستک دے کر آیا کروں۔ میں کوئی بدنیت آدمی ہوں۔ تمہارا دیور ہوں۔ جب چاہو
آؤں گا' جاؤں گا۔ بھیا مجھے سب اختیارات دے کر گئے ہیں۔"

"میں نہیں جانتی۔" فلکی اپنے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ "تم وقت بے وقت مجھے ڈسٹرب کرتے ہ
اب میں نماز پڑھ رہی تھی اور تم مسلسل بک رہے تھے۔ یہ کیا طریقہ ہے؟"

"شاید تم نئی نئی مسلمان ہوئی ہو۔ ورنہ میں نے دیکھا ہے۔ ڈھول بجتے رہتے ہیں۔
چٹخارتے رہتے ہیں اور لوگ نماز پڑھتے رہتے ہیں۔ ایک وقت میں دو کام کرتے ہیں' گا
سنتے ہیں اور اللہ میاں کو بھی خوش کرتے ہیں۔"

"کرتے ہوں گے۔" فلکی نے ناگواری سے کہا "مجھے سکون کے ساتھ نماز پڑھنے میں ا

۔ تم نے ٹھیک سے دعا بھی نہیں مانگنے دی۔"

ور تم دعا میں کیا مانگنا چاہتی تھیں؟" اسحاق بالکل اس کے سامنے صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔
یا رہ گیا ہے جس کی تمہیں تمنا ہے؟"

روری نہیں کہ آدمی ہمیشہ دنیاوی چیزوں کی خواہش کرے۔"

رحبا' سبحان اللہ۔" اسحاق نے مصنوعی انداز میں جھوم کر کہا۔ "تو گویا تم دنیا سے ماورئ
ہو۔ یہ منزلیں کہاں طے کیں۔ کب طے کیں؟"

او اسحاق' مجھے تنگ نہ کرو۔"

دھے سیدھے کہو تم بھیا کے لیے اداس ہو گئی اور اب ان کی واپسی کی دعائیں مانگ رہی

ں ایسی دعائیں نہیں مانگا کرتی۔"

کیا چاند سا مُنّا مانگنے کے لیے دعا کر رہی تھیں۔"

اند سا مُنّا۔" فلکی کو ہنسی آگئی۔ اس کے آنگن میں چاند ہی نہ اترا تھا' مُنّا کہاں سے آئے

دعا مانگی ہے تو بھیا کو آنے دو۔"

اپنے خیالات میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کی بات نہیں سنی۔ بے خیالی میں بولی۔

ادت ہر بندے کا خدا سے ذاتی معاملہ ہوتا ہے۔ اللہ سے کچھ مانگنے کی ضرورت نہیں
وہ بن مانگے خود دیتا ہے۔"

ابی! تم تو واقعی صوفی ہوتی جارہی ہو۔

اس چاند سی جبیں پہ عبادت کا نقش ہو!
ظالم خیال کر ابھی عہدِ شباب ہے

نی میں ایسی باتیں کر رہی ہو تو بھیا بے چارے کیا کریں گے۔"

چھا تم اس وقت جاؤ اسحاق۔"

اں جاؤں؟ میں تو پکچر کے دو ٹکٹ لے آیا ہوں۔ جلدی چلو دیر ہو جائے گی۔"

ں نہیں جاؤں گی۔"

کیوں نہیں جاؤ گی۔ میں زبردستی لے کر جاؤں گا۔"

حاق میرے ساتھ زبردستی نہ کرنا۔ میں طبیعت کی بہت بری ہوں۔"

"میں بھی کوئی اچھا آدمی نہیں ہوں۔ بھیا کی شرافت سے میرا اندازہ مت لگانا۔ ز
اٹھاؤں گا اور موٹر میں ڈال دوں گا۔"

"بھیا کی شرافت۔" فلکی ذرا مسکرائی۔ گویا یہ اپنے بھائی کو بہت شریف سمجھتے ہیں۔"

"اسحاق۔" فلکی بہت نرمی سے بولی۔ "مجھے پکچر وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"مانا کہ تمہیں دلچسپی نہیں ہے۔ مجھے تو ہے۔ بعض اوقات دوسروں کی خوشنودی کی
کچھ کرنا چاہیے۔"

"تم ایسا کرو اپنے کسی دوست کو لے جاؤ۔"

"اس وقت میں کون سے دوست کو لے جاؤں۔ جب پکچر شروع ہونے میں دس
ہیں۔"

فلکی خاموش ہو گئی۔

"بڑی اچھی فلم ہے "مارنی" دیکھ کر تو جی خوش ہو جائے گا۔"

""مارنی" میں پہلے بھی دو دفعہ دیکھ چکی ہوں۔ اب نہیں دیکھوں گی۔"

"ہاں اگر پنجابی میں اس کی نقل "چورنی" کے نام سے بنی ہوتی تو تم پانچ دفعہ دیکھتیں۔"

فلکی ہنسنے لگی۔

"میں نے کبھی پنجابی فلم بھی نہیں دیکھی۔"

"کب سے نہیں دیکھی؟"

"جب سے شادی ہوئی ہے۔"

"تمہاری شادی کو ابھی تو سال بھی نہیں ہوا اور اتنے کم عرصہ میں تم بدل گئی ہو۔"

"بس لڑکی اپنے گھر میں مگن ہو جائے تو پھر سب کچھ بھول جاتا ہے۔"

"تم مگن ہو گئی ہو؟"

"ہاں۔"

"ذرا اپنا چہرہ تو دیکھو' ہر وقت اداسی اور مایوسی چھائی رہتی ہے۔"

فلکی خاموش ہو گئی بلکہ اداس ہو گئی۔ یہ کم بخت اس کا بھرم توڑنے کے درپے تھا۔ پتہ
کیوں اس کے اعصاب پر سوار ہو رہا تھا۔

اسے خاموش دیکھ کر اسحاق نے سوچا کہ وہ نیم رضامندی سی ہو گئی ہے۔ ایک دم سے کھڑا
اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچ لیا۔

ی نے اپنا ہاتھ یوں چھڑایا جیسے بھڑ نے کاٹ لیا ہو اور ذرا دور سٹ کر کھڑی ہو گئی اور
ی سے بولی۔

"اسحاق تم دور سے بات کیا کرو۔ میں اتنی بے تکلفی پسند کرتی۔"

"ہاں اگر بے تکلفی اپنی مائیں بہنیں پسند نہیں کریں گی تو کیا باہر کی لڑکیاں پسند کریں گی؟ تم
ہ میں تمہیں اٹھا کر لے جاؤں۔"

"اچھا دور رہو۔" فلکی نے ڈرتے ہوئے کہا "میں خود چلتی ہوں۔"

"کیا اسی حلیے میں جاؤ گی؟"

"کیوں میرے حلیے کو کیا ہوا ہے؟"

"بالکل ملانی لگ رہی ہو۔ سلوٹ زدہ کپڑے' پاؤں میں چپل' سر پر دوپٹہ۔"

"میں تو اسی طرح چلوں گی۔"

"کسی لڑکے کے ساتھ خوب صورت لڑکی جا رہی ہو تو سب مڑ مڑ کر دیکھتے ہیں۔ خواہ وہ خوب
ت لڑکی اس کی بہن ہو۔"

"بے غیرت۔" فلکی نے بے ساختہ کہا۔

"اچھا محترمہ غیرت صاحبہ اب آ بھی چکو۔"

اسحاق کمرے سے باہر نکل گیا۔ فلکی اس کے پیچھے پیچھے مرے مرے قدموں سے چلتی ہوئی
اصل میں اسحاق کے ساتھ فلم دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ شادی کے بعد آفاق کے ساتھ ایک
لم دیکھی اور محبوب کے ساتھ اندھیرے میں بیٹھ کر فلم دیکھنا کیا ہوتا ہے' اس پر عیاں ہو گیا
اور اب وہ کسی کے ساتھ بیٹھ کر بھی فلم نہیں دیکھنا چاہتی تھی' چاہے وہ اس کا سگا بھائی ہی
ں نہ ہو۔ آفاق اور اسحاق میں بہت فرق تھا۔

ہ کچوکے لگاتا تھا۔

اور یہ زخم کریدتا ہے۔

مارا وقت ہنگامہ کرے گا۔ جانے کیا کیا کہے گا اور آفاق سوچے گا کہ میں اتنی سستی لڑکی
کہ مجھے ہر کوئی فلم دکھانے لے جا سکتا ہے۔ باہر نکل کر اس نے اپنی چپل دیکھی اور بولی۔

رو تو ابھی آتی ہوں۔ جوتا بدل آؤں۔"

وتا بدلنے کے بجائے وہ غسل خانے میں چلی گئی۔

ے پندرہ منٹ برباد کر کے جب وہ باہر آئی تو اسحاق غصے سے کھول رہا تھا۔ وہ چپ چاپ

موٹر میں بیٹھ گئی۔

"شکر ہے سواری' بادِ بہاری آئی تو۔"

"دیکھو اسحاق مجھے مزہ نہیں آتا۔ اگر پکچر شروع ہو چکی ہو۔"

"نہیں۔ یہ انگریزی فلم ہے دیر سے شروع ہوتی ہے۔"

"پلیز۔ ایک بات میں کہہ دوں۔ اگر فلم شروع ہو چکی ہوئی تو میں اندر ہرگز نہیں جاؤ گی۔"

"آپ نے تو دوبار دیکھی ہوئی ہے۔"

"خواہ دیکھی ہوئی ہو۔ شروع پکچر میں نہیں دیکھوں گی۔"

"ٹھیک ہے۔"

اور فلکی دل میں دعا کرنے لگی کہ پکچر شروع ہو چکی ہو۔

سنیما ہال پہنچ کر اسحاق جلدی سے اترا اور اندر چلا گیا۔

اللہ کرے پکچر شروع ہو چکی ہو۔ فلکی دل ہی دل میں دعائیں کرنے لگی۔

ابھی وہ بیٹھی دعائیں کر رہی تھی کہ اس نے دیکھا کہ ایک خاتون ہنستی مسکراتی پرس جُھلا اندر سے آ رہی ہے۔ فلکی نے سرسری نظر سے دیکھا تو وہ چہرہ شناسا سا لگا۔ پھر غور سے دیکھنے لگ قریب آئی تو فلکی نے اسے پہچان لیا۔

وہ نوری تھی۔

آفاق کی دوست نوری۔

آج بھی نوری نے براؤن رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی اور اتنی سخت سردی میں سلیولیس بلاؤز پہنا ہوا تھا۔ اس کے گورے گورے بازو گہرے براؤن رنگ میں چمک رہے تھے اور ا لگ رہا تھا۔ جیسے بھری بہار میں چمن میں چہل قدمی کو نکلی ہو۔

فلکی کے دل میں ایک دَم دو طرح کے جذبات جاگے۔

پہلے تو اسے غصہ آیا اور اس کے دل میں حسد لہریں لینے لگا۔ نوری کا سامنا کرنا بہت برا لگا۔ دوسرے ہی لمحے اس کا تجسس جاگا اور اس کا دل چاہا وہ نوری کو روک کر اس سے باتیں کرے۔ ہاں یہ پوچھے جب آفاق اس کی خاطر امریکہ چلا گیا ہے تو وہ یہاں کیا کر رہی ہے؟

نوری کی نظر اس پر نہیں پڑ رہی تھی۔ وہ ہنستی ہوئی' پرس جُھلاتی ہوئی اپنی گاڑی کی طرف بڑھی چلی جا رہی تھی۔

کہ فلکی نے ایک دم اپنی کار کا دروازہ کھول دیا اور دوڑ کر نوری کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"ارے" نوری ایک دَم چونکی۔ پھر شناسائی کی روشنی اس کے چہرے پر چمکی۔ اس نے جلدی سے فلکی کا ٹھنڈا برف ہاتھ تھام لیا۔ فلکی نے صاف محسوس کیا باوجود اس کے نوری نے گرم کپڑے نہیں پہنے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ گرم تھے اور فلکی نے گرم شال لپیٹ رکھی تھی' مگر اس کے ہاتھ ٹھنڈے برف تھے۔

زندگی اور محرومی میں کیا فرق ہے۔ اسے فوراً پتہ چل گیا۔

"ارے..... فلکی... فلکی۔" ... وہ چیخی۔

یہ کہہ کر اس نے فلکی کو اس طرح لپیٹ لیا کہ فلکی کا ایک رخسار نوری کے رخسار کے ساتھ مس ہوا۔ نوری کے جسم میں سے جان لیوا خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں۔ نوری ایک بھڑکتا ہوا شعلہ لگ رہی تھی۔

اور فلکی بجھی ہوئی آگ۔

فلکی کے دل میں پھر حسد کی لہریں اٹھنے لگیں۔ اس کا جی چاہا وہ نوری کا منہ نوچ لے۔ اس کو لہولہان کر دے۔ اس کا خوب صورت چہرہ بگاڑ دے۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے نوری ایک جادوگرنی ہے جس نے اس کے آفاق کو مکھی بنا کر دیوار کے ساتھ چپکا دیا ہے۔

"کیسی ہو؟" نوری نے لگاوٹ سے پوچھا۔ "آفو کہاں ہے؟ اچھے ہو تم میاں بیوی' اپنے آپ میں مگن رہتے ہو۔ اس دعوت کے بعد صورت ہی نہیں دکھائی۔ پکچر دیکھ چکی ہو یا دیکھنے جا رہی ہو"

"نہ دیکھ چکی ہوں' نہ دیکھنے جا رہی ہوں۔ بس زبردستی لائی گئی ہوں۔ اسحاق کو آپ جانتی ہیں۔"

"ہاں ہاں۔" وہ اپنائیت سے بولی "تم کاکو کا ذکر کر رہی ہو نا؟ آفو کا چھوٹا بھائی۔"

"جی وہ مجھے زبردستی لے آیا تھا... اور..."

"ہاں کاکو فلموں کا بڑا شیدائی ہے اور اس کا یہ بچپنا جائے گا نہیں۔ آفو اور کاکو میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔"

فلکی کو یوں محسوس ہوا۔ جب نوری آفاق کا ذکر کرتی ہے' اس کے لہجے میں شہد گھل جاتا ہے اور کتنی بے تکلفی سے یہ پورے خاندان کا ذکر کرتی ہے جیسے .... جیسے ... فلکی کے اندر آگ سی جلنے لگی۔

اسی وقت ایک اونچا' لمبا' بڑی بڑی قلموں' گھنی گھنی مونچھوں اور لمبے لمبے بالوں والا ایک آدمی بازو پر ایک سفید کوٹ لٹکائے باہر آگیا اور ان کے قریب آکر کھڑا ہوگیا۔

"تم دنیا کے کسی خطّے میں چلی جاؤ تمہیں کوئی نہ کوئی واقف کار ضرور مل جاتا ہے۔" اس نے پائپ کا کش لے کر کہا۔

نوری اس طرح ہنسی جس طرح سکّے ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔

Dont be Jealous Darling

اس نے ادا سے کہا۔ پھر فلکی سے بولی "پہلے میں تعارف کرا دوں۔ یہ سرمد ہے۔"

"بھئی کچھ آگے بھی کہو۔" سرمد نے اسے ٹھوکا دیا۔

"میں سوچ رہی تھی۔ الفاظ ڈھونڈ رہی تھی..."

"میں نے تم سے کہا تھا نا فلکی! کہ پاکستان میں میرا دل ہے... تو یہ ہے' وہ دل' جس کے لیے میں یہاں آگئی۔"

سرمد قہقہہ لگا کر ہنسا۔

فلکی کو جیسے چکّر آگیا۔

"ایک مہینہ ہوا' میری اور سرمد کی شادی ہوگئی ہے مگر تم جانتی ہونا' مرد بڑا خودپسند ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ جس عورت سے اس نے شادی کی ہے' وہ ہر بار' سرِ محفل' سرِراہ اس بات کا اعتراف کرے کہ اس نے اس آدمی کے آگے گھٹنے ٹیکے ہیں۔ اپنا حُسن اور جوانی اس کو خیرات میں دیا ہے... کیوں سری؟" اس نے سرمد کی آنکھوں میں جھانکا۔

"اوہ... نو... نو... میں تو یونہی مذاق کر رہا تھا۔ سرمد نے پیار سے نوری کا ہاتھ تھام لیا۔

"مگر مجھے اعتراض نہیں۔" نوری اس کے کندھے سے لگ گئی۔

"ساری زندگی' ساری دنیا کو یونہی سرِراہ چیخ چیخ کر کہہ سکتی ہوں کہ اس آدمی نے میری زندگی اجیرن کی ہوئی تھی۔ اپنی ہر بات منوائی ہے اس نے' اور اب مجھے پاکستان لے آیا ہے' ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔"

You are Lovable سرمد نے بڑے پیار سے کہا۔

فلکی کھڑی کھڑی تھر تھر کانپنے لگی۔ میاں بیوی کا یہ انداز بھی ہو سکتا ہے۔ اسے اپنی شادی کے دن یاد آگئے۔

کیسی قیامتیں گزری تھیں' اس پر۔

تو یہ ہوتی ہے محبت کی شادی۔

"ڈارلنگ! یہ اظہارِ محبت کا پلیٹ فارم نہیں' سینما ہال کی راہ گزر ہے۔" سرمد نے یاد دلایا۔

"خود ہی باتوں میں الجھا لیتے ہو۔ ابھی تک میں نے تمہیں بتایا ہی نہیں کہ یہ کون ہیں؟"

"ہوگی' تمہاری کوئی پرانی دوست۔" سرمد نے لاپرواہی سے کہا۔

"نہیں' میری دوست نہیں بلکہ دوست سے کچھ بڑھ کر ہے۔"

"کیا مطلب...؟"

"یہ میری بھابی ہیں... اور وہ بھائی' جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ

؎ غالب' ندیم دوست سے آتی ہے بُوئے دوست

"ہیں... ہیں... دوست... بھابی۔ یہ کیا چکّر ہے۔ میں تمہاری سب بھابیوں کو جانتا ہوں۔ کیا کسی بھائی نے چوری چھپے...؟" سرمد نے بائیں آنکھ بند کی۔

"او نہیں نہیں..." نوری زور سے ہنسی۔

"تمہیں یاد ہے... آفو... آفاق...؟"

"ہاں ہاں..." سرمد کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک لہرائی۔

"فلکی' آفو کی بیوی ہیں... جانتے ہو' دونوں کی لَو میریج ہوئی ہے؟"

"اچھا..."

"مجھے' آفو نے خود بتایا تھا۔ اور واقعی فلکی اور آفو کا جوڑ ہے۔"

"منہ پر تعریف جھوٹی ہوتی ہے۔"

"اچھا اب بکواس نہیں۔"

"یہ کیا ڈرامہ ہو رہا ہے بھئی؟" اسحاق ایک دَم سے بیچ میں کُود پڑا۔

"ارے' کاکو...!"

"اوہ... نوری آپا...!"

"کیا عجیب ملاقات ہے۔"

"اور کتنی عجیب جگہ پر۔" اسحاق نے سینما ہال کی طرف اشارہ کیا۔

سب ہنسنے لگے۔

تھوڑی سی علیک سلیک اور خیر و عافیت دریافت کرنے کے بعد اسحاق نے فلکی کی طرف منہ کر کے کہا۔

"بسورتا ہوا منہ لے کر نکلی تھیں نا... آدھی فلم چل چکی ہے۔ کھڑے کھڑے دو تین سین دیکھ کر نکل آیا ہوں۔"

"تم فلم دیکھنے آئے تھے؟" نوری نے پوچھا۔

"ہاں آپا!"

"تو پھر دیر کیوں کی؟"

"یہ محترمہ نہیں آرہی تھیں۔ ان کا موڈ نہیں تھا۔ شوہر صاحب یاد آرہے تھے۔"

"ارے' ہاں.... آفو کہاں ہے؟"

"چلے گئے امریکہ۔ وہ ایک جگہ ٹِک کر تو نہیں رہ سکتے نا۔" اسحاق نے اسی لہجے میں کہا۔

"آپ پکچر دیکھ کر جارہی ہیں؟" فلکی نے بات بدلنے کے لیے پوچھا۔

"نہیں' اس سنیما کا مالک' سرمد کا دوست ہے۔ ہم اسے ایک پیغام دینے آئے تھے۔ اس نے ہمیں چائے پر بٹھالیا۔ ورنہ ہمیں فلم دیکھنے کی فرصت کہاں۔"

"ہاں' ہنی مون کے دنوں میں تو اپنے گھر میں فلم چلتی ہے۔" اسحاق نے لاپروائی سے کہا۔

"کمینہ..." نوری نے اس کے منہ پر ہلکی سی چپت لگائی۔

"یہ کبھی نہیں بدل سکتا' ہے نا فلکی؟"

"ہاں...." فلکی ہنس پڑی۔

"بھئی' گپ ہی لگانا ہے تو کسی جگہ چل کر بیٹھتے ہیں۔ مجھے بھی کافی بوریت ہورہی ہے۔" اسحاق نے کہا۔

"چلو کسی ریستوران میں بیٹھیں۔" سرمد بولا۔

"نہیں۔ اس طرح کریں کہ ہمارے گھر چلیں۔ وہیں گپ شپ ہوگی۔" فلکی نے ذرا جرأت کرکے کہا۔

نوری نے اجازت طلب نظروں سے سرمد کی طرف دیکھا۔

سرمد نے منہ سے پائپ نکال کر کہا "صرف آدھا گھنٹہ۔"

"ٹھیک ہے۔"

وہ لوگ اپنی اپنی موٹروں میں بیٹھ گئے۔

اتفاق سے سرمد اور نوری کی موٹر آگے تھی۔

فلکی دیکھ رہی تھی کہ سرمد کا ایک ہاتھ نوری کے کندھے پر تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ موٹر

رہا تھا۔ ابھی جب وہ ہال سے باہر آیا تھا تو اس نے اپنے بازو پر نوری کا فرکوٹ ڈال رکھا تھا۔

وہ کوٹ اس نے پچھلی سیٹ پر رکھ دیا تھا۔

کیا سرمد مرد نہیں تھا...؟

کیا نوری عورت نہیں تھی..؟

لیکن ایک قدر مشترک تھی ان میں۔

وہ ایک دوسرے سے عشق کرتے تھے' محبت کرتے تھے۔

... اور بس...

"رازداں" میں دونوں موٹریں آگے پیچھے داخل ہوئیں۔

فلکی جلدی سے کافی کا کہہ کر ڈرائنگ روم میں آگئی۔

"فلکی! میں تم سے خفا ہوں۔" نوری نے پیار سے کہا۔ "تم سے بھی اور آفو سے بھی!"

"کیوں....؟" فلکی نے معصومیت سے پوچھا۔

"تم دونوں میری شادی پر کیوں نہیں آئے۔"

"آفاق یہاں نہیں تھے۔"

"لیکن تم تو آسکتی تھیں۔"

فلکی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا جواب دے۔ اسے تو پتہ بھی نہیں تھا کہ ان کی شادی ہوئی۔ آفاق نے اسے کارڈ بھی نہیں لاکر دیا تھا۔

فلکی تھوڑی دیر چپ رہ کر بولی۔ "میں آپ کو منالوں گی۔"

"آفو نے تمہیں بالکل اپنے جیسا کردیا ہے۔"

"بس... بس..." اسحاق کھڑا ہوگیا۔ یہ تو تمام تر آفاق بن چکی ہیں۔ انتہائی بور قسم کی خاتون۔ ان کا بس چلے تو بھیّا کے آنے تک برت رکھ لیں۔ فلم دیکھنا ان کو برا لگتا ہے۔ ہنسنے بولنے سے پرہیز کرتی ہیں۔ سنسار سے انھیں چڑ ہوگئی ہے۔ ہر ایک کو کاٹ کھانے کو دوڑتی ہیں۔"

"اسحاق! جھوٹ نہ بولو۔" فلکی ہنس کر کھڑی ہوگئی۔ عبدالکریم کافی لے آیا تھا۔ وہ اُٹھ کر بنانے لگی "آج یہ زبردستی مجھے فلم دکھانے لے جانا چاہتا تھا اور میرا موڈ نہیں تھا۔" فلکی نوری کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اس کا مطلب ہے آپ کو اپنے شوہر سے بہت محبت ہے۔" سرمد نے اُٹھ کر کافی کی پیالی پکڑلی۔ خشک میوے کی مٹھی بھری اور اپنے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"آفو بہت خوش نصیب ہے۔" نوری نے کہا۔ "یہ تو میں نے اسے اُس دن بھی کہا تھا۔
نوری نے بھی اپنی پیالی لے لی۔
"تمہیں ایک مزے کی بات بتاؤں فلکی!
ہم تینوں کا بچپن اِکٹھا گزرا ہے۔"
فلکی نے استفہامیہ انداز میں پلکیں اٹھائیں۔
"میں' آفو اور سرمد ایک ہی فلیٹ میں رہا کرتے تھے۔ تینوں ایک ہی سکول میں پڑھتے !
اور اکٹھ مل کر کھیلا کرتے تھے۔ دل سے تو مجھے سرمد پسند تھا میں اسے جلانے کے لیے عام طور
آفو کا سہارا لیا کرتی تھی۔ جب کسی بات سے سرمد انکار کرتا تو میں آفو کے پاس چلی جاتی۔ ا
طرح سرمد بہت جلا کرتا تھا۔"
"اور جلانے کا یہ سلسلہ اس نے اب تک جاری رکھا تھا۔"
سرمد ہنس پڑا۔
"اب نہیں سرمد' اب تمہیں پتہ چل گیا تھا۔"
"پتا ہے کتنا عرصہ سرمد اور آفو کی لڑائی رہی۔"
"یعنی وہی فلمی سین۔" اسحاق منہ میں مونگ پھلی ڈال کر بولا۔ "فلمی مثلث بن گئی تھی۔
"سراسر سرمد کی زیادتی تھی۔" نوری بولی۔
"اچھا' یہ بات تھی۔" سرمد نے تہدیدی انداز میں اسے گھورا۔
"اور میں تمہیں کس طرح اپنی طرف ملتفت کرتی۔ اصل میں پتہ نہیں چل رہا تھا'
تمہارے دل میں کیا ہے... تو ہم نے یہ چکر چلایا۔"
"ویسے میں بھیا کی جگہ ہوتا تو "کاٹی" مار لیتا۔" اسحاق نے کہا۔
سب ہنسنے لگے۔

"آفاق ایسا نہیں ہے۔ اس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔" نوری بولی۔ "ویسے ایک بات او
بھی ہے۔ آفاق اچھا دوست ہو سکتا ہے مگر اچھا شوہر....." پھر وہ ایک دم رکھ ...ی اور فلکی
طرف دیکھ کر بولی "کوئی بات نہیں۔" فلکی ہنس پڑی "میں ان کے باس۔ ...ں زیادہ جا
ہوں۔"
طرز
"دراصل آفو بچپن ہی سے بہت سنجیدہ تھا۔ جوان ہو کر بعض معاملوں مطلہ ... سنجیدگی سے !
تھا۔ کہتا تھا' عورت کا مقام گھر ہے۔ عورتیں بے مہار کیوں پھرتی ہیں؟ پھر ... پن اسے ام

...ا لگتا تھا۔ وہ زندگی کو اسی پرانے زاویے سے دیکھتا تھا۔ اسی واسطے کوئی لڑکی زیادہ دن تک
...ی دوست نہیں رہتی تھی۔ میں اسے کہا کرتی تھی کہ تم اپنی بیوی پر بہت سختی کرو گے۔ پتہ
...ں کوئی لڑکی تمہارے ساتھ خوش رہ سکے گی یا نہیں... کیا تم خوش ہو فلکی؟" نوری نے ایک
اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔
"جی میں تو بہت خوش ہوں۔" فلکی نے خوش دلی سے کہا۔ "شروع شروع میں ذرا مشکل
...ں آئی تھی۔ بس یہ ذرا دوسرے مردوں سے مختلف ہیں۔ میں ان کا مزاج پا گئی تھی۔ ایسے
...دل کے بہت اچھے ہوتے ہیں۔"
"ہاں..." نوری ایک دَم بولی "آفو کا دل بہت اچھا ہے۔ یہ مجھے بھی معلوم ہے۔ بہت ہمدرد
...غم گُسار ہے۔ ہر مشکل میں مدد کرتا ہے مگر اپنے اصول نہیں توڑتا۔ زندگی میں کوئی بے
...ولی پسند نہیں کرتا اور..." وہ رک کر بولی "میں ٹھہری ازل سے بے اصول اور لاپرواہ... تو
...انخواستہ جو میری شادی آفو سے ہو جاتی اور دوسرے ہی دن معاملہ... ٹائیں ٹائیں فش
...ہو جاتا۔ تم بڑی بہادر ہو فلکی!" نوری نے ہنستے ہوئے کہا۔
"ہاں۔ ان کی بہادری کی تو میں بھی داد دیتا ہوں۔" اسحاق بولا۔ "اتنے بڑے گھر میں تنہا
...تی ہیں اور ان کو ڈر نہیں لگتا۔"
"اچھی عورت وہی ہوتی ہے جو اپنے شوہر کی رضا میں ڈھل جائے۔" سرمد جو لگاتار
...وزے کھا رہا تھا' بول اٹھا۔
"اچھا' اب تم مجھ پر طنز کر رہے ہو۔" نوری بولی۔
"بھئی میں تم پر کیوں طنز کروں گا؟"
"تم نے گھر سے نکلتے وقت کہا تھا نا' کہ کوٹ پہن لو... اور میں نے تمہاری بات نہیں مانی۔
...ونکہ مجھے سردی میں اس طرح پھرنا اچھا لگتا ہے۔"
"اور پھر یہ تو خلق کی بھلائی کے لیے ایسا کرتی ہیں۔ اب دیکھیں نا... اتنی سخت سردی میں
...ں نے بھی یہ خوب صورت سڈول بازو اور یہ سراپا دیکھا ہوگا' گرم تو ہو ہی گیا ہوگا۔" اسحاق
...ا۔
"کمینہ..." نوری نے اسے گھورا۔ "کاکو! تو ہمیشہ کمینہ رہے گا۔ تو اسی طرح ہمیں بچپن میں
...ی جلایا کرتا تھا۔"
"جی ہاں۔ آپ بھی کوئی ماچس کی تیلی ہیں۔"

"تمہیں پتہ ہے نوری... ایک بار اس نے ہمارے سکول میں جاکر مشہور کردیا تھا کہ آفاق اور نوری کی انگیج منٹ ہوگئی ہے۔ اس پر کچھ مت پوچھو' کتنا شور مچا۔ گھر پر مبارکبادی کے فون آنے لگے... اور ماما اور پاپا سے ہمیں مار بھی خوب پڑی۔"

"لیکن یہ بھی تو مانئے سرمد بھائی سے آپ کی صلح ہوگئی تھی۔" وہ بولا۔

"ہاں' سرمد کے دماغ کا بھوت ضرور اُتر گیا تھا۔"

پھر وہ سب اپنے بچپن کی باتیں یاد کرنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد سرمد گھڑی دیکھتا ہوا بولا۔ "میری آنکھوں کا نور' اُٹھو۔ آج ایک ڈنر پر بھی جانا ہے۔"

نوری ایک دَم کھڑی ہوگئی۔ "اوہ' مجھے تو یاد ہی نہیں رہا تھا۔"

"اچھا فلکی! اب اجازت دو۔"

فلکی بھی کھڑی ہوگئی۔

"آپ اور سرمد بھائی کل ہمارے ہاں کھانا کھائیں۔"

"ہاں ہاں۔" اسحاق آگے آگیا۔ "پلیز مان لیں۔ ہم کچھ لوگوں کو بُلائیں۔ ہلا گلا کریں۔ میں تو اس گھر کی یکسانیت سے تھک گیا ہوں۔"

"نہیں فلکی.... آفو کے بغیر اچھا نہیں لگے گا۔ آفو کو آ لینے دو۔" نوری بولی۔

"اُن کے آنے پر پھر بُلا لیں گے۔" فلکی نے کہا۔

"ابھی مجھے فرصت بھی نہیں۔ یہ سارا مہینہ بک ہے... اور میں آفو پر ذرا رعب بھی ڈالنا چاہتی ہوں کہ میں اس سے خفا ہوں۔"

نوری باہر آگئی۔ اس کے پیچھے سب نکل آئے۔

گرم کمرے سے باہر آتے ہی نوری کو ایک چھینک آئی۔ سرمد نے آگے بڑھ کر کوٹ اس کی طرف بڑھایا اور بولا۔

"کیا تمہارے نازک کندھے اس کوٹ کا بوجھ برداشت کرلیں گے؟"

نوری نے ایک پیارا سا قہقہہ لگایا۔

"یہ نازک کندھے صرف محبت کا بوجھ اٹھا سکتے ہیں۔"

"مگر اس وقت کوٹ زیادہ ضروری ہے۔" سرمد نے اس کے کندھوں پر کوٹ ڈال دیا۔

"آفو کے آتے ہی مجھے اطلاع دینا۔"

وڑی دور جاکر پھر واپس مڑ آئی اور فلکی کے کان کے پاس منہ لے جاکر بولی "جو عورت آفو یت لے گی وہ اس دنیا کی خوش قسمت ترین اور عظیم عورت ہوگی۔"

یہ کیا سیاسی نکتے سمجھا رہی ہو انہیں؟" اسحاق نے خواہ مخواہ اپنا منہ بھی فلکی کے کان کے کرلیا۔

تم نہیں سمجھ سکو گے۔" نوری نے اسے چپت ماری۔

بھی تم واپس کب جارہے ہو کاکو!"

یں تو جانے کے لیے پر تولے بیٹھا ہوں۔ اب وہ حضرت رانجھا صاحب اپنی ہیر سیال کے تشریف لے آئیں تو میری خلاصی ہو۔ ایسا لگتا ہے جیسے شیر پنجرے میں بند ہوگیا ہے۔

واہ رے میرے لکڑی کے شیر..."

رمد نے اس کی کلائی پکڑ کر کہا۔

یہ بھی کوئی زندگی ہے میاں..... کوئی من موہنی صورت ہی نظر نہیں آتی۔"

اس کا کچھ کرو بھابی۔" سرمد نے کہا۔

ھائی' میں نے تو اسے کہا ہے کہ یہ اپنی گرل فرینڈز کو بلا لیا کرے۔ اس کے علاوہ میں اور سکتی ہوں۔"

ہاں ہاں..."

وری نے ہنس کر کہا۔ "تمہاری تقدیر میں مایوسیاں ہی لکھی ہیں۔"

لوگ ہنستے ہوئے موٹر میں بیٹھ گئے۔

ی جلدی سے اپنے کمرے میں آگئی۔ اسے معلوم تھا کہ اب فلم کا سارا غصہ اسحاق اس پر گا۔

ات کو سوتے وقت فلکی کا دل بہت مطمئن تھا۔

خواہ مخواہ نوری پر شک کرتی رہی۔ نوری تو بہت اچھی لڑکی تھی۔ بڑی صاف گو اور صاف

۔

تو اسے پتہ چل گیا تھا کہ عورت' آفاق کی کمزوری نہیں ہے۔ مگر آفاق کی کمزوری کیا اس بات کا اسے پتہ نہیں چل رہا تھا۔ آفاق کا دل جیتنا بہت بڑی بات تھی۔

ل! وہ آفاق کا دل جیت سکے۔

یک دن علی الصّباح جب وہ نماز پڑھ کر اپنا کل کا سبق دہرا رہی تھی تو' فون کی گھنٹی بجی۔

فلکی کا دل دھڑک اٹھا۔

اتنی صبح کون فون کر سکتا ہے....؟"

ہاں۔ بے وقت کالیں دور دیس سے آیا کرتی ہیں..

شاید... شاید اس بے درد کو میرا خیال آگیا ہو۔

میں جو رات بھر بے قرار رہی ہوں۔

شاید دل کی پکار اس نے سن لی ہو..

گھنٹی مسلسل بجتی جارہی تھی... دور کی کال لگ رہی تھی یہ۔

ایک دم فلکی کھڑی ہوگئی اور پھر ننگے پاؤں دوڑتی ہوئی فون کے قریب آگئی اور دھڑ دھڑاتے دل کے ساتھ ریسیور اٹھالیا۔

"ہیلو..."

"جی آپ لاہور سے بول رہی ہیں؟"

"جی ہاں..."

"کراچی بات کریں۔"

"کراچی... کراچی... وہ دشمن جاں کراچی کے راستے ہی تو گیا تھا۔

ابھی وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچی تھی کہ ایک مانوس سی آواز نے اسے خوابوں کے جزیرے سے

"ہیلو... ہیلو... فلکی... فلکی ڈارلنگ..."

یہ وہ مانوس آواز تھی جسے وہ بچپن سے سنتی آرہی تھی۔ مگر اب کیسے اجنبی بنی کھڑی تھی وہ پہچاننے سے انکار کرنا نہ چاہتی ہو۔ خود فریبی کا پردہ چاک نہ کرنا چاہتی ہو۔

"ممی.... ممی... یہ آپ ہیں۔"

بالآخر اس نے گلے میں سے آواز کھینچ کر کہا۔

"ہاں ڈارلنگ۔"

اف کیسی مایوسی ہوئی؟ کاش! ممی نے یوں فون نہ کیا ہوتا۔ ان کے آنے کی خوشی تو مار نہ ہوتی۔

"فلکی کیسی ہو جان...؟"

"اچھی ہوں ممی... آپ کب آئیں؟"

میں ابھی ابھی آئی ہوں۔ کراچی ایئرپورٹ سے تمہیں فون کر رہی ہوں۔ تمہارے لیے بے تاب تھا۔"

ڈیڈی کہاں ہیں؟"

وہ بھی آئے ہیں۔ سامان کے بکھیڑے نمٹا رہے ہیں۔ میں یہاں انتظار میں کھڑی تھی۔ اتنے میں اپنی فلکی سے بات کرلوں۔"

آپ لوگ لاہور کب آرہے ہیں؟"

فلکی نے اپنے لرزتے ہوئے وجود پر قابو پاکر پوچھا۔

دو بجے والے جہاز میں ہماری بکنگ ہوگئی ہے۔ اب یہاں ایک پل بھی رکنے کو جی نہیں چاہتا۔ تم ایئرپورٹ پر آؤ گی۔"

جاؤں گی ممی۔"

ضرور آنا' تمہاری صورت دیکھنے کو ترس رہی ہوں۔"

ممی کو ہمیشہ پانچ چھ مہینے بعد صورت کے دیکھنے کا خیال آتا تھا۔

خدا حافظ ڈیئر' آکر باتیں کروں گی۔"

خدا حافظ ممی۔"

آوازیں بند ہوگئیں۔ فلکی نے فون واپس رکھ دیا۔

ناشتے کے بعد ایئرپورٹ انکوائری پر فون کر کے پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ ممی کا جہاز دس پچاس پر آئے گا۔

فلکی نے جلدی جلدی دوپہر کے اور رات کے کھانے کے بارے میں عبدالکریم کو سمجھایا۔ اسحاق کو بھی دفتر جانے سے پہلے بتا دیا کہ آج وہ ممی کے ہاں چلی جائے گی۔

"میں تمہیں لینے آجاؤں بھائی؟"

"نہیں اسحاق... پتہ نہیں میں کب فارغ ہوں گی۔ آج تم اپنے دوستوں کے ساتھ کوئی باہر کا پروگرام بنالینا۔"

"ظاہر ہے جب دشمن ساتھ چھوڑ جائیں تو دوست ڈھونڈنے پڑیں گے۔" اسحاق نے برگی سے کہا۔

فلکی کو ہنسی آگئی۔

دل ایک دم بجھ گیا تھا۔

"میں رات کو واپس آجاؤں گی۔"

"ہاں۔" وہ موٹر میں بیٹھتا ہوا بولا۔ "رات کو واپس ضرور آجانا۔ میں گھر میں اکیلا نہیں رہوں گا۔"

"پاپا تم اس طرح کرتا ہے جیسے ننھا بچہ ہو۔"

"ننھا بچہ ہی تو ہوں۔ مجھے بھی ممی یاد آتی ہے مگر تم تھپک تھپک کر نہیں سلاتیں۔"

"اچھا' اب بکواس بند کرو اور جاؤ۔"

"آج تمہاری ممی آرہی ہیں بھابی! آج تو تمہارا لب و لہجہ ہی بدلا ہوا لگ رہا ہے۔"

فلکی سوگوار انداز میں ہنس پڑی۔

اسحاق کیا جان سکتا ہے کہ فلکی کے دل پر کیا گزر گئی ہے۔

آہٹیں سنتی سنتی وہ دیوانی ہو گئی ہے... اور آہٹوں کا فریب کھا کھا کر تھک گئی ہے...

ایئرپورٹ جانے سے پہلے فلکی بڑے اہتمام سے تیار ہوئی۔ اس نے موتیوں کے کام کی ایک فیروزی رنگ کی ساڑھی پہنی۔ خوب اچھا میک اپ کیا۔ بڑے پیارے بال بنائے۔ ایک ہلکا فیروزے کا سیٹ پہنا تاکہ ممی پر اس کی اداسی اور سوگواری ظاہر نہ ہو۔ ممی کو ویسے بھی سنوری عورتیں اچھی لگتی تھیں اور پھر وہ ممی کو اپنی گزشتہ زندگی کا کوئی تاثر نہیں دینا چاہتی تھی۔

یہ وہی فلکی تھی جو چھ ماہ پہلے ممی کو ایک ایک بات بتا دینا چاہتی تھی اور اب ایک ایک بات چھپانے کا تہیہ کیے ہوئے تھی۔

لاؤنج سے باہر آتے ہی ممی اسے خوب خوب گلے لگا کر ملیں۔ بار بار اس کا منہ چومتی رہیں۔ ہاتھ پکڑ پکڑ کر اس کی خیریت دریافت کرتی رہیں۔

"تم ذرا کمزور لگ رہی ہو... یا یہ میرا وہم ہے۔"

"رنگ بھی ویسا چمک دار نہیں۔"

"ٹھیک تو ہو۔"

"ٹھیک تو ہو۔"

ممی کے ایسے جملوں پر فلکی کو رونا آرہا تھا۔ اس کی وہی کیفیت ہو رہی تھی۔

ع پوچھا کسی نے حال تو آنسو نکل پڑے

ڈیڈی کے سینے سے لگتے وقت تو اس کے سچ مچ آنسو نکل آئے۔ جنھیں اس نے بڑی نفاست سے

صاف کرلیا۔ ڈیڈی ہمیشہ کی طرح تھے۔ سنجیدہ اور مطمئن... اسی طرح دھیمے دھیمے مسکراتے ہوئے... البتہ مانگ کے کچھ اور بال سفید ہوگئے تھے جس سے ڈیڈی اور بھی گریس فل لگ رہے تھے۔

لیکن ممی پہلے سے زیادہ سمارٹ اور تازہ دم لگ رہی تھیں۔ چہرے کی سلوٹیں بھی حیرت انگیز طور پر کم ہوگئی تھیں۔ ممی حسبِ معمول فیشل ٹریٹ منٹ لے کر آئی تھیں یا فیس لفٹنگ کرا کر آئی تھیں۔ بہرحال لمبے سیاہ کوٹ میں زیادہ اچھی لگ رہی تھیں۔

فلکی اپنے تمام تر میک اپ کے باوجود ان کے سامنے مرجھائی ہوئی لگ رہی تھی۔

"تمہاری صحت تو ٹھیک ہے ڈارلنگ۔"

موٹر میں بیٹھتے ہی ممی نے گفتگو شروع کردی جس سے فلکی گھبرا رہی تھی۔

"میں تو بالکل ٹھیک ہوں ممی۔" پھر وہ بات کا رخ بدلنے کے لیے بولی "اور آپ ماشاء اللہ پہلے سے بھی خوب صورت لگ رہی ہیں۔ اس کا مطلب ہے اس مرتبہ آپ کا ٹرپ بہت اچھا رہا ہے۔"

"سویٹ..." ممی نے بے اختیار اس کا منہ چوم لیا۔

"اس بار تمہارے ڈیڈی نے میرا ساتھ دینے سے انکار کردیا تھا۔ میں اپنی مرضی سے ادھر ادھر گھومتی رہی ہوں۔ بہت انجوائے کیا ہے میں نے... تمہاری طرف سے بے فکری تھی اس لیے....."

"ہاں میری طرف سے تو آپ ہمیشہ بے فکر ہی رہیں۔"

"ہاں.. آفو مجھے ملا تھا۔" ممی اچانک بولیں "... میں ان دنوں کینیڈا میں تھی جب اس نے نیویارک سے فون کیا تو میں دو دن کے لیے نیویارک آگئی تھی۔ اس کی ممی کے پاس ٹھہری تھی۔ بہت لطف آیا۔ آفو نے ہمیں نیویارک کے وہ علاقے دکھائے جو ہم نے اس سے پہلے نہیں دیکھے تھے اور تم جانتی ہو.. آفو از اے جم... اس کی کمپنی میں کوئی بور نہیں ہو سکتا۔ بہت خوب صورت پرسنلیٹی ہے اس کی.."

فلکی اس مرتبہ صرف مسکراتی رہی اور سوچتی رہی۔

آفاق نے ممی کو کیسے کیسے نہ شیشے میں اتارا ہوگا۔

"تمہارے لیے اس نے ایک چاکلیٹ کا ڈبہ لے کر دیا تھا۔ وہ میرے بیگ میں ہے۔"

ممی ذرا جھک کر پاؤں میں پڑا شاپنگ بیگ ٹٹولنے لگیں۔ فلکی چپ بیٹھی رہی۔ اس نے بالکل

نہیں کہا.... "گھر چل کر لوں گی می' رہنے دیں۔ پلیز..."

می نے ڈھونڈ ڈھانڈ کے ایک خوب صورت سا گلابی اور سرخ کاغذوں والا ڈبّہ نکال ہی لیا اور پھر فلکی کی گود میں رکھ دیا۔

فلکی نے جلدی سے پکڑ لیا۔

اتنا خوب صورت تھا کہ حد نہیں۔

جس کاغذ میں لپٹا ہوا تھا۔ اس پر جا بجا ایف... ایف لکھا ہوا تھا اور ایف کے ساتھ کہیں کہیں پر سرخ رنگ کے دل کے نشان بنے ہوئے تھے۔ اوپر سنہری رنگ کا رِبن لپٹا ہوا تھا۔

فلکی کا دل چاہا وہ اس ڈبّے کو سینے سے لگا لے۔ اس کے محبوب نے پہلا سندیس بھیجا تھا مگر اس نے وہ ڈبّہ اپنی گود میں رکھ لیا۔ بھلا اتنا خوب صورت پیکٹ کھول کر کہیں برباد کیا جاتا ہے...؟

"بس..." فلکی نے بے اختیارانہ می سے پوچھ ڈالا۔

"بس..." می نے ہنس کر جواب دیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ اصل تحفے میں خود لاؤں گا اور یہ کہہ رہا تھا۔ فلکی کو میرا پیار دے دیں..."

"اوہ ڈارلنگ! اپنے آفاق کا پیار تو لو۔"

انھوں نے آگے بڑھ کر فلکی کے رخسار کو پھر چوم لیا۔

اتنی سی بات سے فلکی کو نشہ آگیا۔

وہ ستم کش' تیر چلانے خوب جانتا ہے۔ اس کو معلوم ہے کہاں کہاں پر ٹھیک نشانہ لگے گا۔

آفاق کی کج ادائی میں بھی اک ادا تھی اور اب فلکی ادا شناس ہو گئی تھی۔

فلکی رات تک می کے ہاں رہی...

می کے ہاں وہی عالم تھا...

دوست واحباب' مبارک بادیاں... چائے' پھل' دعوتیں...

"فلک بوس۔" میں پھر سے قہقہے اڑ رہے تھے۔

می اپنے سفر کی داستان خوب چٹخارے لے لے کر سنا رہی تھیں۔ ڈیڈی حسبِ معمول بیٹھے پائپ پی رہے تھے اور بات بے بات مسکرا رہے تھے۔

(ڈیڈی! اب مجھے معلوم ہو گیا کہ آپ پائپ کیوں پیتے ہیں۔ آپ پائپ نہیں پیتے غصہ پیتے ہیں۔ آپ صبر کے گھونٹ بھرتے ہیں۔ غضب ہے کہ می تمام عمر' تمام تر شوہرنی رہی... ا

ہے... آپ... اور آپ کی فلکی کو یہ سب بھگتنا پڑا!)

می اس کے لیے بے شمار چیزیں لائی تھیں۔

پورے دو بکس بھرے ہوئے تھے جو صرف فلکی کے لیے ہی تھے۔

جس جس ملک سے جو جو چیزیں خریدی تھیں' اس کی تفصیل بتاتی رہیں۔ پہلے فلکی ایسی چیزیں لے کر بے حد خوش ہو جایا کرتی تھی۔ جب سے پیدا ہوئی تھی' اس کو ایسی سوغاتیں ملتی ہی تھیں۔ یہی انمول چیزیں اس کی زندگی تھیں۔ می کے آتے ہی وہ اپنی چیزیں اٹھا کر اپنے دوستوں کے پاس لے جایا کرتی تھی۔ پھر وہ باقاعدہ اپنے ملبوسات دکھانے کے لیے پارٹیاں کرتی اور دوستوں سے خوب خوب داد لیا کرتی تھی۔

مگر آج اس نے ان چیزوں کو زیادہ دل چسپی سے نہیں دیکھا۔ اس کے اندر جیسے کوئی کہہ رہا تھا.... دنیا میں اور بھی بہت کچھ ہے جو اِن چیزوں سے بہت ضروری ہے... زندگی صرف ملبوسات اور زیورات کے سہارے نہیں گزر سکتی... فانی چیزیں لافانی جذبوں کا مول نہیں ہو سکتیں۔ پھر اس نے بڑے قرینے سے ساری چیزیں بکسوں میں بند کر دیں اور بڑے خلوص سے می کا شکریہ ادا کیا۔

پھر می سے بولی۔

"می! ابھی آپ ان چیزوں کو اپنے پاس ہی رکھیں۔ جب آفاق آئیں گے میں تب یہ چیزیں لے کر جاؤں گی.."

اس کا خیال تھا اگر آفاق پسند کرے گا تو فلکی یہ چیزیں می سے لے لے گی ورنہ نہیں اور می اس خیال سے چپ ہو گئیں کہ غالباً" یہ اپنے شوہر پر رعب ڈالنا چاہتی ہے۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد فلکی نے می سے اجازت مانگی۔

"کیوں لو (Love) جلدی کیوں جا رہی ہو؟ میں اتنے دنوں بعد آئی ہوں۔ اب میرے پاس رہو.."

"ابھی آپ آرام کریں می... پیچھے گھر بھی اکیلا ہو گا۔"

"کیا نوکر نہیں ہیں گھر میں...؟"

"ہیں تو... مگر نوکروں پر گھر تو نہیں چھوڑا جا سکتا۔"

"نان سینس... میں نوکروں پر گھر چھوڑ کر ساری دنیا گھوم آئی ہوں اور تم.."

"می آپ کی اور بات ہے..." (آپ کے گھر میں اور میرے گھر میں بہت فرق ہے۔ آپ

کے گھر کو کوئی گھر تو نہیں کہہ سکتا نا؟"...)

"وہ اسحاق بھی تو آج کل یہیں ہے اور میں نوکروں سے کہہ کر بھی نہیں آئی۔"

"یوں کرو۔ سب کو بتا کر آجاؤ۔"

"ممی میں رات کو یہاں نہیں رہوں گی۔"

"اب آفاق بھی یہاں نہیں ہے۔ وہاں جانے کی کیا مجبوری ہے۔"

What a change

ممی نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھول کر کہا۔

"جان جی! کہاں ہو؟" اس نے صدر الدین کو آواز "ذرا اپنی لاڈلی کی شاندار بات ما آکر..."

ڈیڈی پل میں بوتل کے جن کی طرح آنمودار ہوئے۔

" تمہاری لاڈلی سال کے اندر اندر بدل گئی ہے جس گھر میں ہمیشہ رہی۔ اب اسے وہ گھر ا نہیں لگتا۔ کہتی ہے اب میں ایک رات بھی اپنے گھر سے باہر نہیں رہ سکتی۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" ڈیڈی نے منہ سے پائپ نکال کر کہا۔ "ایک دم ٹھیک ٹھاک..." پھر وہ پائپ کا دھواں چھوڑتے ہوئے یوں چلے گئے جیسے انھیں فلکی سے یہی امید ہو۔

فلکی اپنے اقدام پر شرمندہ نہیں تھی۔ اس نے جو محسوس کیا تھا' صاف صاف کہہ دیا تھا۔

"اس کو جانے دو نازلی۔ کل پھر آجائے گی۔"

جاتے جاتے ڈیڈی اتنا کہہ گئے۔

"تھینک یو' ڈیڈی۔" ...وہ دوڑتی ہوئی گئی اور ڈیڈی کے کندھے پر سر رکھ دیا۔ ڈیڈی تو بن کہے دل کی بات جان لیتے تھے۔

مگر ممی کو اس کا یہ لگاؤ پسند نہیں آیا... بس خاموش ہو گئیں۔

"او کے ممی..." فلکی نے اپنا پرس اٹھایا اور باہر نکل گئی...

ممی کو کیا معلوم...؟

انتظار کیا ہوتا ہے...؟

محبت کسے کہتے ہیں...؟

ممی وہ خوب صورت موم بتی ہیں جو کمرے کی خوب صورتی میں اضافہ کرنے کے لیے ڈرائنگ روم کے وسط میں رکھ دی جاتی ہے۔ وہ موم بتی ڈیکوریشن پیس ہوتی ہے جو کبھی نہیں

جاتی' کبھی کمرے کو روشنی نہیں بخش سکتی... ہاں نگاہوں کو بھلی ضرور لگتی ہے....

لکن یہ تو جلنے والے جانتے ہیں کہ آدھ جلی موم بتی کس قدر خوب صورت ہوتی ہے۔ جل ر پگھلتی جاتی ہے مگر ایک دلکش شکل اختیار کرتی جاتی ہے... دل میں اتر جاتی ہے... کسی ہم آجاتی ہے... اپنا آپ جلا دیتی ہے... موم کا وہ ڈھیر بھی جو میز پر پڑا رہ جاتا ہے... مصور ی مورتی سے کم نہیں ہوتا... ہاتھ میں اٹھا لینے کو جی چاہتا ہے...

ی کیا جانیں...؟

ا جانیں ممی...؟

رف محبت کروانا ہی زندگی نہیں ہے!

بت کرنا اور نثار ہو جانا ابدی زندگی ہے۔

بت طلب نہیں کرتی۔ محبت دینا چاہتی ہے۔

بت سودا نہیں کرتی۔ محبت بے مول ہوتی ہے۔

بت خریدی نہیں جاتی بلکہ وہ تو نس نس میں خون کی طرح اتر جاتی ہے۔ سانس کی طرح تی ہے۔ جذبے آنسوؤں کی طرح آپ ہی آپ ابھر آتے ہیں... ممی کیا جانیں...

وہ پل پل اس جفاجو کا انتظار کرنا چاہتی ہے....

آہٹ پر چونک جاتی ہے...

ا چلے تو اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے...

ی دروازہ کھولے تو کھڑی ہو جاتی ہے....

ن کی گھنٹی بجے تو دوڑ پڑتی ہے...

ل آئے تو دل دھک دھک کرنے لگتا ہے....

ر کا ہارن بجے تو خون شریانوں میں تیز تیز دوڑنے لگتا ہے...

لے پھر پھولوں والی روش پر' ہوا کے سنگ سنگ پتے کھڑکیں تو وہ رو پڑتی ہے۔ بہک اٹھتی

نے آفاق کس وقت آجائے۔

ی کا ایک دیا اس نے اپنی منڈیر پر رکھ دیا تھا۔

فروں کو اپنا گھر ضرور یاد آتا ہے...

ل بھی یاد آتا ہے جو اس کے لیے دھڑک رہا ہو...

ظالم کو اپنا ظلم یاد آتا ہے...

مبادا... وہ اچانک... بالکل اچانک آجائے... اپنی ہر غیر یقینی عادت کی طرح.. اور اسے
میں نہ پاکر کتنا مایوس ہو...؟

اس کا گشت ضائع ہوجائے...

اس کی آہ بے اثر ہوجائے....

وہ ہمہ وقت گھر میں رہنا چاہتی تھی۔

انتظار کرنا چاہتی تھی۔

چوکھٹ سے نہ اُٹھنا چاہتی تھی۔

ممی! آفاق نے آنے کے بارے میں کیا کہا تھا..؟"

دوسرے دن جب وہ ممی سے ملنے گئی تو اس نے پوچھ ہی لیا۔

کیا اس کا خط نہیں آیا تمہیں...؟" ممی نے اپنی حیران نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔

کونسا خط...؟" پھر فلکی بوکھلا گئی... ہاں وہ... وہ پہلا خط جو انہوں نے جاتے ہی لکھا تھا۔"

ارے ابھی ایک ہفتہ ہوا وہ مجھے ملا تھا اور اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے تمہیں مفصل
ں اپنا آئندہ کا سارا پروگرام لکھ دیا ہے۔"

مل جائے گا...." وہ جلدی سے بولی "بس آج کل میں مل جائے گا۔"

"اور تمہارا خط بھی اسے مل گیا تھا۔"

نسا...!اچھا.... اچھا...." فلکی کا منہ ایک دم سرخ ہوگیا۔ اس سے جھوٹ بھی سلیقے سے نہ
لیا۔

ڈارلنگ! میں خط و کتابت کو برا نہیں سمجھتی۔ تم مجھ سے کیوں چھپانا چاہتی ہو۔"

AFTER ALL HE IS YOUR HUSBA

کتنا اچھا ہے ممی کہ آپ ذہین بالکل نہیں ہیں۔ فلکی نے دل میں سوچا)

مگر مجھے تم نے صرف دو تین خط لکھے..." ممی نے شکوہ ہی کر دیا۔

"ان دنوں آفاق یہیں تھے ممی۔ مجھے فرصت ہی نہ ملتی تھی۔"

"ہاں ڈارلنگ میں جانتی ہوں۔ اب اس گھر اور اس گھر میں بہت فرق پیدا ہوگیا ہے۔"

"سویٹ ممی۔" فلکی نے ہنس کر ممی کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"اچھا ذرا پرے ہٹو۔ میرے رولرز ڈھلک جائیں گے۔"

ممی جلدی جلدی اپنے رولرز ٹھیک کرنے لگیں۔

ممی چاہتی تھیں کہ فلکی روز صبح کو "فلک بوس" میں آجایا کرے۔ سارا دن ممی کے پاس رہا

کرے اور رات کو "رازداں" میں لَوٹ جایا کرے۔ لوگ دَھڑا دَھڑ ممی کی دعوتیں اور پار[illegible] کررہے تھے۔ ممی اسے مجبور کرتی تھیں کہ وہ ہر پارٹی اور دعوت میں ان کے ساتھ جایا کر[illegible] فلکی کو ان پارٹیوں سے وحشت ہوتی تھی۔ وہ کب کی ان کھوکھلی دعوتوں اور بناوٹی قہقہوں [illegible] دور ہوگئی تھی۔ نہ اسے فضول باتوں پر ہنسی آتی اور نہ خواہ مخواہ بیٹھ کر وقت ضائع کرنے کو [illegible] کرتا۔

اور پھر اسے ہر وقت ایک دھڑکا سا لگا رہتا۔

اگر آفاق کسی روز اچانک آجائے اور اسے ڈھونڈتا ہوا ممی کے گھر پہنچے... اور اسے پتہ [illegible] کہ فلکی تو ممی کے ساتھ فلاں پارٹی میں گئی ہوئی ہے تو۔

تو... تو کیا ہو..؟"

وہ گھبرا جاتی۔

آفاق تو یہی سمجھے گا کہ اس کی عدم موجودگی کا فائدہ اٹھا کر فلکی واپس اپنی دنیا میں لوٹ [illegible] ہے۔نہیں نہیں... وہ گھبرا جاتی۔

سب کیے کرائے پر پانی پھر جائے۔

کہیں جیتنے والی بازی وہ ہار ہی نہ جائے۔

وہ ممی کو طرح طرح سے ٹال کر تھک گئی تھی۔

کبھی سر درد کا بہانہ' کبھی پیٹ درد کا عذر' کبھی بے خوابی کی شکایت... اور ممی حیران [illegible] پوچھتیں۔

" فلکو' تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ تم اس قدر بور بھی ہوسکتی ہو؟ مجھے تو یقین نہیں آتا۔ تم [illegible] انسانوں سے وحشت ہوتی ہے اور اپنا ویران گھر اچھا لگتا ہے۔ آخر تم اتنی بددل کیوں [illegible] ہو۔ یہی تو عمر ہے لائف انجوائے کرنے کی۔"

ممی وہ ماں نہیں تھی جسے دردِ دل میں شریک کیا جاتا ہے۔

جو وہ ممی کو داستانِ غم سنا بھی دیتی تو انھیں کہاں سمجھ آتی بلکہ وہ تو یہی کہتیں کہ آفاق [illegible] خلاف محاذ کھول دو... اس کی ایسی تیسی...

"درمیانِ قعرِ دریا' تختہ بندم کردہ ای"

والا معاملہ تھا۔

اسے اپنی اَناّ سے سنی ہوئی بچپن کی ایک کہانی یاد آجاتی۔

[illegible]ر پار سیاہ پتھروں والی اس وادی کے دوسری طرف ایک کالے دیو نے ایک خوب صورت [illegible]ے کو پتھر میں تبدیل کردیا تھا۔

[illegible] دن ایک حسین و جمیل سیم تن شہزادی اپنی ملازمہ کے ساتھ سیر کو نکلی اور راستہ بھول [illegible] بھٹکتے بھٹکتے وہ سیاہ پتھروں کی اس وادی میں جا نکلی۔ وہاں جو اُس نے پتھر کا شہزادہ دیکھا تو [illegible] رنج پہنچا۔ شہزادے کے لیے اس کے دل میں ہمدردی کا ایک غبار اٹھا جو رفتہ رفتہ محبت [illegible] اختیار کرگیا۔ اس نے اپنے دل میں سوچا۔ اے کاش! وہ اس شہزادے میں جان ڈال [illegible] اسی وقت اسے اپنے بچپن کی سہیلی سبز پری کا خیال آگیا۔ جسے اس نے بچپن میں ایک [illegible] قید سے رہائی دلائی تھی... جونہی اس نے سبز پری کو یاد کیا۔ وہ اپنے سبز پنکھ ہلاتی نمودار

[illegible]ے بچپن کی سکھی' شہزادی نے بے تابانہ اس کے ہاتھ تھام لیے۔

[illegible]دا کے واسطے اس خوبرو شہزادے کو انسانی صورت میں بدل دے۔ میں تیرا یہ احسان کبھی [illegible]وں گی۔"

[illegible]ے نیک دل شہزادی! اگر تو اس شہزادے کے سر میں چُبھی ہوئی جادو کی ساری سُوئیاں [illegible]ے تو یہ اپنی اصلی صورت میں آجائے گا... یاد رہے سُوئیاں ایک ہی نشست میں نکالنی [illegible]۔" شہزادی نے سوئیاں نکالنی شروع کردیں۔

[illegible] کے نازک ہاتھ لہولہان ہوگئے.. تھکن سے شہزادی نڈھال ہوگئی۔ جب چند سُوئیاں باقی [illegible] تو شہزادی کو نیند نے آگھیرا۔

[illegible] نے اپنی کنیز سے کہا۔

[illegible]م یہاں پتوں کا بستر بچھا دو۔ میں تھوڑی دیر کے لیے آرام کرنا چاہتی ہوں۔ ذرا سستا کر [illegible]زہ دَم ہوجاؤں گی اور باقی کی سُوئیاں بعدازاں نکال دوں گی تاکہ بیدار ہونے کے بعد میں [illegible]ے سے گفتگو کرنے کے قابل ہوجاؤں۔"

[illegible] وہیں ایک گھنے درخت کی چھاؤں میں نیند کی ماری تھکی ہاری شہزادی سوگئی۔ کئی راتوں کی [illegible]۔ نیند نے سحر طاری کردیا۔ ٹھنڈی ہَوا اسے لوریاں دینے لگی اور پتے اس کے نصیب کا [illegible]نے لگے۔

[illegible]ے مدہوش دیکھ کر اس کی خادمہ نے باقی کی چند سُوئیاں بھی نکال دیں۔

[illegible]ادہ انسانی پیکر میں آتے ہی اس خادمہ کے قدموں میں گر پڑا اور بولا "اے نیک دل

دوشیزہ تو نے مجھے پتھر سے انسان بنا دیا ہے۔ میں کس منہ سے تیرا شکریہ ادا کروں‘ میں تو نصیب پر رو بیٹھا تھا کہ کون اس ویرانے میں مجھے چھڑانے آئے گا۔ اللہ نے تجھے رحمت کا اور میری زندگی کی نوید بنا کر بھیجا ہے۔ تیرے احسان کا بدلہ میں زندگی بھر نہیں چکا سکوں گا بھی مجھے بتا میں تیری کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ میں سراندیپ کے بادشاہ کا اکلوتا بیٹا ہوں۔"

کنیز نے گھبرائی ہوئی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر سرگوشی کے انداز میں بولی۔

"مجھے صرف تیری رفاقت چاہیے کہ میں پہلی نظر میں تیری اسیر ہو چکی ہوں۔ جتنی بھی ہو سکے‘ مجھے یہاں سے نکال کر اپنے دیس میں لے جا۔

جب شہزادی کی آنکھ کھلی..

تو.. وہاں نہ شہزادہ تھا... نہ اس کی کنیز..

یہ سوچ کر فلکی ہمیشہ تھرا جاتی۔

"بھلا شہزادی کی آنکھ اتنی دیر بعد کیوں کھلی....؟"

"بھئی وہ کئی راتوں کی جاگی ہوئی تھی۔"

"بھلا اسے سونے کی کیا ضرورت تھی؟ جب صرف دو چار سوئیاں باقی رہ گئی تھیں...؟"

وہ بار بار اَنّا سے پوچھتی۔

"ہاں یہ بات پوچھنی چاہیے..... بس اس سے بے وقوفی ہو گئی۔"

"کیوں ہو گئی بے وقوفی..؟ جب وہ شہزادی تھی۔"

"تو کیا شہزادیوں سے بے وقوفیاں نہیں ہونی چاہئیں۔"

"نہیں..." وہ غصے سے مٹھیاں بھینچ لیتی۔ "شہزادیاں تو خوب صورت ہوتی ہیں۔ عقلمند ہیں... اور بہادر ہوتی ہیں..." وہ اپنی لال لال آنکھیں میچ لیتی۔ "مگر بے وقوف نہیں ہوتیں۔

اَنّا زور سے ہنس پڑتی۔

"ایسی شہزادی تو میری فلکو ہے... ہے نا؟" ... تو شہزادی فلک ناز ہے... اور شہزادی فلک ہے... پتہ ہے تجھے..."

"اچھا اَنّا‘ اب دوسری شہزادی کی کہانی سناؤ جو سونے والی شہزادی نہیں تھی۔"

"ہاں جو سوتا ہے‘ وہ کھوتا ہے۔"

اَنّا لہک لہک کر گانے لگتی...

"اور جب شہزادی کی آنکھ کھلی..."

تک یہ کہانی فلکی کے لاشعور میں تھی۔

کا اس کہانی سے کیا تعلق ہے بھئی...؟

بار اپنے دل سے پوچھتی... اس کے نصیب کی سوئیاں نہ جانے کہاں کہاں چُبھی ہیں؟

بھی جانے کیوں وہ اپنے گھر سے باہر نہ رہنا چاہتی تھی... کہیں جانا نہ چاہتی تھی...

رات کو...

اس پر انتظار کا قہر بن کر ٹوٹتی۔

ی قہر میں اس کی بقا تھی۔

می چاہتی تھیں‘ وہ اپنا گھر چھوڑ کر یہاں آ جائے۔

کے گھر میں زندگی کی ہر آسائش تھی مگر دل کا سکون نہیں تھا۔

خالی پلنگ پر جو اس کی مانگ کی طرح ویران تھا... وہاں محبت کے پھول نہیں بکھرے

تلخ یادوں کے انگارے ضرور تھے اور کبھی کبھی انگاروں کو کلیجے میں بھر کے سو جانے کو جی

ہے۔

ر اسحاق بھی اب اس سے الجھنے لگا تھا۔

ابی.. تمہاری بوریت سے عاجز آ کر میں نے دوستوں کو گھر پر بلانا شروع کر دیا ہے۔ اب

رے باہر رہنے لگی ہو۔"

م جانتے ہو نا اسحاق‘ ممی آ گئی ہیں۔ اس مرتبہ وہ کافی عرصہ کے بعد آئی ہیں اس لیے اگر

بھی جاؤں تو وہ ڈرائیور کو بھیج کر مجھے بلوا لیتی ہیں۔"

راہ‘ میرے مہمان کہتے ہیں‘ وہ حسین میزبان کہاں ہے جس کو دیکھتے ہی دھڑکنیں تیز

ہیں؟"

چھا تم ہر وقت بکواس مت کیا کرو۔ آج میں کہیں نہیں جاؤں گی۔"

نک کا پروگرام بنا لیں۔ کسی دور دراز علاقے میں جائیں گے۔ کل چھٹی بھی ہے۔"

ہیں‘ بھئی..... میں پکنک پر نہ جا سکوں گی... اور پھر تمہاری اودھم پارٹی کے ساتھ..."

یوں‘ بھابی! آپ نے کبھی شور نہیں مچایا؟ کبھی نہیں اُچھلیں‘ کودیں؟"

ضرور ایسا کیا ہو گا.. مگر اب نہیں۔"

ب کیوں نہیں؟"

"اب میں ایک ذمّے دار عورت ہوں۔"

"اور ذمّے دار عورت کا بس یہی کام ہے کہ دنیا کی رنگینیوں سے منہ موڑ کر بیٹھ جائے؟"

"دنیا کی ساری رنگینیاں اگر گھر میں موجود ہوں تو پھر کون کافر گھر سے نکلتا ہے۔"

"کہاں ہیں اس گھر میں دنیا کی رنگینیاں؟ مجھے تو کہیں نظر نہیں آتیں.... ایک خاموش اور سنسان سا گھر ہے۔ چاروں طرف وحشت ٹپکتی ہے۔ اتنے بڑے گھر کے صرف دو مکین... اور خود گھر کا مالک بھی نہیں نکلتا۔ میرا تو اس گھر میں ذرا بھی دل نہیں لگتا۔"

"تو تم گھر سے باہر دل لگا لو۔ تمہیں کون روکتا ہے؟ میرا تو یہ گھر ہے۔ مجھے یہاں عمر بھر رہنا ہے۔"

"اتنی بڑی بات نہ کرو بھابی! پتہ نہیں کل کیا ہو جائے اور تم اس گھر کو لات مار کر چلی جاؤ۔"

"اللہ نہ کرے۔" فلکی کا دل واقعی دھڑک اٹھا۔

جب سے اسحاق آیا تھا' بدشگونی کی باتیں کر رہا تھا۔ پتہ نہیں اسے اپنے بھائی پر اعتبار کیوں نہیں تھا؟

"چلو گی یا نہیں؟" اسحاق نے قریب آ کر اسے ٹہوکا دیا۔

"تمہیں کتنی بار کہہ چکی ہوں' اسحاق کہ مجھ سے دور رہ کر بات کیا کرو۔"

"میں جو پوچھ رہا ہوں' اس کا جواب دو۔"

"کل میں نہیں جاسکوں گی۔"

"کیوں...؟"

"مجھے گھر پر کچھ ضروری کام ہیں۔"

"مثلاً...؟"

"ہیں نا... کہہ جو دیا۔"

"اپنے "سرتاج من" کو "سلامت باشد" والا خط لکھنا ہوگا۔

فلکی بے اختیار ہنس پڑی۔

"یہ "سرتاج من" اور "سلامت باشد" کیا ہوتا ہے؟"

"ہماری امی' ہمارے ابا کو اسی طرح خط لکھا کرتی تھیں۔"

"نہیں بھئی... میری ممی ایسے خط نہیں لکھتیں۔" فلکی بولی۔

ری ممی کیا لکھتی ہیں' مائی ڈیئر' ڈارلنگ' سویٹ ہارٹ' ہنی' مائی لو' مائی ہارٹ یا پھر یہ
ھر' دل گردہ' پھیپھڑا! کیوں؟" سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ کر اسحاق اس کے
پ سے بیٹھ گیا۔

و وکیبولری (Vocabulary) ختم ہوگئی یا سانس پھول گئی ہے؟ اچھا تم بتاؤ' تم کیا
پنی فیانسی کو؟"

... میں کیوں خط لکھوں گا۔ آخر خط کی نوبت ہی کیوں آئے گی۔ وہ مجھ سے دور جانے
ہ کیسے کرے گی؟... ہاں۔" اس نے ہاں کو ذرا لمبا کر کے کہا "اگر کبھی ایسا موقع آ ہی
ف ایک فقرہ لکھ دیا کروں گا' بندے کی پتّر بن کے آجا۔"

پر فلکی بے تحاشا ہنسنے لگی۔

ا! تم ہنستی ہوئی بہت اچھی لگتی ہو۔ مگر تم اتنا کم کیوں ہنستی ہو؟"

وہ ہنسنے سے دل مُردہ ہو جاتا ہے۔"

... یہ تم سے کس نے کہہ دیا؟"

نے حدیث کی ایک کتاب میں پڑھا تھا۔"

' اس عمر میں حدیث' فقہ' فلسفہ' گیان.. کچھ تو خدا کا خوف کرو۔ کس کے لیے یہ سارا
لے رہی ہو؟"

نے سر جھکا لیا اور خاموش ہوگئی۔

تو مورکھ ہے۔ اس کے پلّے کچھ نہیں پڑے گا۔ بڈّھی روح کے واسطے تم اپنی ہستی پر
ا کر بیٹھی ہو... اور اب بھیّا کہاں دیکھ رہے ہیں کہ تم کیا کر رہی ہو؟ ہزاروں میل دور
کر رہے ہوں گے۔"

نہیں دیکھ سکتے' میں تو انھیں دیکھ سکتی ہوں۔ دل کی آنکھ بہت تیز ہوتی ہے' اسحاق!"

ا' دل کی بھی آنکھ ہوتی ہے؟"

۔ دل سراسر آنکھ ہوتا ہے۔"

بایونک آنکھ' والا معاملہ تو نہیں؟"

ں' بالکل نہیں۔" فلکی ہنسنے لگی۔

آنکھ ہمیشہ فاصلوں سے ہی بہتر دیکھ سکتی ہے۔"

ن تم کس وقت دیکھ لیتی ہو؟"

"جس کی جان ہو گذری میں' ساری رات وہ جاگے ہو۔"

"خدا کے واسطے... اتنی مشکل مشکل باتیں نہ کرو بھابی! کچھ جینے کی باتیں کرو۔"

"اچھا ذرا میرے ساتھ بازار چلتے ہو؟"

"وہ کس خوشی میں بھابی۔"

"مجھے کچھ شاپنگ کرنا ہے۔"

"میں سمجھا' تم مجھے کوئی تحفۂ محبت خرید کر دو گی۔"

"بھئی' تم بھی خرید لینا کچھ... مگر چلتے ہو؟"

"کیوں نہیں چلوں گا؟ ظالم حسینہ نے پہلی بار فرمائش کی ہے۔ میں اس کی فرمائش کیسے ٹال سکتا ہوں؟... بس' ایک سیکنڈ میں گاڑی کی چابی لے کر آتا ہوں تاکہ میرے آنے تک تم ارادہ ہی نہ بدل جائے۔"

فلکی ہنستی ہوئی جا کر موٹر میں بیٹھ گئی۔

"شکر ہے' تم روایتی خاتون کی طرح پیچھے نہیں بیٹھی ہو۔" اس نے چابی گھماتے ہوئے کہا

"اچھا' تو اب اپنے بھائیوں کے ساتھ بیٹھنا بھی معیوب ہو گیا ہے؟"

فلکی نے دونوں ہاتھوں سے اپنے بال درست کیے۔

"بھابی! تمہاری عمر کیا ہے؟"

اسحاق نے گاڑی کو سڑک پر ڈال دیا۔

"کیوں.... یہ تمہیں یکایک میری عمر سے دلچسپی کیوں پیدا ہو گئی ہے؟"

"ویسے ہی' اپنی تسلی کی خاطر پوچھ رہا ہوں۔"

"اگر تمہاری تسلی نہ بھی ہو تو مجھ پر کوئی فرق نہیں پڑ سکتا... میری شادی ہو چکی ہے۔"

"افوہ' بھابی! اب تم بالکل عورتوں کی طرح اپنی عمر چھپا رہی ہو۔"

"عورت جو ہوئی میں۔"

"مجھے معلوم ہے۔ زیادہ سے زیادہ تمہاری عمر اٹھارہ سال کی ہو گی۔"

"جی نہیں' تم مجھے خوش کرنے کے لیے مبالغے سے کام لے رہے ہو۔ اٹھارہ سال کی میں' میں نے بی اے کیا تھا۔"

"پھر کیا کیا تھا؟"

"ایم۔ اے... پھر ایک سال بعد میری شادی ہو گئی۔"

"اٹھارہ میں دو جمع کیے' بیس ہو گئے۔ بیس میں ایک ڈالو تو اکیس تم اکیس یا بائیس برس کی ں جب تمہاری شادی ہوئی تھی اور شادی کو ابھی پورا سال نہیں ہوا۔ زیادہ سے زیادہ تم ں چوبیس برس کی ہو گی۔"

"چلو' اچھا ہوا... تمہارا حساب تو صحیح نکل آیا۔"

"میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ تم مجھ سے عمر میں چھوٹی ہو۔ مجھ پر رعب نہ جمایا کرو۔"

"عمر میں چھوٹی ہوں۔ عقل میں نہیں۔"

"عقل میں بھی چھوٹی ہو' اسی لیے تو صحیح انتخاب نہ کر سکیں۔"

فلکی ایک دم خاموش ہو گئی۔

"بھیا اس وقت بتیس سال کے ہیں۔ میں ان سے پانچ برس چھوٹا ہوں یعنی ستائیس برس کا نوجوان۔ تمہارا' میرا جوڑ..."

"اسحاق! مجھ سے پٹ جاؤ گے' یہیں سڑک پر... تم جانتے ہو' میں اتنی خاموش اور بزدل ں ہوں' جتنا تم سمجھ رہے ہو... تم نے ابھی میرا جلال دیکھا ہی نہیں۔"

"بس یہی دیکھنا چاہتا تھا۔" اسحاق نے قہقہہ لگایا۔ "مزہ آیا تمہارے منہ سے یہ بات سن ۔"

"بس بس... وہاں سامنے صوفہ کلاتھ' پر گاڑی روک لو۔" فلکی نے جلدی سے اسے ٹوکا۔

فلکی کو ممی کی ہر روز کی دعوت اور پارٹیوں نے ہلکان کر دیا تھا۔ گھر میں سارا وقت اسحاق اس جان کھائے رکھتا تھا۔ وہ کئی دنوں سے سوچ رہی تھی کہ کوئی ایسی راہ نکالی جائے کہ وہ وقت بے وقت ان دونوں کی نوازشوں سے بچ جائے۔

بہت دنوں تک سوچتے رہنے کے بعد اسے خیال آیا... کیوں نہ وہ اپنا گھر سنوارنا شروع دے۔ سارے کمروں کے پردے اور قالین میلے ہو رہے تھے۔ جانے کب سے نہیں دھلوائے تھے۔

بعض کمروں کی کلر سکیم ہی اسے پسند نہیں آئی تھی... پھر اس کی شادی اتنی جلدی میں ہوئی ی کہ کمروں کو نئے سرے سے سنوارا نہیں گیا تھا۔

ہاں' یہ کام ٹھیک ہے.... اس نے دل میں سوچا۔

گو سردی کا موسم شروع ہو گیا تھا۔ دن چھوٹے ہو گئے تھے مگر آفاق کے موجود نہ ہونے کی جہ سے کوئی مصروفیت ہی نہ تھی۔ ورنہ ہر شام مہمانوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ اس نے سوچا'

موقع اچھا ہے۔ آفاق کے آنے سے پہلے وہ گھر کو دلہن کی طرح سنوار لے گی تو داد وصول کرنے کا ایک اور موقع مل جائے گا... بلکہ آفاق کو اندازہ بھی ہو جائے گا کہ اس میں جمالیاتی حس کس قدر ہے۔

یہی سوچ کر آج وہ کچھ نئے پردے خریدنے نکلی تھی۔

... اور پھر خرید و فروخت کا یہ سلسلہ چل نکلا۔ روزانہ شام کو اسے کسی نہ کسی دکان پر جانا پڑتا۔ احساق ساتھ ہوتا۔ کبھی وہ ڈرائی کلیننگ کی دکان پر جاتی' جہاں اس نے قالین اور پردے دُھلنے کو دیے تھے... کبھی پردوں والے درزی کے پاس جاتی.. کبھی صوفے والے کے ہاں' کہ بعض صوفے اس قدر چکنے ہو گئے تھے کہ ان کے کپڑے بدلوا لینا ہی بہتر تھا۔

سب سے زیادہ مشکل اسے اپنے بیڈ روم کے لیے پیش آ رہی تھی۔ وہ اس کی ساری کلر اسکیم بدل دینا چاہتی تھی۔ پہلے اس کی دیواریں گلابی تھیں اور سرخ ریشمی پردے لٹک رہے تھے۔ صوفے سنہری رنگ کے تھے۔

سرخ رنگ اسے راس نہیں آیا تھا۔ یہ پردے اور صوفے اس نے گیسٹ روم کی نذر کر دیے۔

کئی روز تک سوچ سوچ کر اس نے گولڈن اور سفید رنگ اپنے بیڈ روم کے لیے پسند کیے۔ سفید پلنگ کے کٹہرے گولڈن کروالیے۔ فرش پر گہرا گولڈن قالین بچھا دیا۔ سفید سلک کے ملائم پردے دیواروں پر ڈلوائے' جن کے اوپر گولڈن رنگ کی ڈوری دار جھالریں لٹک رہی تھیں۔

صوفے پر جو کپڑا تھا' اس کا پرنٹ ہلکا کاسنی اور گولڈن تھا۔ غرض وہاں کی ہر شے بدل ڈالی تھی۔ اپنی شادی کی ایک تصویر بڑی کروا کر دیوار پر آویزاں کر دی تھی۔ کمرے میں کشادگی اور پاکیزگی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔

اسی کمرے میں آفاق کا پلنگ بھی پڑا تھا' جس پر پیلی چادر اور پیلے تکیے کے غلاف چڑھا کر' اس نے کاسنی بیڈ کور ڈال دیا تھا۔

اپنے بستر پر سفید جھالروں والا بیڈ کور ڈالا تھا۔

سفید رنگ پاکیزگی اور معصومیت کی علامت ہے۔

سب سے زیادہ محنت اس نے اپنے بیڈ روم اور ڈرائنگ روم پر کی تھی۔ جتنے ہلکے رنگ اپنے بیڈ روم میں استعمال کیے تھے' اتنے ہی شوخ رنگوں کا انتخاب ڈرائنگ روم میں کیا تھا تاکہ رات کو جب آتش دان میں آگ جلے تو اس کی روشنی میں سب رنگ زندہ ہو جائیں۔

اس نے اپنا بیڈ روم سب سے پہلے ٹھیک کرا لیا تھا۔ مبادا کسی روز تھکا ہوا مسافر اچانک لوٹ آئے۔

... مگر باقی سارے گھر میں ہمہ وقت سامان پھیلا رہتا۔ کسی کمرے میں درزی بیٹھے کھٹا کھٹ مشین چلا رہے ہوتے... کہیں کوئی کاریگر کرسیاں بُن رہا ہوتا۔

ایسے میں احساق ہر جگہ چیختا چلاتا نظر آتا۔

"یہ گھر ہے یا سرائے... صبح کو کوئی چیز مشرق کی طرف رکھیں تو شام کو مغرب کی طرف ملے گی... بھئی' یہ سارا سلسلہ کس لیے ہو رہا ہے۔ کچھ پتہ بھی تو چلے؟ یوں معلوم ہوتا ہے اس گھر میں بارات آنے والی ہے۔"

"تمہاری بارات آنے والی ہے' احساق..." وہ ہنس کر کہتی۔

"خدا کی پناہ! ایک خاوند کے لیے زر کو آگ لگائی جا رہی ہے۔"

"تمہیں کیا معلوم' خاوند کیا ہوتا ہے۔"

"میں پوچھتا ہوں' کیا ہر بار جب وہ باہر جایا کریں گے' تم اسی طرح دولت لٹایا کرو گی؟ وہ تو بنجارہ ہے۔ گھومنا پھرنا اس کا شغل ہے۔"

"اوے... ان پر نہ لٹاؤں تو اور کس پر لٹاؤں...؟ ان ہی کی دولت ہے' ان ہی پر نچھاور کر رہی ہوں۔"

"خداوندا! یہ شوہر پرست لڑکیاں... بس کیا کہوں؟ اپنی ساری دلکشی ختم کر لیتی ہیں۔"

"اچھا اب زیادہ جلو نہیں۔ جب تمہاری بیوی آئے گی تو میری مثالیں دیا کرو گے۔"

"واقعی...؟"

وہ فلکی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ڈھٹائی سے ہنسا۔

"کمینہ...!" فلکی زیرِ لب بڑبڑائی۔

کبھی کبھی فلکی سوچتی کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے؟ کیا وہ فضول خرچ ہے؟ یا احمق ہے؟"

وقتاً فوقتاً" آفاق اسے خرچ کے لیے پیسے دیتا رہتا تھا مگر وہ اس نے خرچ نہیں کیے تھے' رکھ لیے تھے۔ اس کی خواہشات آپ ہی آپ محدود ہو گئی تھیں۔ اب بھی جاتے وقت آفاق اس کی ہتھیلی پر دس ہزار روپے کا چیک رکھ گیا تھا۔ جسے اس نے پیار سے اُٹھا کر اپنی ڈائری میں رکھ لیا تھا۔

آفاق نے اس پر ہر قسم کے ظلم کیے تھے' مگر پیسے کی تنگی کبھی نہیں دی تھی۔

نہ جانے کیوں وہ خود ہی پیسے سے دور ہو گئی تھی۔

ابھی تو اس کے پاس' اس کا سلامیوں والا ہزاروں روپیہ بھی بڑے بڑے ہاروں کی شکل میں اس کی الماری میں پڑا ہوا تھا۔

آخر یہ پیسہ کس دن کام آئے گا؟

یہ سوچ کر اس نے گھر کو سجانا شروع کر دیا تھا۔ جب عورت اپنے نئے گھر کو آباد کرتی ہے تو وہ اپنے حسن سلیقہ کے خوب خوب جوہر دکھاتی ہے۔ اب فلکی کو بھی اپنے جوہر دکھانے کا موقع مل رہا تھا۔

بے شمار نئی چیزیں خرید لائی تھی۔ نئی سیزیاں' نئے گل دان' نئے ایش ٹرے' نئی کتابیں....

غرض اس کا دل چاہتا کہ روش روش پر دیئے جلا دے اور ایک ایک دیئے میں اپنی آنکھوں کی جوت رکھ دے۔

آنکھیں' جو اپنا بچھڑا ساجن تلاش کر رہی تھیں۔

اس ساری مصروفیت کا ایک فائدہ ہوا کہ ممی نے اس کی جان چھوڑ دی۔ کبھی کبھی' کھڑے کھڑے آ جاتیں۔ اسے بال الجھائے' حساب کرتے ہوئے دیکھتیں تو بیٹھتیں بھی نہیں۔ پھر سارے گھر میں رنگ و روغن کی بو رچی ہوئی تھی۔ اس بو سے انھیں الرجی ہوتی تھی۔ پہلی چھینک پر ہی ناک پر رومال رکھ کر باہر چلی جاتیں۔

سارا گھر ٹھیک ہو گیا تھا۔ فرش سے لے کر چھت کے پنکھوں تک ہر چیز چم چم کر رہی تھی۔

گھر کی حالت اس دلہن کی سی ہو گئی تھی جو سولہ سنگھار کیے' سنگھاسن پر بیٹھی' اپنے پیا کی راہ دیکھ رہی ہو۔

ہر شے جیسے آنکھیں کھولے پڑی تھی۔

ہمہ تن انتظار تھی۔

ہر کمرے میں موسم کے پھول گلدانوں میں مسکرا رہے تھے۔

سردی شدید ہو گئی تھی۔

اتنا زیادہ کام کر کے فلکی تھک گئی تھی۔

ہر شام وہ کمروں کے پردے گرا کر اندر بیٹھی درد بھرے گیت سنا کرتی۔

سردیوں کی شام ویسے بھی بوجھل ہوتی ہے۔ اندھیرا جلد اتر آتا ہے۔

اس روز بھی گھرے گھرے بادل آسمان پر تیر رہے تھے۔

شام جلد ہی سیاہی مائل ہو گئی تھی۔

فلکی نے سارے گھر کے پردے گرا دیے۔ کمروں میں گیس کے ہیٹر لگے ہوئے تھے' ان کو آن کر دیا... اور خود آ کر ٹی۔وی لاؤنج میں بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر تک بیٹھی "لوسی شو" دیکھتی رہی۔ پھر اسے عشاء کی اذان سنائی دی اور وہ ٹی وی بند کر کے نماز کے لیے چل دی۔

دوبارہ ٹی۔وی لگانے کو جی نہ چاہا تو اختر شیرانی کی شعروں کی کتاب لے کر بیٹھ گئی۔

ساڑھے آٹھ بج گئے تھے مگر اسحاق ابھی نہیں آیا تھا۔ ہر روز تو چھ بجے ہی آ جایا کرتا تھا ممکن ہے آج کسی دوست کے ہاں چلا گیا ہو۔

وہ سوچ رہی تھی کہ اسحاق آئے تو وہ کھانا کھا کر سو جائے۔

آج اس کی طبیعت بیشہ سے زیادہ اداس تھی۔ کتنے دنوں سے اس نے کپڑے نہیں
تھے۔ بال نہیں دھوئے تھے۔ سلیقے سے کنگھی تک نہیں کی تھی۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے نا کہ آدمی اپنے ہی وجود سے تھک جاتا ہے۔ اپنے آپ سے ا
ہے۔ پھر دل چاہتا ہے کہ ایک فالتو شے کی طرح اپنے آپ کو کسی گڑھے میں گرا دیا جائے۔
پھر خود فراموشی طاری کرلی جائے۔

کتنی بار اس کے دل نے چاہا۔

ذرا ہمت کرو..... اٹھو..... کپڑے بدلو..... حلیہ ٹھیک کرو.....

یسے گھر میں کوئی بھی آسکتا ہے۔

اور تو اور' ممی ہی آسکتی ہیں... اور ممی تو اس کی لاپرواہی کو اب ہمیشہ سے زیادہ کو
تھیں۔

نہیں...!

نہیں...!

نہیں...!!

اس نے اپنے دل کو صاف جواب دے دیا تھا۔

کون آتا ہے یہاں؟

یہ کہہ کر وہ قالین پر دراز ہوگئی۔

وہیں ایک نیچی سی تپائی پر' بڑے سے گلدان میں نرگس کے ڈھیر سارے پھول مسکرا
تھے۔

نہیں.... نرگس کے پھول کبھی نہیں مسکراتے صرف بولتے ہیں۔

ان کی نہ معلوم آنکھیں بولتی ہیں۔

ان کی چپ چاپ خوشبو بولتی ہیں۔

اسے پہلی بار شاعروں کی تشبیہ پر یقین آیا۔ واقعی نرگس کے پھولوں کی خوشبو کس
اداس کردینے والی ہوتی ہے... قلب و جان میں اتر جاتی ہے۔ ذہن میں قنوطیت ہی قنو
بھردیتی ہے۔

اس نے پھولوں کے قریب اپنا چہرہ رکھ کر پلکیں موندلیں۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے پھ
کی خوشبو کراہ کراہ کر کہہ رہی ہے۔

لوٹ آؤ...!

لوٹ آؤ...!!

آ بھی جاؤ....

ان کی خوشبو میں انتظار کا سوز کیوں ہے؟

ان کی اداسی میں ایک سہاگن کے سونے بستر کی پکار کیوں ہے؟

یا ایک کنواری کے منتشر خوابوں کی آس...

اس نے پھر شعروں کی کتاب اٹھالی۔ ورق پلٹا' سامنے ہی شعر نظر پڑا۔

نہ پھولوں کی تمنا ہے' نہ گل دستوں کی حسرت ہے
مجھے تو کچھ انہی بیمار کلیوں سے محبت ہے

"بیمار کلیاں...
روگی غنچے..."

فلکی نے زیرلب دہرایا... اور پھر نرگس کے پھولوں میں کھوگئی۔

اسی وقت بالکل اچانک' گھر کی ساری بتیاں چلی گئیں۔ گھر پر اندھیرا چھاگیا اور خوف ناک
سناٹا طاری ہوگیا۔

چند سیکنڈ تک فلکی انتظار کرتی رہی۔ جب بجلی نہیں آئی تو اٹھ کر موم بتی تلاش کرنے لگی۔
اس نے ہر کمرے میں کنگ سائز موم بتیاں اور ماچس کا پیکٹ رکھا ہوا تھا۔ بس ذرا اندازے
سے ٹٹول کر وہاں تک جانے کی ضرورت تھی۔

جب موم بتی مل گئی تو اسے جلا کر اس نے کینڈل اسٹینڈ میں رکھ دیا۔

پھر دوسری جلائی... پھر تیسری....

سر اٹھا کر دیکھا تو ہر دیوار پر موم بتیوں کے سائے لرزاں تھے۔

روشنی اور اندھیرا' جیسے ایک دوسرے کے ساتھ محوِ رقص تھے۔

تنہائی ہو تو موم بتی کی یہی لرزتی ہوئی لو دیوار پر بھوت بن جاتی ہے اور ڈرانے لگتی ہے۔
فلکی جتنی زیادہ موم بتیاں جلاتی' اسے اتنا ہی ڈر لگنے لگتا۔ حقیقت ہے' ہزاروں کی تعداد میں
موم بتیاں بھی بجلی کا بدل نہیں بن سکتیں۔

باورچی خانے سے ملازموں کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ غالباً انھوں نے بھی روشنی کا
بندوبست کرلیا تھا... گھر میں اس وقت ملازموں کے علاوہ کوئی اور نہ تھا۔

اسے ان ملازموں سے بھی خوف آنے لگا۔ باہر گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا اور اندر بلا کا سناٹا... سناٹا تو خواہ مخواہ آوازوں کو جنم دیتا ہے۔

اس نے سامنے شیلف میں رکھا ہوا اسحاق کا ٹرانسسٹر ریڈیو اٹھا لیا۔ آن کیا تو سیلون سے پرانے گیت بج رہے تھے۔

یا صورت آ کے دِکھا جاؤ
یا کہہ دو ہم کو یاد نہ کر
دل جلتا ہے تو جلنے دے
آنسو نہ بہا فریاد نہ کر

یوں تو یہ گیت درد ہی درد ہے... سوز ہی سوز ہے۔

مگر اس وقت جیسے فلکی کے پہلو میں کئی نشتر ایک ساتھ چبھ گئے۔

یا صورت آ کے دِکھا جاؤ..

یا کہہ دو....

یا کہہ دو' ہم کو یاد نہ کر

دل جلتا ہے تو....

جلنے دے...!

جلنے دے...!!

آنسو نہ بہا فریاد نہ کر...

جیسے کمرے کی ایک ایک چیز' اس گیت کی ہم آواز ہو گئی.... چاروں طرف سے پکار ہونے لگی۔ دہائیاں اٹھنے لگیں۔

میں کب فریاد کر رہی ہوں؟

دل ہی تو جلا رہی ہوں۔

فلکی نے جلتی ہوئی ایک موم بتی ہاتھ میں پکڑ لی۔

اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

پھر اس نے موم کے قطروں سے ذرا سے ننگے فرش پر آفاق کا نام لکھ دیا... میز پر... پاس پڑی ہوئی کتاب پر...

آفو...!

...!! آفو...!!!

ر اس نے اپنی ہتھیلی پر بھی لکھ دیا.. اف! گرم گرم قطرہ اس کی ہتھیلی پر گرا تو اس کی جان ی گئی۔

اب شرم و حیا کے پردے میں
چُھپ چُھپ کے یوں بیداد نہ کر

اد نہ کر...

اد نہ کر...

ی بے دردی سے اپنی ہتھیلی جلائے گئی... جلاتی رہی....

ب اچانک... بالکل اچانک دھڑ سے دروازہ کھلا اور فلکی موم بتی سمیت لرز کر چونک

ر اس کے ہاتھ میں کانپی... اور پھر وہ یوں کھڑی ہو گئی جیسے اس نے دروازے میں بھوت یا ہو۔

روازے میں آفاق کھڑا تھا۔

ی آفاق' جسے اس نے ہتھیلی پر جمایا تھا۔

س کا آفاق!

س کے خوابوں کا شہزادہ آفاق..

سے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

کن ہے' یہ واہمہ ہو.. خواب ہو.. ہیولہ ہو... کوئی اور ہو' جو اندھیرے میں آفاق کی شبیہہ ے کھڑا ہو۔

ر وہ آفاق تھا۔

و والہانہ انداز میں اس کو تک رہا تھا۔

س کے ایک ہاتھ میں بریف کیس تھا اور دوسرے ہاتھ میں کیمرہ تھا۔

لیٹی رنگ کا سرخ دھاریوں والا سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ صحت مند اور چاق و نظر آرہا تھا۔ آنکھوں میں چمک تھی... چہرے پر سرخی تھی۔

مک کھل کر اور بھی صاف ہو گیا تھا۔

ونٹوں پر پیاری سی مسکان تھی۔

یہ' اس کا دیوتا تھا۔

وہ ایک دوسرے کی جانب پاگلوں کی طرح دیکھ رہے تھے۔

آفاق کی آنکھوں میں چمک تھی۔

فلکی کی آنکھوں میں وحشت تھی۔ خواب سے جاگ اٹھنے کا تاثر تھا۔

پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ آفاق کی جانب دیکھے جا رہی تھی... ایک نشاط آگیں چیخ لبوں پر رک گئی تھی۔ لٹیں گلے میں جھول رہی تھیں۔ ہاتھ میں موم بتی کی لَو تھر تھرا رہی تھی۔

جلتا ہوا موم اس کی ہتھیلی پر جمع ہو رہا تھا۔

اس کا دوپٹہ' کندھوں سے ڈھلک کر کلائی پر گر گیا تھا۔

وہ ابھی تک یقین اور غیر یقینی کے دوراہے پر کھڑی تھی۔

چار آنکھیں ایک دوسرے کے آر پار جا رہی تھیں۔

... اور بس..

باقی سارا عالم ٹھہر گیا تھا۔

جب ایکدم موم بتی ختم ہو گئی۔ پگھلا ہوا موم ایک شعلے کی طرح بھڑکا اور شعلے نے اس دوپٹے کو پکڑ لیا جو ہتھیلی پر سرک آیا تھا۔

"ارے... ارے... آپ نے دوپٹہ جلا لیا۔"

بریف کیس فرش پر رکھ کر آفاق چیختا ہوا اس کی طرف دوڑا۔ اس کا دوپٹہ کھینچ کر پھینکا اور پھر اپنے بھاری بوٹ مار مار کر دوپٹے کی آگ بجھانے لگا۔

دوپٹہ جلا تو تمہیں نظر آگیا۔

میں تو دین و دنیا جلا بیٹھی' تن مَن پھونک بیٹھی' آگ ہی آگ بھر لی اپنے جیون میں... آگ تو تمہیں نظر نہ آئی۔

"ارے' یہ گرم گرم موم آپ کا ہاتھ جلا دے گا۔"

آفاق نے دوپٹے کی آگ بجھا کر اس کی طرف دیکھا... پھر قریب آ کر بڑی تشویش سے اس کا لرزتا ہوا ہاتھ تھام لیا۔

اسی وقت بتیاں جل اٹھیں۔ کمرہ روشن ہو گیا سارے میں چکا چوند ہو گئی۔

ہائے کم بخت کو کس وقت خدا یاد آیا

فلکی آہ بھر کر رہ گئی۔

تھوڑی دیر اور بتیاں نہ جلتیں تو کونسا خدائی قہر ٹوٹ پڑتا۔

اس نے ان موم بتیوں کی طرف دیکھا جو بجلیاں جل اٹھنے کے بعد پھڑپھڑا رہی تھیں اور بہت شرما رہی تھیں۔ شاید بجلیوں کے سامنے وہ اپنے تن سے لَو کا رشتہ توڑنا چاہتی تھیں۔

وہ آفاق کے سامنے وہ بالکل حقیر اور چھوٹی سی لگ رہی تھی۔

آفاق نے اس کا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔

ہتھیلی پر چھالوں کی صورت میں "آفو" لکھا ہوا دیکھ لیا تھا۔

اس نے فرش پر دیکھا۔ میز پر دیکھا.... کتاب پر دیکھا.... اخبار پر دیکھا۔ اِدھر اُدھر ہر جگہ لکھا ہوا تھا۔

اس کی نگاہ پلٹ کر آئی تو فلکی کے چہرے پر ٹھہر گئی۔

اس کا چہرہ سچ بول رہا تھا۔

اس نے بھی تڑپ کر اپنی سلگتی ہوئی آنکھیں' اس کی آنکھوں میں الجھا دیں... آج وہ دل کی حالت اپنی آنکھوں سے واضح کر دینا چاہتی تھی۔ پر برا ہو' اسحاق کا... اسی وقت لات مار کر دروازہ کھولا اور اندر آگیا۔

"اچھا... تو یہاں لو (Love) سین ہو رہا ہے اور میں باہر گاڑی میں بیٹھا بیٹھا اکڑ گیا ہوں.... آپ تو یہ کہہ کر آئے تھے کہ ابھی کسی ملازم کو روشنی کے ساتھ باہر سامان اٹھانے کو بھیجیں گے۔ میں جانتا ہوں کہ اندر کی فضا بڑی ہوش ربا ہے مگر ایسی بھی کیا بے مروّتی کہ چھوٹا بھائی ہی ذہن سے اتر گیا۔ اسے کہتے ہیں "سگ باش برادرِ خورد مباش۔"

آفاق نے فلکی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اس کا ہاتھ یوں گرا جیسے ہڈّی ٹوٹ گئی۔ گرم گرم بچے کھچے قطرے اس کے پاؤں پر گر گئے۔

آفاق نے ایک کھسیانہ سا قہقہہ لگایا۔ پھر ملازموں کو آوازیں دینے لگا۔

"عبدالکریم!"

دو ملازم دوڑے آئے۔ صاحب کو دیکھا۔ سلیوٹ کیا... اور پھر سامان اٹھانے باہر کی طرف دوڑے۔

.... تو.... اسحاق انہیں لینے گیا تھا اور مجھے اطلاع بھی نہ دی۔

فلکی کے کھلے ہوئے چہرے پر ایک دم ناگواری سی چھا گئی۔ یہ دونوں بھائی مجھے اس قابل نہیں سمجھتے کہ کسی خوشی میں شریک کریں۔

فلکی نے گھور کر اسحاق کی طرف دیکھا... اور منہ پھیر لیا۔

"ارے بھابی محترمہ! مجھے اس طرح کھا جانے والی نظروں سے نہ دیکھو۔ اس میں میرا قصور نہیں تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے بھیّا نے ایئر پورٹ سے فون کیا تھا۔ میں اتفاق سے اُدھ ہی بیٹھا ہوا تھا... جا کر انھیں لے آیا۔ باقی حساب کتاب انہی سے دریافت کریں۔"

فلکی نے آفاق کی طرف ملامت بھری نظروں سے دیکھا۔

"جو اچانک ہو ملاقات' خوشی ہوتی ہے۔"

آفاق نے آنکھوں میں پیار بھر کر گنگنانے والے انداز میں کہا۔

"میں آپ کو اس خوشی سے محروم نہیں رکھنا چاہتا تھا۔"

فلکی کے سارے گلے آپ ہی آپ دور ہو گئے۔

میں جانتی ہوں مسٹر آفاق... تم کیوں اچانک آئے ہو.... آئے ہو تو کیا... تمہاری را تمہارے نام پر بیٹھی دیے جلا رہی تھی... یہی دیکھنا چاہتے تھے نا تم...؟ اس نے اپنے دل دل میں کہا۔

"بھیّا! اس خاتون نے آپ کے پیچھے مجھے بہت بور کیا۔ قسم اللہ پاک کی میرے آباؤ اجد توبہ' جو کبھی میں کسی شوہر پرست خاتون کے گھر میں اکیلا رہوں۔"

فلکی وہاں سے دانستہ کھسک گئی۔ سیدھی باورچی خانے گئی۔ آج اس نے رات کے کھـ پر بالکل اہتمام نہیں کیا تھا.... اسحاق بھی رات کو زیادہ کھانے کا عادی نہیں تھا۔

اس نے فرج کھول کر دیکھا۔ گوشت' مرغی' مچھلی سب کچھ پڑا ہوا تھا۔

عبدالکریم کو چند ضروری باتیں سمجھا کر وہ دوبارہ ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

سارا کمرہ آفاق کی خوشبو سے بھرا ہوا تھا۔ وہی مخصوص سگریٹ کی مہک... پرفیوم کی ... فضا میں مٹیلا دھواں تھا۔

اور ایک ایک شے پکار پکار کر کہہ رہی تھی۔

وہ آ گیا ہے!

وہ آ گیا ہے!!

وہ جس کے انتظار میں تم اور ہم سب ہمہ تن انتظار تھے۔

ہمارا آقا....

ہمارا خواب....

ہمارا پیارا....

آفاق بڑی ادا سے نرم صوفے پر دراز تھا۔ اس وقت اس نے اپنا کوٹ اتار دیا تھا۔ گلابی قمیص کے بٹن کھلے تھے' گریبان کی اوٹ سے سینے کے سیاہ بال نظر آ رہے تھے' آنکھیں ہو رہی تھیں' جانے کیوں۔ بال ذرا سے بکھر گئے تھے اور ان بکھرے ہوئے بالوں میں وہ ا اچھا لگ رہا تھا۔

ہمیشہ سے زیادہ اچھا لگ رہا تھا۔

فلکی کا ڈرا' سہا ہوا دل چپکے چپکے اس کی بلائیں لینے لگا۔

اس نے نظر چرا کر اپنے کپڑوں کی طرف دیکھا... میلے چکٹ ہو رہے تھے۔ آج وہ جمعدارنی رہی تھی۔

وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔

وہ مہمان جو نس نس میں بسا ہوا تھا....

...اس کے شبستان میں چاند بن کر آ گیا تھا۔

واہ' فلکی..... ذرا آئینے میں اپنی صورت تو دیکھو۔

"کھانا کھائیں گے؟" اس نے جلدی سے یوں پوچھا جیسے اپنی آوازوں سے آپ بچنا چاہتی

"کیوں نہیں کھائیں گے؟" اسحاق جلدی سے بولا "آج بھیّا کے آنے کی خوشی میں روزہ کھلواؤ گی کیا؟ تمہاری بھوک تو انھیں دیکھتے ہی مٹ گئی ہوگی۔ مگر ان سے مسلسل باتیں کر کے میرے پیٹ میں چوہے فٹ بال کھیلنے لگے ہیں۔"

اور ہم نے..." آفاق بہت آہستہ سے یوں بولا جیسے اس کی زبان کو تلخ کلامی کی عادت ہی نہ "اور ہم نے اس شوق میں کچھ نہیں کھایا تھا کہ گھر جا رہے ہیں۔ ویسے جہازی بیٹیاں بھر بھر اچھے لائی تھیں۔"

یہ کہہ کر آفاق نے براہِ راست اپنی نگاہیں فلکی کے چہرے پر گاڑ دیں۔ فلکی کا منہ سرخ گیا۔ وہ کچھ بول نہ سکی اور دوڑ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔

اب وہ ساری چیزیں آفاق کی پسند کی بنانا چاہتی تھی۔

آفاق کو خاگینہ پسند تھا۔ کچے قیمے کے کباب اچھے لگتے تھے۔ انار دانے اور پودینے کی چٹنی بھی لگتی تھی۔ چاولوں کی کھیر اچھی لگتی تھی اور یہ سب چیزیں جلدی بن سکتی تھیں۔ فلکی یوں

ہاتھ چلانے لگی جیسے کسی کھلونے میں نئے سیل ڈال دیے گئے ہوں۔

رات کے گیارہ بجے انھوں نے خوب چٹخارے لے لے کر کھانا کھایا۔

کھانے کے بعد دونوں بھائی پھر کاروباری معاملات پر گفتگو کرنے لگے۔ اس دفتر میں جو کچھ ہوتا رہا تھا' اسحاق اسے بتاتا رہا... اور امریکہ میں جو کام آفاق کر کے آیا تھا اس کی تفصیلات اسحاق کو سمجھاتا رہا۔

گو فلکی کے لیے اس موضوع میں کوئی دلچسپی نہ تھی... اور نہ وہ اسے کاروباری گفتگو میں شامل کرنا پسند کرتے تھے۔ پھر بھی فلکی وہیں بیٹھی رہی۔ آفاق کے قریب سے اٹھنے کو اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا... اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ آفاق کی صورت دیکھتی رہے۔ اس کی آواز سنتی رہے۔ اس کی خوشبو سونگھتی رہے۔

ذرا سی دیر کو فلکی اپنے کمرے میں آئی۔ جب واپس آئی تو ڈرائنگ روم خالی تھا۔

وہ لوگ کہاں گئے؟

وہ آفاق کے کمرے تک گئی۔ جھانک کر دیکھا۔

وہیں پر آفاق جوتوں سمیت چت لیٹا ہوا تھا۔

اندر چلی جا...

فلکی کے دل نے کہا۔

جا... چلی جا.....

سب دوریاں ڈھا دے۔

یہ کیا ذرا سی انا بچا کر رکھی ہوئی ہے۔

اس کا بھی بچپن کچل دے۔

اتنے دنوں کے بعد تیرا پریتم آیا ہے۔

دونوں طرف جذبات تپ رہے ہیں۔

ذرا سانس کی ہلکی سی آنچ دے...

آگ بھڑک اٹھے گی۔

اس آگ میں جل کر خاکستر ہو جا۔

مگر میں تو آج اتنی گندی ہو رہی ہوں..... وہ شہزادہ لگ رہا ہے۔

بناؤ سنگھار کرنے میں وقت لگ جائے گا۔

کا سیندور نہ دیکھ۔

... ان قدموں سے لپٹ جا۔

جسم میں حلول ہو جا۔

اپنی آن کا خول توڑ دے۔

بار... صرف ایک بار۔

گھونگھٹ خود اٹھا دے۔

تیرا شوہر بھی ہے۔

نے جیسے اپنے آپ کو دھکا دیا اور اندر چلی گئی۔

کے قریب چلی گئی۔

آنکھیں بند کیے پڑا رہا تو اس نے اس کے پاؤں کی طرف دیکھا۔ پاؤں میں بوٹ اسی طرح

وں سے ابتدا کر دے۔ قدموں پر رکھا ہوا سر کوئی کم ظرف ہی ٹھکراتا ہے۔

جھک کر بوٹوں کے تسمے کھولنے لگی۔

چونکا اور پھر اس نے آنکھوں پر سے اپنا بازو ہٹا کر دیکھا۔

آپ ہیں۔" ... اس نے پاؤں کھینچے۔ "یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟"

آپ کے جوتے اتار رہی ہوں۔ آپ شاید بہت تھک گئے ہیں۔" فلکی نے زبردستی

پاؤں پکڑ کر جوتے اتار دیے۔ پھر جرابیں کھینچ لیں۔ اندر سے گورے گورے صاف

پاؤں نکل آئے۔

نے بڑے پیار سے دونوں پیروں پر ہاتھ پھیرا تو آفاق یوں تڑپ کر اٹھ بیٹھا جیسے اس

کو بچھو نے ڈس لیا ہو۔ اس نے جلدی سے اپنی ٹائی کی گرہ ڈھیلی کی اور گلے سے نکال

کے ہاتھ میں پکڑا دی۔

لمبی سی جمائی لے کر بولا۔

راتوں سے نہیں سویا ہوں فلک بیگم!"

چھا۔" فلکی کا دل دھڑک اٹھا... میری طرح شاید.....

والیہ نگاہوں سے آفاق کی جانب دیکھنے لگی۔

سل سفر میں آدمی کہاں سو سکتا ہے؟" وہ کھڑا ہو گیا۔

"آپ کو معلوم ہے... پچھلے دس دنوں سے مسلسل سفر میں تھا۔ نیویارک سے ٹوکیو گیا۔ دو دن رک کر پیرس جانا پڑا... دو دن پیرس میں رہا پھر جرمنی چلا گیا... وہاں سے بلجیم اور سے ناروے... ناروے سے لندن... وہاں سے کراچی پھر لاہور... جہاں بھی جاتا تھا' مکمل نصیب ہی نہیں ہوتی تھی... کبھی تو جہاز میں بیٹھے بیٹھے رات ڈھل جاتی تھی اور کبھی راستہ ہونے سے پہلے دوسرے ملک کے دن کی ابتدا ہو جاتی تھی۔ ابھی پوری طرح سو نہیں پاتا اگلے سفر کی تیاری شروع کر دیتا تھا۔

"لیکن پیرس میں تو آپ کو کم از کم ایک ہفتہ رک کر آرام کرنا چاہیے تھا۔"

آفاق اس طرح مسکرایا جیسے فلکی کی بات سمجھ گیا ہو۔

"بھئی... اس طرح کا آرام کرنے کے لیے تو ٹوکیو سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہے۔"

"پھر ٹوکیو ہی میں رک جاتے؟" فلکی نے ہنس کر کہا۔

"جنت وہی جگہ ہے جہاں دل بہل گیا... یہ بات آپ کہاں سمجھ سکیں گی فلک بیگم۔"

پھر ایک لمبی سی جمائی لے کر بولا۔

"یہ کاروبار بھی بڑی ظالم شے ہے۔ جب میٹنگ کا وقت لے رکھا ہو' کاروباری لوگ اپنی چھریاں تیز کیے آپ کے انتظار میں ہوں اور آپ شہر میں اجنبی ہوں' زبان سے نا ہوں' وہاں کے آداب معاشرت نہ جانتے ہوں' وقت بھی کم ہو' جانے کا ٹکٹ بھی لے ر اور آپ اپنی ساکھ بھی رکھنا چاہتے ہوں تو زلف و رخسار کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے۔ یاد آتا ہے کہ

تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے۔"

فلکی کو دل میں تو بہت خوشی ہوئی لیکن بے پروائی سے بولی۔ "آپ پورے آٹھ ہفتے بعد آئے ہیں بلکہ ایک دن اوپر بھی۔"

"اچھا... اصل میں میرا حساب کمزور ہے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے کل گیا تھا' آج آ ہوں۔" یہ کہہ کر آفاق غسل خانے میں چلا گیا۔ واپس آیا تو اس نے براؤن رنگ کا دھار سلیپنگ سوٹ پہن رکھا تھا۔

سگریٹ سلگا کر بستر پر بیٹھ گیا۔ دو تین کش لیے پھر سالم سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا دی۔

"میں نے ابھی آپ سے کہا تھا نا کہ میں کئی راتوں سے نہیں سویا۔ اب میں سونا چاہتا اس لیے اپنے کمرے میں ہی سو جاؤں گا۔ تھک گیا ہوں۔ ٹوٹ گیا ہوں... جوڑ جوڑ دکھ ر مہربانی کیجیے گا۔ صبح جب تک میں خود نہ اٹھوں' مجھے کوئی نہ جگائے۔"

"جی اچھا..." فلکی نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

اس نے رضائی کی تہ لگا کر اس کی پائنتی کی طرف رکھ دی... اور اس کا سامان کمرے میں طرف لگا دیا جو ابھی تک بند پڑا ہوا تھا۔ ایک ایک سوٹ کیس کے ساتھ کئی کئی چٹیں لٹک تھیں۔

پھر اس نے مڑ کر آفاق کی طرف دیکھا۔ وہ رضائی میں گھس گیا تھا۔

... زیرو کا بلب جلا کر فلکی نے کمرے کی بتیاں گل کر دیں اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کمرے نکل آئی۔

یہ زیادتی ہوگی اگر میں...

پھر یہ موقع ہاتھ نہیں آئے گا۔

نہیں... نہیں... یہ تہذیب کے خلاف ہے۔

محبت میں سب جائز ہے۔

اس نے التماس کی ہے۔

تم بھی کر سکتی ہو۔

بڑا اکل کھرا ہے... بہت شرم آئے گی' اگر اس نے جھٹک دیا۔

تیرے نصیب ہی ایسے ہیں۔

شاید نصیب ہی ایسے ہیں... اپنے آپ سے لڑتی ہوئی وہ آکر اپنے بستر میں گھس گئی۔

کئی راتوں سے وہ بھی نہیں سوئی تھی۔ اس کو بھی بے خوابی کی تکلیف تھی... وہ بھی مضطرب ... مگر دونوں کی بے خوابی میں بہت فرق تھا۔

وہ چین سے سوئے گا... فلکی آج رات بھی بے قرار رہے گی۔

اس نے آج' لاج کا آخری پردہ بھی اتار دینے کی ٹھان لی تھی۔ وہ تو پندار' انا' وقار' داری... سب کچھ بھینٹ چڑھانے چلی تھی۔

مگر اپنی نیند بھینٹ چڑھا کر سرد بستر کی بے حس آغوش میں بیٹھی' رات کے گزرنے کا انتظار رہی تھی۔

صبح اسحاق ناشتہ کر کے دفتر چلا گیا تھا۔ فلکی نے سارا گھر صاف کرایا۔ ہر کمرے میں نئے پھول سجائے۔ اٹھ کر ہی تو آفاق نے گھر کی نئی سج دھج دیکھنی تھی۔ کئی بار اس نے آفاق کے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ وہ بچوں کی مانند بے سُدھ سویا پڑا تھا۔ فلکی نے اپنا آج کا سبق پڑھا۔ اب وہ بیسویں سیپارے پر پہنچ گئی تھی اور بڑی جلدی کلام پاک پڑھ رہی تھی۔ ایک تو اس میں پڑھنے کی لگن تھی اور دوسرے اس کے پاس وقت بھی بہت تھا۔ تقریباً آدھا سیپارہ روز پڑھ لیا کرتی تھی۔ ایک بار دہرا کر پھر اگلے دن فجر کی نماز کے بعد دہراتی تھی۔

سب کاموں سے فارغ ہو کر اس نے سوچا کہ وہ نہا دھو کر اچھے اچھے کپڑے پہن لے۔ اس نے اپنا ایک نارنجی رنگ کا سوٹ نکالا جس پر مختلف رنگوں میں کارنیشن کے پھول بنے ہوئے تھے۔ "کارنیشن کا پھول محبت کی علامت ہے" جیسے کسی نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

وہ مسکراتی ہوئی غسل خانے میں چلی گئی۔

نہا کر آئی تو اس نے ہلکا سا میک اپ کر لیا۔ بال ابھی گیلے تھے اس لیے اس نے کُھلے چھوڑ دیے۔

ویسے بھی بہت دنوں کے بعد سنگھار کیا تھا۔ چہرے پر روپ آگیا تھا۔ وہ آنے والی رات کے تصوّر سے مدہوش ہوئی جاتی تھی۔

سوچ رہی تھی... ہوش اور بے ہوشی کے درمیان
یہ آخری چھلانگ ہوگی...
آخری کھائی ہے جسے عبور کرنا ہے۔
بے خطر اس آگ میں کود جا۔
گلزار بنے.. یا جل مرے...
قسمت پر چھوڑ۔

ہ پہر ترنگ میں آ کر اب ڈھلنے لگی تھی۔ آفاق ابھی تک نہیں اٹھا تھا۔ فلکی کا دل بڑا بے تھا۔ اس کا دل چاہتا کہ جا کر اس کے پاؤں میں گُدگُدی کر کے اسے جگا دے۔ اتنے دن اور اتیں اس کے بغیر گزاری تھیں.. اور اب چند گھڑیاں گزارنا محال ہو رہا تھا۔

ور زندگی ان ہی چند گھڑیوں میں آ کر اٹک گئی۔

لی چائے، کھانا، پھل، کافی ہر چیز تیار کیے بیٹھی تھی، جو بھی مانگے گا پیش کر دے گی... آج ان بھی مانگے تو.....

ش! مانگے تو...

ام کو چار بجے آفاق کے کمرے سے ہلکا ہلکا دھواں نکلا... فلکی نے اس خوشبودار دھوئیں کو ینے سے لگا لیا جیسے ماں اپنے بچے کو لگاتی ہے۔ ڈرتے ڈرتے اندر جھانک کر دیکھا۔

فاق سیدھا لیٹا، چھت کو گھور رہا تھا اور سگریٹ پی رہا تھا۔

آپ اُٹھ گئے؟...."

لی نے دبے پاؤں، اس کے قریب جا کر پوچھا۔

لی ہاں جاگ اٹھا ہوں۔ آپ سرہانے آئیں تو شاید مُردے بھی جاگ اٹھیں۔"

لی ہنس دی۔

چائے لاؤں یا کچھ اور...؟" اس نے رک رک کر پوچھا۔

چائے ہی لے آئیں۔"

لی دوڑ کر کچن میں گئی اور ٹرالی پر چائے لگا کر لے آئی۔ آفاق نے اپنی سگریٹ بجھائی اور رکلی کی... پھر بستر پر بیٹھ گیا۔

لی چائے بنانے لگی۔ چائے پیش کرتے وقت اس نے آہستہ سے کہا۔

اس بار آپ سگریٹ کچھ زیادہ ہی پینے لگے ہیں۔"

کچھ نہ کچھ تو پینا ہی پڑتا ہے فلک بیگم!" اس نے پیالی تھام لی اور سائڈ ٹیبل پر رکھ دی۔

"سفر میں یونہی بے سکوں کٹتی ہیں زندگانیاں"

لی نے اٹھ کر تپائی ذرا آگے کر دی... اور پھر اخبار اُٹھا کر اس کے آگے رکھ دیا۔ وہ جانتی ہ چائے پیتے وقت آفاق اخبار ضرور دیکھا کرتا ہے۔

فاق نے چائے کا گھونٹ لے کر اخبار اٹھا لیا اور فلکی کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

ائے، یہ نخرے وہاں نہیں اٹھائے جاتے نا... اس لیے گھر واپس آنا پڑتا ہے۔"

پھر وہ اخبار دیکھنے لگا۔

فلکی سامنے صوفے پر بیٹھ گئی اور اس کی جانب دیکھنے لگی۔ سوجی سوجی آنکھیں' خشک سے ہونٹ... بکھرے ہوئے بال' سلوٹ زدہ کپڑے' وہ کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ لاأبالی سا... میلا میلا... الجھا الجھا' سخت' کٹھور' بے ترتیب۔ اس کے وجود سے ایک خوب صورت مردانہ سی مہک اٹھ رہی تھی۔ ایسی مہک' جس میں کھو جانے کو' ٹوٹ پھوٹ جانے کو جی چاہتا ہے۔

ایسی مہک جو پندار کے شیشے کرچی کرچی کر دیتی ہے۔

فلکی اس کے وجود میں کھو گئی۔ اسے اس وقت اپنے بناؤ سنگھار سے شرم آنے لگی۔

وہ بن ٹھن کر بھی اس کے سامنے ہیچ لگ رہی تھی... اور وہ ہمیشہ' ہر روپ میں اس کو مات دے جاتا تھا۔

اس لاأبالی سے بچے کو اٹھا کر اپنے کلیجے میں بھر لے۔

ہائے' یہ کیسی بندشیں ہیں جو توڑی نہیں جا سکتیں..... آخر اپنے شوہر سے بڑھ کر اور کون سا رشتہ ہو سکتا ہے؟

صرف اور صرف ایک رشتہ قریب تر رشتہ ہے جو خون کا رشتہ ہرگز نہیں ہے مگر سب خون کے رشتوں پر حاوی ہے... سب سے برتر ہے۔ میاں بیوی کا ہی ایک ایسا رشتہ ہے جن کے درمیان کوئی دنیوی حجاب نہیں ہوتا۔

لیکن وہ دونوں تو حجاب اندر حجاب زندگی گزار رہے تھے۔

ٹھیک ہے' آفاق کو اس پر غصہ ہے لیکن فلکی کو تو غصہ نہیں ہے۔

اٹھ .... اس کے دل نے کہا۔ اس کے دھڑکتے سینے پر سر رکھ کر اعتراف کر لے... اور آ دل کا دامن تھام کر محبت کی بھیک مانگ لے۔

اسی وقت آفاق نے اخبار چہرے پر سے ہٹا کر اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

"پلیز.... آپ میرا سامان کھول دیں گی؟"

"ضرور....." فلکی کھڑی ہو گئی۔ اس نے باری باری دونوں سوٹ کیسوں کی طرف دیکھا۔ آفاق جب گیا تھا تو صرف ایک سوٹ کیس لے کر گیا تھا۔ اب واپسی پر دو لایا تھا وہ سوچنے لگی کہ پہلے کون سا سوٹ کیس کھولے۔

"چابی میرے کوٹ کی جیب میں ہے شاید۔"

فلکی نے کوٹ کی جیبیں ٹٹولنی شروع کر دیں۔ چابیاں نکل آئیں۔ اس نے پہلے آفاق کا

ی کیس کھولا' جو وہ یہاں سے لے کر گیا تھا۔

سب کپڑے نکال لیے جو بے ترتیبی سے بھرے ہوئے تھے۔ سوٹوں کو ہینگروں میں لٹکایا۔ تے نکال کر "شوریک" میں رکھے۔ ٹائیاں اپنی جگہ لٹکائیں۔ میلی قمیصیں' بنیانیں اور جرابیں ی کر کے پلاسٹک کے بیگ میں ڈال دیں تاکہ بعد میں دھو سکے۔ شیونگ کٹ نکال کر سامنے ینگ ٹیبل پر رکھ دی۔ جب وہ سوٹ کیس کی جیبوں کی تلاشی لے کر اسے جھاڑ رہی تھی تو پوسٹ کارڈ سائز کی تصویریں نکل کر فرش پر گر گئیں۔

فلکی نے لپک کر وہ تصویریں اٹھالیں' جیسے ان ہی کی تلاش تھی اسے تینوں تصویریں لڑکیوں کی تھیں مگر تینوں فرنگیں تھیں۔

"یہ... یہ...." فلکی نے تینوں تصویریں آفاق کے سامنے پھیلا دیں' جیسے کہ اس کے دل کا ر پکڑنا چاہتی ہو۔

آفاق نے اپنی انگلیوں سے تصویریں سیدھی کیں اور شہادت کی انگلی ان کے چہروں پر رکھ بولا۔

"یہ جولیا ہے' پیرس میں رہتی ہے....

یہ لنڈا ہے' امریکہ میں رہتی ہے.....

اور یہ کرسٹین ہے' میونخ میں رہتی ہے۔"

"اچھی ہیں..." یہ کہہ کر فلکی لاپروائی سے باقی ماندہ بکھری ہوئی چیزیں سمیٹنے لگی۔

"ارے..." آفاق اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "آپ کو ذرا بھی حسد محسوس نہیں ہوا۔"

"کیوں...؟" فلکی کے ہاتھ رک گئے "اس میں حسد والی کون سی بات تھی؟"

"تین جوان لڑکیاں بیک وقت میری دوست ہیں اور ہر ملک میں میرا انتظار کرتی ہیں۔"

"میں جانتی ہوں۔ ایک آدمی بیک وقت تین لڑکیوں سے محبت نہیں کر سکتا۔"

اسے نوری کی بتائی ہوئی سب باتیں یاد آنے لگیں۔

"کیوں نہیں کر سکتا؟ میں تو بیک وقت چار لڑکیوں سے محبت کرتا ہوں۔ ایک پاکستان میں ی ہے۔"

یہ بات سن کر فلکی کا دل اس انداز میں دھڑکا کہ خالی ہینگر اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ اس نے ہستہ سے ہینگر اٹھایا' اس میں قمیص لٹکائی اور پھر وارڈروب کے پاس جا کر اس نے اپنی آواز پر بو پالیا اور بولی۔

"پھر آپ ان تینوں کو بے وقوف بنا رہے ہوں گے۔"

"یا پھر..." فلکی نے ڈرتے ڈرتے نظریں اٹھائیں اور اس کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی "اپنے آپ کو۔"

یہ سنتے ہی آفاق نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔

فلکی کی جان میں جان آئی ورنہ وہ ڈر گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ چھوٹے منہ سے بڑی بات نکل گئی ہے۔

اس نے دوسری چابی نکال کر دوسرا سوٹ کیس کھولنا چاہا تو آفاق جلدی سے بولا۔

"بھئی' یہ سوٹ کیس آپ کا ہے۔ یہ میری امی نے زبردستی ساتھ کردیا تھا۔ کہہ رہی تھیں کہ اس میں میری بہو کی چیزیں ہیں۔ کچھ تحائف آپ کو ثوبیہ نے بھجوائے تھے۔ سب کچھ اس میں ہے۔ آپ دیکھ لیں۔ اندر ثوبیہ کا خط اور سامان کی لسٹ بھی ہوگی۔"

"کیا کیا چیزیں ہیں؟" فلکی فرطِ شوق سے دیوانی ہوگئی۔

"آپ خود دیکھ لیں۔ میں نے تو کھولا بھی نہیں ہے۔ اٹھانے کا گنہگار ضرور ہوا ہوں۔"

فلکی نے جلدی سے سوٹ کیس کھول ڈالا۔

اف' اتنی چیزیں... کوٹ' سوئیٹر' ساڑھیاں' قمیصوں کے پیس' گھڑی' جیولری' پرفیوم' ثوبیہ اور امی کی ایک تصویر تھی۔ ایک لمبا سا خط بھی تھا۔

فلکی ایک ایک چیز کو محبت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ جیسے یہ سوغاتیں اس نے زندگی میں پہلی بار دیکھی ہوں۔ پھر اس نے ثوبیہ کا مفصل خط پڑھا' جس میں اسے امریکہ آنے کی پرزور دعوت دی گئی تھی۔ امی جان کے سینکڑوں پیار اور ڈھیروں دعائیں تھیں۔

فلکی کو ایک انجانی محبت کا مطلب سمجھ میں آرہا تھا۔

اس نے خط بند کرکے لفافے میں ڈالا اور ایک ذم گھڑی ہوگئی۔

"آپ میرے لیے کیا لائے ہیں؟ یہ سب چیزیں تو امی جان نے بھیجی ہیں۔"

"ارے واہ... میں یہ سب کچھ اٹھا کر یہاں تک لایا ہوں۔ آپ کی خاطر مزدور بنا' ملک ملک پھرتا رہا ہوں۔ یہ جوتے' جو امی جان نے بھیجے ہیں' میں اپنے سر پر اٹھا کر لایا ہوں... اگر میں یہ چیزیں لانے سے انکار کردیتا تو...؟"

"خیر' آج باتیں بنانے سے کام نہیں چلے گا۔ آپ نے اپنی جیب سے کیا خریدا ہے میرے لیے؟"

"بھئی' میں نے اپنی جیب سے آپ کے لیے جو خریدا تھا' وہ آپ کی ممی کے ہاتھ بھیج دیا تھا۔"

"وہ تحفہ تھا..؟ وہ تو چاکلیٹ تھے۔"

"اچھا... تو چاکلیٹ تحفہ نہیں ہوتے؟"

"کھانے کی چیز تو کھائی جاتی ہے۔"

"پھر آپ اسے نہ کھاتیں' سنبھال کر رکھ لیتیں۔"

فلکی مسکرا دی۔

"میں نے وہ نہیں کھائیں۔ سنبھال کر رکھ لی ہیں۔"

"کیوں...؟" آفاق کھڑا ہوگیا اور تعجب سے گھورنے لگا۔

"اس کا ریپر بہت خوب صورت تھا اور میں اسے ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔"

"تو بس' پھر اسی ریپر کو ہی تحفہ سمجھ لیں۔"

"تو یوں کہیے کہ آپ کو اتنی حقیر سی بات کا خیال ہی نہیں آیا۔"

آفاق غسل خانے کی طرف جاتا جاتا پلٹ آیا اور پھر سگریٹ کو ایش ٹرے میں بجھا کر بولا۔

"آپ کے لیے میں خود جو آگیا ہوں۔"

اور جلدی سے غسل خانے میں گھس گیا۔

فلکی دل تھام کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

اچھا جواب تھا... اچھا جواب تھا... شاید وہ یہی سننا چاہتی تھی۔ اس سے اچھا تحفہ اور کون سا ہو سکتا ہے؟

ہے' نا...؟ اس نے اپنے دل سے پوچھا۔

مگر دل میں کہیں ملال تھا' شاید۔

تھوڑا' تھوڑا...

دل چاہتا تھا..... دنیاوی اعتبار سے دل کے جذبات کا اظہار کیا ہوتا... کوئی ایسی چیز دی ہوتی' جس سے اس کے احساسات کا اندازہ ہو سکتا۔

فلکی نے جلدی جلدی اس کا کمرہ ٹھیک کرنا شروع کردیا تاکہ اس کے باہر آنے سے پہلے ہر چیز ترتیب سے رکھ دے۔ رضائی کی تہہ لگا کر جب اس نے چڑمڑ سے نرم تکیوں کو اٹھایا تو ایک ڈبہ فرش پر گر گیا۔

اس نے دیکھا۔ سیاہ رنگ کا مخملیں ڈبّہ تھا۔ جانے اس میں سگریٹ ہوں گے یا کف لنک؟

فلکی نے ڈرتے ڈرتے اسے اٹھایا۔

کہیں کچھ ٹوٹ نہ گیا ہو۔

کھولنے سے پہلے ڈر گئی۔ آفاق نکل آیا تو ڈانٹے گا کہ میرِ اس کی تلاشی لے رہی ہوں۔

مگر آج دل باغی ہو رہا تھا۔

غسل خانے کی طرف پیٹھ کرکے اس نے جلدی سے ڈبّہ کھول لیا۔

"آخاہ... وہ ہیروں کا ایک نازک سیٹ تھا۔ گلے کا لاکٹ' کانوں کے بُندے اور ایک انگوٹھی...

سب میں دل کی شکل بنی ہوئی تھی جس میں ننھے ننھے ہیرے جڑے ہوئے تھے۔

جی بھر کر دیکھ نہ سکی۔ سارے جسم پر ہیجان طاری ہو گیا۔

یقیناً یہ میرے لیے ہے۔

اس قدر خوب صورت... اتنا انوکھا تحفہ...

آنکھیں بھیگنے لگیں.. پتہ نہیں' یہ جذبات کا کون سا موڑ تھا' جیسے اس نے کسی پوشیدہ دفینے کا کھوج لگا لیا ہو۔

اس نے جلدی سے وہ ڈبّہ تکیوں کے نیچے رکھ دیا۔ بستر پر بیڈ کور ڈالا اور گھبرا کر باہر آگئی۔

اپنے آپ کو نارمل کرنا بہت ضروری تھا... ورنہ بھید کھل جانے کا ڈر تھا۔

دل جب اچھی طرح تڑپ چکا تو پھر وہ اپنے حواسوں میں آگئی.. اس کی طبیعت کو سکون آ گیا۔

سکون میں آتے ہی جب وہ اندر آئی تو آفاق لابی میں کھڑا فون کر رہا تھا۔ فلکی تھوڑی دیر اس کے پاس کھڑی رہی۔ شاید وہ دفتر میں اسحاق سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ باورچی خانے میں گئی اور وہاں سے آفاق کے لیے شیو کا گرم پانی لے آئی۔

"میرا کوئی شلوار کرتہ نکال دیجیے۔"

آفاق شیو کا پانی لے کر غسل خانے میں چلا گیا۔

فلکی نے کپڑوں کی دراز کھول کر آفاق کے لیے خاکی رنگ کا ایک کرتہ' شلوار نکالا' نئی بنیان نکالی' کرتے کو اپنی پسند کی پرفیوم لگائی اور نیا تولیہ نکال کر پلنگ پر رکھا۔

پلنگ کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کا دل مچلا... اس کا دل چاہا کہ وہ دیکھے' ڈبیا اپنی جگہ

ہے یا نہیں۔

وہ اپنی خواہش کو روک نہ سکی۔

جلدی سے تکیے اٹھا دیے...

مگر ڈبیا اب وہاں نہیں تھی۔

غالباً" آفاق نے اٹھا کر کسی محفوظ جگہ پر رکھ دی تھی.... کسی مخصوص وقت کے لیے۔

اگلا ہفتہ انتہائی بوریت میں گزرا۔ آفاق اس قدر مصروف ہو گیا کہ اسے گھر کا بھی ہوش نہ رہا۔ وہی فائلیں' وقت بے وقت آنا' رات رات بھر کام کرنا جتنی دیر گھر پر ہوتا' دونوں بھائی بیٹھے کاروباری گفتگو کرتے رہتے' بحث کرتے رہتے... رات گئے تک ان کے صلاح مشورے اور بحثیں جاری رہتیں۔

... اور جب فارغ ہوتا تو کھانا کھا کر اس طرح بے سُدھ ہو جاتا' جیسے دنیا میں اور کوئی کام نہیں رہا۔ اس وقت فلکی کو بے حد غصہ آتا۔

لیکن وہ کر بھی کیا سکتی تھی؟

جس موقعے کی تلاش میں وہ تھی' اسے وہ موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ کبھی کبھی تو اسحاق اسے اپنا رقیب معلوم ہونے لگتا۔ کم بخت' جب سے آیا تھا' فلکی کو ایک پل سکون نہیں ملا تھا... اب آفاق کے ساتھ سائے کی طرح لگا ہوا تھا حتیٰ کہ آفاق رات کو اسی کے کمرے میں سونے لگا تھا۔

وہ ایک بار بھی تو فلکی کے بیڈ روم میں نہیں آیا تھا۔

اپنے شبستانوں کو اس نے اپنے خوابوں کی طرح سجایا تھا... اور چاہتی تھی کہ اب اس کے خوابوں کا شہزادہ اس کے خواب مجسم کرنے کو یہاں آجائے۔

مگر اسے تو اندر جھانکنے کی بھی فرصت نہ تھی۔

فلکی دادِ لیتی بھی کیسے؟

ویسے اس نے سارے گھر کی تعریف کی تھی اور ایک ایک کمرے کی سجاوٹ دیکھ کر فلکی کے ذوقِ جمال کی داد دی تھی اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا تھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ میرے پیچھے آپ نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا۔"

"جو وقت کسی کی یاد میں بسر ہوتا ہے' وہ ضائع نہیں جاتا..." فلکی کا دل چاہا کہ وہ کہہ دے مگر اسحاق اس وقت بھی سر پر سوار تھا۔ وہ خوف کے مارے چپ ہی رہ گئی۔ مبادا بات ہی بگاڑ دے... ویسے بھی وہ اٹھتے بیٹھتے فلکی کی حالتِ زار کا نقشہ کھینچا کرتا تھا۔

لیکن اب...

ہر رات فلکی اس کی آہٹیں دل میں بسائے سو جاتی۔

وہ ستم پیشہ اس کے تجلۂ عروسی میں نہیں آ رہا تھا۔

ایک بار آئے تو...

فلکی من ہی من میں سوچتی... پھر... پھر...

اسے وہ کھڑی یاد آجاتی' جو جالا بنتی ہے... اور پھر جو بھی اس جالے کے قریب سے گزرتا ہے' اسے اسیر کر لیتی ہے۔

فلکی نے بھی اپنی ساری جراتوں اور ہمتوں کو جمع کر کے ایک جالا بن لیا تھا۔

اور یہ جالا اس کے بیڈ روم میں تھا۔

فلکی کو جالے میں پھنسانے کا ڈھنگ بھی آگیا تھا۔

وہی کمرہ جس نے اس کے بدلتے ہوئے' سلگتے ہوئے اور ریگتے ہوئے شب و روز دیکھے تھے اور جس کمرے میں اس نے زندگی کی پہلی ہار تسلیم کی تھی' اسی کمرے میں وہ اپنی محبت کو سُرخروئی عطا کرنا چاہتی تھی۔

ایک دن کھڑی اپنی سوچوں سے الجھ رہی تھی۔ ارادے باندھ باندھ کر توڑ رہی تھی.....

کہ ایک دم آفاق اس کے کمرے میں آگیا۔

فلکی اپنے بال سُلجھا رہی تھی... فوراً کھڑی ہوگئی۔ لمبے سنہری بال بے ترتیب ہوگئے۔

آفاق کمرے کے وسط میں آکر کھڑا ہوگیا۔ حیرت سے چاروں طرف دیکھا ایک ایک چیز کو آنکھوں ہی آنکھوں میں سراہا اور بولا۔

"آپ گھر کی سجاوٹ کے بارے میں اتنا اچھا ذوق رکھتی ہیں... اس کا یقین مجھے آج ہوا ہے۔ بیڈ روم واقعی خوابوں جیسا ہے۔"

"تو تم اس میں خواب بن کر سما جاؤ نا..." اس کے دل نے کہا۔

فلکی منہ سے کچھ نہ بولی۔ چاندی کی کنگھی سے کھیلتی رہی۔

وہ اور قریب آگیا۔

"بس' ایک شوہر کے بارے میں آپ کی چوائس اچھی نہ تھی۔"

"جی...؟"

فلکی چونکی تو وہ پورا گھوم گیا۔

"یہ کیوپڈ کے مجسمے کے ساتھ آپ نے تاج محل کیوں رکھ دیا ہے؟"

فلکی تھر تھر کانپنے لگی۔

ہر کیوپڈ کے شکار کے مقدر میں تاج محل تو نہیں ہوتا...

"تاج محل ہی لافانی محبت کی علامت ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ زمین پر تعمیر کیے جائیں۔ یہ دلوں میں بھی تعمیر ہو سکتے ہیں۔"

فلکی نے بڑی جرأت کر کے کہہ دیا۔

"ہاں ٹھیک ہے.. مگر یہاں تاج محل رکھنا' قنوطیت کی علامت ہے۔"

(تو کیا یہاں میں اپنا دل رکھ دوں....؟)

"انجام سے آپ ڈرتی ہیں؟"

وہ اس قدر قریب آگیا کہ اس کی سانس فلکی کے رخساروں کو چھونے لگی۔

"نہیں تو... انجام تو مجھے معلوم ہے۔"

فلکی نے سر جھکا کر کہا۔

آفاق نے ایک دم اس کے لمبے لمبے کھلے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔

"کتنے خوب صورت ہوگئے ہیں آپ کے یہ بال؟... اچھا کیا کٹوائے نہیں۔ لمبے بال آپ پر بہت اچھے لگتے ہیں۔"

آفاق نے جوں ہی اس کے بالوں کو چھوا' اس کے سارے جسم میں سنسناہٹیں سی ہونے لگیں۔ سر سے پاؤں تک ایک آگ لگ گئی۔ گُدگُدی اور کرنٹ کی کیفیت ایک ساتھ ہی پیدا ہوئی۔

آفاق نے اس کے بال چھوڑ دیے اور ہاتھ سے کنگھی لے لی۔

"واہ... چاندی کا کنگھا اور سونے کے بال۔"

اس نے شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر اس کی کنگھی سے اپنے بال درست کیے۔ پھر کنگھی ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دی۔

"اچھا... چلتا ہوں۔" اس نے دوبارہ اس کے لمبے بالوں کو چھوا۔

فلکی کی پھر جان نکل گئی۔ روح حلق میں اٹک گئی۔ وہ پوری گھوم گئی۔ اس کے دل نے فریاد کی۔

پھر چھوؤ' میرے بالوں کو...

پھر انگارے بھر دو' میرے تن من میں...
پھر بجلیاں اتار دو میری نس نس میں....
مجھے مدہوش کر دو..... کہ میں' اَنا کے اس ناگ کو کچل ڈالوں تمہارے بازوؤں میں آ کر مر جاؤں... فنا ہو جاؤں... نہیں تو...
زہر کا ایک پیالہ کہیں سے لا دو اور اپنے ہاتھوں سے مجھے پلا دو۔
وہ دروازے تک جاتا جاتا پھر پلٹ آیا۔
فلکی کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے اس کے دل کی فریاد سن لی ہے۔
"جو کہنے آیا تھا' کہے بنا جا رہا ہوں۔ اس کمرے کے سحر نے مجھے سب کچھ بھلا دیا۔"
فلکی کے لب لرزنے لگے۔ بھلا وہ کیوں اس کے سامنے بزدل بن جاتی ہے۔
یہی وہ وقت ہے' یہی... باہر دونوں وقت مل رہے ہیں... تو اپنی بانہیں پھیلا دے۔
"دراصل میں یہ بتانے آیا تھا کہ آج رات میں کراچی جا رہا ہوں۔"
"کراچی..." فلکی یوں لڑکھڑائی جیسے گر ہی تو جائے گی۔
"ہاں' احاق نے امریکہ جانا ہے۔ میں نے سوچا... میں خود ہی اسے کراچی تک چھوڑ آؤں اور وہاں میری ایک میٹنگ بھی ہے۔"
"آپ کب تک واپس آئیں گے؟"
فلکی نے مری ہوئی آواز میں اس طرح پوچھا... جیسے جان نکل رہی ہو۔
"پرسوں صبح... انشاء اللہ واپس آ جاؤں گا۔"
"پرسوں صبح...؟" ابھی دو راتوں کا سمندر بیچ میں ہے' جسے پار کرنا ہو گا۔
دو راتیں... دو صدیاں....
یہ بھی گزر ہی جائیں گی' جیسے اتنے ڈھیر سارے دن بیت گئے۔
"ذرا آپ' میرا سامان پیک کر دیں گی؟"
"جی' اچھا..." فلکی نے کنگھی ہاتھ سے رکھ دی۔
آفاق' کمرے سے نکل گیا۔ فلکی نے اپنی الماری کھول کر پہلے وہ سب چیزیں نکالیں جو وہ آفاق کی امی اور ثوبیہ کو بھیجنا چاہتی تھی۔ آفاق کے جانے سے پہلے ان کا پارسل بنا کر بھی احاق کو دینا تھا۔

آج صبح آفاق کو کراچی سے واپس آنا تھا۔ فلکی رات بھر اضطراب کے مارے سو نہیں سکی تھی۔ دل میں کیا کیا منصوبے بناتی رہی تھی۔ اسے معلوم تھا' سفر سے آ کر آفاق آرام کیا کرتا ہے۔ دفتر نہیں جاتا۔
اس لیے وہ' صبح ہی صبح تیار ہونے لگی۔
آج مطلع اَبر آلود تھا۔ صبح پوری کہر اور دُھند میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس واسطے اندر گرم گھروں میں بھی سردی محسوس ہو رہی تھی۔
اس نے اپنا ویلوٹ کا سرخ سوٹ نکالا جس کے "چائنیز نیک" پر تلے اور نقشی کے ساتھ فل اسٹائل کا کام بنا ہوا تھا۔
سوٹ پہنتے وقت وہ ڈر گئی۔
سرخ رنگ مجھے راس نہیں آتا۔
اس نے اپنے دل میں سوچا۔
کوئی بات نہیں... اس کے دل نے کہا۔ واہموں کا دَور گزر گیا ہے... اور اب وہ بہادر عورت بن گئی ہے... اب جب کہ دو ہی صورتیں باقی بچی تھیں۔
زندگی یا موت...
تو پھر ڈرنا کیسا...؟
ٹھکرانا اس کی ادا ہے تو وہ بھی ڈھیٹ بن چکی تھی... آج کہاں تک ٹھکرائے گا۔
وہ اس حد تک سر جھکائے گی کہ سر ٹوٹ جائے گا۔

آج ہے پیار کا فیصلہ اے صنم' آج میرا مقدّر بدل جائے گا
تو اگر سنگدل ہے تو پرواہ نہیں' میرے نغموں سے پتھر پگھل جائے گا

دھیرے دھیرے گنگناتی ہوئی فلکی تیار ہونے لگی۔

آج وہ اس طرح تیار ہو رہی تھی جیسے خاص طور پر بجلی گرانے کے لیے تیار ہوا جاتا ہے۔
عورت جب آگ لگانے کا ارادہ کرلے تو مرد کو خاکستر ہونا پڑتا ہے۔
اور پھر آج تو معاملہ ہی اُلٹ تھا۔
فلکی محبوبہ بن کر نہیں... کنیز بن کر رسائی چاہتی تھی۔
وہ معشوقہ نہیں بن سکی تھی۔ اس نے عاشق بننا گوارا کرلیا تھا۔
وہ بیوی ہوتے ہوئے بھی بیوی نہ تھی۔
آج وہ اپنا حق نہیں مانگ رہی تھی بلکہ چڑھاوا چڑھانا چاہتی تھی۔
محبت میں چڑھاوے بھی چڑھائے جاتے ہیں....
منتیں بھی مانی جاتی ہیں۔
محبوب کے قدموں میں سر بھی رکھا جاتا ہے۔
گو ہوتا آیا ہے کہ یہ سب عورت کی تقدیر میں ہوتا ہے۔
لیکن تقدیر نے فلکی پر اوچھا وار کیا تھا۔
آج فلکی' آفاق تھی... اور آفاق' فلکی کی جگہ پر تھا۔
من و تُو کا فرق اس نے مٹا دیا تھا۔
حجاب کے پروے تار تار کردیے تھے۔
اپنے اوپر جوائے کی خوشبو چھڑکتے ہوئے اس نے ریڈیو لگا دیا۔
مدھر سُروں میں آواز ابھری۔

روح بے چین ہے قدموں سے لپٹنے کے لیے
تجھ کو ہر سانس بُلاتی ہے تجھے کیا معلوم

میرے مالک...
مجھے قبول کرلینا!
اس نے اپنے ماتھے پر ننھا سا ٹیکا سجایا۔
مجھے سویکار کرلینا۔
مجھے اون OWN کرلینا۔
میری مانگ میں سیندور بھر دینا۔
میرے چڑھاوے کا مان رکھ لینا۔

اسی جب پوجا کرتی ہے تو پھول چڑھاتی ہے... میں اپنا دل اپنا جسم چڑھاؤں گی۔
وی دیوتا منت پوری کرے یا نہ کرے...
چڑھاوے کو نہیں ٹھکراتا۔
پھولوں کو اپنے قدموں میں رکھ لیتا ہے۔
یرے پھولوں کو بھی اپنے قدموں میں جگہ دینا۔
یرے پھولوں کو انگارے نہ بنا دینا...
یرے پھولوں کو' میری سانسوں کو...
یری آسوں کو...
یرے ارمانوں کو...
مجھے...!
مجھے...!
سی وقت باہر کار کا ہارن سنائی دیا۔
ڈرائیور' آفاق کو لینے ایئرپورٹ گیا تھا۔
فلکی جان بوجھ کر نہیں گئی تھی۔
وہ نئی نویلی دُلہن بن کر گھر پر انتظار کرنا چاہتی تھی۔ یوں سرخ کپڑے پہن کر' ماتھے پر ٹیکا ایئرپورٹ جانا اسے بہت برا لگ رہا تھا۔ سارے لوگ اسی کو دیکھنے لگ جاتے اور شاید فلکی س طرح جانا آفاق کو بھی برا لگتا۔
فلکی اب بالکل تیار تھی۔
جب باہر کار کا ہارن سنائی دیا تو اس نے اپنا سرخ جال والا دوپٹہ اٹھا کر اپنے سر پر اوڑھ لیا۔
فلکی ہی کیا' سارا کمرہ ہی حجلۂ عروسی بنا ہوا تھا۔ پلنگ پر سرخ بیڈ کوَر بچھا ہوا تھا۔ سینٹر ٹیبل پر گلاب مسکرا رہے تھے۔ آتشدان میں سرخ رنگ کا ہیٹر جل رہا تھا اور فلکی شعلہ بنی کھڑی

کمرے میں خوشبو ہی خوشبو تھی۔
خوشبو...
تنہائی....
دلہن... اور... حُسن

جب چاروں محاذوں پر صف آرائی ہو تو پھر نہتے آدمی کے لیے جائے فرار نہیں رہتی۔

فلکی کو یوں محسوس ہو رہا تھا...

جیسے وہ آج کیل کانٹوں سے لیس ہو کر میدانِ جنگ میں کھڑی تھی۔

بس، طبلِ جنگ بجنے والا ہے۔

مگر عجیب بات ہے..... آج کی جنگ میں ہارنے والا ہی فاتح ہوگا۔ اس واسطے، جیتنے کے سارے سامان کے ساتھ فلکی ہارنے کو تیار کھڑی تھی۔

آج اسے اس محاورے پر یقین آ رہا تھا کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔

فلکی ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ اسے پیشوائی کے لیے باہر جانا چاہیے.... یا اندر رہ کر آفاق کا انتظار کرنا چاہیے۔

کہ ایک دَم بھاری بوٹوں کی آواز آئی... اور پھر آفاق اندر آ گیا۔

فلکی نے اس کی غیر متوقع آمد سے شرما کر، سر کو یوں جھکا لیا جیسے آج پہلے پہل پریتم کے دوارے آئی ہو۔

آفاق نے یونہی سرسری نظر سے فلکی کی طرف دیکھا، جیسے کوئی دیوار کو، پودے کو یا کسی پرندے کو دیکھتا ہے... اور پھر صوفے پر بیٹھ گیا۔

فلکی کا دل دھک دھک کر رہا تھا لیکن کھڑی کانپ رہی تھی۔

آج اس کے جذبات اس کے چہرے پر لکھے ہوئے تھے اور اس کے ارادے سرخ گھونگھٹ کی اوٹ سے جھانک رہے تھے۔

جانے اب اگلے لمحے کیا ہو؟

آفاق کا چہرہ سپاٹ تھا۔ نیلے آسمان کی مانند، جس پر بادل کا کوئی آوارہ ٹکڑا نہیں ہوتا۔

سگریٹ سلگا کر آفاق نے ہونٹوں میں دبا لیا اور پھر فلکی کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

"فلک... آپ جانتی ہیں، آج کیا تاریخ ہے؟"

فلکی نے بولنے کے بجائے نگاہ اٹھا کر سامنے دیوار پر لگے سوئٹزرلینڈ کے کیلنڈر کی طرف دیکھا جو برف باری کے بّراق آسا منظر کے ساتھ نئے مہینے کی تاریخ بھی دکھا رہا تھا۔

"آج ہماری شادی کو ایک سال ہو گیا ہے، ہے نا؟"

فلکی کی نگاہ یکم جنوری پر اٹکی ہوئی تھی۔

واقعی... لیکن یہ تاریخ اس کے ذہن سے کیسے نکل گئی۔ جب کہ دس دن پہلے اس نے اس

یخ کے بارے میں اچھا خاصا سوچ لیا تھا اور یہ بھی سوچ رکھا تھا کہ آفاق کو Surprise ینے کے لیے وہ شادی کی سالگرہ کا اہتمام کرے گی اور آفاق کو کوئی انوکھا سا نرالا سا تحفہ بھی ے گی۔

مگر... پھر... شاید پچھلے ہفتے کی جذباتی کشمکش کے باعث وہ سب کچھ بھول گئی تھی، ئہ بھولنا نہیں چاہیے تھا... یہ دن اس کی زندگی کا اہم ترین دن تھا... اور اس دن اس کی گرہ بھی ہوتی تھی۔

کیسا اتفاق تھا؟ آج پھر وہ دُلہن بنی کھڑی تھی اور آفاق خود اس کے کمرے میں آ گیا تھا۔

اور یہ دن خود بخود یادگار ہوا جا رہا تھا۔

"آج..." آفاق اسی سپاٹ لہجے میں گویا ہوا۔ "آج میں نے سوچا ہے کہ اس یادگار دن... کو کوئی انوکھا اور نرالا تحفہ دیا جائے۔"

فلکی کا سارا خون چہرے پر آ گیا۔

اس کا دھیان، اس سیاہ مخملیں ڈبیا کی طرف چلا گیا۔

اس نے سوچا... وہ کہہ دے.... تم... تم مجھے قبول کر لو۔

"آج سجن موہے انگ لگا لو جیون سپھل ہو جائے۔"

یہی... یہی سب سے بڑا انعام اور سب سے عظیم تحفہ ہوگا۔

آفاق ایک دَم کھڑا ہو گیا جیسے وہ بھی کسی کشمکش کا شکار ہو۔ اس نے فلکی کی طرف پیٹھ لی اور بولا۔

"ایک بار آپ نے مجھ سے اپنی آزادی مانگی تھی اور میں نے وعدہ کیا تھا کہ جب آپ ین خاتون بن کر دکھائیں گی تو میں آپ کو آزاد کر دوں گا۔"

یہ... یہ کون سا موقع ہے اس بات کے یاد دلانے کا... فلکی کی ٹانگیں لرزنے لگیں۔

اس نے مڑ کر دیکھا۔ فلکی گم صم کھڑی تھی۔

"..... اور میں نے آپ سے یہ بھی کہا تھا کہ آپ اپنا عزم بھول جائیں گی مگر میں اپنا وعدہ یاد وں گا۔ میں بات کا دھنی ہوں، وعدے کا پکا ہوں۔ میری یادداشت قابلِ رشک ہے... ہے "اس نے طنزیہ انداز میں فلکی کی طرف دیکھا۔

اتنے میک اپ کے باوجود، فلکی کے چہرے کا رنگ بار بار متغیر ہو رہا تھا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا... وہ کہاں ہے؟... وہ کیا سن رہی ہے؟...

کیا دیکھ رہی ہے؟ اسے کیا کرنا چاہیے... اور کیا کہنا چاہیے؟...

"تو آج..." وہ ڈرامائی انداز میں بولا۔

"اس یادگار دن' میں آپ کو آپ کی آزادی لوٹا رہا ہوں۔ آپ نے واقعی ایک مثالی خاتون بن کر دکھایا ہے اور بڑی لگن کے ساتھ زندگی کا قرینہ سیکھا ہے... اسی دن میں نے آپ کو نکاح کے زِندان میں قید کیا تھا... اگر آپ' میرے ساتھ رہنا نہ چاہیں تو آپ جاسکتی ہیں.. ابھی... اسی وقت... ایک لمحہ توقف کے بغیر۔"

فلکی نے اپنا سر تھام لیا۔ اس کا لرزتا ہوا ٹیکہ اس کی ہتھیلی پر آگیا۔

"میں نے ایک مہربانی آپ کے ساتھ کی ہے۔ آپ مانیں یا نہ مانیں کہ میں نے آپ کے ساتھ کوئی جسمانی تعلق قائم نہیں کیا۔ جسمانی رشتے محبّتوں کو مضبوط کرنے کے لیے قائم کیے جاتے۔ ہیں محض حیوانی جذبوں کے اظہار کے لیے نہیں۔ بعض اوقات جسم کا تعلّق جذباتی وابستگی کا سبب بن جاتا ہے۔

"میں نے آپ کو کبھی بھی مالِ غنیمت نہیں سمجھا۔ کبھی پامال نہیں کیا حالانکہ میں ایک مرد ہوں... اور آپ جانتی ہیں کہ میرے لیے ایسا کرنا بہت کٹھن تھا... اگر میں زبردستی کرتا تو اپنی نظروں میں بھی گر جاتا۔"

اس نے جیب سے ایک چیک نکالا اور اس کو ایش ٹرے کے نیچے رکھ دیا۔

"میں نے کچھ رقم بینک میں آپ کے لیے مخصوص کردی ہے۔ باقی اس گھر میں جو کچھ ہے' آپ ہی کا ہے جو بھی لے جانا چاہیں' لے جاسکتی ہیں۔ آپ کی اپنی گاڑی باہر کھڑی ہے۔ اب اس پر آپ کا اختیار ہوگا... خدا حافظ....."

اس نے کہا اور زن سے دروازے سے نکل گیا... جس طرح بندوق کی گولی نکل جاتی ہے۔

پھر یہ گولی خواہ جس کے لگے.. کہیں لگے... کسی کا ماتھا پھوٹ جاتا ہے' کسی کے نصیب... کسی کا دل زخمی ہوتا ہے' کسی کی آن... کسی کی روح نکل جاتی ہے کسی کی جان...

فلکی کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کی جان نکال دی ہو۔

وہ ایک خالی خول کی صورت میں فضا میں معلّق ہو۔

جب باہر آفاق کے کار سٹارٹ ہونے کی آواز آئی تو وہ ہوش میں آگئی۔

ہوش میں آتے ہی معاملے کی تہ تک پہنچی۔ تصدیق کرنے کے لیے چلتی ہوئی اس چیک کے پاس گئی۔

اتنی زیادہ رقم' صرف کھیل ختم کرنے کے لیے۔

اس نے چیک ہاتھوں میں لے کر ٹکڑے ٹکڑے کردیا۔ چیک کیا ٹکڑے ہوا' ایسا لگا جیسے فلکی سیب آگیا ہو۔

یک وقت تہذیب یافتہ' بنی سنوری' حلیم الطبع فلکی کے اندر سے وہی وحشی' جنگلی اور ب پرور فلکی نکل آئی۔

اس نے نوچ نوچ کر اپنے سارے زیور اُتار پھینکے' زرتار دوپٹہ تار تار کردیا۔ چوڑیاں اُتار دور پھینک دیں۔ ڈریسنگ ٹیبل کی ساری شیشیاں اٹھا کر آئینے پر دے ماریں۔ آئینہ چکنا چور یا۔ ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں میں' اس کے شکست خوردہ چہرے کے مختلف حصے نظر آرہے تھے' ں دیکھ دیکھ کر وہ چیخنے اور چلّانے لگی۔

کمینہ...

بے حس...

سنگدل...

اُلو کا پٹھا...

حیوان....

میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کوئی انسان اس قدر پنچ بھی ہو سکتا ہے۔

اتنا گرا ہوا...

اتنا گھمنڈی...

اتنا مغرور....

یہ سمجھتا کیا ہے' اپنے آپ کو... اس کے اشاروں پر چلتی رہی... اس کے ظلم سہتی رہی... کے لیے خاک ہوگئی....

اور یوں مجھے ٹھکرا کر چلتا بنا۔

اس ساری تپسیا کا یہ صلہ ہے۔

اب جو میں زندگی بھر اس منحوس کی شکل دیکھ گئی...

چیخ چیخ کر روئی' جی بھر کر روئی۔ جتنے کپڑے تار تار ہو سکتے تھے' کیے... جتنے شیشے اور گلدان ٹوٹ سکتے تھے' توڑے۔

جتنی گالیاں یاد تھیں وہ دے ڈالیں۔

جتنے کوسنے زبان پر آئے' وہ ادا کیے۔

اس وقت اس کا غصہ سوا نیزے پہنچا ہوا تھا۔ اس وقت تو اگر آفاق بھی اس کے سامنے ہوتا تو وہ اس کا منہ نوچ لیتی۔

کیا کیا نہ کردیتی وہ۔

اور جب تھک ہار گئی تو اٹھ کر اپنے کپڑے سمیٹنے لگی۔ فلکی صرف وہی سامان لے کر جانا چاہتی تھی جو وہ ممی' ڈیڈی سے لائی تھی۔ چن چن کر ایک ایک چیز جمع کی۔ اس وقت غصے میں یاد بھی نہیں آرہا تھا کہ کون سا کپڑا کہاں پڑا ہے۔ اس نے تو کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ یوں اٹھ کر جانا پڑے گا۔

سامان اکٹھا کرلینے کے بعد اس نے آئینے میں دیکھا۔ سارا کاجل بہہ گیا تھا۔ چہرہ بہت بھیانک ہورہا تھا۔

دلہن کی بجائے' وہ چڑیل لگ رہی تھی۔

اس نے غسل خانے میں جاکر ٹھنڈے پانی سے منہ دھویا' تولیے سے صاف کیا اور ایک ہلکی سی کریم لگالی۔

سرخ سوٹ اتار کر ایک سادہ سوٹ پہن لیا۔ اپنا کالا فروالا کوٹ اُٹھا کر کندھوں پر ڈالا۔

وہ' اس قابل نہیں کہ اس کے گھر میں ایک پل بھی رہا جائے۔

کم ظرف..

تنگ نظر۔

کور نگاہ....

گھٹیا... کمینہ....

عبدالکریم کو آواز دی۔ سامان اٹھوا کر اپنی گاڑی میں رکھا۔ سوچی سوچی آنکھوں پر کالی عینک لگا کر باہر آگئی۔

سارے ملازم آکر لائن میں کھڑے ہوگئے۔

ایک ایک کی نگاہ میں تاسف اور تعجب تھا۔

ہر ایک کا چہرہ سوال کررہا تھا۔

بی بی! تم کہاں جارہی ہو؟

مگر فلکی نے کسی کی طرف نہیں دیکھا... وہ سب اس کے کیا لگتے تھے؟...

جو آدمی دل میں نہ رہ سکے' اسے قدموں میں بھی نہیں رہنا چاہیے۔

گاڑی میں چابی لگی ہوئی تھی۔

فلکی نے دروازہ کھولا' اندر بیٹھتے ہی گاڑی اسٹارٹ کردی۔

گیٹ کا چوکیدار پریشان ہوکر کھڑا ہوگیا۔

حسب عادت اس نے گاڑی کو جاتا دیکھ کر ہاتھ سے سلیوٹ مارا مگر آج فلکی نے سر کی جنبش ہ اسے جواب نہیں دیا..... اور تو اور..... گل چہرہ نے بھی باڑھ کے پیچھے سے جھانک کر یکھا۔ کیونکہ فلکی نے آج کا سبق پڑھنے سے انکار کردیا تھا۔ کہا تھا' کل... دُگنا پڑھ لے گی...

ر فلکی کا خیال تھا کہ چند دنوں میں قرآن ختم ہوجائے گا تو وہ ایک جشن کا اہتمام کرے گی۔

اس کا جشن چراغاں' گریہ غم میں تبدیل ہوگیا تھا۔ اس نے پلٹ کر کسی شناسا چہرے کی رف نہیں دیکھا... یہ چہرے نہیں' دیو تھے' بھوت تھے' جن کی طرف پلٹ کر دیکھنے والا خود سیاہ ھر میں بدل جاتا ہے۔ وہ تیز رفتار سے یوں "رازداں" سے نکل آئی جس طرح کوئی رازدل سے نکل جاتا ہے۔

"فلک بوس" میں فلکی کی آمد سے سب چھوٹے بڑے بے حد مسرور ہوئے۔ شادی کے بو پہلی مرتبہ یوں رہنے کے لیے آئی تھی۔ نوکر چاکر بے حد خوش ہوئے۔ ہر کوئی ملنے کو چلا آ ہے..... اور امی تو اسے اتنے سازوسامان کے ساتھ دیکھ کر نہال ہو گئیں۔ یہ بھی نہ پوچھا کہ تہ چہرہ کیوں اُترا ہوا ہے؟ آنکھیں کیوں سُوجی ہوئی ہیں.... اور آفاق ساتھ نہیں کیوں نہیں آیا؟

ایسی ماں کبھی کبھی کتنی بڑی Blessing بن جاتی ہے۔ فلکی نے دل میں سوچا۔ ممی کی لً کبھی اتنی گہری نہیں ہو سکتی کہ زندگی کے معاملوں میں دور تک جائے۔

شاید لاشعوری طور پر ممی آفاق سے حسد کرنے لگی تھیں۔ آفاق نے فلکی کو ممی سے چھی لیا تھا۔

مگر فلکی نے تو کبھی کلب' میک اپ' رولرز اور بیرونی ملکوں سے حسد نہیں کیا تھا۔ ممی ہمیٔ ان چیزوں کو فلکی پر ترجیح دیتی رہی تھیں۔

"کچھ دن آرام کرو میری جان... تمھارے نازک کندھوں پر بہت بڑا بوجھ پڑ گیا تھا۔ اب واپس جانے کی ضرورت نہیں۔" ممی نے رات کو اس کے رخسار چُوم کر کہا۔

واپس کون کافر جا رہا ہے... اور دوبارہ اس جنم میں... بڑی مشکل سے تو رِہائی ملی ہے...

... کیا واقعی....؟

رات بھر وہ روتی رہی اور اپنے دل سے پوچھتی رہی۔

اب زندہ رہنے کا طریقہ یہی تھا کہ بھول کر بھی آفاق کے بارے میں نہ سوچے... سب روزن' دروازے بند کر دے اور میٹھی نیند سو جائے۔

دو چار دن تک اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ روز رات کو نیند کی گولی ضرو کھا کر سوتی تھی... اور صبح اُٹھ کر روبوٹ کی طرح دو چار کام کر کے پھر سو جاتی تھی۔

مسلسل نیند کی گولیاں کھانے سے اس کی نیند اُڑ گئی تھی۔ اب گولی نہ کھاتی تو رات بھر ج

نہ آتی۔

تب وہ بیٹھی بھولے بِسرے نغمے سنا کرتی۔

بھولے بِسرے نغمے' اسے کبھی بھی اچھے نہ لگتے تھے۔ یہ بالکل ایسا تھا جیسے جوانی میں کوئی دنیا ترک کر دے۔

لیکن اب پرانے اور درد بھرے گیت سن کر اس کے دل میں ہوک اٹھتی تھی۔ بھلا پرانے نغموں میں اتنا درد کیوں ہوتا ہے؟

اتنی بے چارگی اور اتنا سوز کیوں ہوتا ہے؟

کیا یہ گزرے ہوئے وقت کا نوحہ کرتے... یا گزری ہوئی عمر کو صدا دیتے ہیں۔

یا ان شکلوں کی یاد دلاتے ہیں جو کبھی زندگی میں آئی تھیں اور ہم نے انھیں حاصلِ زندگی کہا تھا۔

کمرے کے پردے گرائے' دروازے بند کیے۔ دونوں تکیوں میں منہ چھپائے کئی روز سے فلکی ایک ہی گیت سنتی جا رہی تھی۔ ممی کے زمانے کا گیت تھا اور ممی کی کبرڈ سے ہی وہ اٹھا کر لائی تھی۔

اک دل کا لگانا باقی تھا' سو دل بھی لگا کے دیکھ لیا
تقدیر کا رونا کم نہ ہوا' آنسو بھی بہا کے دیکھ لیا

وہ بار بار سوچتی' آخر وہ یہ گیت کیوں سنتی ہے' جب اسے گزرے زمانے کا ملال ہی نہیں تو... مگر پھر ہر بات کے جواب میں آنسو نکل آتے' جو اس کی نرم پلکوں کو بِھگو جاتے۔

اک بار بُھلانا چاہا تھا' سو بار وہ ہم کو یاد آیا
اک بھولنے والے کو ہم نے سو بار بُھلا کے دیکھ لیا

....

اب تک تو ہمیں معلوم نہیں' اس دل کی تمنّائیں کیا ہیں؟
.... اس دل کی تمنّائیں کیا ہیں؟
.... اس دل کی تمنّائیں کیا ہیں؟
سو بار ہنسا کر دیکھ لیا' سو بار رُلا کر دیکھ لیا!

اور پھر فلکی دھواں دھار رونے لگتی۔ گیت ختم ہوتا تو نئے سرے سے لگا دیتی۔ وہ اتنا رو چکی تھی کہ اگر گیت کے الفاظ اس کے سامنے رکھے ہوئے ہوتے تو اب تک مِٹ گئے ہوتے۔

وہ آفاق کے لیے ہرگز نہیں روتی۔ وہ بار بار اپنے دل کو تسلی دیتی۔

آفاق جیسے آدمی پر کیا رونا... رونا تو اسے اپنی تقدیر پر آرہا تھا۔

اس نے آفاق کے دونوں رُخ دیکھ لیے تھے اگر اس کے دل میں فلکی کا ذرا سا بھی خیال ہوتا تو وہ اب فلکی کو قبول کرلیتا۔

لیکن وہ تو محض ایک کھیل رچا رہا تھا.....

.....کیا اسے کھیل کہا جاسکتا ہے... اگر یہ کھیل تھا تو یہ فلکی نے شروع کیا تھا۔

وہ تو ہمیشہ فلکی سے دور رہا... ہمیشہ متنفر۔

خیر... دور رہنے کی تو بہت سی وجوہات ہوسکتی ہیں۔

پھر بھی اس نے شرافت تو برتی۔

تو نے خود ہی اس سے آزادی مانگی تھی فلکی بیگم... ہر قیمت پر آزادی۔

وہ تو فلزوج کے زمانے کی بات تھی۔ اب وہ زمانہ گزر گیا تھا۔

لیکن اس نے وعدہ جو کر رکھا تھا اگر وہ نہ نبھاتا تو اسے عہد شکن اور خود غرض کہتی۔

کاش وہ عہد شکن ہوتا... دل شکن نہ ہوتا...

وعدہ توڑ دیتا... میرا دل نہ توڑتا۔ وہ ایفائے عہد ہی کیا جو کسی کی زندگی ختم کردے۔

یہ سب باتیں تو اس کے سامنے بھی کہہ سکتی تھی۔

میں کیوں کہتی... اس کٹھور سنگدل سے بھیک مانگتی... ہاں' اب تو بھیک مانگنا ہی رہ گیا تھا۔

بھیک ہی مانگ کر دیکھی ہوتی۔ یہ ذرا سی انا بچا کر کیوں لے آئی ہو؟

میں بھی آخر گوشت پوست کی انسان ہوں۔ فٹ بال نہیں ہوں کہ ہر وقت ٹھوکر مارا جائے۔ وہ اتنا تو کہہ سکتا تھا کہ بھئی میں اپنے وعدے پر قائم ہوں... اب آگے تمہاری مرضی۔

اس نے تو حکم صادر کردیا' جیسے کہ وہ خدا ہو اور لوگوں کی تقدیروں پر قدرت رکھتا ہو۔

اپنی ذات پر اسے کس قدر گھمنڈ ہے۔

ٹھیک ہے' پہلے میں بُری لڑکی تھی۔

میں نے بہت سی بُری حرکتیں کی تھیں۔

مگر بعد میں اسے اس کی پسندیدہ لڑکی بن کر تو دکھایا تھا۔ اسے میری نفرت اور رعونیت کا چل گیا تھا... میری محبت کو کیوں نہ پہچان سکا؟

کیا وہ عقل کا بھی اندھا ہے؟

زندگی بھر اس کا نام نہیں لوں گی۔

اس کی صورت نہیں دیکھوں گی۔

اس نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے؟

اب میں اس کے چنگل سے آزاد ہوں' جو جی چاہے گا' کروں گی اور جہاں جی چاہے گا' جاؤں گی۔ میں نے اپنی آزادی کی پوری پوری قیمت ادا کی ہے۔

ایک شام کو ممی بن ٹھن کر اس کے کمرے میں آگئیں اور بولی۔

"آج کلب میں ایک "میوزیکل کنسرٹ" ہے۔ کیا تم چلوگی؟"

"نہیں' ممی! میرا دل نہیں چاہ رہا' پلیز..." فلکی نے بیزاری سے کہا "میں تھک گئی ہوں۔ ہاں آرام کرنے کے لیے آئی ہوں۔"

"اوہ' ڈیئر... ذہنی سکون کے لیے موسیقی اور تفریح دونوں کی بہت ضرورت ہے۔ گھر پڑی پڑی مُرجھا جاؤ گی۔"

"ممی..... مجھے ساتھ جانے پر مجبور نہ کریں۔ میرے پاس سننے کو بہت سے ریکارڈ ہیں۔"

"بے وقوف... زندہ موسیقی چیز ہی مختلف ہوتی ہے... اور کیا تم سارا وقت بوڑھے بوڑھے ریکارڈ سنتی رہتی ہو۔ ہمیشہ جوان رہنے کے لیے ضروری ہے کہ ترنگ سے بھری ہوئی موسیقی سنی جائے۔"

"ممی! آپ یقین کریں کہ مجھے آپ کی کلب پارٹیوں سے ذرا بھی دلچسپی نہیں ہے۔"

"تمہیں کیا ہوگیا ہے فلکو مائی ڈیئر' تم تو بالکل ہی بدل گئی ہو۔"

"ہر لڑکی شادی کے بعد بدل جاتی ہے ممی۔" اس نے جل کر جواب دیا۔

"مگر تم تو بالکل ہی مُردہ دل ہوگئی ہو... ذرا اپنی شکل دیکھو' آئینے میں۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے ہیں۔ رنگ زرد اور میلا ہوگیا ہے۔ آنکھوں کے گرد لائنیں پڑ گئی ہیں۔ جسم ڈھیلا ہوگیا ہے... مائی گاڈ! اس عمر میں تمہارا یہ حلیہ ہوگیا ہے۔ ابھی تو بچہ بھی نہیں ہوا۔ ذرا دیکھو! میں تم سے زیادہ فریش لگتی ہوں۔"

فلکی نے نظر اُٹھا کر ممی کے چہرے کو دیکھا۔

ممی واقعی بہت جوان اور تر و تازہ لگ رہی تھیں۔ زیادہ سے زیادہ فلکی کی بڑی بہن معلوم ہو رہی تھیں..... سال کے تین سو پینسٹھ دن وہ اپنے فگر اور فیس کا دھیان رکھنے میں گزارتی تھیں۔ احساس جیسی کوئی شے ان کے پاس نہیں تھی۔

کسی کی خاطر جینا انھیں آتا ہی نہیں تھا۔
دوسروں کو اپنے لیے مارنے کے درپے تھیں۔
وہ صرف اپنے لیے جیتی تھیں اس لیے خوش باش تھیں۔
کاش! مجھے بھی ڈیڈی جیسا شوہر ملا ہوتا... فلکی نے آہ بھر کر سوچا۔
کچھ جانے بنا ہی جیون گزر جاتا۔
"تم کل تیار رہنا۔ میں تمہیں سوزانہ بیوٹی کلب' میں لے چلوں گی۔ تمہارا فیشل کراؤں گی۔ صبح صبح ایکسرسائز کیا کرو۔ تمہارا جسم ٹائٹ ہونا چاہیے۔ زیادہ تر جوس پیا کرو۔ بہتر ہوگا اگر نہار منہ ایک لیموں پانی میں نچوڑ کر پیو۔"
"توبہ ہے۔"
فلکی' ممی کے لیکچر سے عاجز آگئی۔ ممی کو تو بیوٹی کلینک "کھول لینا چاہیے۔ یہ ممی کا دلپسند موضوع ہے۔
"اک ذرا چھیڑیے' پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے۔"
"آج کل شہد کا ماسک بھی تمہارے لیے ٹھیک رہے گا۔"
"ممی پلیز... آپ جائیں' آپ کو دیر ہو رہی ہے۔"
عاجز آکر فلکی نے کہا۔
"ہاں' میں چلی جاتی ہوں۔ میں بھی لیٹ نہیں ہونا چاہتی مگر تم اپنا دھیان رکھو۔ تم مرد کی فطرت کو نہیں جانتیں (اور جیسے آپ تو جانتی ہیں) مرد بڑا ہرجائی ہوتا ہے۔ پھول میں رس نہ رہے تو فوراً اُڑ جاتا ہے۔ (اور بعض اوقات رس دار پھول پر بیٹھتا ہی نہیں)... مجھے دیکھو... میں نے اپنے سدا بہار حسن اور تروتازگی کی وجہ سے تمہارے ڈیڈی کو اپنا... یعنی تم سمجھ رہی ہو نا؟ آج تک انھوں نے کسی دوسری عورت کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔" (مگران کی نگاہ میں کیسی بے چارگی ہے)
وہ ہنس پڑیں۔ "یہ سب عورت کی مجبوریاں ہیں۔ جان' تم ان باتوں کا خیال رکھو۔ نازلی صدرالدین کی بیٹی کو بھی سدا بہار ہونا چاہیے۔ ایک تو تم نے اتنی جلدی شادی کرلی... اور اوپر سے بالکل روایتی عورت بن گئی ہو۔ اچھا میں چلتی ہوں۔"
فلکی چپ بیٹھی رہی۔
ممی اداسے کھڑی ہوگئیں۔

"وہ تمہاری دوست نینا بھی امریکہ سے آئی ہوئی ہے۔ روز تمہارا پوچھتی ہے۔ جب سے لنان آئی ہے' ہر شام کلب آتی ہے۔ کسی دن اس سے ملنے کے لیے ہی چلی چلو۔"
"چلوں گی۔ ضرور چلوں گی... مگر آج نہیں... ابھی کچھ دن آرام کروں گی۔"
"اور ہاں..." ممی جاتے جاتے پھر رک گئیں۔
توبہ ہے فلکی نے دل میں سوچا۔ ممی جا ہی نہیں چکتیں۔
"ڈارلنگ! تمہارے بال بھی بہت بڑھ گئے ہیں۔ ایک چٹیا کے ساتھ تم کافی سوبر اور افسردہ ہو۔ "پامیلا" کے پاس بہت سے نئے اسٹائل آئے ہیں۔ جاکر اپنا نیا ہیئر کٹ کراؤ۔ کیا یات شکل بنا رکھی ہے۔ جیسے کوئی بڈھی مائی ہو۔"
"اچھا... ممی' اچھا..."
بڑی مشکل سے ممی نے پیچھا چھوڑا۔
ممی نے کبھی وہ نصیحت نہ کی جو زندگی کے لیے ضروری تھی۔
یہ بال...
یہ بال کیوں زندگی کے معاملوں کے بیچ میں آگئے۔
اس نے اپنی میلی چٹیا ہاتھ میں پکڑلی.... اور اپنے رخساروں کے ساتھ لگالی۔
اب بھی اس میں مہک آرہی تھی۔
ممی سمجھتی ہیں' ایک چٹیا بنانے سے میری شکل افسردہ لگتی ہے۔
واہ' میری ممی... زندہ باد۔
افسردگی... کا کوئی جواز بھی تو ممی کے پاس نہیں ہے۔
ایک عورت حسین ہو... دولت مند ہو' دنیا کی کسی نعمت کی کمی نہ ہو تو اسے ہمیشہ خوش رہنا چاہیے... ہے نا ممی؟"
مگر آپ جیسی بے حس خاتون کی بیٹی اتنی حساس کیوں ہوئی؟ آپ اپنی ساری دولت دے کر مجھ سے احساس کی یہ سلگتی ہوئی بھٹی چھین لیں نا۔
جبھی تو سب کچھ ہوتے ہوئے' سرِراہ یوں لُٹ لُٹا کر بیٹھی ہے جیسے سفر کے پہلے پڑاؤ ہی پر کسی راہزن' آخری پونجی تک لُوٹ کر لے گیا ہو۔
ہاں' اب اس کے پاس ہے کیا؟... ان لمبے بالوں کے سوا۔
یہ بال تو اس نے اس دشمن جاں کے لیے بڑھائے تھے جس نے ایک دن ذرا کی ذرا بالوں کو

چھو لیا تھا۔

بالوں کو چھو لیا تھا....

آسمان کو تو نہیں چھو لیا تھا۔

مگر وہ اس آسمان پر ضرور پہنچ گئی تھی جس پر بجلیاں چمکتی ہیں اور نظارے جنم لیتے ہیں۔

ایک چیز تو اسے' اس کی پسند آئی تھی۔

وہ اپنی چٹیا' کلیجے سے لگائے بیٹھی رہی۔

پھر ایک دم اسے غصہ آگیا۔

کیوں... کیوں آخر؟

اس کی خاطر کیوں؟ وہ میرا کون ہوتا ہے؟ اسے میری کس بات کا احترام تھا؟ میں اپنی زندگی سے اس کا نشان تک مٹا دوں گی۔

کوئی ایسی یادگار نہیں رکھوں گی۔

وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔

دراز کھول کر کار کی چابی نکالی اور باہر آگئی۔

سیدھی "پامیلا ہیئر فیشن" پہنچی۔ وہ ایک عرصے سے پامیلا سے بال کٹوا رہی تھی۔ وہ اس کی پسند اور ناپسند کو جانتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ فلکی کو چٹیا سخت ناپسند ہے۔

وہ فلکی کے اتنے لمبے بال دیکھ کر حیران ہی رہی۔

اس نے جب فلکی کے کندھے پر تولیہ بچھا کر اس کے سنہری بال پھیلائے تو فلکی جی جان سے لرز گئی۔

اتنے خوب صورت بال۔ پورا ایک سال لگا تھا انھیں بڑھانے میں.... کس کس مرحلے سے نہ گزرے تھے یہ بال... انھوں نے معطر بستر پر محبت کی چھایا بن کر اس ستمگر کے کندھوں پر بکھر جانا چاہا تھا...

مگر ان کے مقدر میں یہ گندہ فرش تھا جس پر پامیلا انھیں کاٹ کاٹ کر پھینک رہی تھی۔

ہر بار' جب وہ قینچی سے لٹ کاٹ کر نیچے پھینکتی' فلکی کو یوں محسوس ہوتا قینچی اس کے دل پر چلی ہے۔

اس کا دل چاہتا کہ وہ پامیلا کا ہاتھ روک لے اور اسے کہے۔

خدا کے واسطے...

خدا کے واسطے' ان بالوں کو اس طرح پامال نہ کرو۔

یہ تو بڑے مقدس بال ہیں...

اور بڑے معطر جذبوں کے ساتھ پالے گئے ہیں۔

یہ بال' میری آبرو ہیں۔

اور اس قدر ناشناس کی آرزو ہیں۔

ان کو کاٹ کر.. گندی زمین پر قدموں تلے نہ پھینکو۔

یہ رات بھر میرے ساتھ خوب صورت بستروں پر سوئے ہیں۔

مگر اس نے اپنی ہر چیخ اپنے سینے میں دبالی۔ یوں بیٹھی رہی جیسے کوئی انقاما" اپنے ذبح ہونے کا نظارہ دیکھتا ہے۔

سارے بال کٹ گئے تھے اور ان کا ڈھیر زمین پر پڑا تھا۔ آج اسے اس ڈھیر پر بے حد پیار آرہا تھا۔

وہ آئینے کے آگے بیٹھی اپنا نیا اسٹائل نہیں دیکھ رہی تھی بلکہ کرسی کے پیچھے پڑے ہوئے سنہری ڈھیر کو دیکھ رہی تھی جو کسی ٹوٹے ہوئے دل کی طرح مردہ پڑا ہوا تھا۔

جب صفائی والا لڑکا' برش لے کر فرش سے وہ بال صاف کرنے کے لیے آگے بڑھا تو فلکی چیخ پڑی۔

"پامیلا' پلیز... میرے سارے بال اکٹھے کر کے مجھے دے دو۔"

"کیوں..؟ پہلے تو تم نے کبھی نہیں مانگے تھے؟"

"اب دے دو' پلیز... مجھے ان کی ضرورت ہے۔"

"مجھے بتاؤ' میں خود تمھیں ان کا اچھا سا پیس بنوا دوں گی۔"

"نہیں نہیں' مجھے اسی طرح میرے سارے بال دے دو۔"

پامیلا نے سارے بال جمع کیے اور پھر انھیں ایک پلاسٹک کے لفافے میں ڈال کر فلکی کو تھما دیا۔

وہ لفافہ گود میں رکھ کر فلکی یوں موٹر چلاتی رہی جیسے اس کا ننھا بچہ گود میں سویا ہوا ہو۔

گھر آکر وہ دھپ سے اپنے پلنگ پر بیٹھ گئی۔

لفافہ کھول کر وہ سارے بال اپنے آگے پھیلا لیے۔

فلکی کو یوں محسوس ہوا جیسے اب اس کے پاس آفاق کی کوئی بھی نشانی نہیں رہ گئی۔

آج آفاق‘ اس کے وجود سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکل گیا ہے۔

اس نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔

کیسی اجنبی اجنبی سی لگ رہی تھی۔

یہ وہ فلکی تو نہ تھی۔

یہ لڑکی کون تھی۔

اف... میں اب اپنے آپ کو بھی نہیں پہچان سکتی۔

فلکی نے کٹے ہوئے بالوں پر چہرہ رکھا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

یہاں "فلک بوس" میں رہنا تو اور بھی کٹھن لگ رہا تھا۔ خصوصاً" پہلا ہفتہ تو بڑا صبر آزما تھا۔ سارا دن کمرے میں پڑی جائے پیتی رہتی یا درد بھرے گیت سنتی رہتی۔ نہ منہ دھونے کو دل چاہتا نہ کپڑے بدلنے کو۔

می آتے جاتے اسے کوئی نہ کوئی لیکچر ضرور دے جاتیں۔

... اور پھر اسے اپنے گھر میں کام کرنے کی عادت پڑ گئی تھی۔

گو وہاں ملازم بھی آگئے تھے مگر علی الصباح ہی آفاق کے دفتر جاتے ہی وہ کام میں لگ جاتی۔ سلیمہ کے ساتھ مل کر خود صفائی کرواتی پھر باورچی خانے میں جاکر عبدالکریم کو سارے دن کا مینو سمجھاتی۔ آفاق کے لیے کوئی چیز اپنے ہاتھ سے بناکر رکھ دیتی۔ کبھی پھول توڑ کر کمروں میں سجاتی' کبھی مشین لے کر کپڑے سینے بیٹھ جاتی۔ کبھی آفاق کی قمیصیں اور پتلونیں لے کر ان کے اکھڑے ہوئے بٹن لگانے بیٹھ جاتی۔

کبھی نئی کتابیں خرید کر لائبریری میں سجایا کرتی۔

غرض شام تک وہ اپنے آپ کو مصروف رکھتی تھی۔ جب آفاق گھر میں ہوتا تو کئی چکر باورچی خانے کے لگا لیتی۔

اور اب یہاں جب سے آئی تھی' اپاہج پڑی ہوئی تھی۔ یوں تو وقت نہیں گزرے گا۔

اس نے سوچا کہ وہ یہاں بھی گھر کا کام شروع کردے۔

پہلے دن جب وہ باورچی خانے میں گئی تو سارے نوکر اس کے پیچھے پڑ گئے۔

"منی بی بی! آپ کیوں یہاں آگئی ہیں۔ جی' ہم کس لیے ہیں جی۔"

"رمضو! باورچی خانے کی حالت دیکھی ہے؟"

ایک دن وہ باقاعدہ رمضو کے سر پر سوار ہو گئی۔

یہ باورچی خانہ ہے یا کباڑ خانہ... اگر کوئی یہ باورچی خانہ دیکھ لے تو ہمارے گھر سے کچھ کھائے بغیر اٹھ کر چلا جائے گا۔"

مضو حیرت سے فلکی کی صورت دیکھنے لگا۔

وہی باورچی خانہ ہے جس کا پکا کھا کر فلکی بی بی اتنی بڑی ہوئی تھی اور آج وہی باورچی برا لگ رہا تھا۔

یری شکل کیا دیکھ رہے ہو؟" اس باورچی خانے کو دیکھو۔

یکھو فرش کتنا گندہ ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے صدیوں سے اس چولہے اور اوون کو صاف یا گیا اور وہ چولہے کے پیچھے کیا ہے' کالا' کالا.. نکالو' اسے ... اف اللہ!... میلے جھاڑن... انھیں سیاہ کرکے چولہے کے پیچھے ڈھیر کرتے جاتے ہو' دھونے کی بجائے تمہیں اور جو مل یں...

اور ذرا الماریاں اندر سے دیکھو..." اس نے باری باری ساری الماریاں کھول دیں۔ زہ ہوا' انھیں صاف کیے... اور یہ کیا ہے؟... ٹوٹے ہوئے برتنوں کا ڈھیر.. اچھا تو جو ٹ جاتے ہیں انھیں اس طرح چھپا دیا جاتا ہے۔ چلو جی' برتن تو ٹوٹ ہی جاتے ہیں ملازموں کے ہاتھ ہمیشہ لوہے کے ہوتے ہیں مگر کیا ٹوٹے ہوئے برتن باہر پھینکنے میں بھی تے ہیں؟

اپنی دیگچیاں دیکھو۔ مجھے معلوم ہے تم ایک سو روپے صرف کلینزرس (Cleansers) تے میں دکھایا کرتے ہو۔ تو کیا ان دیگچیوں کے تلے صاف نہیں رکھ سکتے۔ کبھی کسی نے لی دیگچیاں بھی سیاہ کی ہیں۔ ظاہر ہے جب تم اسٹیل کو زیادہ آنچ دیتے ہو تو وہ جل جاتا پھر تمہیں ان دیگچیوں کو مانجھ کر صاف بھی کرنا چاہیے... اور اس بیسن کو دیکھو۔ اس بو آرہی ہے۔ برتن دھونے کے بعد اسے گرم پانی سے مانجھتے ہو؟ اس کی نالیوں پر گرم دھار مارتے ہو؟ اگر ایسا نہیں کرتے تو برتنوں کا جما ہوا گھی کس طرح نالیوں سے نکلے گا؟ ن گٹر بند ہو جائے گا اور تم صرف کھلوانے کے دو سو روپے مانگ لو گے۔

ے جو جلدی مل جاتے ہیں' اس گھر میں...

ں کہتی ہوں جلدی یہ سارا باورچی خانہ صاف کرو۔ اس طرح چمکا دو۔ جیسے ابھی نیا بنایا ں سے میں خود ہی باورچی خانے میں آکر کام کیا کروں گی۔ یاد رکھو' اگر باورچی خانہ گندہ نے میں لذت نہیں ہوتی۔"

ر منو کو ہدایات دے کر وہ لان میں نکل گئی۔
آج دھوپ کافی چمک دار تھی۔
مالی دھوپ میں آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا اور سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگا رہا تھا۔
اس کا ٹرانسسٹر ریڈیو دور پودوں کی آڑ میں پڑا پوری آواز میں بج رہا تھا۔
"میرے سجناں وی ڈاچی بدامی رنگ دی"
فلکی نے مالی کو دو تین آوازیں دیں مگر ریڈیو اتنی اونچی آواز میں چنگھاڑ رہا تھا کہ اس نے
ہی نہیں۔ فلکی خود چلتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی۔
مالی نے جب فلکی کو اپنے سامنے کھڑا پایا تو بوکھلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ سگریٹ دور پودوں میں
پھینک دیا اور ہاتھ ماتھے پر لے جا کر سلام کیا۔
"آج کل کیا کر رہے ہو قادر بخش؟"
"جی...." مالی سمجھ نہیں سکا اور ہونقوں کی طرح اس کا منہ دیکھنے لگا۔
"پہلے اس مصیبت کو بند کر کے آؤ۔" فلکی نے ریڈیو کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ مالی دوڑ
ہوا گیا اور ریڈیو بند کر دیا۔
"تم سارا دن ریڈیو سنتے ہو یا کوئی کام بھی کرتے ہو؟"
"ریڈیو تو جی' ایسے ہی تھکاوٹ دور کرنے کے لیے لگا لیا ہے۔ کام کر رہا ہوں جی..."
"کیا کام کر رہے ہو؟"
"ابھی یہ گراؤنڈ صاف کیا ہے جی۔"
"یہ گراؤنڈ صاف کیا ہے تم نے؟ ہر طرف کچرے سے جلے ہوئے پتے بکھرے پڑے ہیں
گھاس کی رنگت تو دیکھو۔"
"کیا کریں بی بی جی؟ اتنا کچرا رہا ہے کہ پودے اور گھاس آپ ہی جل جاتے ہیں۔"
"تم مالی ہو۔ تم جانتے ہو' پودوں کو کس طرح کچرے سے محفوظ رکھنا چاہیے؟"
"جی..... جی..."
"یہ جو آم کے نئے پودے لگائے تھے' ان پر سرکنڈوں کی جھاڑیاں کیوں نہیں لگائیں؟ ا
الوچے سب جل جائیں گے۔ بہار میں ان کے شگوفے کیسے پھوٹیں گے؟"
"جی' لگا دوں گا' جی۔"
"تمہیں معلوم ہے اس موسم میں کون سے پھول لگائے جاتے ہیں؟"

"جی کیا فائدہ لگانے سے' سردی سے سب جل جائیں گے؟"
"سب نہیں جلتے' اس موسم کے خاص پھول ہوتے ہیں۔ میں تمہیں پرچے پر نام لکھ دوں
ا۔ کل نرسری میں جانا اور نئی پنیری لے کر آنا۔"
"اچھا' جی۔"
"اس موسم میں مختلف قسم کی گھاس لگانی چاہیے۔ وہ تو سارا سال رہتی ہے۔ سدا سہاگن
لہ پودے لگاؤ۔"
"اچھا جی۔"
"وہ دیسی گلاب کیا ہوئے؟"
"وہ تو جی.... بس جی.... بیگم صاحب باہر تھیں نا... تو جل گئے۔"
"بیگم صاحب باہر تھیں۔ تم تو باہر نہیں تھے نا؟ بس بیٹھے رہتے ہو گے ریڈیو کے قریب....
پ کو ممی نے بگاڑ دیا ہے... اب جاؤ' نرسری سے دیسی گلاب کی قلمیں لاؤ۔ یہی موسم ہے
نے کا' اور ہاں گلابوں کا ایک تختہ بھی لگا دینا۔"
"جی اچھا حضور۔"
"اور اب ہر روز میں آ کر کام کی جانچ پڑتال کیا کروں گی... سمجھے۔"
"اچھا جناب!" مالی نے سر جھکا لیا۔
اور دل میں سوچنے لگا' جب چھوٹی بی بی' اس گھر میں ہوا کرتی تھی تو اسے اس وقت گراؤنڈ کا
ا خیال نہیں تھا اب یکایک یہ پودوں میں دلچسپی کیسے لینے لگی ہے؟
"گراؤنڈ میں روز مشین چلایا کرو۔"
"اچھا حضور..."
"درختوں کے نیچے جتنے پتے گرے ہوئے ہیں' ایک گڑھا کھود کر ان کو اس میں جمع کرتے
ہو اور ان کی کھاد بناؤ۔ موسم بہار میں کام آئے گی۔"
"بہت اچھا جناب...!"
"اور..." فلکی جاتے جاتے رک گئی۔
"کام کے وقت ریڈیو مت لگایا کرو... اور ہر روز شام کو مجھے کام کی رپورٹ دیا کرو۔"
"بہت اچھا' حضور!"
اس کے جاتے ہی مالی نے سکون کا سانس لیا۔

گیٹ پر سے گزرتے ہوئے وہ رک کر ڈرائیور کی کارکردگی کا جائزہ لینے لگی۔

ان کے گھر میں دو بڑے گیراج تھے جن میں بیک وقت چار موٹریں آگے پیچھے کھڑی ہو سکتی تھیں مگر وہاں اب تین موٹریں کھڑی تھیں۔

ایک ڈیڈی کی سیاہ مرسیڈیز تھی... دوسری ممی کی کتھئی رنگ کی شیوا امپالا تھی اور ہلکے بھورے رنگ کی ٹیوٹا کرولا' جو انھوں نے فلکی کو جہیز میں دی تھی... اور جسے فلکی اپنے ساتھ ہی لے آئی تھی۔

ڈرائیور نے ممی کی کار کا کیسٹ ریکارڈ چلایا ہوا تھا اور مزے سے اندر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا

"سب موٹریں صاف ہو چکی ہیں محسن خان؟" اس نے آگے بڑھ کر بلند آواز سے پوچھا۔

محسن خان نے آواز فوراً" آہستہ کر دی اور کار سے نکل آیا۔

"جی سر....!"

"وہیل کپ تو ساری گاڑیوں کے گندے نظر آ رہے ہیں۔ ذرا میری موٹر کا اندر والا حصہ دیکھو۔ جب میں آئی تھی تو میری موٹر چم چم کر رہی تھی۔ تم نے اسے کبھی محنت سے صاف نہیں کیا۔ کھڑی کھڑی ہی گندی ہو گئی ہے۔

"یہ دیکھو' ڈیڈی کی موٹر کی سیٹوں کے کور کس قدر میلے ہو رہے ہیں۔ انھیں ڈرائی کلین کیوں نہیں کرواتے؟"

"بیگم صاحبہ جب آرڈر کریں گی تو دھلوا دوں گا جناب۔"

"تمہیں خود نظر نہیں آتا کہ جب کور میلے ہو جائیں تو اتار کر دھلنے کو دے دو اور ممی سے پیسے لے لو۔

"اور ادھر دیکھو۔ ممی کی گاڑی کے پیچھے جو کتا رکھا ہوا ہے' اس کی گردن ٹوٹ گئی ہے... کیسے ٹوٹی یہ؟"

"یہ گاڑی تو کسی نے شادی پر مانگی تھی۔ واپسی پر کتے کی گردن ٹوٹی ہوئی تھی۔ شاید ان کے بچوں نے توڑ دی۔"

"اس ٹوٹے ہوئے کتے کو نکال کر باہر پھینک دو۔"

"جی' آرڈر کے بغیر میں ایسی حرکت کیسے کر سکتا ہوں؟"

"اسے آرڈر ہی سمجھو۔

"کام کے وقت ریڈیو مت لگایا کرو۔ صبح صبح آ کر سب سے پہلے گاڑیاں دھویا کرو۔"

"جی' بہت اچھا۔"

تمام ملازمین حیران تھے کہ فلکی بی بی کو کیا ہو گیا ہے؟ ہر بات میں نقص نکالنے لگی ہے۔ خود پریشان تھیں۔ انھیں فلکی کے چڑچڑے پن کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ کبھی کھانے کی پر بیٹھی خود ہی پھلکا لینے چل دیتی...

...اور ممی کو آوازیں سنائی دیتیں۔ وہ اونچی آواز میں خانساماں کو ڈانٹ رہی ہوتی "ذرا دھ' یہ روٹی پکائی ہے تم نے۔ پھلکے پر کبھی کالے پھول نہیں ہونے چاہئیں۔ تمہیں پھلانے کا نہ نہیں آتا۔ کہیں سے کچا ہے' کہیں سے جلا ہوا ہے۔"

ایک روز ڈیڈی نے فرمائش کر کے کھیر پکوائی تھی۔

ممی تو ایک چمچ کھاتے ہی واہ واہ کرنے لگیں۔

فلکی نے جب کھیر کھائی تو سر منہ کو بلایا اور پوچھنے لگی۔

"کیا یہ کھیر ہے؟ ایسا لگتا ہے چاول ابال کر دودھ میں ملا دیے ہوں۔ نہ خوشبو ہے' نہ ذائقہ۔ کیا الائچیاں ڈالی تھیں' اس میں' تم نے؟"

"نہیں' سرکار..."

"کھیر اور کسٹرڈ میں الائچی ہی سے امتیاز ہوتا ہے۔ اتنے بڈھے ہو گئے ہو اور ابھی تک تمہیں نہیں چلا...

...کل میں خود کھیر پکاؤں گی۔" فلکی نے کہا۔

"جانی' تم کیا تردد کرتی پھرو گی۔ پھر کبھی سہی۔" ممی نے جلدی سے کہا۔

"نہیں ممی! میں ان خانساماں لوگوں کو صحیح کھانا پکانا ضرور سکھاؤں گی۔"

ممی نے ماتھے پر بل ڈال لیے.... اب ان کی اکلوتی بیٹی خانساماں گیری کرے گی۔

اور.... ڈیڈی مسکراتے ہوئے میز سے اٹھ گئے۔

بھی دوپہر کے کھانے پر وہ کہتی۔

"سر منہ... یہ سالن کا رنگ اتنا کالا کیوں ہے؟"

"کالا تو نہیں ہے سرکار!"

"تو یہ کیا ہے؟ اس میں کون سی سبزی ڈالی ہے؟"

"سرکار' گوبھی ہے۔"

"اور گوبھی کی تم یہ شکل بنا کر لائے ہو؟ گوبھی ہی تو ایک ایسی سبزی ہے جب تک اس کے

پھول اور رنگت اصلی حالت میں نہ رہیں تو اسے کھانے کا مزہ نہیں آتا۔"

کسی دن وہ شامی کباب میں نقص نکال دیتی۔

"دیکھو' رمضو... جب تک قیمہ اچھی طرح پک نہ جائے اسے پیسا نہ کرو۔ ورنہ کچے قیمے کی باس آتی رہتی ہے اور کبابوں کے اندر مصالحہ بھرا کرو۔"

"جان کیسی بڈھوں والی باتیں کرنے لگی ہو تم۔" ممی چڑ کر کہتیں۔ "تم میں سے ہری مصالحے کی بُو آنے لگی ہے... اوہ' سویٹ ہارٹ! خوشبوؤں کی بات کرو' پھولوں کی بات کرو۔"

"ممی! کھانے کی اپنی ایک خوشبو ہوتی ہے۔ جب تک کھانے کی رنگت اور خوشبو ٹھیک نہ ہو' کھانے کا مزہ نہیں آتا۔ ویسے تو دنیا کے سب لوگ کھانا کھا کر ہی زندہ رہتے ہیں' مگر کھانے کا بھی اپنا اپنا سلیقہ ہوتا ہے۔"

"اوہ' ڈارلنگ! تم ہمیشہ اس گھر کا کھانا کھاتی رہی ہو۔ اب تمہیں اس میں نقص نظر آنے لگے ہیں۔ کیا تم نے Cooking کا کوئی خاص کورس پاس کرلیا ہے۔ پوچھوں گی اس آفاق کے بچے سے... اس نے میری بیٹی کو باورچن بنا دیا ہے۔"

"کوئی کسی کو کچھ نہیں بنا سکتا ممی!" فلکی نے چڑ کر کہا "یہ تو اپنے شوق کی بات ہوتی ہے۔"

"میں نے گھرداری پر بے شمار کتابیں پڑھی ہیں... اور پریکٹیکل بھی کیا ہے جو بات دل کو اچھی لگے' قبول کرلینی چاہیے۔"

حقیقتاً اسے اس وقت آفاق کا تذکرہ ذرا بھی اچھا نہیں لگا تھا۔

دن میں ایک بار وہ کچن میں ضرور جاتی۔ پھر سارے نوکروں کی شامت آجاتی۔

"اسٹین لیس سٹیل کی کٹلری کو دھوتے ہی فوراً" کپڑے سے خشک کرنا چاہیے ورنہ اس پر پانی کے داغ رہ جاتے ہیں۔

"تڑالی کا کوئر روز بدلا کرو۔ کبھی کبھی اس کے پیندے بھی صاف کیا کرو۔

"تم چائے کس طرح دَم دیتے ہو رمضو؟"

"جس طرح ہمیشہ دَم دیتا رہا ہوں۔" وہ سر جھکا کر کہتا۔

"نہیں' وہ طریقہ غلط ہے۔"

رمضو حیرت سے اس کا چہرہ دیکھنے لگ جاتا۔

"پہلے چائے دانی کو اچھی طرح صاف کرو۔ پھر کھولتا ہوا پانی ڈال کر چائے دانی کو اندر سے کھنگالو۔ اسی طرح گرم گرم چائے دانی میں دو چمچ چائے کی پتی کے ڈالو اور اس پر ڈھکنا لگا دو

پتی کو دم آجائے۔ اس کے بعد کھولتا ہوا پانی ڈال کر اوپر تی کوزی لگا دو... اور ہاں' ایک اور یاد رہے۔ چائے کا پانی نہ تو کچا ہو اور نہ بہت زیادہ ابلنے پائے۔ سمجھ گئے؟"

"جی سمجھ گیا' سرکار...!"

"ذرا اس چاندی کی چائے دانی کو دیکھو... کس طرح سیاہ ہو چکی ہے.... کتنے خوب صورت پن ہیں' اس گھر میں۔ مگر سب تباہ ہو چکے ہیں۔"

"بی بی جی.. کیا کریں؟ یہ تو چاندی ہے' کالی ہو جاتی ہے۔"

"تو کیا تم ہر ہفتے اسے کھٹے سے نہیں دھو سکتے؟.... اتنا خرچ ہوتا ہے اس گھر میں۔ سلاد کے پتے روز لیموں آتے ہیں۔ ایک لیموں کاٹ کر اس پر ملو۔ دیکھو کس طرح سفید ہوتی ہے۔"

"اچھا' سرکار!"

رمضو منہ لٹکا کر چلا جاتا مگر دل میں ضرور سوچتا کہ منی بی بی کی شادی تو ایک بہت بڑے آدمی کے ساتھ ہوئی تھی مگر یوں لگتا ہے جیسے یہ کسی خاندانی خانساماں کے ساتھ رہ کر آئی ہو۔

یہی حال سارے ملازموں کا تھا۔

کوئی اس سے خوش نہیں تھا۔

ایک روز ممی اپنے چہرے پر شہد کا ماسک لگائے' سر پر بجلی کے رولرز لگائے' سن روم میں بیٹھی اپنی ٹانگوں پر زیتون کے تیل کا مساج کر رہی تھیں کہ فلکی آگئی۔

"کیا بات ہے زندگی؟"

ممی کے ہاتھ وہیں رک گئے۔

"ممی! ڈیڈی آج ناشتہ کیے بغیر چلے گئے ہیں۔"

"ان کا دل نہیں چاہ رہا ہوگا۔"

"یہ بات نہیں ہے ممی!"

"تو کیا بات ہے؟"

"رمضو نے انڈے ٹھیک سے نہیں بنائے تھے۔ چائے بھی بہت پہلے دَم دے دی تھی۔ ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ رات کو مکھن اس نے ڈیپ فریزر میں رکھ دیا تھا۔ صبح کو پتھر ہوا پڑا تھا۔"

"تو اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے جان؟... نوکروں سے اس قسم کی غلطیاں ہو سکتی ہیں۔"

"ممی' پلیز.. آپ ڈیڈی کا خود خیال رکھا کریں۔"

"تو کیا تمہارے ڈیڈی بچے ہیں؟"

"یہ بات نہیں ممی... آخر بیوی کس لیے ہوتی ہے؟"

"بیوی اور نوکرانی میں بہت فرق ہوتا ہے ڈارلنگ... تمہارے ڈیڈی کی ایسی ہی عادتیں ہیں۔ وہ سب کچھ برداشت کرلیتے ہیں۔"

"ممی' آپ کے بھی تو کچھ فرائض ہوں گے؟"

"ہماری شادی کو پچیس سال ہوگئے ہیں اور ہم اسی طرح خوش ہیں۔ اب تم ہماری زندگی میں بے سکونی پیدا کرنا چاہتی ہو۔"

"ممی... ممی' پلیز! سمجھنے کی کوشش کریں۔"

"اوہ' ڈیئر۔" ممی نے تیل کا ڈبہ اٹھا کر اپنے ہاتھ پر تیل ڈالا۔

"پتہ نہیں' کیوں آج کل تم Bitchy ہو رہی ہو؟ اتنی Frustration کیوں پیدا ہوگئی ہے تم میں؟... ہر نوکر کو ڈانٹ دیتی ہو۔ جانتی ہو' آج کل نوکروں کا ملنا کتنا مشکل ہے... اور یہ سارے پرانے ملازم ہیں۔ یہ اتنے عرصے سے لگے ہوئے ہیں۔ اب تم انھیں نکالنے کے درپے ہو۔ آخر تمہیں کیا ہوا ہے؟"

"ممی' میں کسی کے رزق پر لات مارنا نہیں چاہتی۔ میں تو چاہتی ہوں کہ سب لوگ سلیقے سے کام کریں۔ نمک حرامی نہ کریں۔ جتنے پیسے لیتے ہیں' اتنی محنت بھی کریں۔"

"فلکی سب ٹھیک چل رہا ہے۔ تمہیں ہی کچھ ہوگیا ہے۔"

"ممی... آپ کو سب ٹھیک لگتا ہے... تعجب ہے.. نوکر آپ کو بے وقوف بنا رہے ہیں۔ روپیہ پانی کی طرح بہہ رہا ہے۔"

"تو پیسہ کس لیے ہوتا ہے جان..... اپنے آرام کے لیے ہوتا ہے نا؟"

"ممی' محنت کے بغیر آرام کب اچھا لگتا ہے۔"

"میں تو کم از کم آرام سے ہوں..." ممی نے پھر اپنے ہاتھ چلانے شروع کردیے۔

"آپ ذرا گھر کے کاموں میں دلچسپی لے کر دیکھیں.. ڈیڈی کی خدمت کرکے دیکھیں۔ آپ کو ایک نیا سرور محسوس ہوگا۔"

"یہ باتیں میں نے تو تمہیں نہیں سکھائی تھیں۔ کہاں سے سن کر آئی ہو؟"

"ممی... زندگی نے سکھائی ہیں۔"

"ارے واہ... جمعہ جمعہ آٹھ دن۔ ابھی تم نے زندگی کو کہاں سے سیکھا ہے؟"

"بہرحال' زندگی بے حسی کا نام نہیں ہے ممی!"

"خوش باشی کو تم بے حسی کہتی ہو۔ میں خوش رہتی ہوں... خوش رہنا چاہتی ہوں۔"

"کیا آپ نے سوچا ہے کبھی کہ آپ کے اس رویے سے ڈیڈی بھی خوش ہیں یا نہیں۔"

"ان کو بھی خوش ہونا چاہیے۔"

"یہ تو آپ نے فرض کرلیا ہے۔"

"نہیں' میں جانتی ہوں' مجھ جیسی بیوی پاکر وہ خود کو ہمیشہ خوش قسمت سمجھتے رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" فلکی ہار گئی۔

"آپ کو معلوم ہے' آج صبح ڈیڈی چلا رہے تھے۔ ان کے کوٹ کا بٹن ٹوٹا ہوا تھا۔"

"غلام رسول کو بٹن لگانا آتا ہے۔ وہ ایسے چھوٹے موٹے سب کام جانتا ہے اسی لیے تو میں نے اسے' تمہارے ڈیڈی کے لیے رکھ چھوڑا ہے۔"

"تو ممی... ایسا کریں... کہ غلام رسول کا نکاح ڈیڈی کے ساتھ پڑھا دیں۔"

"فلکی... فلکی..." ممی ایک دم پریشان ہوا ٹھیں۔ فلکی نے اپنی پوری زندگی میں ایسی بیہودہ بات نہ کہی تھی۔

"میں کئی دنوں سے سیریسلی سوچ رہی ہوں کہ تمہیں کسی ماہر نفسیات کو دکھا دوں۔ بیٹی! تمہاری حالت بڑی تشویش ناک ہے۔ میرا خیال ہے تم ابھی بیوٹی کلینک نہ جاؤ بلکہ ڈاکٹر مالک کے پاس چلو۔ سنا ہے' ابھی ابھی امریکہ سے آیا ہے اور بہت ماہر ڈاکٹر ہے۔"

"افوہ...!"

"ممی... آپ..."

اور پھر فلکی وہاں سے اٹھ آئی۔

یہ کیسا جہاں ہے' جہاں عقل کی بات کی جائے تو لوگ پاگل قرار دیتے ہیں۔

اس نے زندگی کو قریب سے دیکھا تھا اور زندگی کی سچائیاں قبول کی تھیں۔ اس واسطے اسے Abnormal سمجھا جارہا تھا۔

کیا وہ پہلے ابنارمل تھی..؟

یا اب ابنارمل ہے۔

کیا وہ پہلے صحیح الدماغ تھی؟

یا اب صحیح الدماغ ہے۔

پر اسے پاگل کس نے بنایا؟ کس نے اس کے ہوش اڑائے؟
کس نے اسے اپنوں سے بیگانہ کیا؟
آفاق نے...؟
ہاں' آفاق نے۔
آفاق ہی نے۔
خدا غارت کرے اس آفاق کو۔
اس کی زندگی کا بیڑہ ہی غرق کردیا۔
اسے کہیں کا نہ چھوڑا۔
بیچ منجدھار میں کشتی اُلٹ دی۔
پہلے کیسے مزے سے گزر رہی تھی۔
ممی' ڈیڈی بھی اسی گھر میں تھے۔
نوکر چاکر بھی یہی تھے۔
کھانے پینے کا عالم بھی یہی تھا۔
پہلے کیا وہ اندھی تھی؟
اندھا ہوجائے آفاق....
جس نے اس کی نگاہ کی معصومیت چھین لی تھی۔
اب وہ کیا کرے...؟
اور کہاں جائے...؟
وہ اپنی پہلی زندگی کے بارے میں سوچنے لگی۔
کیسی شاہانہ زندگی تھی۔ کھانا' پینا اور سونا اور بے شمار دوست....
دوستوں کا خیال آتے ہی اسے وہ سارے پرانے شناسا چہرے ایک ایک کرکے یاد آنے لگے... پیاری پیاری سہیلیاں' جان نثار کردینے والے دوست۔
کس طرح وہ مل کر پکنک کو جاتے تھے' فلمیں دیکھتے تھے۔ خوش خوش رہتے تھے۔
اس کے علاوہ زندگی کا مقصد ہی کیا تھا۔
پھر وہ کتنی دور چلی گئی کہ درمیان میں میلوں کے فاصلے آپ ہی آپ پیدا ہوگئے۔
لَوٹ جاؤں...!

میں لَوٹ جاؤں...!!
ابھی بہت رات بھی نہیں ہوئی... فاصلہ ناقابلِ عبور بھی نہیں ہوا۔
شاید وہی میری منزل ہو... جہاں سے میں جدا ہو کر آئی ہوں۔
شاید وہی میرا آسمان ہو... جس کا میں ٹوٹا ہوا ستارا ہوں۔
شاید وہی میرا سکون ہو... جہاں میرا بچپن گزرا۔
یہ پڑاؤ عارضی ہو۔
شاید یوں زندگی بہل جائے۔
کوشش تو کرکے دیکھنی چاہیے۔
پھر ایک دَم اسے آفاق پر غصہ آنے لگا۔ وہ سمجھتا ہوگا' میں اس کے بغیر مرجاؤں گی۔ زندہ ہیں رہوں گی۔ خودکشی کرلوں گی۔
نہیں...
مجھے اس کو بُھلانا آتا ہے۔
اس نے ڈائری اٹھا کر جلدی جلدی پنکی کا فون نمبر ڈھونڈا۔
اور پھر نمبر ملالیا۔
"ہیلو...!"
پنکی کی آواز تھی۔ سوئی سوئی۔ بھاری بھاری سی۔
"مجھے پہچانتی ہو پنکی؟"
"پنکی تھوڑی دیر چپ رہی...
اور پھر بولی۔
"اوہ... تم فلکی ہی ہونا... مگر آج تمہاری آواز کو کیا ہوا ہے؟ یہ اس فلکی کی آواز نہیں۔"
"واہ' واہ۔" فلکی ہنس پڑی۔
"دوست ہو تو ایسی ہو۔ تمہاری پہچان کی داد دیتی ہوں۔ یہ بھی تم نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ یہ اس فلکی کی آواز نہیں۔"
"کیوں' کیا ہوا فلکو؟" پنکی نے اتنے پیار سے پوچھا کہ فلکی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔
"بس کچھ نہیں ہوا۔" فلکی اپنی آواز پر قابو پاکر بولی۔
"وہ فلکی آسمان پر رہتی تھی۔ یہ فلکی زمین پر آرہی ہے۔"

"اوہ... نو... پہیلیاں نہ بجھواؤ۔ کہاں سے فون کر رہی ہو؟"

"ممی کے ہاں سے۔"

"اور وہ تمہارا آفاق کہاں ہے؟"

"نام نہ لو' اس خبیث کا۔" فلکی گرجی۔

"میں نے سنا ہے کہ وہ تم پر بہت سختی کرتا ہے۔ کسی سے ملنے نہیں دیتا اور... اور..."

"چھوڑو' یار! اس منحوس کا ذکر۔ آؤ مل کر باتیں کریں۔ عرصہ ہوا' میں باتیں کرنے کو ترس گئی ہوں۔"

"یار' یہ تو بتاؤ' یہاں کیسے آئی ہو؟ کہیں اس کی چُھٹی تو نہیں کرا دی۔"

"بس' کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔"

"پر یہ ہوا کیسے؟"

"اب سب کچھ فون پر تو نہیں بتاؤں گی... تم آؤ تو..."

"ابھی آجاؤں؟"

"آجاؤ.. میں تو گھر پر ہی ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد پنکی اپنی منی موریس چلاتی ہوئی آ پہنچی۔ یوں گلے ملی' جیسے برسوں کی بچھڑی ہوئی ہو۔ فلکی نے نہایت اختصار کے ساتھ اپنے حالات بتائے۔ وہ سب کچھ تفصیل سے نہیں بتانا چاہتی تھی۔ جانے کیوں' وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اس کے سامنے آفاق کو بُرا بھلا کہے۔ پنکی اس کے لوٹ آنے سے بہت خوش تھی اور اسے بتا رہی تھی کہ اس کے جانے کے بعد اس نے تین نئے فرینڈز بدلے ہیں۔

پھر وہیں سے مل کر دونوں نے اپنی ساری سہیلیوں کو فون کیا۔ ٹونو' ہنی' تارا' چندا' فیضی' بلی سب کو فلکی کے لوٹ آنے کی اِطلاع دی گئی۔ سب نے بڑے پُرجوش انداز میں اس خبر کا استقبال کیا۔

کل شام' سب نے "فلک بوس" میں جمع ہونے کا پروگرام بنا ڈالا۔

پنکی کافی دیر تک بیٹھی رہی.... اور پچھلے ایک سال کی باتیں' اسکینڈل اور نئے معاشقوں کے بارے میں فلکی کو تفصیل کے ساتھ بتاتی رہی.... اس پورے ایک سال میں گینگ میں کیا کیا تبدیلیاں آئیں۔ کتنے نئے لوگ آئے' کتنے پرانے گئے۔ کس کا معاشقہ کس کے ساتھ چل رہا ہے.. کتنے معاشقے ناکام ہوئے۔ کب کب چھری' چاقو چلا۔

بڑی دیر سے فلکی اس سے ایک بات پوچھنا چاہتی تھی مگر ہر بار وہ بات اس کے لبوں پر آکر گل جاتی تھی۔ بار بار بس ایک ہی سوال دہرائے جا رہی تھی "اور سناؤ' سب کے کیا حال ہیں؟"

"ارے سب کا بتا تو چکی ہوں۔ اب تو کس کا پوچھنا چاہتی ہے؟"

"ہاں' میں جانتی ہوں۔" وہ پھر شرارت سے ہنس کر بولی۔

"تو بوبی کے بارے میں جاننا چاہتی ہے نا؟"

"ارے نہیں' مجھے کوئی تجسس نہیں ہے۔ میں تو یونہی سب کا پوچھ رہی تھی۔ فلکی نے نظریں چُراتے ہوئے کہا۔

"بڑے مزے میں ہے وہ کمینہ۔" پنکی نے خود ہی کہنا شروع کیا۔ "دو سہیلیاں بدل چکا ہے اور آج کل ایک تیسری کے ساتھ ہے۔ شاید' وہ تیرا غم اس طرح غلط کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

"خیر مجھے کیا...؟" فلکی کو دل کے اندر دُکھ کا عجیب سا احساس ہوا۔

"ابھی میں تیری آمد کے بارے میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ کل سب لڑکیاں یہاں جمع ہو رہی ہیں۔ خوب ہلّہ گلّہ ہوگا۔ اس کے بعد ہم سب مل کر "رین بو کلب" کے سب ممبروں کو سرپرائز دیں گے۔"

"وہ کس طرح...؟"

فلکی چونک اٹھی۔

"بھئی تیری واپسی کا جشن جو منانا ہے۔"

"چھوڑو یار! میں ویسے ہی کسی دن کلب چلی چلوں گی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے فلکو' تو تو ہماری آنکھ کا تارا تھی۔ ہم تیری واپسی کا جشن ضرور منائیں گے۔ یوں کریں گے کہ ہفتے کی رات کو ایک پارٹی ارینج کریں گے' اس میں کلب کے تمام نئے و پرانے ممبروں کو مدعو کریں گے.. پھر سب سے آخر میں تو آجانا.. کیسا رہے گا؟"

"پتہ نہیں۔"

"کم بخت بڑا مزہ آئے گا اور اس دن بوبی کا بھی تماشا دیکھیں گے۔"

"کیا خیال ہے..؟"

"سوچوں گی۔" فلکی نے کاہلی سے کہا۔

نہیں۔ اب سوچنے کی ضرورت نہیں۔ ورنہ ہم سب مل کر آئیں گے اور تجھے پکڑ کر لے جائیں گے۔"

"پلیز' اس طرح میرا جلوس نہ نکالنا۔"

"پھر تم حامی بھرلو نا۔"

"اچھا..." فلکی کچھ سوچتے ہوئے بولی "ضرور آجاؤں گی۔"

"اور خوب بَن ٹھن کر آنا..."

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے....."

"کیوں نہیں پڑتا..."

"آج تو یوں اجڑی شکل بنا کر کیوں بیٹھی ہے؟"

"بس یار' سنگھار سے مجھے نفرت ہوگئی ہے۔"

"اور پہلے تو کتنی شوقین تھی۔ مجھے یاد ہے' تیرے پاس دو سو تو لپ اسٹکوں کے شیڈ تھے۔"

"پہلے کی بات اور ہے۔ پہلے چار سو امنگیں بھی تھیں' دل میں..."

"مگر ہوا تو سہی ہوا کیا..؟"

"کچھ بھی نہیں..."

"کیا وہ تجھ سے پیار نہیں کرتا؟"

"وہ کسی سے بھی پیار نہیں کر سکتا۔"

"کیوں....؟"

"پتہ نہیں۔"

"کیا وہ ذہنی مریض ہے؟"

"شاید ایسا ہی ہو۔"

"مگر دیکھنے میں تو اچھا بھلا لگتا تھا۔"

"اب دیکھنے میں تو میں بھی اچھی بھلی لگتی ہوں۔ مگر میں جانتی ہوں کہ اس کے ساتھ رہ کے میں بھی ذہنی مریض بن گئی ہوں۔"

"دوسری عورتوں کے پاس جاتا ہے؟"

"اونہہ..." فلکی طنزیہ ہنسی۔ "اسے عورت ذات سے ہی نفرت ہے۔"

"اچھا... پر کوئی وجہ تو ہوگی؟"

"میں کیا جانوں... اب تو اس کے ذکر کو چھوڑ۔ میں فضول باتیں نہیں کرنا چاہتی۔"

"واہ۔ کل تک تو تو اس کے عشق میں مبتلا تھی اور آج اس کا نام بھی نہیں لینا چاہتی۔"

فلکی کے دل میں درد اٹھا۔

یہ اس ظالم کے ذکر پر ہر بار دل میں درد کیوں اٹھتا ہے... اگر لگن سچی نہیں تو شریانوں کا خون آخر کیوں پکارنے لگتا ہے...؟

"اچھا تو بتا..." فلکی نے بات بدل دی۔ "تیرے اس چمگادڑ کا کیا حال ہے؟"

"وہ اپنے باپ کے ساتھ چمڑے کے کارخانے میں بیٹھتا ہے۔"

"عشق ہَوا ہوگیا...؟"

"اور کیا... باپ نے کہا بچو! ایک پیسہ نہیں دوں گا۔" اس نے جھٹ چچا کی لڑکی سے شادی کرلی۔

"یار! آج کل کے لڑکوں کا عشق ایسا ہی ہوتا ہے۔" فلکی نے سوچتے ہوئے کہا۔ "بیچارے پنالائف بجٹ دیکھ کر عشق کرتے ہیں۔"

"دفعہ کرو ان کو' ہم کون سا سیریس ہیں۔" پنکی بولی۔ پھر اس نے گھڑی دیکھی اور اٹھنے لگی۔

"اب اجازت دو فلکو! امی نے ہو سپٹل جانا ہے اور میں ہی انھیں لے کر جاؤں گی۔"

"اچھا۔"

"ہاں... اور کل ہم سب لوگ شام کو چار بجے آئیں گے۔ ٹھیک ہے۔"

"اوکے۔ بائے۔"

"بائے۔"

جب شام کو فلکی نے ممی کو بتایا کہ کل اس نے چار بجے اپنی سہیلیوں کو بُلایا ہے تو ممی کو ایسے محسوس ہوا جیسے ان کے من کی مراد بر آئی ہو۔

ہفتے کی شام کو فلکی ایک خاص اہتمام سے تیار ہونا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی نئی چھب اور نئے روپ کے ساتھ کلب جائے۔ اپنے سارے اچھے اچھے کپڑے تو وہ "رازداں" میں چھوڑ آئی تھی۔ اس روز مارے غصّے کے اس نے کچھ بھی نہیں اٹھایا تھا... پر شکر ہے وہ دونوں سوٹ کیس، جو امی اس کے لیے لائی تھیں، ابھی تک یہیں پڑے ہوئے تھے۔ اس نے انھیں کھولا اور موزوں کپڑے تلاش کرنے لگی۔ اس میں زیادہ تر ٹراؤزرز، سلیکس، بلاؤز اور اسکرٹیں تھیں۔ ایک لونگ ڈریس بھی تھا۔ اس نے سیاہ رنگ کی ایک ٹراؤزر کا انتخاب کیا اور اس پر ایک سرخ رنگ کا بلاؤز پہنا جس کے سینے پر سیاہ دھاگے سے Love Me لکھا ہوا تھا، گلے میں اسکارف باندھا ہاتھوں میں سیاہ رنگ کی زنجیر پہنی۔ رات کے لیے شوخ میک اپ کیا۔ آنکھوں کو سیاہ شیڈو دیا۔ ویسے بھی راتوں کو جاگ جاگ کر اور رو رو کر اس کے پپوٹے سیاہی مائل ہو گئے تھے اور آنکھوں کے نیچے حلقے بھی پڑ گئے تھے جن کو اس نے میک اپ سے چھپا لیا۔ کانوں میں چھوٹے چھوٹے ڈائمنڈ کے بُندے پہنے۔ بال تو اس نے ویسے بھی چھوٹے کروا لیے تھے۔ اس نے آئینے میں دیکھا تو وہ بالکل ایک سال پہلے والی فلکی لگ رہی تھی۔ کتنی عجیب بات ہے۔ سراپا وہی رہتا ہے مگر انسان کے دل کی دنیا بدل جاتی ہے۔ کون جان سکتا ہے کہ اس خول کے اندر وہ پہلے والی فلکی نہیں ہے۔ جب اپنی گاڑی کی چابی گھماتی ہوئی وہ باہر آئی تو ممی اسے اس حلیے میں دیکھ کر نہال ہو گئیں۔

میری بیٹی نارمل ہو رہی ہے۔ انھوں نے دل میں سوچا۔ رفتہ رفتہ بالکل پہلے جیسی ہو جائے گی۔

"کہاں جا رہی ہو جان؟" انھوں نے بڑی محبت سے پوچھا۔

"ممی، آج رین بو کلب والوں نے مجھے ڈنر دیا ہے۔"

"ونڈر فل..." ممی مسکرائیں۔

آپ چلیں گی ممی؟"

مجھے کہاں فرصت ہے، زندگی! میں تو خود آج ایک ڈنر پر جا رہی ہوں۔ تمھارے ڈیڈی کا ۔ ہے۔ جانے دفتر میں کیوں بیٹھے ہیں.. تم جاؤ جانی... تم جاؤ... ممی نے جلدی سے کہا... تمھارا انتظار کر رہے ہوں گے۔ تمھارے ڈیڈی کے آنے تک میں ذرا سی بیوٹی سلیپ ں۔"

لی جب کلب کے ڈانسنگ ہال میں پہنچی تو پورا ہنگامہ عروج پر تھا۔ آرکسٹرا بری طرح چیخ ا۔ لڑکیاں اور لڑکے مل کر ناچ رہے تھے۔ پورے ہال میں دھواں اور مختلف قسم کی ئیں پھیلی ہوئی تھیں، بار کاؤنٹر پر بے شمار کُھلی اور اَدھ کُھلی بوتلیں پڑی تھیں۔ کچھ لڑکے کیاں لمبے اسٹولوں پر بیٹھے پی رہے تھے۔ کسی کے ہاتھ میں کوک تھا۔ کسی کے ہاتھ میں بیئر ۔ کوئی چرس پی رہا تھا اور کوئی آئس کریم کھا رہا تھا، کہیں سے جانوروں کی طرح چیخنے کی یں آ رہی تھیں۔ کہیں سے قہقہوں کا سیلاب امڈ رہا تھا۔

ا جلی آوازوں پر آرکسٹرا کی دُھن اپنی دھاک بٹھائے چلی جا رہی تھی۔

رض کچھ ایسا سماں تھا جیسے تہذیب اپنے ماضی کی طرف لَوٹ گئی۔ انسان ایک دوسرے کے سے بے نیاز، کہاں ہے، کس حال میں، کس کے ساتھ ہے، کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ادراک و اسے عاری..

س مہذّب دنیا میں ایسا غیر مہذّب نظارہ اسے غار کے زمانے کی طرف لے گیا۔ منظم رے میں یہ غیر منظم ہنگامہ۔

یسے وہ کسی دوسری دنیا میں پہنچ گئی ہو۔ اسی کلب میں وہ جوان ہوئی تھی۔ پہلی مرتبہ نہ آئی اور انہی نظاروں کا ایک حصّہ تھی وہ...

راب ایک ستون کی آڑ لیے کھڑی تھی۔ منظر کو دور سے دیکھا تو آگے بڑھنے کی ہمت نہ

ا۔

سینے پر دونوں بازو باندھے ایک ایک کو تکنے لگی۔ پرانے چہروں میں بہت سے نئے چہرے رہے تھے۔

نیا چہروں سے کبھی خالی نہیں ہوتی۔ ایک کی جگہ دس چہرے دیتی ہے۔ چہرے یہاں پھولوں رح اُگتے ہیں اور سورج کی طرح ڈوب جاتے ہیں۔ لڑکیاں زیادہ تر سلیکس اور ٹراوزر میں تھیں۔ تنگ بلاؤز، مسلی ہوئی چولیاں...

نوخیز' نوبہار لڑکیاں۔ ابھی انھوں نے دنیا کا کچھ نہیں دیکھا تھا۔ سب کچھ یہیں دیکھنے چلی آئی تھیں۔

پتلی پتلی کمر والے نوعمر لڑکے... بعض کی تو ابھی مَسیں بھیگ رہی تھیں۔

ایک دوسرے کے چہروں اور جسموں میں گھسے جاتے تھے... ہر لڑکی کے ساتھ ایک لڑکا ہوا تھا۔ کسی نے ہاتھ کمر میں ڈالا ہوا تھا۔ کسی نے ایک دوسرے کی ہتھیلیاں پکڑ رکھی تھیں۔ کچھ رخسار کے ساتھ رخسار ملا کر ناچ رہے تھے۔ کچھ پیشانی سے پیشانی جوڑ کر دنیا کی فکروں سے دور ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھے تھے۔

اس اتنی بڑی انجمن میں بظاہر کوئی تنہا نہیں تھا۔ اپنی ذات اور ذاتی غرض کے ساتھ تنہا۔ فلکی کو اختلاج سا ہونے لگا۔

پتہ نہیں وہ کیا سوچ کر یہاں آگئی تھی۔ ابھی وہ کوئی فیصلہ نہیں کرپائی تھی کہ پنکی کی نظر اس پر پڑ گئی... اس نے زور سے تالی بجائی اور اشارے سے آرکسٹرا بجانے والی ٹیم کو روک دیا۔ ایک دم آرکسٹرا بند ہوگیا' ہال میں سناٹا چھا گیا۔

سب لوگ ادھر دیکھنے لگے جدھر پنکی دیکھ رہی تھی۔ سب سے پہلے بوبی نے اسے پہچانا سرخ میکسی میں ملبوس ایک گوری سی لڑکی کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ ایک دَم اس نے لڑکی کو دیا اور نعرہ بلند کیا... "ہرا....

HERE COMES PRIMEDONA

اور پھر پنکی نے دوڑ کر اس کے ٹھنڈے ہاتھ تھام لیے۔

اس نے فلکی کے ہاتھ پکڑ کر بلند کردیے... "یہ ہے ہماری فلکی' ہماری محفل کی جا دوستوں کا ایمان' اس کلب کی سب سے پرانی ممبر۔"

"تھری چیئرز فار وی کم بیک آف کوئین فلک ناز..." اس پر سب لوگ زور زور تالیاں بجانے لگے۔

اس کے بعد پھر پینے پلانے کا دَور شروع ہوگیا۔ "کیا پیوگی۔ کیا لوگی؟" شور بلند ہوا۔ جا کر ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ کچھ لوگ اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئے۔

بوبی دوڑ کر مختلف مشروبات کی ٹرے اٹھا لایا۔

فلکی نے صرف کوک اٹھا لیا۔

"ابھی تک صرف کوک...؟" بوبی نے ایک آنکھ بند کرکے کہا... پھر اس نے اپنا اسپیشل

یا اور جام کو فلکی کی بوتل کے ساتھ ٹکرا کر ٹوسٹ کیا۔ سب لوگوں نے اس کی تقلید کی۔

"چیئرز... چیئرز..."

سارے ہال میں شور مچ گیا۔

ہر شخص کچھ نہ کچھ بول رہا تھا۔ فلکی گھونٹ گھونٹ کوک پینے لگی۔

پتا نہیں' اس کا دل کیوں گھبرا رہا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے کہیں سے چھپ کر آفاق اسے رہا ہو۔

اف اللہ... ایک تو بھوت کی طرح آفاق اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ اس نے اپنے سر کو کر آفاق کا خیال نکالنے کی کوشش کی۔

بوبی شاید کافی دیر سے پی رہا تھا اور بہت زیادہ نشے میں معلوم ہوتا تھا۔ اس کے قریب آکر

"آؤ' ظالم ہوجائے ایک راؤنڈ۔"

"ابھی نہیں' میں پہلے کوک پیوں گی۔"

بوبی کے اٹھتے ہی سب لڑکے اور لڑکیاں فلور پر آگئے۔ آرکسٹرا پھر بجنے لگا... رقص شروع یا۔

کچھ لڑکیاں فلکی کے پاس بیٹھی رہیں۔ پھر رفتہ رفتہ ان لڑکیوں کے پارٹنر بھی انھیں اٹھا کر گئے۔ صرف پنکی وہاں بیٹھی رہ گئی۔

پھر دور ہی دور سے پنکی کلب کے ممبروں کے بارے میں اسے بتانے لگی کہ کون کن کن وصیات کا مالک ہے۔

"اور وہ کون ہے!" فلکی نے ایک طرف اشارہ کرکے خود ہی پوچھا۔

"وہ جو سرخ میکسی میں' بُوٹے سے قد کی سرخ و سفید لڑکی بوبی کے ساتھ رقص کر رہی ہے؟" پنکی نے پوچھا۔

"ہاں ہاں' وہی۔"

"ارے یہی تو شوشو ہے۔ میں نے تمھیں بتایا تو تھا۔ بڑی آفت کی پرکالا ہے۔ ابھی ابھی ساس سے آئی ہے۔ اس نے آتے ہی تمھاری جگہ لے لی ہے۔ گو تم جیسی خوب صورت ں مگر تم سے زیادہ ہوشیار ہے۔ اور تو اور... بوبی بھی اس پر مرنے لگا ہے۔"

"اچھا!"

"ہاں' ایک بار اس کی خاطر بوبی اپنا گلا کاٹنے لگا تھا۔"

"واقعی...؟"

"ہاں.. اور وہ بھی بوبی کو جلانے کے لیے دوسرے لڑکوں کے ساتھ چلی جاتی تھی۔"

"پھر..؟"

"پھر ایک دن بوبی پستول نکال کر لے آیا۔ اس نے کہا میں چن چن کر اپنے سارے رقیبوں کو ختم کردوں گا۔"

"پھر...؟" فلکی کا دل ڈوبنے لگا۔

"بس' پھر شوشو ٹھیک ہوگئی۔ مجھ سے کہہ رہی تھی کہ میں تو یونہی ذرا بوبی کی محبت کو آزما رہی تھی کہ دیکھوں کہیں مجھے سے فلرٹ تو نہیں کررہا۔ مگر وہ تو بہت سنجیدہ ہے۔"

فلکی کے دل میں ایک ہوک اٹھی... کبھی بوبی نے اس کی خاطر بھی اپنا گلا کاٹنے کی کوشش کی تھی...؟ اور وہ سمجھ رہی تھی کہ بوبی نے اس کی جدائی میں رو رو کر اپنا حال تباہ کرلیا ہوگا۔ وہ چھوڑ دی ہوگی۔ محبت سے متنفر ہوگیا ہوگا۔

... مگر یہ لوگ تو سوداگر ہوتے ہیں۔ پیشہ ور عاشق ہیں۔ جس طرح ان کی شکلیں جھوٹی ہوتی ہیں' اسی طرح ان کے دل بھی جھوٹے ہوتے ہیں۔ یہ بھنورے ہیں... سائے ہیں۔ تاریکی میں ساتھ چھوڑ جانے والے۔

یہ بوالہوس ہیں۔ ہر چہرے پر مرمٹنے والے..... ہر جسم سے پیاس بجھانا چاہتے ہیں۔

وہ ہرنی بن کر دوبارہ ان کے درمیان کیوں آگئی؟

"تو کیا یہ دونوں شادی کرلیں گے؟" فلکی نے ڈوبتے ابھرتے لہجے میں پوچھا۔

"شادی کون کرتا ہے جان..." پنکی نے آخری گھونٹ بھر کر کہا۔ "میرا خیال ہے شوشو' بوبی سے فلرٹ کررہی ہے۔"

"تمہیں کیسے پتہ؟"

"اس کا اصلی بوائے فرینڈ تو ٹیکساس میں ہے۔"

"تمہیں کس نے بتایا ہے؟"

"خود ہی بتا رہی تھی..... اور جانتی ہو' وہ امریکن لڑکا ہے۔ شوشو' اس پر جان دیتی ہے۔"

"کیا شوشو' امریکن لڑکے سے شادی کرلے گی؟"

"وہ کہہ رہی تھی کہ اس کے ماں باپ اتنے لبرل نہیں کہ اسے شادی کی اجازت دے دیں۔ اس لیے وہ آج کل چوری چوری' امریکا کا ویزا بنوانے کی فکر میں ہے اور اس کے لیے بوبی کو

خال کررہی ہے کیونکہ بوبی کا ایک چچا' امریکی قونصل خانے میں کام کرتا ہے۔ کہہ رہی تھی کسی طرح ٹکٹ کا بندوبست کرکے والدین سے چوری چھپے بھاگ جائے گی۔"

"وہاں جاکر کیا کرے گی؟"

"وہ کہہ رہی تھی کہ بھاگے ہوئے لوگوں کے لیے وہ ملک بہت اچھا ہے۔ وہاں ہر ایک کو پناہ ہے۔ جاب کرلے گی... عیش کرے گی۔"

"شوشو جیسی لڑکیاں اپنے ملک کو وہاں جاکر بدنام کرتی ہیں۔" بے اختیار فلکی کے منہ سے گیا۔

نکی نے حیرت سے فلکی کی شکل دیکھی۔

فلکی جلدی سے بولی "بیچارا بوبی کیا کرے گا؟"

"بوبی کو کوئی اور مل جائے گی.. یاد ہے' تمہارے پیچھے کس قدر پھرا کرتا تھا۔" یہ کہہ کر پنکی انداز میں ہنس پڑی۔

ایک برچھی سی فلکی کے دل کے پار ہوگئی۔

"وہ دیکھو' میرا بلاوا بھی آگیا۔" ایک لڑکا جھومتا ہوا' انہی کی طرف آرہا تھا۔

یہ کون ہے؟"

"یہ میرا اپنا ہمسایہ ہے... عمیر۔"

"تم بھی روز ساتھی بدلتی ہو؟"

"جان! میں تمہاری طرح خوش قسمت نہیں ہوں۔ جس دن بڑی جگہ پر ہاتھ مارا۔ سب دوں گی۔"

س لڑکے نے قریب آکر پنکی کے کندھے پر ہاتھ مارا تو پنکی "ایکسکیوزمی" کہہ کر اٹھ گئی۔

یب فلکی تنہا رہ گئی تھی۔ کوک ختم کرکے اس نے بوتل فرش پر رکھ دی اور صوفے کی پشت ٹکا کر سب کا جائزہ لینے لگی۔ رقص اپنے عروج پر تھا۔ جوش رقص میں سب جوڑے اپنے د و حواس کھو بیٹھے تھے۔

ون کیا کررہا ہے... کسی کو خیال نہ تھا۔ فلکی کی نظروں کی زد میں بوبی اور شوشو تھے۔ دورانِ ص' بوبی' شوشو سے لپٹا جارہا تھا۔ حجاب کی ہر حد توڑ رہا تھا' بالکل حیوان لگ رہا تھا۔

ور واقعی دیکھنے میں بوبی کس قدر داہیات شکل و صورت کا لڑکا تھا... یہ تو اس نے آج ہی یا تھا۔ لمبے لمبے بے ترتیب بال' لمبی لمبی قلمیں' چہرے پر بال ہی بال۔ پتلے پتلے بازو'

کوڑے کی طرح پتلی کمر۔ ہاتھوں میں چھلّے' گلے میں زنجیر۔

وہ تو کسی طرح بھی مرد نہیں لگ رہا تھا۔ ہاں مرد کا کارٹون ضرور لگ رہا تھا۔ اس بوبی کو آفاق پر ترجیح دینا چاہتی تھی؟ اس کے پاس کیا ہے اس کے پاس تو اخلاقی روایات بھی نہیں جو ہر مرد کا اثاثہ ہوتی ہیں۔ آج فلکی' کل شوشو' پرسوں کوئی اور..... یہ تو بھوکے گدھ ہیں۔ بس بھوک مٹانا جانتے ہیں۔ فلکی کا سر چکرانے لگا۔

ساری ناچتی ہوئی لڑکیاں اسے کٹ پتلیاں نظر آنے لگیں جنہیں مرد اپنے ہاتھ سے بناتے ہیں۔ پھر نچاتے ہیں اور آخر میں اپنے ہی ہاتھوں سے توڑ دیتے ہیں۔ عورت شیشے کی ہوتی ہے، کاش اسے معلوم ہو جائے' شیشہ ٹوٹ جائے تو کبھی نہیں جُڑتا۔ دنیا کا کوئی بھی مصالحہ عمر بھر کے ٹوٹے ہوئے شیشے کو نہیں جوڑ سکتا۔

یہ تمام شیشے ان بے حس پتّھروں کے درمیان کیوں آگئے ہیں؟

کیا دنیا سے سارے آفاق اٹھ گئے ہیں؟... کیا اب دنیا میں صرف بوبی ہی بوبی ہیں؟

افوہ... بے خیالی میں پھر اسی منحوس کا نام لبوں پر آگیا۔

اسی وقت راؤنڈ ختم ہو گیا اور بوبی بھاگ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ پسینے میں تر بتر' بکھرے ہوئے بال... عجیب وحشت زدہ سا ڈھانچہ لگ رہا تھا۔ اس نے آتے ہی فلکی کا ہاتھ پکڑا اور اسے کھینچ لیا۔ فلکی کھڑی ہو گئی۔

"کب تک تڑپاؤ گی' ہنی! آؤ' آج موقع دو۔" بوبی اسے گھسیٹ کر فلور پر لے گیا۔ سب لوگ تالیاں بجانے لگے۔ شوشو اپنا پسینہ پونچھتی ہوئی سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔

جاتے جاتے بوبی نے اس کے کان میں کہا۔

"فلکی میری پہلی محبت ہے اور تم آخری محبت ہو۔"

بوبی کے جسم میں سے وہسکی اور پسینے کی بو آرہی تھی۔ جب وہ فلکی کے قریب آیا تو فلکی کو ابکائی آنے لگی۔ وہ اس بدبو سے کتنی دور چلی گئی تھی' اس گھر میں جہاں تقدس آسمانی نیکیوں کی طرح چھایا ہوا تھا۔ آفاق کی رعونت اور نفرت اس بدبو سے بدرجہا بہتر تھی۔

بوبی نے اپنا گرم گرم اور گیلا گیلا ہاتھ جب فلکی کی کمر میں ڈالا تو وہ تڑپ کر یوں پیچھے ہٹ گئی جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

"ارے' تم تو اور بھی چکنی ہو گئی ہو۔" وہ بے حیائی سے بولا۔

فلکی اس سے دور ہٹ کر رقص کرنے لگی۔ ہر قدم بے دلی سے رکھ رہی تھی اس لیے بوبی

تھ نہیں دے پا رہی تھی۔ بوبی کی آوارہ نظریں مستقل اس کے چہرے پر تھیں۔

"کیسی گزر رہی ہے پھر؟" اس نے بائیں آنکھ دبا کر پوچھا۔ پرانے خدمت گار بھی یاد آتے یا نہیں؟"

فلکی خاموش رہی۔

"کبھی کبھی مل لینے میں کیا حرج ہے؟ ہم کوئی غیر تو نہیں' تمہارے چاہنے والے ہیں۔" وہ آوارگی سے ہنسا۔

"تم جانتے ہو بوبی' میں شادی شدہ ہوں۔" فلکی غصّے سے بولی۔

"اری او' قاتل کی بچّی! تجھے کون شادی شدہ کہہ سکتا ہے۔ اس احمق کی اولاد نے تیرا کچھ ں بگاڑا۔"

فلکی نے ناگواری سے منہ پھیر لیا۔

وہ قریب پہنچ کر بولا۔ "سچ سچ بتاؤ' کیا بات ہے؟"

"شٹ اپ...!" فلکی غصّے سے بولی۔

"بھئی میرا تو ابھی تک وہی موٹو ہے۔ Shut up or put up اب تم جو کچھ کہو گی' اشت کرلوں گا۔"

فلکی نے اس کی طرف سے منہ موڑ لیا اور سوچنے لگی۔ راؤنڈ ختم ہو تو وہ اپنی جگہ پر چلی ئے۔

"تڑپانے کی وہی ادا ہے تمہاری۔" بوبی جھومتے ہوئے بولا۔ "ذرا اس خوب صورت رے کا رس پینے دو۔ اگر ہم اپنا حصّہ مانگیں تو کیا برائی ہے۔ پرانے ساتھی' پرانے دلبر ہیں۔" کہہ کر جب بوبی نے فلکی کے گالوں کو ہاتھ لگایا تو فلکی نے پھر کر پوری قوت سے ایک زناٹے ر تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔ تھپڑ کی آواز اتنی بلند تھی کہ آس پاس رقص کرنے والے جوڑے ک کر کھڑے ہو گئے... آرکسٹرا بجانے والی ٹیم نے بھی یہ منظر دیکھا تھا۔ آرکسٹرا خود بخود ک گیا۔ ہال میں سناٹا چھا گیا۔ فلکی نے چاروں طرف دیکھا۔ ہر نگاہ اسی پر تھی۔ تجسّس' راض جھنجلاہٹ کی ہوئی' حیرت زدہ....

اس سے پہلے کہ چہ میگوئیاں شروع ہوتیں' وہ ان سب کو حیران اور ششدر چھوڑ کر اس لتے سے نکلی اور باہر کی طرف بھاگی... شاید کچھ لوگ اس کے پیچھے دوڑے تھے۔ کچھ لوگوں نے سے پکارا بھی تھا۔ پھر آوازیں آنا بند ہو گئیں۔

وہ دوڑ کر کلب سے باہر آئی اور اپنی کار کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور دل نہایت تیزی سے دھڑک رہا تھا... اور آنکھوں میں پچھتاوے کے آنسو تھے۔ اس نے سر اسٹیئرنگ پر رکھ دیا اور رونے لگی۔

جب تک دل کا غبار نہ نکلے' دل ٹھیک نہیں ہوتا۔ گاڑی چلانے سے پہلے نارمل ہونا ضروری تھا۔

خدا کرے تم کبھی سکون سے نہ رہو آفاق... تم نے مجھے برباد کردیا ہے۔ میں جہاں کی ہاں تھی۔ یہی سب کچھ میں بھی کرتی تھی اور خوش رہتی تھی۔ تم نے مجھ سے میرا جہاں چھین لیا اور اپنے جہاں سے دھکے دے کر نکال دیا۔

میری زندگی' انہی لوگوں کی طرح' انہی فضولیات میں بسر ہو جاتی... مجھ پر آگہی کے دروازے کیوں کھولے؟ تم نے مجھے کہیں کا نہ رکھا' آفاق... نہ خدا ہی ملا وصال صنم... میں کیا کروں؟... میں کدھر جاؤں؟

آفاق! تم نے میری زندگی تباہ کردی۔ میری خوشیاں لوٹ لیں۔ اللہ کرے تم مرجاؤ' آفاق!

اس نے اسٹیئرنگ پر سر رکھ لیا اور بلک بلک کر رونے لگی۔

جب اچانک اسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کی گاڑی کا ہونٹ بجا رہا ہے تو اس نے جلدی سے سر اٹھا کر دیکھا اور آنکھیں صاف کرلیں۔ دو نوجوان لڑکے' ونڈ اسکرین کے پار سے اسے گھور رہے تھے اور ہونٹ بجا بجا کر اسے اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے۔

"کیا بات ہے؟" فلکی نے اپنی آواز صاف کرکے غصے سے پوچھا۔

ان میں سے ایک ناک میں سے آواز نکال کر امریکن لب و لہجے میں بولا

Shall we keep you company

فلکی نے غور سے دیکھا۔ دونوں پاکستانی تھے اور دونوں نے پی رکھی تھی۔ دونوں بوبی کے قبیل سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے ارادے بھی وہی تھے جو بوبی کے۔

.... رات کا وقت... کلب کا کمپاؤنڈ... اور دو شرابی لڑکوں کے درمیان' ایک تنہا لڑکی۔

فلکی کے ذہن میں خطرے کے الارم بجنے لگے۔

فلکی کو سوچ میں مگن دیکھ کر وہ آنکھوں سے اپنے ارادوں کا اظہار کرنے لگے۔ فلکی نے سیلف میں لگی ہوئی چابی ایک دم سے گھمائی اور کار اسٹارٹ کردی۔

"اوہ' نو..." ان میں سے ایک منہ اندر کرکے بولا "ہم تمہیں بہت اچھا وقت دے سکتے

ہیں۔"

"شٹ اپ۔" فلکی نے گیئر لگایا۔

"باری باری..." دوسرے نے منہ اندر کیا اور شراب کا بدبودار بھبکا گاڑی میں پھیل گیا۔

"شٹ اپ! باسٹرڈ..." فلکی زور سے چلائی اور اس نے ایکسیلیٹر پر پاؤں رکھ دیا۔ گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھی اور گیٹ سے نکل گئی۔

پتہ نہیں فلکی کس رفتار سے گاڑی چلا رہی تھی۔ اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ کو کوس رہی تھی۔ بھلا وہ اس وقت کلب میں آئی ہی کیوں تھی؟ کیا یہ شریف لڑکیوں کے باہر نکلنے کا وقت ہے؟ اس وقت رات کے نو بج رہے تھے۔ سڑکیں سنسان نہ ہوئی تھیں۔ مگر ایک تنہا لڑکی کو کوئی بھی حادثہ پیش آسکتا ہے۔

ہر اکیلی لڑکی' جو رات کو باہر نظر آتی ہے' اسے بیسوا سمجھا جاتا ہے... افسوس صد افسوس... عورت نے اپنے آپ کو اتنا طاقت ور کیسے سمجھ لیا... یہ Womans lib کا نعرہ عورت کو سیکورٹی نہیں دے سکتا۔ آج بھی تنہا لڑکی طوائف ہے۔

عورت کو ہمیشہ تحفظ کی ضرورت رہتی ہے۔ مرد اس کا محافظ ہے۔ وہی اس کا پاسبان ہے۔ باپ ہو' بھائی ہو' شوہر ہو یا بیٹا۔ ان چاروں شاخوں سے ٹوٹ کر عورت کچھ بھی نہیں.... ایک اڑتا ہوا پتہ ہے جسے ہوا اڑا کر جا ہے بیچ پر چھوڑ دے یا گندگی کے ڈھیر پر... اوہ' میرے خدا.....

یہ سچائیاں میری جھولی میں کیوں آن گریں۔ فلکی روتی رہی اور گاڑی چلاتی رہی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ آج اس کا ایکسیڈنٹ ہوجائے... آج اس کی گاڑی چکنا چور ہوجائے اور اس کا وجود کچلا جائے۔ اس کے سلگتے ہوئے ذہن کا نام و نشان مٹ جائے وہ مرجائے۔ کچھ تو ہو' کچھ تو ہو.....

یہ زندگی کا جمود تو ٹوٹے... قنوطیت کی کوئی راہ تو ملے... لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ آج جیسے ہر حادثہ بڑی احتیاط سے گاڑی چلا رہا تھا۔

وہ صحیح و سلامت گھر پہنچ گئی۔ پورچ میں پہنچ کر اس نے گاڑی کی اندر کی بتی جلائی۔ پھر آئینہ اور رومال نکال کر اپنا چہرہ صاف کرنے لگی۔ ممی کے سوالات سے بچنے کے لیے اپنی حالت درست کرنا ضروری تھا۔

زندگی اس طرح نہیں گزر سکے گی... فلکی نے پڑے پڑے سوچا۔ پچھلے ہفتے کا تجربہ بہت تلخ تھا۔ تین دن سے کمرہ بند کیے پڑی تھی۔

اف اللہ... اسے کلب کی رات یاد آجاتی تو اس کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے۔ اس رات کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

اب وہ لاابالی اور عاقبت نا اندیش لڑکی نہیں تھی۔ کسی شریف آدمی کی ذمے دار بیوی تھی... گو اُسے، اس نے اپنایا نہیں تھا مگر باقاعدہ طلاق تو نہیں ہوئی تھی۔ یوں کہہ دینا "میرے گھر سے چلی جاؤ۔" تعلق یا رشتے کو توڑ نہیں دیتا۔ میاں بیوی لڑائی میں سو بار ایسا کہتے ہیں۔

بیوی کہتی ہے۔ "میں میکے جارہی ہوں، ہمیشہ کے لیے۔"

اور شوہر کہتا ہے "دفعہ ہوجاؤ... نکل جاؤ میرے گھر سے۔"

لیکن یہ تو ان کا روزمرّہ کا محاورہ ہوتا ہے۔

اور اس نے تو اس کی آزادی لوٹائی تھی... آزادی کا مطالبہ تو فلکی نے ہی کیا تھا نا؟... فلکی نے ایک ٹھنڈی آہ کھینچی۔

ایک زمانہ تھا، جب اس کی ایک ہی تمنّا تھی کہ آفاق کو چھوڑ کر چلی جائے... تو اس نے تیری آزادی لوٹا دی... آزادی کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم دونوں جدا ہوگئے۔ الگ الگ ہوگئے... قانون اور شرع کی نظروں میں تم دونوں ابھی تک میاں بیوی ہو۔

ہاں تو تم اپنے شوہر کی عزّت کو کلب اچھالنے گئی تھیں... اس سے انتقام لینے کی خاطر... یا اپنی تسکینِ قلب کے لیے...

اس رات اگر کچھ ہوجاتا تو.... فلکی کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے۔

کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ پھر باقی کیا رہ جاتا۔

اس سے پہلے وہ اتنی محتاط نہ تھی... غیر شادی شدہ تھی تو نڈر تھی۔ بہادر تھی۔ منہ زور

تھی۔ بے لگام تھی۔ اخلاقی قدروں پر ایمان نہ رکھتی تھی مگر شادی ہوئی تو عزّت و عصمت کا مطلب سمجھ میں آیا۔ چادر اور چار دیواری کی وضاحت ہوگئی۔

عورت کے لیے چادر اور چار دیواری کس قدر ضروری ہے اور اس سے زیادہ ضروری ہے، مرد کا سائبان سر پر ہو۔ مرد کے بغیر تو عورت ننگے سر ہے۔

جب عورت ایک مرد کو اپنے حقوق نہیں سونپتی تو پھر ہر مرد اس کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے مگر کوئی اس کے ننگے سر پر آنچل نہیں ڈالتا بلکہ تن کا لباس بھی نوچ ڈالتا ہے۔

ہوں.....

اور تُو نے آفاق سے ٹکر لینے کے لیے اس گندے متعفّن تالاب میں چھلانگ لگانے کی کوشش کی تھی۔

چاہتی تھی کہ گوشت کا لوتھڑا بن کر قصاب کی دکان پر لٹک جائے۔ ہر روز تجھے تولا جائے اور ہر روز تیری قیمت چکائی جائے۔

چھی.....

کتنی گر گئی ہے تُو.....

بتا، عرفان و ادراک کی ساری منزلیں طے کرنے کے بعد، محبّت کا مطلب سمجھنے کے بعد کیا تُو اس دنیا میں واپس جا سکتی ہے جو کچے شیشے کی دنیا ہے اور ایک پاؤں کا بوجھ بھی برداشت نہیں کر سکتی؟

نہیں... نہیں... نہیں! فلکی نے سر اِدھر اُدھر مارا۔

یہ تو ہوگئی ایک طے شدہ بات کہ وہ لوٹ کر شراب و رنگ کی مسلی ہوئی، دھواں دھواں فضا میں نہیں جا سکتی۔

پھر... عمر کیسے گزرے گی... یہ اتنی لمبی عمر...

اس ناقدرے کی دنیا سے نکل کر کہاں ٹھکانہ ہوگا... کہاں سکون ملے گا...؟

عمر کیسے کٹے گی سیف یہاں
رات کٹتی نظر نہیں آتی

اب وہ اتنی نااہل اور اپاہج بھی نہ تھی کہ یوں ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ جاتی... کوئی کام کرنا چاہیے...

کچھ کرنا چاہیے... زندگی گزارنے کے لیے... خود کو زندہ رکھنے کے لیے....

ظاہر ہے۔ اب وہ کسی اور کے قابل نہ رہی تھی اور نہ اس واہیات چکر میں دوبارہ پڑنا چاہتی تھی...

وہ جانتی تھی۔ سچی محبت کے نقش دل پر گہرے ہو جاتے ہیں...

اور دل کو بدل لینا کھیل نہیں۔ تماشا نہیں۔

وہ ڈھیر سارے نئے و پرانے اخبارات نکال کر لے آئی اور ہر جگہ "وانٹڈ" کے کالم دیکھنے لگی۔ رات تک اس نے ڈھیر سارے کالم دیکھے اور "ضرورت ہے۔" کی ساری پرچیاں قینچی سے کاٹ لیں۔ پھر وہ ان پر غور کرنے لگی کہ اسے کہاں کہاں Job کرنا چاہیے۔ پھر اسے تین معقول جگہیں نظر آئیں اور اس نے سوچا اللہ کا نام لے کر عرضیاں لکھ ہی دے۔

ایک کمپنی کو لیڈی سیکرٹری کی ضرورت تھی۔ آنے جانے کی سہولت کے علاوہ تنخواہ بھی معقول تھی۔

دوسری جگہ ایک سکول کو انگریزی پڑھانے کے لیے ایک ٹیچر کی ضرورت تھی مگر ٹیچر کا ٹرینڈ ہونا اور تجربہ کار ہونا ضروری تھا جب کہ اس نے بزنس مینجمنٹ میں ایم۔اے کیا تھا۔

تیسری جگہ کچھ دل کو لگتی نہ تھی مگر دل بہلانے کو ٹھیک تھی... کیا حرج ہے اگر ذرا سا گلیمر پیدا کیا جائے۔ ایک "ڈرائیونگ اسکول" نے ایک لیڈی ڈرائیور مانگی تھی جو کافی تجربہ رکھتی ہو اور خواتین کو موٹر چلانا سکھا سکے۔

فلکی جب پندرہ سال کی تھی کہ اس نے موٹر چلانی شروع کر دی تھی۔ تجربہ بہت تھا۔ آج تک ٹکر نہیں ماری تھی۔ امید تھی کہ جاب مل جائے گا۔ اس نے رات ہی تینوں عرضیاں' بڑی خوش خطی سے لکھیں۔ لفافے پر ان کے پتے لکھے، ٹکٹ لگائے اور جگہوں کے فون نمبر اپنی نوٹ بک میں نقل کر لیے اور اطمینان سے سو گئی۔ صبح اٹھ کر تیار ہوئی اور خود ہی جا کر پوسٹ آفس میں خط بھی ڈال آئی۔ خوش قسمتی سے ہفتے کے اندر اندر تینوں جگہوں سے کال آ گئی۔

سب سے پہلا انٹرویو لیڈی سیکرٹری کا تھا۔ اسے وہ دن یاد آ گیا جب وہ آفاق کو انٹرویو دینے گئی تھی مگر اس نے فوراً" آفاق کے خیال کو جھٹک دیا۔ نہ معلوم کیوں ہر موقع پر اس منحوس کا خیال خود ہی آن کھڑا ہوتا تھا۔ جانے کیسے وہ لاشعوری کھڑکی کھول کر باہر نکل آتا تھا۔ وہ شعوری کوششوں سے اسے ہر بار دور بھگا دیتی تھی۔ اب وہ پہلے والی لاابالی فلکی نہیں تھی جو شکار کرنے جایا کرتی تھی۔ ذمے دار اور سوبر خاتون بن کر جانا چاہتی تھی۔

اس نے کتھئی رنگ کی سادہ سی ساڑھی نکالی اور اس پر سفید گرم بلاؤز پہن لیا۔ کورٹ

شوز پہنے اور اپنے چھوٹے بالوں کو سمیٹ کر اس پر موپڈ لگا لیا کہ جُوڑا لگانے سے عورت ذرا گریس فل لگتی ہے۔ بالکل برائے نام میک اپ کیا اور باہر آ گئی۔

آج کوئی بجلی گرانے کے ارادے تو نہ تھے بلکہ ضرورت مندی ظاہر کرنا تھا۔

اگر ممی نے جاتے دیکھ لیا تو جان کو آ جائیں گی اس لیے اس نے اپنی شال اوڑھ لی جس کے پلوؤں پر طلائی کام کیا ہوا تھا' پھر آ کر موٹر میں بیٹھ گئی۔ نو بج گئے تھے اور نو بجے اسے دفتر میں ہونا چاہیے تھا۔ راستہ زیادہ دور نہیں تھا۔

اس نے باہر جھانک کر دیکھا۔ ممی کہیں نظر نہیں آ رہی تھیں... غالباً" کہیں بیٹھی ماسک لے رہی ہوں گی یا کوئی باتھ لے رہی ہوں گی۔ ان کو اِطلاع دینی فضول سمجھ کر وہ گاڑی سڑک پر نکال لائی۔

سڑکوں پر ابھی رات والی دُھند باقی تھی۔ کہرسا ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ دن کے وقت بھی بعض لوگوں نے موٹروں کی بتّیاں جلا رکھی تھیں۔ موسم حد درجے خنک ہو گیا تھا... اور جنوری کا مہینہ تو لاہور کا سرد ترین مہینہ ہوتا ہے اور اسے یہ سرد سرد موسم اچھا لگتا تھا۔ جب آتش دان کے سامنے بیٹھ کر وہ مزے مزے کے ناول پڑھا کرتی تھی اور چلغوزے' مونگ پھلیاں چھیل چھیل کر چھلکوں کے ڈھیر لگا دیا کرتی تھی۔ پھر دھوپ میں الٹا لیٹ کر ٹانگیں چلانا کتنا اچھا لگتا تھا۔ بار بار چائے پینا' کافی بنانا' سہیلیوں سے گپ لگانا۔

تیرا بچپنا کہاں گیا فلکی؟ وہ لڑکپن کہاں ہے؟

وہ بانکپن... وہ تیکھا پن... وہ کج ادائی.. وہ زندگی کی لاپروائی... فلکی وہ سب کہاں گیا؟

اولین جوانی کا وہ خوب صورت دفینہ کون لے گیا؟.... رفاقتیں... چلبلا پن... خیال آرائیاں... غرور... بے فکری... محبت...

محبت لے گئی سب کچھ۔ بڑی زہریلی شے ہے محبت' یہ وہ نہیں جو کتابوں میں لکھی ہوتی ہے۔ یہ تو درد ہی درد ہے۔ جب درد دل میں جگہ لیتا ہے تو دنیا جھوٹ نظر آنے لگتی ہے۔ دنیا کی حقیقت ہی بدل جاتی ہے۔

آپ ہی آپ ہر شے دل سے نکل جاتی ہے۔

بھلا ایسا کیوں ہوتا ہے؟

ع۔ جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی

کار کا ریڈیو دھیمے سروں میں اقبال کا نغمہ بجا رہا تھا۔ فلکی نے ہاتھ بڑھا کے ریڈیو بند کر دیا۔

مطلوبہ دفتر آگیا تھا۔ وہ گرم موٹر سے باہر نکلی تو ایک دم یخ بستہ ہوا کے تھپیڑے نے اس کے سندر چہرے کی بلائیں لیں۔ خوب صورت سی ننھی سی ناک اور سرخ ہوگئی۔ فلکی کو بے اختیار ایک چھینک آگئی اور چھینک کے ساتھ ہی ذرا سا پانی آنکھوں میں آگیا۔ کاش! وہ اپنا فر والا کو: پہن ہی لیتی۔ اب کہیں صاحب بہادر یہ نہ سمجھ لیں کہ لڑکی نروس ہو رہی ہے' بہرحال دفتروں کے اندر تو گرم رکھنے کا پورا پورا بندوبست ہوتا ہے۔ وہ اوپر چلی گئی۔

انتظار گاہ میں دو لڑکے اور چار لڑکیاں پہلے سے بیٹھی تھیں۔ فلکی نے سرسری نظر سے انھیں دیکھا اور منہ پھیر کر شیشے میں سے باہر دیکھنے لگی۔ کُہر کی وجہ سے کھڑکی کے شیشے دُھندلائے ہوئے تھے اور کھڑکی کے شیشوں کو باہر کی طرف سے ٹھنڈے پسینے آرہے تھے۔ طُرفہ تماشا ہے۔ فلکی نے سوچا۔

فلکی آج خالی الذہن تھی۔ نہ دل میں کوئی جذبہ تھا۔ نہ پہلو میں کوئی امنگ۔

نوکری اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ نوکریوں سے اور دلوں سے کھیلنے والی لڑکی محض اپنی ذات سے انتقام لینا چاہتی تھی۔

نہیں' تم آفاق سے انتقام لینا چاہتی ہو اس کی راہ میں دوسرا آفاق کھڑا کر کے۔

کیا یہ سچ ہے؟ اس کا دل احساسِ جرم سے بج اٹھا۔

اسی وقت اس کا نام پکارا گیا اور وہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔

بڑے وقار سے چلتی ہوئی گئی اور سلام کر کے کرسی پر بیٹھ گئی۔ ایک سرسری نظر اس آدمی پر ڈالی... پچاس کے لگ بھگ عمر ہوگی۔ معقول صورت تھا۔ اچھی صحت کی وجہ سے جوان لگ رہا تھا۔

صورت کیا ہے۔ صورت سے سبھی آدمی معقول نظر آتے ہیں۔ آفاق کی صورت سے بھی وہ دھوکا کھا گئی تھی۔

فلکی نے ایک ہی نظر میں اس کا اور اس کی میز کا جائزہ لے کر اپنی نظریں جھکالیں۔ گو وہ نروس نہیں تھی مگر گرم کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا اور ننھی سی ستواں ناک پر ننھے ننھے پسینے کے قطرے نظر آنے لگے تھے۔

کچھ سیکنڈ تک وہ آدمی مبہوت سا بیٹھا رہا۔

پھر اسے سوال کرنے کی ہمت ہوئی۔

فلکی بڑی خود اعتمادی سے ہر سوال کا جواب دیتی رہی۔

کاروباری سوال کرنے کے بعد وہ بولا۔

"ذاتی سی بات ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو پوچھ لوں۔"

"ضرور پوچھیے۔" فلکی نے شائستگی سے کہا۔

"آپ نے کہا ہے۔ آپ شادی شدہ ہیں۔ اپنی شکل و صورت کے اعتبار سے آپ کسی اچھے خاندان کی لگتی ہیں۔ میرا مطلب ہے ایسے گھرانے سے جہاں "ضرورت" سے مجبور ہو کر نوکریاں نہیں کی جاتیں... اگر میرا اندازہ صحیح ہے تو پھر آپ ملازمت کیوں کرنا چاہتی ہیں؟"

فلکی نے اس کا جواب سوچ رکھا تھا۔

"میرے شوہر چند سالوں سے بیرونِ ملک چلے گئے ہیں۔ میں گھر بیٹھ کر وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی اور چونکہ اس سے پیشتر ایک دفتر میں ملازمت کر چکی ہوں اسی لیے اپنے سابقہ تجربے کی بنا پر اس بار بھی دفتر کی ملازمت کو ترجیح دی۔"

"تو اس کا مطلب ہے آپ کو دفتر کی نوکری خوش گوار لگی۔" وہ بولا۔

فلکی بے اختیار مسکرا دی۔ پتہ نہیں اس مسکراہٹ میں طنز زیادہ تھا یا تلخی۔

"آپ یہی سمجھ لیں۔" وہ اس کا زیادہ واضح جواب نہیں دینا چاہتی تھی۔ کیا کہتی کہ دفتر کی نوکری نے اسے دنیا میں زندہ رہنے کے قابل نہیں چھوڑا۔

"آپ ٹائپ کرنا جانتی ہیں؟" اس نے پھر پوچھا۔

"جی نہیں۔"

"لیکن ایک سیکرٹری کے لیے ٹائپ اور شارٹ ہینڈ کا جاننا بہت ضروری ہوتا ہے۔ آپ جانتی ہیں۔"

"مجھے افسوس ہے۔" وہ بولی "میں اس کوالی فیکیشن سے محروم ہوں۔"

"کیا آپ تین مہینے کے اندر اندر ٹائپ سیکھ لیں گی؟" وہ بڑی مروت سے بولا "اگر دفتر میں آپ کے لیے سکھانے کا بندوبست کر دیا جائے تو..."

"جی' اگر یہ بہت ضروری ہوگا تو سیکھ لوں گی۔ میں کام سے نہیں گھبراتی۔"

"آپ کا کوئی اور مطالبہ ہے؟" وہ آہستگی سے بولا۔

"جی نہیں' میں تو ملازمت کے لیے آئی ہوں۔"

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کو سلیکٹ کر لیا گیا ہے؟" وہ آنکھوں میں چمک پیدا کر کے بولا۔

"جی نہیں... جی... کیسے... جی میں کیسے مان سکتی ہوں۔" فلکی ایک دَم بوکھلا گئی۔

وہ اس کی بوکھلاہٹ پر مسکرانے لگا۔

"اس کے باوجود کہ میں ٹائپ نہیں جانتی۔"

"اس کے باوجود کہ آپ ٹائپ نہیں جانتیں۔"

"مہربانی بہت بہت۔"

"فلکی خوش نہیں ہوئی خاموش ہو گئی۔

منتخب کرنے کا یہ انداز نہیں ہوتا۔ ہمیشہ گھر پر چٹھی جاتی ہے۔ شاید یہ مجھے اس طرح مشکور کرنا چاہتا ہے۔

"میں کب سے آنا شروع کروں؟" اس کی چبھتی ہوئی نظروں سے بچنے کے لیے فلکی جلدی سے بولی۔

"کل سے آجائیں۔"

"مجھے کہاں بیٹھنا ہوگا؟"

"آپ کا کمرہ الگ نہیں ہے۔ آپ کو میرے ہی کمرے میں بیٹھنا ہوگا۔"

"آپ کے کمرے میں؟"

"جی ہاں۔ آپ میری پرسنل سیکرٹری ہیں تو یہیں بیٹھیں گی۔"

"لیکن ہر دفتر میں سیکرٹری کا کمرہ باس کے کمرے سے الگ ہوتا ہے۔"

"ہمارے دفتر میں ایسا نہیں ہے۔"

فلکی نے چاروں طرف دیکھا۔ ایک مستطیل سے کمرے میں مختلف قسم کا فرنیچر پڑا ہوا تھا۔ خوب صورت غالیچہ بچھا تھا۔ دبیز پردے لٹک رہے تھے۔ ایئرکنڈیشنر بھی لگا ہوا تھا۔ آتش دان میں ایک خوب صورت امپورٹڈ ہیٹر کمرے کو گرم کر رہا تھا۔ دیواروں پر خوبصورت پینٹنگز لگی ہوئی تھیں۔

"اور لڑکیاں بھی ہیں اس دفتر میں؟" فلکی نے کمرے کا جائزہ لے کر پوچھا۔

"ہاں، ہیں۔"

"وہ کہاں بیٹھتی ہیں؟"

"لڑکیاں عام طور پر میرے کمرے میں بیٹھتی ہیں اور مرد دوسرے کمرے میں۔ اس واسطے آپ کو اجنبیت بالکل محسوس نہیں ہوگی۔"

ٹھیک ہے جی۔ مجھے اب اجازت ہے۔ فلکی کھڑی ہو گئی۔

ویسے آپ کو آپ کا اپائنٹمنٹ لیٹر بھی مل جائے گا۔"

تھینکس یو سر۔" فلکی نے بڑے روایتی انداز میں کہا۔

اور پھر باہر جانے کو مڑی۔ وہ آدمی بھی کھڑا ہو گیا اور پھر چلتا ہوا فلکی کے ساتھ دروازے گیا۔

اچھا تو پھر کل ملاقات ہوگی۔"

جی....." فلکی نے بڑی شائستگی سے کہا۔ اس کی نگاہیں فلکی کے ایک ایک نقش کا طواف تھیں۔

خدا حافظ۔" فلکی باہر نکل آئی۔

اور کوریڈور میں سے ہوتی ہوئی سیدھی سیڑھیوں پر آ پہنچی... اور زینہ زینہ نیچے اترنے

نے کب وہ پیچھے چلا آرہا تھا....

اس بلڈنگ میں لفٹ بھی ہے... اور میں نے ہی لگوائی ہے۔ آپ اس طرف سے چلی ہے۔ میں آپ کو چھوڑ آؤں گا۔"

جی شکریہ۔" فلکی کا ایک پاؤں نچلی سیڑھی پر تھا اور دوسرا اوپر والی سیڑھی پر.... اس نے اپنے نئے باس کو دیکھا... جو سوالیوں کی طرح کھڑا تھا۔

سردیوں میں مجھے زینہ طے کرنا بہت اچھا لگتا ہے۔ اس سے ورزش بھی ہو جاتی ہے۔"

اسی لیے آپ اس قدر اسمارٹ ہیں۔"

تھینک یو سر!"

لی جلدی سے نیچے اتر آئی۔ اس کی ہیل کی ٹھک ٹھک خود اس کے ذہن میں ہتھوڑے کی لگ رہی تھی۔

رک کر دروازہ کھولا اور بیٹھ گئی۔ پرس سیٹ پر رکھا اور ایک طویل سانس لی۔

ہوں... تو ہو گیا انٹرویو... صاحب بہادر بھی گھائل ہو گئے۔ کبھی مَردوں کے یہ انداز اسے پسند آتے تھے۔ کتنا مزہ آتا تھا لوگوں کو تڑپا کے مگر اب یہ سب گھٹیا پن لگ رہا تھا۔ آخر مرد اس کی طرف متوجّہ کیوں ہو۔ اسے خوب صورت کیوں کہے۔ جبکہ وہ ایک مرد کی ہے۔

بیٹھے بیٹھے وہ آفاق کا اس شخص کے ساتھ موازنہ کرنے لگی۔ آفاق کی بے نیازی، رواداری... وقار....

پہلی ملاقات میں اسے آفاق بہت مغرور اور اکڑفوں نظر آیا تھا۔ وہ چاہتی تھی اس آدمی طرح آفاق بھی انٹرویو والے دن دو زانو ہوجاتا۔ باہر تک اسے چھوڑنے آتا اور اپنی آنکھوں کے کسی زاویے سے بتا دیتا کہ وہ تن من سے گھائل ہوچکا ہے۔

مگر آفاق نے ایسا نہیں کیا تھا۔

وہ ایک مختلف مرد تھا۔

اس نے تو اسے اس طرح بھی نہیں دیکھا تھا جیسے کسی جوان لڑکی کو دیکھتے ہیں۔

اسے صرف مشین سمجھا تھا۔

اور اسی بات نے فلکی کو خار دلائی تھی۔

وہ آفاق کو نیچا دکھانے کا ارادہ کر بیٹھی تھی۔

کیا خبر تھی۔ زندگی بھر کے لیے خود دو زانو ہوجائے گی۔

مگر... ایک بات ماننا پڑے گی۔ آفاق سب مَردوں سے مختلف' سب سے جدا' سب سے م آدمی تھا۔

اس نے ہی تو اسے بتایا کہ صحیح مرد کیا ہوتا ہے۔

گدھوں کی طرح منڈلانے والے مردار ہوتے ہیں۔ مرد نہیں ہوتے۔

اور اسے اپنے نئے باس سے خواہ مخواہ گھن آنے لگی۔

حضرت فرما رہے تھے۔ "آپ میرے کمرے میں بیٹھیں گی۔"

واہ ری قسمت۔

کبھی اس نے تمنا کی تھی کہ آفاق اسے اپنے کمرے میں بٹھائے۔ ہمہ وقت اس کے سامنے رہے۔ اس کو ادائیں دکھائے۔ اس کو لبھائے اور اس کو پھنسا لے۔

تب تو یہ آرزو پوری نہ ہوئی کہ آفاق تریا چلتر کا قائل نہیں تھا۔

مگر اب میں ان حضرت کے کمرے میں بیٹھوں گی۔"

اور جب کہ میرے من میں کوئی اور سمایا ہے اور تن پہ میرا اختیار نہیں۔"

اونہہ۔

کام کروانا مقصود ہے یا آنکھیں سینکنا۔ یہ دفتر ہے یا بازار لیکن خیر' اس کا جو بھی مقصد ہ

لڑکی کس طرح ہمہ وقت کسی آدمی کے سامنے بیٹھ سکتی ہے۔ جب بھی نظر اٹھے' اسی پر ۔ آخر اپنی پرائیویٹ نشست و برخاست بھی تو ہوتی ہے نا؟ ایسا بھی کیا کہ آدمی چھینک نہ بول نہ سکے' ہنس نہ سکے اور فریم میں جڑی تصویر کی طرح بت بنا بیٹھا رہے۔

ور حضرت باس جب چاہیں اور جس طرح چاہیں نظریں گھما کر دیکھ لیں۔ نظروں سے ٹٹول ور بات کرنے کا بہانہ ڈھونڈھ لیں۔

وکری تو اچھی ہے مگر یہ باس کے کمرے میں بیٹھنے والی شرط غلط ہے۔

ور اگر آفاق کو پتہ چل جائے تو...

وکیا کہے گا...

یا سمجھے گا وہ ستم کیش....

ہ میں پھر... پھر کسی اور....

فوہ۔ اس نے جلدی سے سیلف میں چابی گھمائی۔ آخر ہر موقعے پر یہ کم بخت آفاق کیوں بیچ آجاتا ہے۔

آخر اس کا یہاں کیا کام ہے۔

یا اس کے ذکر کے بغیر کوئی بات نہیں بن سکتی۔

اس نے جھٹکے سے گاڑی اسٹارٹ کردی... اور ایکسیلیٹر پر پاؤں رکھ کر اسپیڈ تیز کردی۔

میری اپنی بھی تو کوئی مرضی ہے نا....

اور اب ساری زندگی میں اپنی مرضی سے گزاروں گی۔

اپنی مرضی سے' ہاں....

اس نے اپنے ہونٹ دانتوں تلے کاٹے اور گھر کی طرف مڑ گئی۔

آج اس کا انٹرویو لڑکیوں کے ایک اسکول میں تھا۔ اس کا خیال تھا' یہ ضرور کوئی معمولی جاب ہوگا اور پھر لڑکیوں کے اسکول میں تو سارا زنانہ اسٹاف ہوتا ہے۔ وہاں ٹھیک رہے گا۔

صبح صبح بڑی اچھی طرح تیار ہو کر اسکول پہنچ گئی۔

اندر قدم رکھا تو یوں محسوس ہوا جیسے کسی رہائشی بنگلے کو کرایہ پر لے کر یہاں اسکول کھولا گیا ہے۔ کیونکہ گیٹ کے پاس جو تل تھا' اس پر ایک مائی جیٹھی برتن مانجھ رہی تھی۔ باہر ایک چھوٹے سے بورڈ پر اسکول کا نام لکھا ہوا تھا۔ وہ دفتر کا پتہ پوچھ کر وہاں آگئی۔ ایک چٹ پر اپنا نام لکھا اور اندر بھجوا دیا۔

دفتر سے باہر ایک چھوٹی سی سختی لگی ہوئی تھی۔ مسز زاہدہ فارانی بی اے' بی ایڈ خالبا" یہی ہیڈ مسٹریس ہوں گی۔ اس نے دل میں سوچا۔ اس کے علاوہ انٹرویو کے لیے کوئی اور نہیں آیا تھا یا تو سب لوگوں کے انٹرویو ہو چکے تھے یا باقی لوگ آنے والے تھے۔ فلکی بہت خوش ہوئی کہ وہ سب سے پہلے آگئی ہے اور اب جلدی ہی فارغ ہو کر چلی جائے گی۔

تھوڑی دیر بعد ایک میلی کچیلی سی مائی اسے بلانے کے لیے آئی۔

فلکی کھڑی ہوگئی۔ اپنی ساڑھی کی فال درست کی۔ ہونٹوں کو ایک دوسرے پر دبا کر لپ اسٹک کو ٹھیک کیا اور چٹ اٹھا کر اندر چلی گئی۔

روایتی سے دفتر میں ایک بھاری بھرکم خاتون' کرسی میں پھنسی ہوئی تھی۔ اسے بیٹھنا ہرگز نہیں کہتے۔

"تشریف رکھیے۔"

اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

بسم اللہ کر کے فلکی اس کرسی پر بیٹھ گئی۔

موٹی خاتون نے پہلے اپنی کلائیوں میں پھنسی ہوئی سونے کی چوڑیوں کو ہاتھوں سے درست

پھر اپنی بوجھل سانس کے زیر و بم کو درست کیا اور بولی۔

فرمایئے' میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟"

فلکی ایک دم بوکھلا گئی۔

پھر بولی "آپ نے مجھے آج انٹرویو کے لیے بلایا تھا۔"

"اچھا.. اچھا... تو آپ انٹرویو کے سلسلے میں آئی ہیں یعنی ملازمت کے سلسلے میں۔"

"جی۔"

"آپ کا نام کیا ہے؟"

"جی میں نے چٹ اندر بھجوائی تھی...."

"اوہ' چٹ...."

وہ اِدھر اُدھر ہاتھ مار کے چٹ ڈھونڈنے لگیں تو فلکی نے مزید کوفت سے بچنے کے لیے وہی بتا دیا۔

"جی میرا نام فلک ناز ہے اور میں نے ملازمت کے لیے درخواست دی تھی اور آپ کی طرف سے کال آئی تھی اس لیے میں یہاں آئی ہوں۔"

"اچھا.... اچھا... تو مس فلک ناز۔"

"جی میں مس نہیں مسز ہوں۔ میں نے اپنی عرضی میں لکھا تھا۔"

"پتہ نہیں اس وقت تمہاری عرضی کہاں ہے۔ بہرحال' میں تمہارا لے لیتی ہوں' وہ... یعنی انٹرویو۔"

"اچھا تو مس... ہاں تو تم مسز ہو۔"

"جی۔"

"تمہارے میاں کا نام کیا ہے؟"

"آفاق احمد۔"

"ہاں تو مسز آفاق' تمہاری تعلیم کتنی ہے؟"

"جی وہ میں نے سب اپنی عرضی میں لکھ دیا ہے۔"

"عرضی بھی مل جائے گی۔ زبانی بتا دو۔"

"میں نے جی' بزنس مینجمنٹ میں ایم۔اے کیا ہے۔"

"کون سی ڈویژن میں' جی۔"

"فرسٹ ڈویژن میں' جی۔"

"کتنے سال ہوئے؟"

"پانچ سال ہوئے۔" (فلکی نے جھوٹ بولا۔)

"پھر اب تک نوکری کیوں نہیں کی؟"

(عجیب احمقانہ سوال ہے)

"اب تک ضرورت نہیں محسوس ہوئی تھی۔"

"کیوں ضرورت محسوس نہیں ہوئی؟"

"جی بس... وہ' میری شادی ہو گئی تھی۔"

"اچھا تو شادی ہو گئی تھی...

کتنے سال ہوئے شادی کو؟"

"جی' پانچ سال۔" (فلکی نے پھر جھوٹ بولا)

"یعنی شادی کو بھی پانچ سال ہوئے ہیں۔"

"جی ہاں۔"

"آپ کے شوہر کیا کرتے ہیں؟"

"جی کاروبار کرتے ہیں؟"

"آپ کے میاں کاروبار کرتے ہیں تو پھر آپ نوکری کیوں کرنا چاہتی ہیں؟"

"تنہائی دور کرنے کے لیے۔"

"اچھا تو آپ کے بچّہ نہیں ہوا؟"

"جی نہیں۔"

"کیوں نہیں ہوا؟"

"اللہ کی مرضی۔"

"اچھا تو اللہ کی مرضی... ہاں تو آپ آج کل کہاں رہتی ہیں؟"

"جی میں اپنے والدین کے ہاں رہتی ہوں۔"

"کیا شوہر سے لڑائی ہو گئی ہے؟"

"جی نہیں۔"

"پھر والدین کے ہاں کیوں رہتی ہو؟"

"بہت سی لڑکیاں شادی شدہ ہیں مگر اپنے والدین کے ساتھ رہتی ہیں۔ کیا یہ قابلِ اعتراض
ت ہے؟"

"اچھا..... اچھا..... رہائش کی مجبوری ہے۔ آج کل رہائش بھی ایک مسئلہ بنی ہوئی ہے....
ب تو مکانوں کے کرائے آسمان تک جا پہنچے ہیں۔ اسی کوٹھی کو لیجیے پرانی سی کوٹھی ہے مگر اب
ب مکان پانچ ہزار روپے ماہانہ مانگتا ہے۔ اس کے ایک حصے میں' میں نے اسکول کھول لیا ہے
ر ایک حصّے میں رہائش پذیر ہوں وہ دو جگہ کرایہ نہیں دیا جا سکتا۔"

"کیا یہ پرائیویٹ سکول ہے؟"

"جی ہاں۔" وہ ہنس کر بولی۔ "مجھے خدمتِ خلق کا بچپن ہی سے شوق تھا۔ اسی لیے میں نے
کول کھول لیا ہے۔"

"بڑا اچھا جذبہ ہے۔"

فلکی حیران ہو رہی تھی۔ وہ یہاں انٹرویو دینے آئی تھی مگر اب تک موٹی خاتون نے ایک بھی
قول سوال نہیں پوچھا تھا۔ خالصتاً" ذاتی سوال کر رہی تھی۔

تھوڑی دیر وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی اور پھر کہنے لگی۔ "اچھا تو تمہاری اپنے شوہر کے
اتھ بنی نہیں؟"

"جی' میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی۔" فلکی زچ ہو کر بولی۔

"خیر.... خیر... تم نے ایم۔اے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا ہے۔"

"جی...." فلکی نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"مگر تمہیں تدریس کا کوئی تجربہ نہیں۔"

"جی نہیں۔"

"اور نہ تمہارے پاس بی۔ایڈ یا ایم۔ایڈ کی ڈگری ہے۔"

"جی نہیں۔ ایسی کوئی ڈگری نہیں۔"

"ہاں....." وہ ہاں کو لمبا کرتے ہوئے بولی۔

"ہم تمہیں رکھ لیتے ہیں... مگر تم جانتی ہو' اَن کوالی فائیڈ ٹیچر کو تنخواہ ٹرینڈ ٹیچر کے سکیل کی
یں ملتی۔"

تنخواہ فلکی کا مسئلہ نہیں تھی۔ پھر بھی مری ہوئی آواز میں بولی "کتنی تنخواہ ہو گی؟"

یہی کوئی تین چار سو روپے۔"

"تین چار سو روپے؟" فلکی کی چیخ نکل گئی۔ "اس سے زیادہ پیسوں کا تو یہاں آنے جانے پٹرول ہی خرچ ہو جائے گا۔"

"کیا تمہارے پاس گاڑی ہے؟"

"جی ہاں۔"

"خیر..." ہیڈ مسٹریس سوچ میں پڑ گئی۔ پھر بولی۔

"یہ آفر بھی اس لیے ہے کہ... میرا خیال ہے تمہاری انگریزی اچھی ہے۔"

فلکی کو ہنسی آگئی۔

فلکی انگریزی کی استانی کا انٹرویو دینے آئی تھی اور محترمہ مسلسل اردو میں سوال کیے جا رہی تھیں۔ فلکی نے خود ہی دو چار بار انگریزی میں جواب دینے کی کی کوشش کی تھی۔

"کون سی کلاسوں کو انگریزی پڑھانا ہوگی؟"

"نویں' دسویں کو۔"

"پہلے کون پڑھاتا تھا؟"

"میں پڑھاتی ہوں۔" ہیڈ مسٹریس نے بڑے فخر سے کہا۔

جس اسکول میں بی۔اے' بی ایڈ ہیڈ مسٹریس ہوگی۔ وہاں ایم۔اے پاس استانی کی کیا قدر و منزلت ہوگی؟

"اب میں جاؤں۔" فلکی نے بڑی بے دلی سے پوچھا۔

"ہاں تم جا سکتی ہو اگر یہ تنخواہ تمہیں منظور ہو تو اس نمبر پر مجھے فون کر لینا۔" اس نے دراز میں سے ایک کارڈ نکال کر فلکی کو دے دیا۔

فلکی نے وہ کارڈ لے کر دیکھا۔ اس پر لکھا تھا۔

"مسز زاہدہ فاروقی' بی۔اے' بی۔ایڈ ہیڈ مسٹریس ماڈرن گرلز ہائی اسکول۔"

خدا حافظ کہہ کر فلکی باہر آگئی۔ واہ واہ۔ اس نے کارڈ پکڑے پکڑے سوچا۔ تعلیم کی کیا قدر دانی ہے یہاں.....

اس کو آج وہ محاورہ بے طرح یاد آرہا تھا۔

مور کے گھر میں سلیمان خدا کی قدرت

باہر آئی تو دیکھا۔ ایک ہیڈ مسٹریس کے جثہ کی خاتون بینچ پر بیٹھی ہوئی تھی۔

"آپ انٹرویو کے لیے آئی ہیں۔"

"جی ہاں۔" اس نے بڑے ادب سے کہا۔

"آپ کی تعلیم کیا ہے؟" یوں ہی فلکی نے پوچھ ڈالا۔

"جی میں نے ایف۔اے کے بعد سی ٹی کا کورس کیا تھا مگر مجھے تدریس کا بارہ سالہ تجربہ بھی ہے۔"

"آپ انشاء اللہ ضرور منتخب ہو جائیں گی۔ اندر جائیے۔"

"شکریہ!" وہ خاتون بوکھلا گئی۔

اور فلکی ہنستی ہوئی آکر اپنی کار میں بیٹھ گئی۔

جن لوگوں کو خدمتِ خلق کا شوق ہوتا ہے' ان پر من من کی چربی چڑھی ہوتی ہے' تو بھی چلی تھی خدمتِ خلق کرنے۔"

بھلا نااہل لوگوں کی ماتحتی میں کام کر کے مزہ آتا ہے؟

اس موٹی محترمہ کے پاس سب کچھ تھا۔ صرف ذہانت نہیں تھی اور شاید مجبور استانیوں کا لہو پی پی کر موٹی ہو گئی تھی۔

اتنی کم تنخواہ پر علم کا سودا کرنا ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔ فلکی کو تو کوئی مجبوری نہ تھی۔ مگر جو خواتین نوکری کرنے پر مجبور ہو جاتی ہوں گی' ان کا گزر اتنے کم پیسوں میں کس طرح ہوتا ہوگا۔

فلکی کا دل رونے لگا۔

اور اسے اپنے آپ پر خود تعجب ہونے لگا...

وہ لوگوں کی ہمدرد کب سے ہو گئی تھی۔

غریب لوگوں کے لیے اس کے دل میں ترحم کب جاگی؟

آج ڈرائیونگ سکول انٹرویو کے لیے جانا تھا۔

دو انٹرویو ہو چکے تھے اور دونوں کا حاصل کچھ بھی نہ تھا۔ دفتروالا باس اسے پسند نہیں آیا تھا اور موٹی استانی کی بے جسی کے زیرِ سایہ کام کرنے کو اس کا دل نہ چاہا تھا تو اس نے سوچا۔

ذرا یہ ڈرائیونگ اسکول والی نوکری ٹرائی کرتے ہیں۔ مختلف بھی ہوگی اور اس میں ہیجان بھی بہت ہوگا... کچھ ایڈونچر رہے گا... گلیمر رہے گا... زندگی کے کچھ دن گزر جائیں گے۔

خوب اچھی طرح تیار ہوئی۔ کام کی مناسبت سے اس نے براؤن چیک ٹراوزرز پہنیں اور اوپر نارنجی رنگ کا ہائی نیک کا سوئیٹر پہنا۔ سر کے اوپر کالا اسکارف باندھا.... کالے دستانے پہنے.... اور پھر اپنے سیاہ ہائی شوز بھی پہن لیے اور چابی گھماتی ہوئی باہر نکل آئی۔ آج فلکی پہلے والی لاابالی سی فلکی لگ رہی تھی۔

جی بھی کچھ ہلکا سا تھا۔

ڈرائیونگ سکول کا پتہ ڈھونڈتی ڈھونڈتی وہ "راست روڈ" پہنچ ہی گئی مگر سکول کا بورڈ بہت آگے کا اشارہ کر رہا تھا۔ اس واسطے کچے راستے پر گاڑی کو اتار کر اسے کچھ دور آگے جانا پڑا جہاں ڈرائیونگ اسکول کا بورڈ لگا ہوا تھا۔

ایک چھوٹی سی چاردیواری بنی ہوئی تھی جس کے سرے پر ایک کوارٹر نما کوٹھڑی بھی تھی جس کے باہر چق لگی ہوئی تھی۔ دو تین کھٹارا سی موٹریں کھڑی تھیں۔ پرانے ٹائر اور ٹیوب بکھرے ہوئے تھے اور تین چار غلیظ سے لڑکے ایک جگہ بیٹھے جیک سے موٹر کا پہیہ بدل رہے تھے۔

فلکی نے آگے جا کر زور سے ہارن بجایا۔

اور پھر دروازہ کھول کر باہر آگئی۔

چاروں غلیظ لڑکوں نے حیرت اور دلچسپی سے فلکی کو دیکھا۔

"جہانگیر صاحب ہیں؟"

فلکی نے قریب جا کر بڑے رعب دار لہجے میں پوچھا۔

مگر لڑکے جواب دینے کے بجائے ہکا بکا اسے دیکھتے رہ گئے۔ کوئی اس کی پتلون کو دیکھ رہا تھا.... کوئی اسکارف کو اور کوئی جوتے کو۔

"میں نے پوچھا ہے' کیا جہانگیر صاحب یہاں رہتے ہیں؟" فلکی نے دوبارہ چلّا کر کہا۔

"جی ہاں۔" ان میں سے ایک جلدی سے بولا "یہیں رہتے ہیں۔"

اور پھر سب کام کرنے لگے۔

"کہاں ہیں اس وقت...؟" "اندر تشریف رکھتے ہیں۔" ایک لڑکے نے سر اٹھا کر اس ٹوٹی پھوٹی چق والے کمرے کی طرف اشارہ کر دیا۔

"استاد جی...."

"استاد جی...."

دوسرا لڑکا اپنی بینڈے جیسی آواز میں چلانے لگا۔

پیشتر اس کے کہ چق اٹھا کر فلکی اندر جاتی۔ اندر سے ایک آدمی برآمد ہوا۔ اس نے میلی کچیلی گریس کے داغ دھبوں والی پتلون پہنی ہوئی تھی۔ گلے میں اسکارف باندھا ہوا تھا... کلے میں پان دبا رکھا تھا... مٹکتا مٹکتا قریب آیا۔

"میرا نام جہانگیر ہے۔" اس نے کمر پر دونوں ہاتھ جما کر کہا "کہئے کیا آپ ڈرائیونگ سیکھنے آئی ہیں؟ آپ کو ایک فارم بھر کر دینا ہوگا۔"

"جی نہیں۔" فلکی بڑے وقار سے بولی "مجھے آپ نے انٹرویو کے لیے بلایا تھا۔ دیکھیے' یہ رہا آپ کا خط۔"

فلکی نے پرس میں سے خط نکال کر دکھایا۔

"اچھا... اچھا... اچھا اچھا..."

وہ آدمی بوکھلا گیا اور پھر فلکی کے چہرے کو حیرت سے دیکھتا ہوا بولا۔

"آپ مس وہ... میرا مطلب کہ فلک ناز ہیں۔"

"جی مسز فلک نا!"

فلکی نے چلّا کر کہا۔ اس بار جانے کیوں اس کے منہ سے فلک ناز آفاق نہ نکل سکا۔

وہ اپنا بھیجا ہوا خط فلکی کے ہاتھ سے لے کر دوبارہ پڑھنے لگا۔ فلکی نے غور کیا۔ بڑا غلیظ آدمی

تھا۔ کپڑے تو داغ دار ہو ہی جاتے ہیں۔ مگر ہاتھ میلے چیکٹ تھے۔ ناخنوں میں میل پھنسا ہوا تھا۔ پان کی پیک ہونٹوں سے سے باہر نکلی ہوئی تھی۔ ایک ہاتھ سے مسلسل سگریٹ پی رہا تھا اس لیے سیدھے ہاتھ کی تین انگلیاں دھوئیں سے سیاہ ہو چکی تھیں۔

"کیا یہ آپ کا ڈرائیونگ اسکول ہے؟"

فلکی نے خود ہی سوال کر دیا۔

"جی ہاں۔"

"کتنی کاریں ہیں' آپ کے پاس؟"

"جی کاریں تو بس دو ہی ہیں... بعض کسٹمر اپنی کاریں لے آتے ہیں۔"

"آپ کے پاس اور کتنی لیڈی ڈرائیورز ہیں؟"

"جی' آپ پہلی خاتون آئی ہیں۔"

"کیا شرائط ہیں آپ کی؟"

"جی' شرائط ہماری کیا ہوں گی' شرائط... تو... آپ کی ہوں گی؟"

"ہوں...."

فلکی کچھ سوچنے لگی۔ پھر بولی۔

"کیا آپ تنخواہ طے کرنا چاہتے ہیں؟"

"جی نہیں... معاوضہ تو گھنٹوں کے حساب سے طے ہوگا۔"

"کیا حساب ہوگا؟"

"جو فیس کسٹمر ادا کرے گا۔ اس میں سے پچیس فیصد آپ کو ملے گا۔"

"یعنی...؟"

"مطلب کہ... اگر آپ اپنی گاڑی میں سکھائیں گی تو دو سو روپے فی کسٹمر اور اگر کمپنی کی گاڑی میں سکھائیں گی تو ایک سو روپے فی کسٹمر... ایکسی ڈنٹ کی ذمے داری ہم پر نہیں ہوگی۔"

فلکی نے بے اختیار ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ ایک عرصے بعد وہ اس طرح ہنسی تھی۔ سارے کام کرنے والے لڑکے چونک گئے اور اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"کتنا عرصہ ہوا آپ کو یہ سکول کھولے ہوئے؟"

"جی' ابھی تو صرف چھ ماہ ہوئے ہیں۔" وہ بولا۔

"اور اشتہار بازی پر آپ کیا خرچ کر چکے ہیں؟"

"یہی کوئی دو ہزار روپے...."

"اگر یہی دو ہزار روپے خرچ کر کے آپ تعلیم حاصل کر لیتے تو آپ کو زیادہ فائدہ ہوتا۔"

اتنا کہہ کر فلکی نے وہ خط وہیں پھینکا اور خود موٹر میں بیٹھ گئی۔

"اے میرے دل کہیں اور چل..."

اس نے گنگناتے ہوئے موٹر سٹارٹ کر دی۔

سب لوگ ہکا بکا اسے دیکھتے رہ گئے۔ مگر وہ جلدی سے پکی سڑک پر آ گئی۔

تو یہ گلبر بھی ہاتھ سے گیا...

تینوں نوکریوں سے اس کا ستارہ نہ ملا۔

وہ دفتر والی نوکری اچھی تھی مگر بس کچھ دل کو جچا نہیں.....

اب کیا کیا جائے...؟"

اب نئے سرے سے اخبار دیکھے جائیں۔ پھر کوئی نوکری تلاش کی جائے پھر کسی منزل کا سراغ لگایا جائے۔

اس نے دھیمے سُروں میں ریڈیو لگا دیا۔ سڑک کافی مصروف تھی اور فلکی بڑی احتیاط سے موٹر چلا رہی تھی۔

تب ہی زن سے ایک گاڑی قریب سے گزر گئی...

گاڑی قریب سے کیا گزری۔ فلکی کی دنیا میں بھونچال آ گیا۔ وہ یقیناً آفاق تھا... آفاق ہی تھا... اسی کی گاڑی... اسی کا نمبر... اسی بے نیازی کے ساتھ گاڑی چلا رہا تھا... بے شمار موٹروں میں اس کی موٹر نمایاں لگ رہی تھی اس کے بیٹھنے کا انداز بیدا دلکش تھا۔

اور اس کا یہ انداز دیکھنے کے لیے وہ کمرے سے نکل کر دور تک اسے جاتا ہوا دیکھا کرتی... وہ گاڑی اس طرح نہیں چلاتا تھا جیسے گاڑی کے اشاروں کا منتظر ہو... بلکہ گاڑی کو اپنے اشاروں پر چلاتا تھا۔ بالکل اس طرح جیسے وہ بیوی کو اپنے اشاروں پر نچانے کا عادی تھا... اس کی اس ادا میں مردانہ پن تھا...

وہی بے نیازی... وہی اکڑی ہوئی گردن... فلکی کے دل میں درد سا اٹھا۔ اس نے بھی پیچھے سے فلکی کو جاتا ہوا ضرور دیکھا ہوگا مگر کیسا انجان بن کے پاس سے گزر گیا... جیسے کوئی شناسائی ہی نہ تھی۔

کتنے دنوں بعد آج اسے آفاق نظر آیا تھا... فلکی انگلیوں پر شمار کرنے لگی۔ تقریباً ایک

مہینہ ہوگیا تھا.... اور اسے تو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے آفاق سے جدا ہوئے ... اس کو دیکھے ہوئے صدیاں بیت گئیں.... ایک مہینے میں ہی اتنے فاصلے بڑھ جاتے ہیں۔

آفاق کی موٹر اگلی موڑوں کی قطار میں کہیں گم ہوگئی تھی۔ جانے وہ کسی طرف مڑ گیا تھا یا کسی موڑ کی آڑ میں ہو گیا تھا... جب تک وہ نظر آتا رہا.... فلکی اس کی طرف دیکھتی رہی۔ فلکی کو معلوم تھا۔ آفاق مڑ کر دیکھنے کا عادی نہیں۔

وہ کبھی مڑ کر نہیں دیکھے گا.....

اگر ایسا ہوتا تو وہ اس ایک مہینے میں اس کی خبر ضرور لیتا۔

مگر کیوں لیتا خبر....؟

جب اس نے کہہ دیا تم چلی جاؤ!

فلکی نے آہستہ آہستہ موٹر اپنے گھر کی طرف موڑ دی۔

عجیب معاملہ ہے...

اس طرف خاموشی ہے۔

اور اس طرف پُرشور طوفان۔

یہ کیسی محبت ہے بارالٰہا۔

کیا محبت بھی یک طرفہ ہوتی ہے۔

اپنی تمام ترکج ادائی کے باوجود آفاق اسے برا نہیں لگا تھا۔ اچھا لگا تھا۔ پیارا لگا تھا... وہ غصہ، گلہ، غم... شاید عارضی تھے یا اصول کی جنگ تھی۔

اصول کی جنگ اور شے ہے۔

محبت کی حقیقت کچھ اور ہے۔

اور اسے تسلیم ہی کرنا پڑتا ہے۔

کیونکہ محبت صلے، قیمت، طلب سب سے بے نیاز ہوتی ہے۔

اب محبت کے صحیح معنی فلکی کی سمجھ میں آئے تھے۔

اپنی جگہ پر محبت کرنا کوئی برا نہیں۔

مگر محبت کر کے احسان جتانا برا ہے۔

فلکی گھر کے نزدیک پہنچ گئی۔

یہ ضرور ہے کہ اسے میری پرواہ نہیں... تو میں کون سا مری جارہی ہوں۔ اس کے بغیر بھی

جی لوں گی۔

اور پھر ایسے مرد کے پاس رہنے کا کیا فائدہ.... جو رموزِ محبت سے آشنا ہی نہ ہو۔

وہ جونہی گھر میں داخل ہوئی۔ ممی سامنے کھڑی نظر آگئیں۔

"کہاں سے آرہی ہو جان..؟"

"بس ایسے ہی ممی، ذرا آوارگی کرنے گئی تھی۔"

"اتنی سردی میں، صبح صبح...؟"

"تو کیا اتنی سردی میں صبح صبح آوارگی کرنے کو دل نہیں چاہتا۔" فلکی نے ہنس کر ممی کی گردن میں بانہیں ڈال دیں۔

"اب میری فلکو کچھ تیز نظر آتی ہے۔" ممی نے فلکی کا رخسار چوم لیا۔

"ہاں ممی، اب تو میں بالکل ٹھیک ہوں۔" فلکی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ (کیونکہ اب میں بے حس ہوگئی ہوں)

"تم ٹینس کیوں نہیں کھیلتی ہو فلکی... ہمارے کلب میں ایک نیا مارکر آیا ہے اور ساری لڑکیاں جوائن کر رہی ہیں۔"

"سوچوں گی۔" فلکی جانے لگی۔

"شام کو چار بجے مارکر کلب میں آجاتا ہے۔ میرا خیال ہے آج تم چلی چلنا۔ آج شام تمہیں کہیں جانا تو نہیں؟"

"نہیں ممی... ویسے میں گھر پر پڑے پڑے بور ہوگئی ہوں۔ کیا کروں ممی؟"

"بس شام کو گیمز شروع کردو۔ میں ابھی تمہارے ڈیڈی کے دفتر جارہی ہوں۔ چلو گی؟"

"کیوں، کوئی خاص بات ہے؟"

"نہیں، مجھے تو ان سے ایک چیک لینا تھا۔ ابھی انھوں نے فون کیا ہے کہ خود آکر لے جاؤ۔"

"اچھا جائیں ممی، میں ذرا بستر میں دبک کر چلتوزے کھاؤں گی۔"

"ارے ہاں، وہاں وہ آفاق بھی تو بیٹھا ہوا تھا۔"

فلکی کا دل دھڑک اٹھا۔ چلتے قدم رک گئے۔

"میری ابھی فون پر اس سے بات ہوئی ہے۔ تمہیں بہت بہت پوچھ رہا تھا۔" فلکی کو غصہ آگیا۔ نہ جانے اب ان چکروں کا کیا مطلب ہے.....؟"

"واقعی' میں نے تو غور ہی نہیں کیا فلکی... آفاق کئی دنوں سے نہیں آیا۔"

"کیا وجہ ہے جان...؟"

ممی نے بغیر کسی تردّد کے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

فلکی ہنس پڑی۔

ممی آپ خواہ مخواہ ماں بننے کی کوشش نہ کریں۔ آپ کی عدم موجودگی میں ایک دو دفعہ آیا تھا' مجھے لینے مگر میں نے جانے سے انکار کر دیا۔"

"کیوں...؟" ممی نے پوچھا۔

"بس میں نے کہہ دیا۔ پورا ایک سال تمہارے پاس رہی ہوں۔ اب دو چار ماہ اپنی ماں کے پاس نہیں رہ سکتی کیا...؟"

"او ڈارلنگ! تم نے ایسا کیوں کیا؟" ممی نے مصنوعی پن سے کہا۔

"واہ ممی... میں پورا سال نہیں آئی تو اس کی عادت ہی بگڑ گئی تھی۔ میں بیوی ہوں۔ ملازمہ تو نہیں۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔" ممی خوش ہو کر بولیں۔

"اب اچھی طرح مزہ چکھا کے جاؤں گی۔ کیوں ممی! آپ مجھے زبردستی تو نہ بھیج دیں گی؟"

"او نہیں ڈارلنگ!" ممی لک کر بولیں "یہ بھی تمہارا گھر ہے۔"

"بلکہ میرا تو جی چاہتا ہے۔ آفاق بھی اسی گھر میں آجائے۔ ویسے تم بہت اچھا کر رہی ہو۔ شادی کے فوراً بعد خاوند کی نازبرداری شروع کر دو تو وہ بہت سر چڑھ جاتا ہے... ذرا پَرے پَرے رکھنا چاہیے۔ پھر دُم ہلاتا پیچھے پیچھے آئے گا..."

(ہاں... فلکی ہنس پڑی۔ آفاق ان آدمیوں میں سے نہیں۔)

"ممی' میں تو گھر کے کام کر کے ہی تھک گئی تھی۔ اب تو آپ کے گھر آکر مکمل آرام کروں گی۔"

"اوہ ڈارلنگ' تم جو بھی کرو' میں نے پہلے بھی کبھی دخل نہیں دیا۔"

"تو آپ جائیں دفتر' مجھے دیکھ کر وہ خواہ مخواہ نصیحتیں کرنے لگے گا....

فلکی نے منہ بنا کر کہا۔

"اور اگر میرا پوچھیں تو کہہ دینا میں بہت مزے میں ہوں۔"

فلکی اپنے کمرے میں آگئی۔

تو فلکی بیگم تم بہت مزے میں ہوں۔

یہ ہوتے ہیں مزے....

اس نے پرس دور پھینک دیا اور رضائی اٹھا کے اس میں گھس گئی۔

ممی کو تو ان ہتھکنڈوں سے خوش کیا جا سکتا ہے... مگر تابہ کے... ایک نہ ایک دن بات کھل رہے گی۔

اس سے پہلے کوئی بندوبست ہو جانا چاہیے....

ایک زمانہ تھا جب وہ آفاق سے جان چھڑانا چاہتی تھی اور آج جب اس کی جان چھوٹ گئی ہ' وہ اس بات کو زمانے بھر سے چھپانا چاہتی تھی۔

بہت سے اخبارات اپنے سامنے پھیلائے' فلکی بکھری بکھری بیٹھی تھی۔ بہت سی نوکریاں وہ ہیں ڈیڈی کی وجہ سے نہیں کر سکتی تھی اور بہت سے کام آفاق کی وجہ سے نہیں کر سکتی تھی۔ ی اور آفاق کا اس شہر میں بڑا رسوخ تھا۔ کسی نہ کسی موڑ پر آفاق کے آ ٹکرانے کا اندیشہ ۔ جب تک وہ یہاں اس شہر میں رہے گی' آفاق کا بھوت اسے ڈراتا رہے گا۔ آفاق نے ے اس طرح چھوڑ کر گویا اسے ننگی تلوار کے نیچے چھوڑ دیا تھا...

کسی بھی وقت یہ تلوار گر سکتی تھی۔ اس کا گلا کٹ سکتا تھا...

بہتر ہے وہ یہ شہر چھوڑ کر چلی جائے....

شہر اسے کون چھوڑنے دے گا.... شہر چھوڑنے سے بہتر ہے کہ وہ ملک ہی چھوڑ دے...

...ہاں... ہاں... فلکی کو یہ تجویز بہت اچھی لگی۔

لیکن کس ملک میں جائے...!

ممی کے ساتھ وہ امریکہ' برطانیہ' انڈونیشیا' ہانگ کانگ' سنگاپور' سری لنکا اور مصر گھوم چکی ی۔ ان ملکوں میں جانا بھی بہت مشکل تھا... پہلے وہاں جا کر رہنے کا بندوبست کرنا ضروری تھا ہ ملازمت کا ہو یا تعلیم کا۔

ممی اور ڈیڈی سے کیا کہا جائے گا...؟

وہ تین سال پہلے ممی کے ساتھ سنگاپور گئی تھی۔ تب سے اس کا پاسپورٹ بند پڑا تھا۔

جس ملک میں بھی جانا ہو گا۔

اس کا ویزا لگوا کر دینا پڑے گا... ویزا کون لگوا کر دے گا؟ مگر ان سب باتوں سے پہلے تو اسے فیصلہ کرنا ہو گا کہ وہ کس ملک میں جائے...؟ یوں تو ہر ملک میں ممی کی سہیلیاں تھیں اور وہ

اکثر پاکستان آکر ممی کے پاس ہی رہا کرتی تھیں مگر وہ ان کے پتے نہ جانتی تھی۔ اب اگر ان کے پتے ممی سے پوچھتی تو ممی نے کرید شروع کر دینی تھی۔

ممی کی ایک بہت پیاری سہیلی آنٹی فینیہ ٹرانٹو میں رہتی تھیں۔ اسے آنٹی فینیہ کا پتہ بھی معلوم تھا اور فون نمبر بھی... کیونکہ ایک بار اس نے ممی کو وہاں خط لکھا تھا اور فون بھی کیا تھا لیکن آنٹی فینیہ سے Contact کرنا مشکل لگ رہا تھا۔ اگر انھوں نے پلٹ کر ممی کو اس کے ارادوں سے آگاہ کر دیا تو کیا ہوگا..؟ بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔

پھر یکایک اسے یاد آیا کہ اس کی ایک بچپن کی دوست لندن میں رہتی ہے۔ اس کی شادی ہو گئی تھی اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ انگلینڈ چلی گئی تھی۔ اس کا پتہ لگا لینا بھی آسان تھا کیونکہ والدین لاہور میں رہتے تھے۔ ٹھیک ہے۔ فلکی نے سوچا' کل وہ فائزہ کے والدین سے مل کر اس کا پتہ لے لے گی۔ پھر اسے فون کر کے کوئی پروگرام بنائے گی۔ ممی کو منا لینا کچھ مشکل نہ تھا مگر مرحلہ ڈیڈی کو قائل کرنے کا تھا۔

لیکن اس سے پہلے باہر جانے کا بندوبست ضروری تھا۔

دوسرے روز فائزہ کی امی کے گھر گئی۔ انھوں نے فلکی کی بہت آؤ بھگت کی۔ نہ صرف اس کا پتہ دیا بلکہ فون نمبر بھی دیا۔

اب فلکی اسی دُھن میں رہنے لگی کہ پتہ چلے کس وقت ممی اور ڈیڈی گھر پر نہیں ہوتے تاکہ وہ وہی وقت مقرر کر کے لندن بات کرنے کے لیے۔

ایک ہفتے کی اوہیڑ بن کے بعد آخر اسے موقع مل گیا۔ اس روز ڈیڈی دو روز کے لیے اسلام آباد دورے پر چلے گئے تھے۔

اور فلکی نے بیرونِ ملک کال بک کرا کے ایکسچینج والوں کو بتا دیا کہ وہ پاکستان کے وقت کے مطابق صبح پانچ بجے ملا دیں۔

کیونکہ ممی عام طور پر آٹھ نو بجے سو کر اٹھا کرتی تھیں۔ اس دن وہ فون بھی اٹھا کر اپنے کمرے میں لے گئی۔

اور اس نے فائزہ سے پندرہ منٹ باتیں کیں۔

پہلے تو فائزہ اس کی آواز سن کر ہی حیران ہو گئی۔

پھر فلکی نے بتایا...

کہ میں لندن آنا چاہتی ہوں۔

"ہاں!" وہ بولی "میں نے سنا تھا تیری کسی بڑے امیر آدمی سے شادی ہو گئی ہے اور تو ضرور لندن شاپنگ کرنے کے لیے آنا چاہتی ہو گی۔"

"نہیں۔" فلکی نے جواب دیا۔ "میں میر کرنے کے لیے آنا چاہتی ہوں۔"

"بے وقوف! آج کل یہاں اس قدر برف باری ہو رہی ہے۔ اتنی سردی میں کیا کرے گی آکر...؟"

"ممکن ہے میں یہ برف باری ہی دیکھنے کے لیے آنا چاہتی ہوں۔ تو مجھے اتنا بتا اگر میں آئی تو کیا مجھے چند روز اپنے گھر میں رکھ لے گی؟"

"کم بخت یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ تو ایسے نازوں کی پالی ہے اور تجھے معلوم ہے۔ لندن میں ڈربے نما گھر ہوتے اور ہمارے ساتھ جب تک تیرا گزارا ہو رہ لینا۔"

"ٹھیک ہے۔" فلکی بولی "مجھے تجھ سے اور بہت سی ضروری باتیں بھی کرنا ہیں جو میں آکر ہی بتاؤں گی۔ مجھے یہ بتا دو۔ اگر مجھے ٹرانٹو جانا ہو تو کیا میں کینیڈا کا ویزا پاکستان سے ہی لے کر آؤں۔"

"ہاں"..... وہ بولی "جن جن ملکوں میں تم جانا چاہتی ہو' ویزا وہیں سے لگوا کر آنا... تو زیادہ آسانی رہے گی۔"

"کیا لندن میں مجھے کوئی جاب مل جائے گا؟"

"کیا کیا..؟" فائزہ چیخ اٹھی "تو مذاق کر رہی ہے۔"

"ہاں' مذاق کر رہی ہوں۔" فلکی بھی ہنس پڑی میرا دل چاہ رہا ہے۔ میں کچھ عرصہ بیرونی ملکوں میں گزاروں۔ یہ میں تم سے آکر پوچھوں گی کہ بہترین طریقہ کیا ہے۔ وہاں رہنے کا..."

"تو کب آ رہی ہے...؟"

فائزہ نے پوچھا۔

"جلدی آؤں گی مگر آنے سے پہلے تمھیں اطلاع کر دوں گی۔"

"اچھا میں تمہارا انتظار کروں گی۔"

"پاکستان سے کچھ منگانا ہو تو مجھے بتاؤ۔"

"بہت کچھ منگانا ہے بھئی.. مگر فون پر نہیں بتا سکتی۔ تم نے تو سوچنے کی مہلت ہی نہیں دی۔"

"اچھا سوچ کر مجھے خط لکھ دینا۔"

"اوکے... بائے۔"

"بائے۔"

فون بند ہو گیا۔

فلکی کو تسلی ہو گئی۔ فائزہ بدلی نہیں تھی۔ اسی طرح مخلص تھی۔ اس کے گھر کچھ دن رہا جا سکتا تھا۔

اگر لندن میں کام نہ بنا تو وہ وہاں سے ٹرانٹو چلی جائے گی اور وہاں پر کوئی جاب کر لے گی۔ لندن جانے کے بعد آنٹی نفیسہ کو فون کرنا بھی آسان ہو جائے گا۔

سنا ہے کینیڈا میں بہت سے پاکستانی ہیں تو وہ وہاں جا کر کوئی نہ کوئی بندوبست ضرور کر لے گی اور پھر ممی کو بھی وہیں جا کر لکھ دے گی کہ میں آگے کینیڈا جا رہی ہوں۔ یہاں سے تو کسی نہ کسی طرح ممی سے کراچی جانے کی اجازت لے لے گی۔ وہاں سے آگے لندن چلی جائے گی۔ فائزہ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔

کینیڈا کا ویزا پاکستان سے ہی لگوانا تھا۔

اب وہ سوچنے لگی کہ کسی طرح اسلام آباد جانے کا چکر چلائے اور خود جا کر ویزا لگوا آئے۔ اس نے سن رکھا تھا کہ کینیڈا کا ویزا بہت مشکل سے ملتا ہے۔ مگر فی الحال تو وہ تین مہینے کا تفریحی ویزا لے کر جانا چاہتی تھی۔

پہلے اس نے اسلام آباد جانے کا پروگرام بنایا۔ وہاں فرنچ ایمبیسی میں اس کی ایک کرسچن دوست ڈورتھی کام کرتی تھی۔ اس نے ڈورتھی کو فون کیا اور اپنا مدعا بیان کیا۔ ڈورتھی بولی "تم اپنا پاسپورٹ لے کر آ جاؤ۔ میں تمہارا کام کرا دوں گی۔"

فلکی کو ڈیڈی کا انتظار تھا کیونکہ ان دنوں وہ بھی اسلام آباد گئے ہوئے تھے... ڈیڈی جب واپس آئے... تو فلکی ان کے گلے میں جھول گئی۔

"ڈیڈی۔ ڈیڈی' میں مری جانا چاہتی ہوں۔"

"اتنی سخت سردی میں..؟" ڈیڈی نے پائپ منہ سے نکال کر کہا۔

"سردی میں کیا ہوتا ہے ڈیڈی۔ میری کچھ سہیلیاں سنو فال دیکھنے جانا چاہتی ہیں۔"

"لیکن سنا ہے اس بار تو مری میں برف باری ہی نہیں ہو رہی۔"

"ڈیڈی' آپ سنی سنائی باتوں پر یقین نہ کیا کریں۔"

"بھئی' میں ابھی اسلام آباد سے ہو کر آ رہا ہوں۔"

"تو کیا ہے... ہم ویسے ہی سیر کر کے آ جائیں گے۔"

"برف باری کے بغیر مری جانا کچھ معنی نہیں رکھتا۔"

"میں اسلام آباد جا کے پتہ کروں گی۔ اگر موسم اچھا ہو گا تو آگے چلے جائیں گے۔"

"ایسی ہی بات تھی تو تم میرے ساتھ چلی جاتیں۔"

"لیکن اب تو ایسا نہیں ہو سکتا نا' ڈیڈی۔"

"ٹھیک ہے اگر تم جانا چاہتی ہو تو آفاق کو فون کر دو۔"

"آفاق...."

فلکی کو یوں لگا جیسے اسے بچھو نے ڈس لیا ہے۔

"آفاق سے کہہ دو' وہ تمہارے جانے کا بندوبست کر دے۔"

"کیوں؟ کیا میں لولی لنگڑی ہوں جو خود نہیں جا سکتی۔"

"بیٹی' وہ تمہارا شوہر ہے۔ اجازت تو اس سے لینی چاہیے۔"

"ڈیڈی.." فلکی مچل گئی۔ "آپ بالکل پرانے زمانے والی باتیں کر رہے ہیں۔ میں رو پڑوں گی۔"

فلکی سچ مچ رونے لگی...

"بھئی' روتی کیوں ہو جا کر اپنی ممی سے مشورہ کر لو جس طرح کہیں گی اسی طرح کر لینا۔"

"میرا تو خیال ہے کہ آفاق کا بھی غالباً پنڈی جانے کا ارادہ ہے... کل ہی میرے آفس آیا تھا... ممکن ہے' وہی تمہیں لے جائے۔"

"ڈیڈی۔ میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ جانا چاہتی ہوں۔ آفاق ہمارے ساتھ خواہ مخواہ بور ہوں گے اور پھر وہ میرا سفر میں کار چلانا پسند نہیں کرتے۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ اپنی ممی سے بات کر لو۔"

شام کو فلکی' ممی کے سر ہو گئی۔

"ممی' ڈیڈی نے تو اجازت دے دی ہے۔ اب آپ بھی اجازت دے دیں۔"

"ڈارلنگ' میں نے تمہیں کب روکا ہے؟" ممی نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔ "آفٹر آل لائف انجوائے کرنے کے لیے ہے.... گھومو پھرو... دنیا دیکھو۔"

"مگر..." فلکی مچل گئی۔

"ڈیڈی کہتے ہیں' آفاق کے ساتھ جاؤ۔"

"پاگل ہیں تمہارے ڈیڈی' اگر سفر میں شوہر ساتھ ہو تو عورت کبھی انجوائے نہیں کر سکتی۔ پھر..." ممی نے ذرا سوچ کر کہا "میرے خیال میں تو آفاق ویسے بھی بڑا تنگ نظر ہے۔"

فلکی کا دل دھڑک اٹھا۔

"جان' میں خود بھی کوشش کیا کرتی ہوں کہ سفر میں تمہارے ڈیڈی ساتھ نہ ہوں۔ ایک تو یہ سفر میں نروس بہت زیادہ کرتے ہیں۔ اگر شام کو چار بجے ایئرپورٹ جانا ہو گا تو یہ صبح آٹھ بجے سے شور مچانا شروع کر دیں گے۔ ارے بھئی تیار ہو گئی ہو نکلو بھی.... نکلو بھی...

"سفر کے دوران انھیں گفتگو بھی پسند نہیں۔ بات بات میں بور کرتے ہیں۔ میری تو نصیحت ہے کہ جب بھی سفر کرنا ہو' اپنے شوہر کے بغیر کرو تاکہ اپنی آنکھوں سے دنیا دیکھ سکو۔ یہ شوہر لوگ باہر جا کر بھی یہی چاہتے ہیں کہ عورت ان کی آنکھوں سے دنیا دیکھے۔"

"ممی زندہ باد۔" فلکی نے تالی بجائی۔

"میری پیاری ممی زندہ باد۔"

"ممی تو پھر میں تیاری کروں؟"

"ضرور کرو۔"

"کیسے جانا چاہتی ہو..؟"

"یہاں سے تو میں اپنی کار پر جانا چاہتی ہوں۔ ڈرائیور کو ساتھ لے جاؤں گی۔ پھر آگے مری جانے میں آسانی ہو جائے گی۔"

"اسلام آباد کہاں ٹھہرو گی جان.....؟"

"ممی کسی ہوٹل میں ٹھہر جاؤں گی۔ ویسے ڈور تھی کے پاس فلیٹ تو ہے مگر اس کے گھر میں بہت لوگ ہیں۔ میں اس کے ہاں نہیں رہنا چاہتی۔"

"ڈیئر' وہاں تمہاری آنٹی عاصہ جو ہیں۔"

"آنٹی عاصہ اسلام آباد میں ہیں ممی؟" فلکی نے حیرت سے کہا۔

"ہاں ہاں پچھلے مہینے محمود کی ٹرانسفر اسلام آباد ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے فون بھی کیا تھا۔"

"اپنی خالہ کا گھر ہو تو کہیں اور نہیں ٹھہرنا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں آنٹی عاصہ کے گھر ٹھہر جاؤں گی۔ آپ انھیں فون کر دیں۔"

"اور آج کل تو راحیلہ بھی سسرال سے آئی ہوئی ہے۔"

"پھر تو خوب مزہ رہے گا' ممی۔"

"جی تو میرا بھی چاہتا ہے کہ میں عاصہ کے ہاں جاؤں۔ بے چاری کئی بار کہہ چکی ہے۔ سوچتی ہو گی۔ خالہ زاد بہن ہے نا! اس لیے نہیں آتی۔ اگر سگی بہن ہوتی تو ضرور آتی۔"

فلکی خاموش ہو گئی۔

اگر سچ مچ ممی اٹھ کر ساتھ چل دیں تو...

سارا معاملہ گڑبڑ ہو جائے گا۔

"ممی آپ پھر کبھی چلی جائیں..." فلکی نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں' یہاں کلب میں کچھ فنکشنز بھی ہیں۔ جنھیں میں نہیں چھوڑ سکتی۔"

"اور ممی میں تو... وہاں دس بارہ دن رہنا چاہتی ہوں۔ سہیلیوں کے ساتھ آگے مری سنوفال دیکھنے جاؤں گی۔"

"ڈارلنگ' مری کی سنوفال دیکھنے کا کچھ لطف نہیں آتا فضول ہے۔"

"ممی پلیز.... اب آپ بھی ڈیڈی کے لہجے میں باتیں کرنے لگی ہیں۔"

"او' نہیں جان! تم جاؤ شوق سے جاؤ مگر ایسا کرنا سفر میں میری گاڑی لے جانا۔ پہلے اس کی سروس کرا لو۔"

"ٹھیک ہے ممی۔"

"تم کب جانا چاہتی ہو؟"

"پرسوں چلی جاؤں؟"

"ہاں' گاڑی چیک کرا لو۔ سفر کے لیے ٹھیک ہے تو چلی جاؤ۔"

"پھر آپ آنٹی عاصہ کو فون کر دیں گی؟"

شام کو کروں گی۔"

"ممی..." فلکی نے ممی کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا۔

"کیا ہے جان؟"

"ممی..." وہ رکی۔ "آفاق کو پتہ نہ چلے کہ.... میں اسلام آباد۔"

"بے وقوف..."

ممی نے اس کا منہ چوم لیا۔

"میں کیوں بتاؤں گی؟ اور پھر تم خود مختار ہو۔ جہاں جی چاہے جاؤ۔ اگر ذرا ذرا سی بات میں اس سے اجازت لینے لگیں تو وہ تمہاری زندگی اجیرن کر دے گا کہے گا' سانس بھی میری مرضی

کے مطابق لو۔"

"ممی' ڈیڈی کو بھی سمجھا دیں۔"

"تم فکر نہ کرو۔ تمہارے ڈیڈی کی کیا مجال کہ میری مرضی کے بغیر بول بھی سکیں۔"

فلکی کو دل میں ہنسی آئی۔ کیا تضاد تھا۔

مگر فلکی کے دل میں ایک نیا احساس بھی اجاگر ہوا۔ ممی غالباً" آفاق سے حسد محسوس کرنا لگی تھیں۔ آفاق نے ان کی فلکی چھین جو لی تھی اسی لیے آفاق کا نام جل کر لیتی تھیں اور فلکی کو آفاق سے دور رکھنے کی کوشش کرتی تھیں۔

آپ کو کیا معلوم ممی.... فلکی نے آنسوؤں میں ڈوب کر سوچا۔

آپ کی فلکی سب سے دور ہو جائے گی....

سب سے دور ہو جائے گی...

نفرتوں اور محبتوں سے کوسوں دور...

دو چار روز کی مسلسل کوششوں سے فلکی کو کینیڈا کا ویزا مل گیا تھا۔ فلکی بہت زیادہ خوش تھی اور تو اور ڈور تھی نے اسے پیرس کے لیے ویزا لگوا دیا تھا۔

"میرا پیرس جانے کا بالکل ارادہ نہیں ہے ڈور تھی!" فلکی نے کہا۔

"فلکی! لندن سے جب ٹورانٹو جاؤ گی نا' تو یہ سفر بہت لمبا ہو جائے گا۔ تم راستہ میں جرنی بریک ضرور کرنا اور دو دن پیرس رک کر جانا۔ پیرس تو سیاحوں کی دنیا ہے۔ تم کیوں وہاں نہیں جانا چاہتیں۔ ساری دنیا ایفل ٹاور دیکھنے جاتی ہے۔"

"بھئی میں ٹورانٹو جو جا رہی ہوں۔ سنا ہے کہ دنیا کا سب سے بلند ٹاور سی این ٹاور ہے۔ میں اسے جو دیکھ لوں گی۔"

"پھر بھی اگر تمہیں اللہ تعالیٰ نے موقع دیا ہو۔ ہمت دی ہو تو تمہیں پیرس ضرور دیکھنا چاہیے۔"

"مگر میں تنہا جو سفر کروں گی۔"

"پگلی! آج کے دور میں ایسی باتیں کرتی ہے... اور پھر تو..." ڈور تھی نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا "تُو تو بلا ہے' شعلہ ہی' آگ ہے۔ تجھے کس بات کا ڈر ہے۔ پھر تیرے جیسی حسین بلا کا بندوبست تو ہر جگہ خود بخود ہو جائے گا۔ بس ایک ذرا فون کرنے کی دیر ہے۔"

تجھے کیا معلوم ڈور تھی۔ یہ آگ بجھ چکی ہے۔ شعلہ سرد ہو چکا ہے اور حسین بلا معصوم فاختہ کا روپ دھار چکی ہے' جسے ہمہ وقت اپنے اردگرد شکاری کتے نظر آتے ہیں اور اپنے آپ کو ہر زمین پر غیر محفوظ محسوس کرتی ہے۔

فلکی زیرِ لب مسکرائی۔

"اچھا اگر تو کہتی ہے تو میں پیرس کا ویزا لگوا لیتی ہوں۔"

ڈور تھی نے اسے فرانس کا ویزا لگوا دیا اور بولی "اب بھی وقت ہے جن جن ملکوں کا کہے گی'

میں ویزے لگوا دوں گی۔"

"ایسا کرو' لگے ہاتھوں امریکہ کا ویزا بھی لگوا دو۔"

"کیوں کچھ ارادہ بدل گیا...؟" ڈور تھی نے آنکھ بند کرکے کہا۔

"نہیں ... جاؤں گی تو ٹورانٹو ہی... مگر ہو سکتا ہے' تفریح کے لیے کبھی نیویارک بھی چلی جاؤں۔"

"نیویارک جائے گی نا؟ تو ذرا ہوش سے جانا!"

"کیوں...؟" فلکی نے ماتھے پر بل ڈالے۔

"سنا ہے۔ دنیا بھر کے چور اُچکے اور لفنگے اسی شہر میں رہتے ہیں۔ اچھی صورت پر ان کی نظر نہیں ہوتی۔ اچھے پرس پر ضرور ہوتی ہے۔"

"اچھا... میرے پاس تو کچھ بھی نہ ہوگا۔"

"تیرے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ تیرے چہرے سے لگتا ہے کہ تو کسی ویس کی شہزادی ہے۔"

(کاش میں کسی ول کی شہزادی ہوتی)

"اتنا نہ ڈراؤ مجھے۔ ورنہ میں نیویارک جاؤں گی ہی نہیں۔"

"میں جانتی ہوں تو بزدل نہیں ہے۔ ضرور جائے گی۔ اور وہ کہاں ہے بھئی' تیرا پالتو شوہر۔ آخر وہ کس دن کام آئے گا۔ لے جانہ اسے ساتھ..."

"وہ..." فلکی مسکرائی۔ ایسے جواب اس نے سوچ رکھے تھے۔

"وہ تو پہلے ہی امریکہ گئے ہوئے ہیں۔"

"ہوں۔ تو اب پتہ چلا۔ تو اس کا پیچھا کرتے ہوئے وہاں جا رہی ہے۔

فلکی ہنستی رہی۔ اس نے کچھ جواب نہیں دیا۔

"تو گویا اب بنی مون منایا جا رہا ہے۔ سچ فلکو' میں تیری شادی پر نہیں آسکی تھی۔ مجھے اتنا رنج ہے کہ کیا بتاؤں۔ سنا ہے۔ بہت ہی لطف آیا تھا... مگر انہی دنوں مجھے رعایتی ٹکٹ مل گیا تھا اور میں پیرس چلی گئی تھی۔"

"اچھا اسی لیے پیرس کے قصیدے پڑھ رہی ہے۔"

"ہاں' میں پیرس دیکھ تو چکی ہوں اور تجھے معلوم ہے۔ عنقریب میں پیرس چلی جاؤں گی۔"

"کیوں؟"

"ہائے کیا بتاؤں۔"

"کچھ کہو بھی تو سہی؟"

"ڈیوڈ کو وہاں پاکستان ایمبیسی میں ملازمت مل گئی ہے۔"

"اچھا..." فلکی چلائی۔ "تو ابھی تک تیرا ڈیوڈ سے رومانس چل رہا ہے۔"

"پگلی! محبت بار بار بھی کی جاتی ہے۔ بچپن سے ہم ساتھ ساتھ رہے۔ ایک ساتھ پڑھے۔ یہاں اس کے پاس اچھا جاب نہیں تھا۔ اس لیے میں نے ہی کہہ سن کے اسے وہاں ملازم کروا لیا ہے۔ اب یہ لوگ میری وہاں ٹرانسفر کردیں گے اور میں وہاں چلی جاؤں گی۔"

"شادی وہاں کرے گی یا یہاں۔"

"نہیں۔" وہ ہنس پڑی۔ "شادی کے لیے اسے یہاں بلواؤں گی۔ ایک مہینے کی چھٹی لے کر آئے گا۔"

"ہاں تو کب ہو رہا ہے یہ معرکہ سر؟"

"ہائے..." ڈور تھی نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ "فقط بارہ مہینے اور انتظار کرنا پڑے گا... فقط بارہ مہینے... اوگاڈ۔ کس طرح گزریں گے اتنے روز؟"

"جس طرح اب تک گزرے ہیں۔"

"تجھے کیا معلوم فلکی! محبت کتنی ظالم شے ہے۔ اس میں تو ایک روز بھی کاٹنا مشکل لگتا ہے۔ ہر ابھرتے سورج کے ساتھ یہ محبت بڑھتی ہے۔ پاگل ہوئی جاتی ہے۔ کاش تو اس آگ سے واقف ہوتی... پر تو ان باتوں سے ہی بے نیاز ہے۔ ہمیشہ محبت کو بکواس اور عشق کو کھیل کہتی رہی ہے۔ پتہ نہیں تیرے نظریات ابھی تک بدلے ہیں یا نہیں۔"

تھوڑی دیر چپ رہ کر وہ خود ہی بولی۔

"تو پیدائشی خوش نصیب ہے فلکی! تو صرف چاہے جانے کو پیدا کی گئی ہے۔ تو ہمیشہ ہر ایک کی محبوب رہے گی۔ تیرا شوہر بھی تجھ پر جان فدا کرتا ہوگا۔ تجھے کیا معلوم کسی پر مرنا کیا ہوتا ہے۔ ہمیں دیکھو! مر رہے ہیں۔ مٹ رہے ہیں۔ جدائی کی سختیاں جھیل رہے ہیں۔ تم ذرا یہاں بیٹھو۔ میں ابھی آتی ہوں۔" یہ کہہ کر ڈور تھی ساتھ والے کمرے میں چلی گئی۔ شاید کوئی دفتری کام نمٹانا تھا۔ فلکی صوفے پر بیٹھ گئی اور اس کے ذہن میں ڈور تھی کے الفاظ گونجتے رہ گئے۔ وہ کوئی مناسب جواب نہ دے سکی تھی۔

وہ ڈور تھی سے کیا کہتی؟

کیا کہتی... کہ ڈارلنگ' وہ آزار جسے لوگ عشق کہتے ہیں' مجھے لگ چکا ہے۔ یہ روگ میں

نے اپنی خوشی سے لگایا ہے۔ یہ آگ میں نے خود اپنے من میں سلگائی ہے۔ تو جھوٹ کہتی ہے کہ میں صرف چاہے جانے کو پیدا کی گئی ہوں... نہیں' میں تو ٹھکرائے جانے کو پیدا کی گئی ہوں۔ میری تقدیر میں یہ رقم تھا کہ.....

دنیا کا وہ واحد آدمی' جسے میں چاہوں' وہ مجھے ٹھکرا دے۔ میری محبت پر تھوک دے۔ میرے جذبوں کا مذاق اڑائے۔ یہی میری نادانی کی سزا تھی۔

مگر ڈور تھی یہ مت کہہ کہ میں اس آگ سے واقف نہیں ہوں۔ اس تپش کو پہچانتی نہیں ہوں۔ اتنا کیا کم ہے کہ میں محبت سے واقف ہوگئی ہوں۔ مجھے عشق کے معنی آگئے ہیں۔ تُو ٹھیک کہتی ہے۔

عشق میں گھُل گھُل کر مرنے اور مر مر کر جینے میں یک طرفہ مزہ ہے۔ تو ٹھیک کہتی ہے۔

انتظار کی آگ بڑی میٹھی ہوتی ہے۔

انتظار زندگی کا سنگھار ہے۔

اس کے بغیر بھی کوئی زندگی ہے؟

...اور تو کیا جانے... کہ محبوب کی لگن کیا ہے؟

آ مجھ سے پوچھ۔

محبوب کی لگن تو یہ ہے کہ تم سجدے کیے جاؤ لیکن تمہاری جبیں پر سجدوں کے نشان نہ ہوں۔

محبوب کی لگن تو یہ ہے کہ اس کے نقشِ قدم کو اپنی سجدہ گاہ بنا لو۔

تمہیں کیا معلوم کہ میں کس مقام پر ہوں۔

زندہ ہوں یا مُردہ ہوں۔

جانے ان فضاؤں میں کسے کھوجتی پھرتی ہوں۔

میں ایک تشنہ روح ہوں۔

ایک بھٹکا ہوا پرندہ ہوں۔

ایک پُرسوز بانسری ہوں۔

اب میرے اندر رو رو ہی درد ہے۔ ٹیس ہی ٹیس ہے۔

مگر....

مجھے چپ رہنا اور جینا ہے۔

جب کہ تم آہ بھی بھر لیتی ہو اور مسکرا بھی لیتی ہو۔

تمہیں تمہارا مستقبل سامنے نظر آرہا ہے اور میرا مستقبل میرے ماضی نے نگل لیا ہے...

ڈور تھی اپنا کام نمٹا کر آدھے گھنٹے بعد واپس آگئی۔

"کیا میں نے کوئی بہت ہی سیریس بات کہہ دی ہے جو تم اس طرح گم صم بیٹھی ہو اور یہ چائے بھی نہیں پی۔ ٹھنڈی ہوگئی ہے۔"

"اوہو...." فلکی ذرا ٹھیک ہو کر بیٹھ گئی۔ "نہیں نہیں... بس... ذرا سوچنے لگی تھی۔"

"فلکو۔" ڈور تھی اس کے قریب بیٹھ گئی۔ "ایک بات بتاؤں۔ میں نے اس مرتبہ تیرے اندر ایک تبدیلی نوٹ کی ہے۔"

فلکی نے استفہامیہ نظریں اٹھائیں مگر خاموش رہی۔ اسے اندازہ تھا کہ ڈور تھی کیا کہنے والی ہے۔

"تُو اب کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہوگئی ہے۔ ہنستی ہے تو ایسے لگتا ہے جیسے زبردستی ہنس رہی ہو۔ بولتی ہے تو ایسے لگتا ہے کہ یہ تیرے الفاظ نہیں ہیں۔ غرض کہ تیری ہر بات سے تبدیلی کا احساس ہوتا ہے۔ کیا تو اپنے گھر میں خوش ہے؟"

"چل اب اماں جان بننے کی کوشش نہ کر۔" فلکی مصنوعی خوش دلی سے یہ کہہ کر کھڑی ہوگئی۔ "میں تو بالکل خوش ہوں۔ ہاں' شادی کے بعد ایک قسم کی بُردباری لڑکی میں ضرور آجاتی ہے کیونکہ وہ عورت بن جاتی ہے اور ایک مختلف قسم کے حلقے میں اس کو ملنا جلنا ہوتا ہے۔ بس وہ لڑکیوں کا چھچھورا پن چھوڑنا پڑتا ہے۔"

"مگر تُو تو کبھی چھچھوری نہیں تھی فلکو' پہلے بھی اچھی لگتی تھی۔ اب بھی اچھی لگتی ہے۔ اب سنجیدہ ہو کر کچھ اور قاتل ہوگئی ہے۔"

"بس' یہ ہوئی نہ بات۔ ویسے تو ٹھیک ٹھاک ہوں' نا؟"

"بالکل۔"

"تو آؤ اب چلیں۔ بہت بور کرلیا تم نے نصیحتیں کر کر کے۔ اب کچھ مری کا پروگرام بنائیں۔"

"بھئی' مجھے تو صرف مجھے کو چھٹی ہوگی۔ باقی لڑکیاں بھی کام پر جاتی ہیں۔ کیا تم مجھے تک رک سکتی ہو؟"

"ضرور رکوں گی۔ کام تو جلدی ہوگیا ہے۔ اب تمہیں سیر بھی تو کرا دوں۔ ٹھہرو۔ میں

اپنا پرس لے آؤں۔ پھر چلتے ہیں۔"

جونہی ڈور تھی اور فلکی فرنچ ایمبیسی کے دروازے سے باہر نکلیں' ان کی مڈبھیڑ اندر آتی ہوئی نوری کی ساتھ ہوگئی۔

نوری کو دیکھ کر فلکی کی جان ہی نکل گئی۔ گویا اب بھانڈا پھوٹا کہ تب پھوٹا۔ لیکن وہ اس کو طرح دے کر نکل بھی نہ سکتی تھی۔ کیونکہ نوری نے اسے اچھی طرح دیکھ لیا تھا بلکہ شناسائی کی ایک گہری مسکراہٹ بھی اس کی طرف پھینکی تھی۔

"ہیلو... فلکی... کیسی ہو بہنی؟" وہ فلکی کے گلے سے لگ گئی۔ فلکی نے دیکھا۔ اس کے ساتھ سرمد نہیں تھا بلکہ ایک اور ہی شخص تھا۔

"ٹھیک ہوں۔" فلکی نے نوری کے رخسار پر بوسہ دیا۔

"کب سے ہو' اسلام آباد میں؟"

"ایک مہینہ ہوا۔"

"ایک مہینے سے یہاں ہو اور مجھے اطلاع بھی نہیں دی... وہ کہاں ہے آفو؟"

"وہ تو نہیں آئے۔" فلکی نے آہستہ سے کہا "مگر مجھے تو یہاں علم ہی نہیں تھا کہ آپ یہاں اسلام آباد میں ہیں ورنہ میں سیدھی آپ کے پاس آتی۔"

"بہنی آفو کو تو اچھی طرح پتہ تھا۔ اکثر سرمد کی اس کے ساتھ فون پر بات ہوتی ہے بلکہ آفو نے ہی تو سرمد کی ملازمت کا بندوبست کیا تھا۔

"آج یہاں کیسے آنا ہوا؟" فلکی نے بات بدل کر پوچھا۔

"یہ سرمد کے کزن عارف ہیں۔ ان سے ملو۔" اس نے نوجوان کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ پیرس جارہے ہیں۔ کل میں ان کا پاسپورٹ' ویزا لگوانے کو دے گئی تھی۔ آج لینے آئی ہوں اور تم کیسے؟"

ابھی اس نے اپنا فقرہ پورا نہیں کیا تھا کہ فلکی جلدی سے بول اٹھی۔

"یہ میری دوست ڈور تھی ہے۔ فرنچ ایمبیسی میں کام کرتی ہے۔ اس سے ملنے آئی تھی۔"

"اچھا تم لوگ جلدی میں ہو شاید۔ جاؤ' مگر میرے ہاں کب آؤ گی؟"

"جب آپ کہیں۔" فلکی نے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔

"ایسا کرو۔ تم آج رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھاؤ۔" نوری نے پرس میں سے سرمد کا کارڈ نکالا اور اسے دیتے ہوئے کہا "اگر گھر کا پتہ نہ چلے تو فون کردینا۔ سرمد یا میں تمہیں آکر لے

جائیں گے۔"

فلکی نے جلدی سے کارڈ لے لیا۔ اس وقت وہ زیادہ دیر نوری سے گفتگو کرنا نہیں چاہتی تھی۔ ورنہ اس کے باہر جانے کا بھید کھل جاتا۔ "ضرور آؤں گی۔" فلکی نے کہا۔

"بائے داوے تم کہاں ٹھہری ہو؟"

"یہاں میری ایک خالہ ہیں۔ ان کے ہاں۔ وہ لوگ مجھے رات کو آپ کے ہاں چھوڑ دیں گے۔"

"دیکھو! ضرور آنا فلکی۔" نوری نے اس کا ہاتھ دبا کر کہا۔

"انشاء اللہ۔"

فلکی نے بھی جواب میں اس کا ہاتھ دبا کر چھوڑ دیا اور خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آئی۔

فلکی نے جھٹ محسوس کرلیا تھا کہ نوری کا جسم بھرا بھرا لگ رہا تھا اور اس کے چہرے پر ایک خاص نور تھا۔ اس کا وجود بھاری بھرکم لگ رہا تھا اور اس پر وہ روپ اتر رہا تھا جو ماں بننے سے پہلے ایک عورت پر اترتا ہے جس روپ کے بارے میں شاعر اور ادیب رطب اللسان ہیں۔

... اور واقعی تخلیق کے اس مرحلے میں عورت کس قدر خوب صورت ہوجاتی ہے۔ فلکی کے دل میں درد نے ایک چٹکی لی۔ اس نے مڑ کر ایک بار پھر اندر جاتی ہوئی نوری کو رشک سے دیکھا۔ اس کے بھرے بھرے کولہے اور پھیلی پھیلی نازک سی کمر بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اجالا تھا۔

"کون تھی یہ؟"

ڈور تھی نے اسے خیالوں سے باہر نکالا۔

"میری دوست ہے۔"

"اس سے پہلے تو کبھی نہیں دیکھا؟"

"شادی کے بعد کچھ نئی دوستیاں کرنی پڑتی ہیں' نا!"

"اچھا۔" ڈور تھی شرمندہ سی ہوگئی۔ "اچھی لگتی ہے۔ خوب صورت۔"

"ہاں' بہت اچھی ہے۔" یہ کہہ کر فلکی موٹر میں بیٹھ گئی۔

"ارے یہ آج تم بھابی فلکی کو کہاں سے "دریافت" کرلائی ہو؟"

رات کو سرمد نے اسے ڈرائنگ روم میں آتے دیکھ کر نوری سے کہا۔

نوری نے اس وقت ڈھیلا ڈھالا امریکن کاٹن کا سوٹ پہنا ہوا تھا اور کالی شال سے اپنے سارے وجود کو ڈھکا ہوا تھا۔ اس سادگی میں بھی وہ بلا کی حسین لگ رہی تھی۔

"یہ مجھے آج فرنچ ایمبیسی میں مل گئی تھی۔"

"کیا کہیں باہر جانے کا ارادہ ہے بھابی جان؟" سرمد نے بڑے احترام سے سلام کرنے کے بعد پوچھا۔

"نہیں جی..." فلکی نے آہستہ سے کہا۔

"... اور یہ اکیلی کیوں جائے گی سرمدی۔ اللہ نہ کرے۔ اب تو جب کبھی جائے گی۔ اپنے شوہر کے ساتھ جائے گی۔"

"افوہ..." فلکی کو اندر ہی اندر اختلاج ہونے لگا۔

آخر بات آفاق... پر کیوں آکر ٹھہر جاتی ہے۔

"میری ایک دوست فرنچ ایمبیسی میں کام کرتی ہے' اسے ملنے وہاں گئی تھی۔" گویا فلکی نے اپنی صفائی پیش کی۔

"آفاق کیسا ہے؟" سرمد نے پوچھا۔

"اچھے ہیں۔" فلکی نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"یہ میں نے کب کہا کہ وہ برا ہے۔ بھئی ہم بھی اسے اچھا ہی کہتے ہیں۔"

اس پر سب ہنسنے لگے۔

"وہ تمہارے ساتھ کیوں نہیں آیا فلکی؟" نوری نے براہِ راست پوچھا۔

"بس مصروف تھے۔"

"مصروفیت تو ہمیشہ کی ہے مگر اپنی بیوی کے لیے وقت نکالنا چاہیے نا؟" نوری نے پیار سے کہا۔

"لعنت کا شکر ہے میری کسی بزنس مین سے شادی نہیں ہوئی۔ ان کے ساتھ زندگی گزارنا... ایک عذاب ہے۔ انھیں تو اپنی میٹنگ اور اپنے کنٹریکٹ' بال بچّوں سے بھی زیادہ پیارے ہوتے ہیں۔"

"اگر آپ کی شادی بزنس مین سے نہیں ہوئی تو آپ کو یہ حسین تجربہ کیسے ہوا ہے؟" سرمد نے پوچھا۔

"حضور! میں اپنی امّی ابّو کی سچ مچ سن کر ہی تو جوان ہوئی ہوں۔"

"اچھا آنٹی اور انکل سے کہوں گا کہ تم محفل میں ان کی برائی کرتی ہو۔"

"کہہ دینا۔ اب تو ابو خود اعتراف کرتے ہیں کہ انھوں نے ہمیشہ امی کے ساتھ زیادتی کی۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔"

"تب تو ہو سکتا تھا' نا۔" سرمد نے بے اختیار کہا۔

"کیا؟" نوری پوچھ بیٹھی۔

"بھئی کوئی اور بچہ ہی ہو جاتا۔"

اس پر سب بے تحاشا ہنسنے لگے۔

"سرمد تم صریحاً" میرے ابو امی کی انسلٹ کر رہے ہو۔" نوری نے کہا۔

"واہ واہ! یہ کیسی انسلٹ ہے۔ میں تو تم سے اظہار ہمدردی کر رہا ہوں۔ بڑا معرکہ سر کیا انھوں نے' بس ایک بگڑی بچّی پیدا کر کے۔ کوشش کرتے تو تمہارا کوئی اور بہن یا بھائی بھی ہوتا مگر انکل تو روپیہ بنانے کی مشین بنے رہے۔"

"تو کیا میں بگڑی بچّی ہوں سرمد۔" نوری روہانسی ہو گئی۔ "سارا دن تمہارے اشاروں پر چلتی ہوں۔ اس کا یہ انعام ہے۔"

"میں تو کہتا ہوں۔ رات کو بھی میرے اشاروں پر چلا کرو۔"

"افوہ! بھئی اتر آئے تم واہی تباہی پر۔" نوری اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں ذرا کچن سے ہو کر آتی ہوں۔ تم یہ خشک میوہ لو نا' فلکی۔"

"لے رہی ہوں۔" فلکی نے آگے بڑھ کر مونگ پھلیوں کی مٹھی بھر لی۔

"لاہور میں کیسا موسم ہے؟" نوری کے جانے کے بعد سرمد بولا۔ "اسلام آباد سے زیادہ

سردی تو نہیں ہے۔ یہاں تو ہیٹر کے بغیر بیٹھا نہیں جاتا۔"

"ویسے اب لاہور میں سردیاں مختصر ہوتی جارہی ہیں۔"

"ہاں۔" فلکی بولی "اب تو نومبر کا مہینہ بھی خوش گوار گزر جاتا ہے۔ صرف دسمبر اور جنوری میں کچھ سردی ہوتی ہے۔"

"اسلام آباد میں بھی تب سردی بڑھتی ہے جب مری میں برف باری ہوتی ہے۔"

"ہاں۔" فلکی بولی "ہم سب سہیلیوں کا پروگرام تھا سنوفال دیکھنے کا۔"

"مگر ابھی تک مری میں برف نہیں پڑی۔" سرمد بولا "اور نہ برف باری کا امکان ہے۔"

"اچھا۔" فلکی خاموش ہوگئی۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو سرمد نے ٹیلی فون اٹھا لیا اور پھر نوری کو آوازیں دینے لگا۔ "نور... اے نور... او میری روشنی کہاں ہو تم؟"

نوری دوڑی آئی۔ "کیا بات ہے؟ کیوں چلّا رہے ہو؟"

"تُو نہیں ہے تو بھائی نہیں دیتا کچھ بھی۔"

سرمد نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"سرمد کبھی تو سیریس رہا کرو۔ ابھی میرا ہاتھ جلنے لگا تھا۔"

"تم سامنے نہیں تھیں تو میرا دل جل رہا تھا۔ اسی لیے تو بلایا ہے۔ تمہاری کسی دوست سحری کا فون ہے۔"

"ابھی تھوڑی دیر بعد کسی افطاری کا فون آجائے گا۔"

نوری نے دوڑ کر ریسیور پکڑ لیا۔

سرمد واپس آکر فلکی کے پاس بیٹھ گیا اور مزے مزے چلغوزے کھانے لگا۔

اتنے میں نوری بات ختم کرکے آئی اور صوفے پر دھپ سے بیٹھ گئی۔

"کافی توانا سہیلی ہے تمہاری۔ ذرا سی فون پر بات کی ہے تو ہانپنے لگی ہو۔ اگر مل بیٹھتیں تو تمہیں باقاعدہ لخلخہ سونگھنا پڑتا۔"

نوری ہنسنے لگی۔

"سرمد اس کے سامنے بھی اس کے موٹاپے کو نشان بناتے رہتے ہو۔ کسی روز وہ برا مان جائے گی۔"

"اور برا مان کیوں نہیں جاتی وہ۔ اس ڈبل ڈیکر کا میں سامنا نہیں کرسکتا اور نام دیکھو نازک

سا، چھوٹا سا "سحری" ذرا بھی شخصیت کے ساتھ میل نہیں کھاتا۔ یہ موٹی عورتیں نازک نازک تخلص کیوں رکھتی ہیں۔" سرمد نے چلغوزے منہ میں ڈال کر کہا۔

"فلکی! تم بور تو نہیں ہو رہیں؟" نوری ایک دم بولی۔ "سرمد ویسے بھی بہت بور کرتے ہیں۔"

"اگر سامنے حسین لڑکی بیٹھی ہو تو میں کبھی بور نہیں کرتا بلکہ آپ ہی آپ خوبصورت گفتگو کرنے لگتا ہوں۔"

"خوش فہمی ملاحظہ ہو۔" نوری اور فلکی ہنسنے لگیں۔

"کس کی؟ میری یا ان کی؟" اس نے فلکی کی طرف اشارہ کیا۔

فلکی ہنستے ہنستے دہری ہوگئی۔ "بھائی، مجھے تو کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔"

"ہوگی تو ضرور... کیونکہ خوبصورت لڑکیاں کافی خودپسند ہوتی ہیں۔ وہ اس سور نے نکال دی ہوگی۔"

"دیکھو سرمد! تم میرے بھائی کو گالی دے رہے ہو..."

"سالا جو ہوا۔"

اس پر پھر قہقہہ پڑا۔

باہر ایک گاڑی کی آواز آئی۔

"جاؤ سرمد، دیکھو کون ہے؟"

سرمد باہر کو لپکا۔

نوری بولی "فلکی! آج میں نے تمہارے اعزاز میں دو چار سہیلیاں بلائی ہیں۔ وہی جو شارٹ نوٹس پر آسکتی تھیں۔"

"بڑا اچھا کیا، آپ کے حلقۂ احباب کا پتہ چلے گا۔"

"ارے، ابھی تو مجھے آئے چند ماہ ہی ہوئے ہیں۔ کچھ زیادہ واقفیت نہیں ہے۔" اتنے میں باہر سے نسوانی قہقہوں کی آواز آئی۔

"شانو آئی ہے شاید۔"

نوری کھڑی ہوگئی۔ ایک خوش باش خاتون اندر داخل ہوئی۔ فلکی کا نوری نے تعارف کرایا۔ اس کے ساتھ اس کا میاں بھی تھا۔

"یار فاروق تو آگیا۔ بہت اچھا ہوا ورنہ ان خواتین کی اکثریت ہوجاتی اور میں خوشامد کرکر

کے تھک جاتا۔"

پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔

"سحری تو آرہی ہے؟" شانو نے پوچھا۔

"نہیں' ابھی اس کا فون آیا تھا کہ نہیں آسکے گی۔ اس کے کچھ سسرالی مہمان آگئے ہیں۔"

"سسرالی مہمانوں کو تو گولی مارو بی چاہیے۔" سرمد جلدی سے بولا۔

"بھلا ان کا بھی استقبال کیا جاتا ہے۔ کیوں فلکی بھابی؟"

"مجھے کوئی ایسا تجربہ نہیں ہے۔" فلکی بولی "میں تو ترستی رہی کہ میری ساس اور نند میرے پاس آئیں۔"

"یہ صرف کہنے کی باتیں ہیں۔ اگر وہ ایک ہفتہ آکر رہتیں تو تم دعا مانگتیں کہ کاش یہ ہمیشہ کے لیے چلی جائیں۔"

"نہیں ہماری فلکی ایسی نہیں ہے۔" نوری بولی۔

اتنے میں کچھ اور مہمان بھی آگئے۔

محفل گرم ہوگئی۔

نوری تھوڑی تھوڑی دیر بعد اٹھ کر باورچی خانے میں چلی جاتی۔ باورچی خانے سے اشتہا انگیز خوشبوئیں آرہی تھیں۔

سب لوگ باتوں میں مگن تھے... چار خواتین مع اپنے شوہروں کے آئی تھیں۔ یہ عورتیں کچھ زیادہ خوب صورت بھی نہ تھیں۔ البتہ شوہر اچھے تھے اور بڑے اچھے عہدوں پر فائز تھے۔ یہ سب عورتیں اور مرد خوب گھل مل کر باتوں میں حصّہ لے رہے تھے۔

فلکی رشک سے انھیں دیکھنے لگی۔

نہ کسی کا شوہر ٹوک رہا تھا نہ کوئی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ سب ہنس رہے تھے' بول رہے تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے۔ کوئی بلند آواز سے بول رہی تھی' کوئی آہستہ۔ کتنی مزے کی تھی ان کی زندگی۔

میاں بیوی میں محبت کا ہونا شاید اسی کو کہتے ہیں۔

یہ محبت ہے یا محض دکھاوا۔

فلکی سوچنے لگی۔

وہ ایسی زندگی گزارنے کو ترستی رہی۔

آفاق کی موجودگی میں تو وہ بول ہی نہ سکتی تھی۔

نوری اور سرمد کیسی چہلیں آپس میں کرتے رہتے ہیں۔ اس کو سرمد کی عادت بہت اچھی لگتی تھی۔ اٹھتے بیٹھتے میاں بیوی ایک دوسرے سے اظہارِ محبت کرتے رہتے یا ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچتے رہتے۔

سرمد بار بار اٹھ کر مہمانوں کو خشک میوہ اور سگریٹ پیش کرتا۔ ذرا ذرا سی دیر بعد نوری کو پکارتا۔ اسے اچھی طرح تنگ بھی کرتا اور پھر تردّد کا اظہار بھی کرتا "تم اب بیٹھ جاؤ۔ تم بہت تھک گئی ہوگی۔"

جانے کیوں وہاں بیٹھے بیٹھے فلکی کا دل ڈوبنے لگا اور اس پر غضب یہ ہوا کہ سرمد نے اٹھ کر کیسٹ ریکارڈ آن کردیا۔ گیت کے بول گونجنے لگے۔

؎ میرے نصیب میں اے دوست تیرا پیار نہیں!

فلکی کا دل چاہنے لگا کہ وہ اس محفل سے اٹھ کر باہر نکل جائے اور کسی کونے میں منہ دے کر تھوڑا سا رولے۔

باتوں ہی باتوں میں دس بج گئے۔

سرمد بولا "نوری آج کھانا کھلاؤ گی یا صرف خوشبوؤں پر اکتفا کرنا پڑے گا۔"

"تھوڑا سا اور صبر کرلو۔"

"اب نہیں ہوتا صبر بھئی' کھانا لگا دو۔"

"تمہیں معلوم تو ہے کہ ایک مہمان کا انتظار ہے۔"

"دس بج گئے ہیں۔ اب کوئی مہمان نہیں آئے گا۔"

"یہ نہیں کہا جاسکتا۔" نوری بن کر بولی۔

"میرا خیال ہے کہ اب میں فلکی بھابی کو بتا ہی دوں۔"

"سرمد" نوری چیخی۔ "سرپرائز دیں گے؟"

"کیا سرپرائز؟" فلکی نے ہنس کر پوچھا۔

"ہے ایک۔" نوری کھڑی ہوگئی۔ "سرمد! میں جاکر کھانا میز پر لگاتی ہوں۔ تم ایسا کرو۔ ایئرپورٹ فون کرکے پتہ کرو۔ اور خبردار جو سیکرٹ آؤٹ کیا۔"

"بہت اچھا حضور!" سرمد نے سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا دیا اور اٹھ کر فون کرنے چل دیا۔

فون کرنے کے بعد سیدھا کچن میں نوری کے پاس چلا گیا۔

اور پھر آکر اس نے سب کو خوش خبری سنائی کہ کھانا لگ گیا ہے۔

سب لوگ میز کے اردگرد بیٹھ گئے۔

"شروع کرو بھئی۔" نوری نے کہا۔

"ہاں۔" سرمد پلیٹ پکڑ کر آگے ہوا۔ "ہمارے ایک معزز مہمان آنے والے تھے۔ ہمیشہ کی طرح انھوں نے انتہائی غیر مہذب حرکت کی ہے کہ نہیں آئے۔ کیا خبر آ ہی جائیں۔ خیر تم لوگ کھاؤ۔"

فلکی کو الجھن ہونے لگی۔

جب سب لوگوں نے کھانا نکال لیا تو پھر سرمد' فلکی کے قریب آکر بولا۔

"بھابی جان! اگر اس وقت اچانک آفاق آجائیں تو کیا انعام دیں گی؟"

نوالہ فلکی کے ہاتھ سے گر گیا۔

"واہ واہ... سرمد زور سے ہنسا۔ "محبت ہو تو ایسی ہو...."

فلکی نے سر جھکا لیا۔

"دراصل فلکی..." نوری بڑی شائستگی سے بولی "آج دوپہر کو آفاق سے فون پر بات ہوئی تھی۔ میں نے اسے کہا تھا کہ آج رات کے کھانے پر فلکی آرہی ہے۔ بڑا ہی اچھا ہو اگر تم اچانک آجاؤ۔ اس نے کہا کہ وہ ضرور کوشش کرے گا اور دس بجے والی فلائٹ سے ضرور پہنچ جائے گا مگر پونے گیارہ بج چکے ہیں۔ ابھی بھی اس کے آنے کا امکان ہے۔ میں نے سرمد سے بہت کہا تھا کہ خاموش رہے مگر یہ تو پیٹ کا ہلکا ہے۔"

"جی ہاں۔ ٹھیک ہی کہتی ہیں آپ۔ ورنہ تیرا چوتھا مہینہ مجھے بھی ہوتا۔"

نوری جھینپ گئی۔

مگر فلکی کی تو جان پہ بن گئی۔ وہ جو پہلی بناوٹی سا کھانا کھا رہی تھی' وہ بھی حلق سے باہر آنے لگا۔

سچ مچ اگر آفاق اچانک آجائے تو فلکی کو کس قدر شرمندگی ہوگی۔ وہ اس کا سامنا کس حیثیت سے کرے گی؟ یہ ڈراما اب کیا جاسکے گا یا نہیں۔ ان لوگوں کو کیا معلوم کہ ان کے درمیان ہر قسم کا تعلق ٹوٹ چکا ہے اور پھر آفاق کیا کہے گا۔

وہ سوچے گا۔ میرا ان لوگوں کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ میں یہاں کیوں آئی بیٹھی ہوں۔ اب میں اتنی لاچار ہو چکی ہوں کہ ہر ایک سے ہمدردی کی بھیک مانگتی پھرتی ہوں۔

اور پھر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ اسی تلخی سے کام لے۔ سب کے سامنے طنز کے تیر برسائے۔

تب وہ کیا کرے گی؟

کوئی جائے پناہ نہ ہوگی۔

فلکی کا دل دھڑ دھڑ دھڑکنے لگا۔ اللہ کرے آفاق نہ آئے... اللہ کرے آفاق نہ آئے.... اپنی تمام تر مجبوریوں کو التجا بنا کر فلکی بس دل ہی دل میں دعا کیے جا رہی تھی اور اپنے آپ کو بھی کوس رہی تھی۔

کاش وہ مروت میں آکے یہ دعوت قبول نہ کرتی۔ کاش وہ نوری کے گھر نہ آتی۔

اس کو اچھی طرح معلوم تھا۔ نوری اور سرمد' آفاق کے قریبی دوستوں میں سے ہیں۔ بھلا یہ بات چھپی رہ سکتی تھی۔

وہ اپنی بد نصیبی کو کوسنے لگی۔

اپنے حالات کو کوسنے لگی۔

اس کے دل کی کش مکش اس کے چہرے سے جھانکنے لگی۔

نوری نے فوراً محسوس کرلیا اور بولی۔

"کیا بات ہے فلکو' تم نے کھانے سے ہاتھ کیوں کھینچ لیا ہے؟"

"بس' میں اور نہیں کھاؤں گی۔" فلکی نے مری مری آواز میں کہا "میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"تم نے تو کچھ بھی نہیں کھایا۔ ایک کباب لیا تھا' وہ بھی پورا نہیں کھا سکیں۔ کیا ہوا تمہاری طبیعت کو؟"

"بس' جی اچھا نہیں۔"

"مجھے بتاؤ۔ میں تمہارے لیے کچھ اور لے آؤں... کیوں جی اچھا نہیں تمہارا کیا لوگی۔ کچھ تو کھالو' نا؟"

"بس' یونہی۔"

"بتاؤ نا۔ اگر گوشت پسند نہیں تو یہ سبزی لو۔ کچھ اور بنا لاؤں میں۔"

"ہاں... ہاں... آج کل نوری سمجھتی ہے کہ ہر عورت کو گوشت سے پرہیز ہے کیونکہ خود جو گوشت نہیں کھا سکتی اور اب اکیس سوالوں میں بوجھتا چاہتی ہے۔ آخر فلکی بھابی کو کیا بیماری

ہو سکتی ہے؟"

"سرمد!" نوری نے سرمد کو گھورا "تم ہمیشہ میرا بھانڈا پھوڑتے ہو۔"

"حضور، آپ کا بھانڈا یہ بڑھتا ہوا جسم پھوڑتا ہے۔ خدا گواہ ہے، میں تو ہمیشہ خاموش رہتا ہوں۔"

"اف میرے خدا... میں کہاں جاؤں..." نوری نے سر پیٹ لیا۔

"اب ہسپتال ہی جانا مگر تین ماہ کے بعد..."

فلکی ایک دم کھڑی ہو گئی اور بولی۔

"گیارہ بج گئے ہیں۔ آنٹی نے کہا تھا۔ دس بجے تک آجانا۔ انھوں نے کہیں جانا تھا۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے بھئی؟"

نوری بھی کھڑی ہو گئی۔

"تم نے تو میٹھا بھی نہیں کھایا... دیکھو تو کیسا زرد رنگ ہو رہا ہے تمہارا؟ کیا واقعی زیادہ طبیعت خراب ہے؟"

"ہاں!" فلکی نے آہستہ سے کہا۔

"پلیز نوری اب اجازت دو۔ پھر کبھی آجاؤں گی۔"

"اف تم کس قدر ٹھنڈی ہو رہی ہو۔ نوری نے فلکی کے ہاتھ تھام لیے۔ "واقعی تمہاری طبیعت زیادہ خراب لگتی ہے۔ اچھا تم جاؤ۔ صبح میں تمہیں فون کروں گی۔"

فلکی جب ڈرائنگ روم میں پرس لینے گئی تو اسی وقت کوریڈور میں رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ سرمد دوڑ کر فون سننے چلا گیا اور نوری فلکی کو لے کر باہر کی طرف چل دی۔

"ہیلو... تو حضرت وہیں براجمان ہیں۔ کیا تماشا ہے بھئی۔" سرمد بولا۔

"ہوں تو سیٹ نہیں ملی۔ کس زعم میں وعدہ کر لیا تھا..."

"یار تمہارے انتظار میں اب کہیں جا کے کھانا نصیب ہوا ہے اور اب گیارہ بجے تم اجازت مرحمت فرما رہے ہو۔ نو بجے نہیں بتا سکتے تھے۔"

"ہاں... ہاں... آج لائن بھی نہیں مل رہی تھی... سن رہی ہو نوری؟"

"کیا آفو کا فون ہے؟" نوری نے باہر سے پوچھا۔

"ہاں۔" سرمد زور سے بولا۔ "بھابی سے بات کرو گے یار۔ تم نہیں آئے تو وہ مایوس ہو کر

جا رہی ہیں۔"

"آؤ بھابی جان!" سرمد نے زور سے آواز دی۔

"... اور نوری فلکی کو پکڑ کر لے آئی۔

"کتنا اچھا ہوا کہ تم چلی نہ گئی تھیں ورنہ بات نہ ہو سکتی تھی۔ آؤ بات کر لو۔"

فلکی کا سارا جسم ٹھنڈا ہو گیا۔

آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا... والا معاملہ ہو گیا۔

وہ اس سے دور بھاگنا چاہتی تھی مگر وہ راہ میں آگیا تھا۔

وہ کیا کہے گی؟ کیا بات کرے گی؟ کیسے اس کی آواز سنے گی۔ اب تو مصنوعی کھیل کھیلنے کی سکت نہیں تھی۔

نوری اس کو گھسیٹ کر لے آئی۔

... اور اس نے ریسیور تھام کر یوں کان سے لگا لیا جیسے وہ مُردہ ہے۔ نہ سن سکتی ہے اور نہ ہی کچھ محسوس کر سکتی ہے۔

یہ وہ گھڑی تھی جب وقت جم جاتا ہے۔ تھم جاتا ہے۔ سن ہو جاتا ہے۔ کاش اس کی بھی ساری سننے اور سمجھنے کی طاقتیں مفلوج ہو جائیں۔ فلکی نے سوچا۔ تاہم ریسیور تو اس نے کان سے لگا لیا تھا اور بڑی بے بسی سے، سرمد اور نوری کی طرف دیکھا جس طرح مذبح خانہ میں جانے والا بکرا قصاب کی طرف دیکھتا ہے۔ سرمد اور نوری کوئی مترنم بات سننے کو مسکرا رہے تھے اور وہ منتظر تھی کسی دھماکے کی۔ ایسی سمع خراش بات۔ کرخت آواز جسے سنتے ہی اس کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں اور احساس کے پرخچے اڑ جائیں۔

"ہیلو۔" اس نے مُردہ سی آواز میں کہا۔

"ہیلو... ہیلو۔" سارا زمانہ جیسے اس کا ہم آواز ہو گیا۔

کائنات ہیلو ہیلو پکاری۔

"ہیلو۔" اب اس کی آواز بالکل مدھم تھی۔

ٹیلی فون میں سے ایک ناگوار سی آواز نکلی۔ تب اسے احساس ہوا کہ فون تو کب سے بند تھا۔ ڈیڈ تھا بالکل۔ دوسرے کنارے پر کوئی نہیں تھا۔ وہ فضاؤں میں ہیلو ہیلو کی تکرار کر رہی تھی۔ بجلی کی دشمن تاریں عیار فاتح کی طرح خاموش تھیں اور ٹیلی فون کا ریسیور بے حس شوہر کی طرح ٹھنڈا برف ہو چکا تھا۔

جانے لائن کٹ گئی یا اس شاطر نے خود سلسلہ منقطع کر دیا جو کچھ بھی ہوا' وہ بہت اچھا ہوا۔ پھر اس کے بعد فلکی کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا حوصلہ ہو گیا۔

اپنے ٹھنڈے ہاتھوں میں ریسیور کو یوں مضبوطی سے پکڑ لیا گویا یہی زندگی کی آخری آس ہو اور اپنے وجود کا پورا زور لگا کر خوب ہیلو ہیلو کیا۔

اس مرتبہ وہ ڈرامہ کر رہی تھی۔

"کمال ہے۔"

اس نے ہنس کر ریسیور واپس رکھ دیا۔

"لائن کٹ گئی ہے۔"

"اوہو۔" سرمد شرمندہ سا آگے بڑھا "کئی دنوں سے ہمارے فون میں گڑبڑ ہو گئی ہے۔ ہمیشہ دور سے آنے والی کال کی لائن کٹ جاتی ہے۔ نوری تم نے ایکسچینج والوں کو شکایت درج کرائی تھی۔"

وہ ٹیلی فون کو زور زور سے ہلانے لگا۔

"کوئی ایک بار۔" نوری طنزیہ ہنسی "اب تو ایکسچینج والے سمجھنے لگے ہیں کہ شکایات درج کرانا خوش فکر لوگوں کا مشغلہ ہے۔ سو بار کہو تو ایک بار جواب ملتا ہے۔"

سرمد کھڑا ہو گیا۔

"ویسے نوری تمہاری سُریلی آواز سننے کے لیے وہ کم بخت تمہاری شکایت درج نہیں کرتا ہو گا۔"

"ویسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ہر بار میں نے خاتون آپریٹر ہی سے شکایت کی تھی۔"

"یہ تو اور بھی برا ہوا۔ کبھی کسی عورت نے عورت کی شکایت سنی ہے' ٹیک بخت' اگر ایکسچینج سے کوئی معقول آواز کی خاتون بولتی ہے تو مجھے کیوں نہ بتایا۔ میں بہتر انداز میں شکایت درج کرا سکتا تھا۔"

یہ بات سن کر دور بیٹھے ہوئے مہمان بھی ہنس پڑے اور فلکی کو بھی بہت دیر بعد مسکرانے کا حوصلہ ہوا۔

"اچھا' اب میں چلتی ہوں۔" فلکی کے لہجے میں اب اطمینان تھا۔ وہ اپنی جگہ سے ہلی۔

"کہاں جا رہی ہیں بھابی جان!" سرمد نے اسے پکڑ کر بٹھا دیا۔ میں بھی اس الّو کے کان کو فون

کرتا ہوں۔ آپ کو نمبر ملا کر دوں گا۔ وہ کیا کہے گا کہ اگر لائن کٹ گئی تھی تو کیا ہم دوبارہ ملا کر نہ دے سکتے تھے۔

"نہیں نہیں۔ فلکی گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ "اب میں گھر جا کر خود اطمینان سے فون کر لوں گی۔"

"گھر جا کے دوبارہ کریں گے اور سونے سے پہلے کوئی ایسا فقرہ کہہ دیجئے گا کہ وہ سخت سردی میں گرم ہو کے سو جائے۔"

سرمد نے شوخی سے کہا اور ڈائل گھمانے لگا۔

خداوندا! یہ کیا مصیبت در مصیبت چلی آ رہی ہے۔ آج وہ ان کے گھر آ کر خواہ مخواہ پھنس گئی مگر بہت کوشش کے باوجود جب آفاق کا نمبر نہ ملا تو فلکی نے باہر کی طرف قدم بڑھائے۔

"سوا گیارہ ہو گئے ہیں۔ میری آنٹی فکر مند ہوں گی۔"

تب سرمد نے فون چھوڑ دیا اور سب اس کے ساتھ ہی باہر پورچ میں نکل آئے۔

فلکی نے سب کا شکریہ ادا کیا اور خدا حافظ کہہ کر موٹر میں بیٹھ گئی۔

"ڈرائیور! موڑ ذرا احتیاط سے چلانا۔" سرمد نے آگے آ کر کہا۔ "آج باہر دُھند بہت زیادہ ہے۔ ذرا نکل کر پہلے شیشے صاف کر لو۔"

جب موٹر ان کے گھر سے نکل گئی تو فلکی کے مُردہ تن میں جان آ گئی۔ کس جنجال میں پھنس گئی تھی یہاں آ کر۔

اسلام آباد میں اسے ہر طرف خطرہ ہی خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔

یوں لگتا تھا اس ملک میں آفاق کا تسلّط ہے اور اس تسلّط سے وہ نکل بھاگنا چاہتی تھی۔

یہ تو اللہ کا شکر ہوا کہ لائن کٹ گئی۔ ورنہ وہ پوچھ بیٹھتا محترمہ آپ کون ہیں اور کس ناتے سے فون کر رہی ہیں تو وہ کیا جواب دے سکتی تھی۔

مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس نے خود ہی فون بند کر دیا ہو اس سے بات ہی نہ کرنا چاہتا ہو۔

ہاں! اس طرف اس کا خیال کیوں نہیں گیا تھا۔

اس کی خود پسندی سے کچھ بعید نہیں۔ اس نے خود ہی فون رکھ دیا ہو گا۔

ہوں' تو ابھی تک اس کے اندر فرعونیت باقی ہے۔

میں کیا سمجھتی ہوں اسے۔ اس کا کیا خیال ہے۔ میں اس کی منّت کروں گی۔ اس کے پیچھے جاؤں گی۔ اس سے ملاقات کا بہانہ ڈھونڈوں گی۔ کبھی نہیں۔ کبھی نہیں۔

وہ سمجھتا ہوگا۔ میں جان بوجھ کر نوری کے گھر گئی ہوں۔ لوگوں کو بیچ میں ڈال کر صلح صفائی کرانا چاہتی ہوں۔ ہمدردیوں کی بھیک مانگتی پھرتی ہوں۔

میں تو اب اس منزل سے گزر چکی ہوں۔ ان فاصلوں نے میرے اور اس کے درمیان کئی پہاڑ حائل کردیے ہیں۔ اُف میں تو کبھی اس کا سامنا بھی نہیں کروں گی۔ مجھے کیا ضرورت ہے کہ کسی کے سامنے اس کا ذکر بھی کروں اور پھر اس کی ضرورت بھی نہ رہے گی۔

غصّے سے کھولتی وہ آنٹی کے گھر پہنچ گئی۔

علی الصباح جب اس نے اپنا سامان پیک کرکے موٹر میں رکھوایا تو آنٹی عاصمہ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔

"اے فلکو! تم نے تو ابھی ایک ہفتہ اور رکنا تھا۔"

"بس آنٹی ممی کے لیے دل اداس ہوگیا۔ اب چلوں گی۔"

"اب تو تیری شادی ہوگئی ہے۔ ابھی تک تیرا بچپنا نہیں گیا۔ ممی کے بغیر سسرال میں کیسے رہتی ہے؟"

"بس وہاں تو گزارا ہو ہی جاتا ہے' آنٹی۔"

"آج... رک جاؤ۔ کچھ دیکھیں گے اور پھر تمھاری ممی کو بھی اِطّلاع کریں گے۔"

"نہیں آنٹی' مجھے جانے دیں۔ صبح صبح نکلوں گی تو تین بجے تک لاہور پہنچ جاؤں گی۔ ہاں' آپ اتنی مہربانی کریں کہ ممی کو فون کرکے بتادیں کہ میں آرہی ہوں۔"

سب روکتے رہ گئے مگر فلکی نکل ہی آئی۔ اب وہ مزید ایک گھنٹہ بھی اسلام آباد میں نہیں رک سکتی تھی۔

غریب ڈور تھی کیا کہے گی جس کے ساتھ مری جانے کا پروگرام بنایا تھا۔

خیر کوئی بات نہیں۔ وہ لاہور جاکر فون پر سب سے معذرت کرلے گی۔

گھر پہنچی تو ممی اور حیران ہوئیں۔

"فلکو کل تُو نے بتایا تھا کہ تُو ہفتے بعد آئے گی۔"

"بس ممی آپ کے بغیر دل نہیں لگا۔" فلکی نے آگے بڑھ کر ممی کی گردن میں بانہیں ڈال دیں۔

"سویٹ۔" ممی نے اس کے رخسار پر بوسہ دیا۔ "پہلے سے کمزور لگ رہی ہے۔"

"بس سفر کی تھکاوٹ ہے۔"

"جاؤ گرم شاور سے باتھ لو اور اپنے آپ کو فریش کرو۔"

"ممی میرا کوئی خط آیا ہے؟" فلکی نے جلدی سے پوچھا۔

"ہاں' دو خط آئے تھے جو میں نے تمھارے کمرے میں رکھوا دیے تھے۔"

فلکی دوڑ کر اپنے کمرے میں گئی۔ اس کا اندازہ صحیح تھا۔

ایک خط فائزہ کا تھا اور دوسرا آنٹی نینیہ کا!

آنٹی نینیہ کو تو اس نے یونہی مصلحتاً ایک محبت نامہ لکھ مارا تھا۔ ان کی اور ان کے بچّوں کی خیریت دریافت کی تھی اور پوچھا تھا وہ کب پاکستان آرہی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ بس ذرا وہ یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ آنٹی نینیہ کا پاکستان آنے کا ارادہ تو نہیں اور ان کے باقی حالات بھی معلوم کرنا چاہتی تھی۔ سو اُن کا خط آگیا تھا انھوں نے فلکی کا بہت شکریہ ادا کیا تھا۔ پیار بھیجا تھا اور اسے گرمیوں میں ٹورانٹو آنے کی دعوت دی تھی۔ انھوں نے بگل بھی کیا تھا کہ وہ ہنی مون منانے کینیڈا کیوں نہیں آئی۔

فلکی کو دل میں بہت ہنسی آئی۔ اس نے کھڑے کھڑے سوچا۔ صرف دو تین مہینے لندن میں گزار کر وہ گرمیاں شروع ہوتے ہی ٹورانٹو چلی جائے گی اور لندن پہنچ کر آنٹی نینیہ کو مفصّل خط لکھ دے گی کہ اس کے لیے کسی جاب کا بندوبست کر چھوڑیں۔ دوسرا خط فائزہ کا تھا۔ اس نے پاکستان سے بے شمار چیزیں منگوائی تھیں اور لکھا تھا۔ وہ شدّت سے فلکی کی منتظر ہے۔

فلکی نے دونوں خط راشک نیل کی دراز میں چھپائے اور غسل خانے میں چلی گئی اگر اس وقت شاور تلے نہ بھی بیٹھتی تو بھی اس کا ذہن اور جسم ہلکا پھلکا ہو چکا تھا۔ اس کا منصوبہ خوبخود کامیابی کی طرف گامزن تھا۔ اب تک کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ اب صرف ٹکٹ کا مسئلہ طے کرنا تھا۔ وہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ پیسے ہوں تو ہر وقت ٹکٹ خریدا جاسکتا ہے۔ پی آئی اے میں اس کی واقفیت تھی اور وہ پی آئی اے سے ہی جانا چاہتی تھی۔ بینک میں اس کی ایک اور دوست تھی جسے اس نے ایکسچینج کے لیے کہہ رکھا تھا۔ ویسے بھی اسٹیٹ بینک سے اسے مقررہ ایکسچینج مل جانے کی امید تھی۔ صرف گھر سے فون کرکے یہ سب کچھ نہیں کرسکتی تھی۔

وہ تولیے سے اپنے بال خشک کرتی باہر آئی۔ ہیئر ٹرالی میں اس کے لیے چائے لگا گیا... اس نے بالوں کے نیچے تولیہ بچھایا اور صوفے سے ٹیک لگا کر چائے بنانے لگی۔

ممی اور ڈیڈی سے کراچی جانے کی اجازت لینا چاہتی تھی۔ کراچی میں انکل وقار رہتے تھے۔ پہلے بھی وہ کئی بار ان کے ہاں جاکر رہی تھی۔ ان کے چار بیٹے تھے اور چاروں سے اس کی دوستی

تھی بلکہ ان کا بڑا بیٹا رونی تو اس سے شادی کا بھی خواہش مند تھا مگر اس نے رونی کو صاف بتا دیا تھا کہ شادی کے لیے وہ اسے پسند نہیں کرتی۔ اس پر رونی نے ذرا بھی برا نہیں منایا تھا بلکہ اس کی شادی کے بعد ایک ماڈل گرل سے شادی کرلی تھی۔ زلفی ان کا دوسرا بیٹا خالیا" امریکہ چلا گیا تھا۔ گوگو اور بنو کراچی میں ہی تھے۔ گو ان کے گھر میں رہنا کچھ ٹھیک نہیں تھا مگر کراچی کے راستے ہی اس نے لندن جانا پسند کیا۔ پنڈی میں جلدی پتہ لگ جانے کا احتمال تھا۔ انکل وقار کے گھر آنے جانے کی اتنی آزادی تھی کہ اگر کوئی رات گئے بھی واپس نہ آتا تو گھر والے فکر نہیں کرتے تھے۔ وہ اس موقع کی تلاش میں رہنے لگی کہ ڈیڈی سے کراچی جانے کا ذکر کرے۔

دوسرے دن اس نے فائزہ کی بھیجی ہوئی لسٹ ہاتھ میں پکڑی اور باہر نکل گئی۔ اس کی مطلوبہ چیزیں ڈھونڈتی ہوئی ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں گھس گئی... چیزیں دیکھتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ ایک خوب صورت 'گول مٹول' صحت مند بچہ ہمک ہمک کر اس کو پکڑ رہا ہے۔ چونک کر دیکھا تو ساتھ والے کاؤنٹر پر ایک خاتون کھڑی تھی جس نے سال بھر کا چاند سا بچہ اٹھا رکھا تھا۔ فلکی نے بچے کی اداؤں سے مجبور ہو کر بچے کی طرف دیکھا تو وہ اس کی آنکھوں میں ڈوبتی چلی گئی۔ بچے کی آنکھیں بولتی ہیں۔ پہلی بار اندازہ ہو' کیونکہ وہ فلکی کو دیکھ کر بار بار مسکرا رہا تھا۔ اچھل اچھل کر اسے پکڑ رہا تھا۔ شاید چاہتا تھا کہ فلکی اسے اٹھالے۔

فلکی کی توجہ اپنے کام سے ہٹ گئی۔ اس کے گال چھو کر اس سے کھیلنے لگی تو ماں نے تردد سے مڑ کر دیکھا اور پھر فلکی کو دیکھ کر مسکرا دی۔

"ماشاء اللہ بڑا پیارا ہے' آپ کا بچہ۔" فلکی نے اس کی ماں سے کہا۔ "کیا نام اس کا؟"

"آفتاب۔"

"آفاق۔" جانے کیوں فلکی کو ایسے لگا جیسے اس نے آفاق کہا ہو مگر اس نے آفتاب ہی بتایا تھا۔ ہر چہرے پر آفاق کی شباہت پڑ رہی تھی اور ہر نام اسی کا نام لگتا تھا۔ جنوں نہیں تو اور کیا ہے؟

فلکی نے آگے بڑھ کر بچے کو گود میں اٹھالیا۔

کیسی پیاری خوشبو نکلی اس میں سے۔ ایسی خوشبو تو کسی پرفیوم کسی ڈیاڈورانٹ سے تو نہیں آتی تھی۔ یہ خالصتا" آسمانی خوشبو تھی۔ تب فلکی کے دل میں ہلکا ہلکا درد ماستا بن کر جمع ہونے لگا۔ کاش.... کاش.... وہ سوچتے سوچتے رک گئی۔

اسے حیرت بھی ہوئی۔ اسے بچوں سے کتنی نفرت تھی۔ اول تو اس نے گھر میں چھوٹے بچے دیکھے ہی نہ تھے اور جو اِدھر اُدھر دیکھ لیتی تو انھیں مصیبت سمجھ کر منہ پھیر لیتی۔ اس وقت جب

وہ خود درد کا ایک انمول خزانہ بن چکی تھی۔ دوسرے کے بچوں کو کلیجے سے لگالینا چاہتی تھی۔

یوں اسے یکایک اندازہ ہوگیا۔ بچہ پاؤں کی زنجیر کیوں بن جاتا ہے؟ اولاد اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت کیوں ہے؟ مامتا کا مول کوئی شے نہیں۔

ان حالات میں بھی' جب تیز روشنیوں کے دروازے بند تھے۔ وہ صرف ایک بچے کی خاطر زندہ رہ سکتی تھی اور سب کچھ کرسکتی تھی۔ کاش! ایسا آسرا تو ہوتا۔ ٹھکرائی ہوئی ماں کے لیے بچہ ایک بیساکھی ہوتا ہے۔ اس کے پاس تو چلنے کے لیے ایسی کوئی بیساکھی نہ تھی اور نہ امید تھی کبھی۔ آنکھوں میں آنسو آنے سے پہلے اس نے بچہ اس کی ماں کو واپس کردیا اور اپنے کاؤنٹر پر لوٹ آئی۔

وہ مرد بھی کوئی انسان ہے جو بچے سے محبت نہ کرسکتا ہو جس کو بچے کی ضرورت نہ ہو۔ بچہ تو پتھر دل کو بھی موم کردیتا ہے اور نفرتوں کی خلیج میں چاندنی اور پھولوں کی چادر بچھا دیتا ہے۔ عورت کو اس کے بنیادی حق سے محروم کرنا ظلم نہیں تو کیا ہے۔

... اور تو یہ کیا سوچ رہی ہے فلکی! تو اس کی دنیا سے جارہی ہے اور جاتے جاتے یہ نیا روگ کیوں کلیجے سے لگالیا۔

پگلی وَم گھٹ کے یہاں سے نکل جا!

فلکی نے اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو بڑی مشاقی سے پیئے اور پھر اپنا سامان چیک کرنے لگی۔

بچہ بار بار اس کی طرف دیکھ کر ہمک رہا تھا۔ مگر اس نے دوبارہ کلیجے پر پتھر رکھ لیا۔

کلیجے پر پتھر رکھ لیا تو کیا ہوا؟ کان بند کرلیے تو کیا ہوا؟ آنکھیں پھیرلیں تو کیا ہوا؟

عورت تو پیدائشی ماں ہے۔ تم اس کے جذبے کے منہ پر چاہے مجبوریوں کا ٹھنڈا ہاتھ رکھ دو۔

ٹکٹ بھی آگیا تھا اور سامان بھی تیار ہوگیا تھا۔ سامان کیا تھا۔ لندن تک تو وہ ایک سوٹ کیس ہی لے جاسکتی تھی۔ اس کے علاوہ اس نے ایک تھیلا بھی بنالیا تھا جس میں فائزہ اور اس کے بچے اور شوہر کے لیے تحائف اور اس کی مطلوبہ اشیاء تھیں۔ اپنے لیے بھی بہت کم سامان رکھا تھا۔ زیادہ تر سامان اور کپڑے وہ وہیں جاکر خریدنا چاہتی تھی۔ اس کی سیٹ اگلے منگل کے لیے بک ہوئی تھی۔

دوسری صبح جب ڈیڈی دفتر کے لیے نکل گئے اور امی ٹیلر کے ہاں چلی گئیں تو اس نے انکل ذوالفقار کے دفتر کا نمبر گھمایا۔

"اوہو' فلکی بیٹی! آج کیسے یاد کیا بیٹی نے؟"

"انکل آپ نے یاد نہیں کیا تو میں نے سوچا۔ میں ہی یہ فرض ادا کروں۔"

"اچھا اب ہماری بیٹی اتنی سیانی ہوگئی ہے کہ انکل کو شرمندہ کرسکے۔"

"او نہیں... میں تو..."

"اچھا سناؤ کیا حال ہیں؟ ممی اور ڈیڈی کیسے ہیں؟"

"ٹھیک ہیں انکل۔"

"تم کہاں سے فون کررہی ہو۔ سسرال سے یا امی کے ہاں سے؟"

"آج کل تو ممی کے پاس ہوں انکل۔" پھر جلدی سے بولی۔ مبادا انکل کوئی بات کریں۔ "انکل ایک سال ہوگیا ہے آپ نے مجھے کراچی آنے کی دعوت نہیں دی۔"

"بیٹی' یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔ تمہیں دعوت دینے کی کیا ضرورت تھی۔ جب چاہو' چلی آؤ۔"

"یہ بھی کوئی بات ہے۔ اب میں شادی شدہ ہوں اور بغیر بلائے منہ اٹھائے چلی آؤں۔"

"اوہو۔" یہ کہہ کر انکل نے زور زور سے قہقہے لگائے "اتنی سی بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی بیٹی۔ معاف کردو۔ ہمیں' تم دونوں کو دعوت نامہ بھیجنا چاہیے تھا۔"

اوہو بات پھر چھڑنے لگی۔ فلکی کو اختلاج ہونے لگا۔

"اچھا تو بیٹی۔ تم اور آفاق میرے ہاں آکر رہو۔ کہو تو آفاق کو تحریری دعوت نامہ بھیج دوں؟"

"انکل۔" فلکی جھلائی۔ پھر بولی "آفاق تو یہاں نہیں ہیں۔"

"کہاں گیا ہے؟"

"جی وہ امریکا گئے ہوئے ہیں۔"

"اچھا۔ پچھلی مرتبہ جب وہ امریکا گیا تھا تو باقاعدہ مجھے مل کر گیا تھا اور واپسی پر بھی اس نے فون کیا تھا۔ اس مرتبہ چپکے سے چلا گیا۔

فلکی کو اور بھی الجھن ہونے لگی۔ ایک بات کو چھپا کر ستر جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ پھر بھی ڈر رہی تھی کہ کہیں راز فاش نہ ہوجائے۔

"اس مرتبہ بہت جلدی میں گئے تھے۔ کہتے تھے واپسی پر آپ کے ہاں ایک دن رکیں گے۔"

"بہت خوب۔" انکل نے ہنس کر کہا۔ "اچھا تو میں سمجھ گیا اور آج کل تم اکیلی بور ہورہی ہو۔"

"ہاں انکل... ہاں جی..." فلکی جلدی سے بولی۔

"بھئی گوگو تو ہوسٹل چلا گیا ہے' کمہ رہا تھا امتحان سر پر ہیں اور پڑھا نہیں جاتا اور بنو اپنے کالج کی طرف سے کوئی ٹیراج دیکھنے گیا ہے۔ میں اور تمہاری آنٹی ہیں۔ آجاؤ' ہمارا دل بھی لگا رہے گا۔"

"ایسے کیسے آجاؤں انکل۔"

"کیا ٹکٹ بھیجوں؟" انکل نے پیار سے کہا۔

"نہیں انکل... ڈیڈی کو فون کریں اور ان سے کہیں کہ مجھے آپ کے پاس بھیج دیں۔"

"فلکو تیری عادتیں ابھی بچوں والی ہیں۔ وہی ضد وہی شوخی۔"

"انکل پلیز..."

"ہاں بھئی ہاں۔" وہ بولے۔

"ضرور کریں گے فون اپنی پیاری بیٹی کے لیے اور ہمیں تو آفاق بھی پسند ہے۔ انتہائی نفیس اور سلجھا ہوا لڑکا ہے۔ اسے مل کر بھی جی خوش ہوجاتا ہے۔ تم بڑی خوش قسمت ہو۔ فی زمانہ

ایسے لڑکے کہاں...."

"انکل اب تو میری شادی ہوچکی۔ اب کیوں مجھے Convince کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔" اس پر انکل نے قہقہہ لگایا۔

"ہماری بیٹی جیلس ہوگئی۔"

"اور کیا ان کے سامنے بھی ایسا ہی کہیں گے تو وہ اور..."

"ارے نہیں۔" انکل بولے۔

"اس کے سامنے تو ہم اپنی بیٹی کی تعریفیں کرتے ہیں۔"

"اچھا انکل' اب میں فون بند کرتی ہوں۔ آپ ابھی ڈیڈی کو فون کردیں اور ان سے کہیں کہ وہ مجھے کل کے جہاز سے روانہ کردیں۔"

"اچھا۔"

"اگلے منگل کو میری ایک پیاری سہیلی کی شادی ہے۔ اس شادی کے بعد واپس آجاؤں گی۔"

"اور کچھ؟"

"بس فی الحال اتنا کافی ہے۔"

"اچھا بیٹی۔ ابھی صدرالدین کو فون کرتا ہوں اور تمہاری آنٹی کو اطلاع دیتا ہوں کہ تمہارا کمرہ ٹھیک کرادیں۔"

"تھینک یو انکل

خدا حافظ۔"

"جیتی رہو بیٹی۔"

فلکی نے فون رکھ دیا۔

ڈیڈی رات کو گھر آئے تو فلکی کو بُلایا۔

"بھئی یہ تم دونوں چچا بھتیجی نے آپس میں کیا سازباز کر رکھی ہے؟"

"کیا ہوا ڈیڈی؟" فلکی انجان بن کر رہ گئی۔

"آج صبح وقار کا فون آیا تھا۔"

"اچھا انکل وقار کا۔" فلکی مصنوعی انداز میں خوش ہوتے ہوئے بولی۔ "کیا کہہ رہے تھے؟ کیا لاہور آ رہے ہیں؟ عرصہ ہوا انکل کو ملے ہوئے۔ میرا تو دل اداس ہو گیا ہے۔"

"اس کا بھی یہی حال ہے۔" ڈیڈی نے پائپ کا کش لیا اور بولے "کہہ رہا تھا' فلکی سے ملے ہوئے عرصہ ہو گیا ہے۔ اسے چند دنوں کے لیے میرے پاس بھیج دیں۔"

"سچ ڈیڈی؟"

"ہاں ہاں۔ وہ تو مجھ سے زبردست وعدہ لے رہا تھا۔"

"پھر.... پھر آپ نے کیا کہا؟" فلکی بے صبری سے بولی۔

"میں نے کہہ دیا۔ میاں اب وہ اپنے گھر کی ہے۔" ڈیڈی پھر پائپ کے کش لینے لگے اور فلکی جیسے سولی پر لٹک گئی۔ اگر ڈیڈی نے آفاق کے بارے میں سب بتا دیا تو بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ افوہ... ڈیڈی بھی بس...

"میں نے کہا میاں وہ اپنے گھر کی ہے۔ خود مختار ہے۔ ہمارا اس پر کیا زور۔ جہاں چاہے جا سکتی ہے۔"

"اوہ ڈیڈی..." فلکی نے ایک اطمینان بخش لمبی سانس لی... اور دل ہی دل میں دعا دی کہ آپ نے میرا بھرم رکھ لیا۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔ "پھر ڈیڈی میں کب جاؤں؟"

"بھئی اس سے ہم انکار تو نہیں کر سکتے تھے۔ کہہ دیا کہ آ جائے گی۔ مگر اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ اگلے مہینے چلی جانا۔"

"نہیں ڈیڈی نہیں۔" فلکی مچلنے والی تھی کہ ایک دم اسے یاد آ گیا۔ بے تکی بات کرنے سے سارا بھید کھل جائے گا۔ اس لیے نرم لہجہ بنا کر بولی "دراصل ڈیڈی! اگلے منگل کو میری ایک سہیلی کی شادی بھی ہے۔ مجھے اجازت دے دیں۔ ایک ہفتے بعد واپس آ جاؤں گی۔"

"اچھا۔" ڈیڈی پھر پائپ کے دھوئیں میں گم ہو گئے۔

ایک تو ڈیڈی بیٹھے بیٹھے مراقبے میں چلے جاتے ہیں۔ فلکی نے غصّے سے سوچا اس کا پریشان دل دھک کر رہا تھا۔

"تو یوں کرو۔" وہ گویا مراقبے کے عالم سے نکلے۔ "آفاق سے مشورہ کر لو۔"

"اونہہ۔" فلکی کا جی ہی تو جل گیا مگر بڑی حاضر دماغی سے بولی "میں نے ان سے مشورہ کر لیا ہے۔"

"کب... کیسے؟" وہ حیرت سے بولے۔ "وقار کا ٹیلی فون تو آج آیا تھا۔"

"اوہ ڈیڈی! آپ تو بال کی کھال اتارتے ہیں۔ میں نے ان سے یہ کہا تھا' مجھے اپنی سہیلی چندا کی شادی پر کراچی ضرور جانا ہے۔ یہ تو اب انکل کا فون آ گیا ہے تو سوچ رہی ہوں ذرا پہلے چلی جاؤں اور انکل وقار کے گھر ہی رہوں۔ صرف شادی کے روز اپنی سہیلی کے گھر چلی جاؤں گی۔ ویسے پروگرام فائنل ہو گا تو آفاق کو بھی اطلاع دے دوں گی۔"

"اچھا۔" ڈیڈی پھر دھوئیں میں گم ہو گئے۔

توبہ ہے۔ فلکی کی جان پر بنی ہوئی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" وہ جیسے نیند میں بولے "چلی جانا۔"

"کب' کب ڈیڈی؟"

"ابھی تو شادی میں ایک ہفتہ ہے۔"

"مگر ڈیڈی' میں تو کل جانا چاہتی ہوں۔"

"ایک دن میں تم تیاری کیسے کرو گی؟"

"تیاری تو..." پھر اس نے دانتوں میں اپنی زبان پکڑ لی۔ "تیاری کوئی مشکل تو نہیں ہے ڈیڈی۔ چند کپڑے ہی تو رکھنے ہوتے ہیں۔ میں کونسا یورپ جا رہی ہوں۔ کراچی ہی تو جانا ہے۔"

اوہ... دل کا چور زبان پر آ گیا۔ اس نے اندر ہی اندر اپنے آپ کو کوسا۔ ڈیڈی چپ رہے تو بولی "میں کل کی فلائٹ سے چلی جاؤں ڈیڈی؟"

"میں ٹکٹ اور سیٹ کا پتہ کرواتا ہوں۔"

"آپ کیوں کرواتے ہیں میں خود کرلوں گی۔ بس مجھے پیسے دے دیں۔

ڈیڈی ہنس پڑے۔ "ابھی تک وہی بچپنا۔ اچھا ایسے کرو۔ کل نہیں پرسوں چلی جانا۔"

"ٹھیک ہے ڈیڈی۔" فلکی نے اطمینان کی سانس لی۔ "ٹکٹ کے پیسے مجھے دے دیں۔ میں خود اپنی بکنگ کرا کے آؤں گی۔"

ڈیڈی نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سو سو کے دس نوٹ نکالے اور اس کی طرف بڑھا کر بولے "ریٹرن ٹکٹ لے لینا اور واپسی کی سیٹ یہیں سے کنفرم کرا کے جانا۔ آج کل حاجیوں کی آمد کی وجہ سے جہاز میں سیٹ ملنا مشکل ہو رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے ڈیڈی۔"

"فلکی نے روپے پکڑے اور اپنے کمرے میں آگئی۔

جھوٹ کو پروان چڑھانا کس قدر مشکل ہے۔ وہ بیٹھی سوچ رہی تھی۔ جانے کیسے لوگ زندگی بھر ایسے کھیل کھیلتے رہتے ہیں۔ حالانکہ وہ اپنی بقا اور اپنی انا کی خاطر اپنے آپ کو بچا لینے کی خاطر۔ اپنے پیاروں کو عارضی طور پر چھوڑ کر جانا چاہتی تھی۔ پھر بھی یوں بیٹھی تھی جیسے کسی نے شکنجے میں جکڑ رکھا ہو۔ سیروں کے حساب سے خون خشک ہو گیا تھا۔ روز مرتی تھی۔ ایک ہی دھڑکا لگا ہوا تھا' کلیجے کو۔

بنی بات کہیں بگڑ نہ جائے۔

بگڑ گئی تو کیا ہو گا؟

نہ آگے کوئی منزل تھی' نہ پیچھے کوئی رستہ تھا۔

کیسی سُونی سُونی شام اتر رہی تھی۔

سردیوں کی شام تو ویسے ہی مغموم اور مختصر سی ہوتی ہے۔ غریب دوشیزہ کی مانند' جس کی جوانی وقت سے پہلے ہی ڈھل جاتی ہے۔

فلکی گم صم برآمدے میں بیٹھی تھی۔ پرسوں اس نے کراچی چلے جانا تھا۔

آج کی شام اور کل کی شام۔ صرف دو اداس اور مختصری ہوئی انجان شامیں درمیان میں تھیں۔ پھر پتہ نہیں وہ کہاں ہو گی۔ کدھر نکل جائے گی۔

وہ دنیا کے ہجوم میں گم ہو جانا چاہتی تھی۔ اس ننھی بچی کی مانند' جو تن تماشہ دیکھنے نکل جاتی ہے۔ میلے کی ہاؤ ہو اُسے بے کل کر دیتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ اجاڑ گھر میں تو ماں کا سایہ بھی

نہ ملے گا۔ یہیں وہ کھو جائے کوئی اسے اٹھا کر لے جائے۔ انجانے راستوں پر نکل جائے۔ جہاں ویرانیوں کے بھیس سانپ نہ ہوں۔ بلا سے کیسے ہی لوگ ہوں۔

فلکی بھی اپنے آپ کو کہیں رکھ کر بھول جانا چاہتی تھی۔

گم ہو جانا چاہتی تھی۔

دور جانا چاہتی تھی۔

مگر کیا...؟

کوئی گرہ سی جی میں پڑ گئی تھی اور اس گرہ سے ٹیسیں اٹھا کرتی تھیں۔ کیا دنیا کے "بھول بھلیاں" راستے اس گرہ پر خود فراموشی کی دھول ڈال دیں گے۔

کوشش ہی تو ہے۔

فرار اور دانستہ فرار۔

فلکی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

زندگی کا یہ رخ اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔

وہ یقین اور بے یقینی کے دوراہے پر کھڑی ہوئی تھی اور اپنے آپ سے بچ کر بھاگی جا رہی تھی۔ دوڑی جا رہی تھی۔ وہے پاؤں۔ یادوں کے جنگل میں سے نکل جانا چاہتی تھی۔

پتہ نہیں وہ ٹھیک کر رہی تھی یا غلط۔

دور سے مغرب کی اذان ابھری تو فلکی نے اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو پونچھ لیے۔ پاس پڑا ٹرانسسٹر ریڈیو بند کر دیا اور سر پر آنچل ڈال لیا۔

سرد دھواں دھواں فلکی شام میں دور سے آتی ہوئی موذن کی آواز کس قدر روح پرور' کتنی جاں سوز لگتی ہے۔ جیسے کوئی... کلیجہ چیر کر اس میں اترا جا رہا ہو۔ جیسے جیسے...

وہ اٹھ کر بے چینی سے ٹہلنے لگی۔ جیسے آسمان کے کناروں سے کوئی بلا رہا ہو۔

اور کہہ رہا ہو۔

دنیا جھوٹ ہے۔

فریب ہے۔

چھل ہے۔

انسان پاگل ہے۔

بے وقوف ہے۔

دیوانہ ہے۔

سچائی کا صرف ایک راستہ ہے۔

سچائی کے راستے کی طرف آؤ۔

محبت کا صرف ایک ہی چلن ہے۔

بے آواز سجدہ!

ایک ہی یقین ہے اس کائنات میں۔

وحدانیت۔

باقی رہنے والی صرف اللہ کی ذات ہے۔

اللہ کی ذات میں گم ہو جاؤ۔

جانے جی کو کچھ کچھ ہونے کیوں لگتا ہے۔ ایسی اذان سن کر۔

خواہ مخواہ سجدے میں گر جانے کو جی چاہتا ہے۔

اللہ کو کھوجنے کو جی چاہتا ہے۔

کتنی غمگین' کتنی اداس' کتنی جان لیوا ہے مغرب کی اذان۔

شام کیا' شام زندگی کی علامت ہے۔ اداس کر دیتی ہے۔

فلکی کا جی دکھنے لگا۔

اذان ختم ہو گئی تو اسے خیال آیا وہ مغرب کی نماز پڑھ لے۔ جانے سے پہلے اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ لے۔ رو رو کر اس سے رخصت مانگ لے۔ مگر پھر وہ دل میں بگڑ گئی۔

"میں نہیں پڑھوں گی نماز۔"

آفاق کے توسط سے اس نے خدا کو جانا تھا مگر خدا نے اس کو کیا دیا۔

دوسرا سجدہ اس نے آفاق کو کیا تھا۔ وہ بھی رائیگاں گیا اور اللہ میاں... بس ڈوری ہلا کر تماشا دیکھتے رہے۔

اری پگلی.... اللہ سے سودا کرتی ہے.... نماز سودے بازی نہیں ہے۔ سر جھکا کر نہ اٹھانا سجدے کی معراج ہے۔

ہوں' تو سودے بازی کس سے کروں؟ کس سے کروں؟ کس سے مانگوں؟ کس کے آگے ہاتھ پھیلاؤں؟ کس کا دامن پکڑ کر چیخوں چلاؤں؟ کون سنتا ہے؟

اس کے سوا کون سنتا ہے؟

میرا اس دنیا میں کون ہے؟

فلکی باقاعدہ رونے لگی۔

جڑواں بچوں کی طرح آنسو دونوں رخساروں پر گرنے لگے۔

افوہ! ذرا سا دل خالی ہوا تو سارے رشتے ناتوں سے ایمان اٹھ گیا۔ ڈیڈی بھی تھے۔ ممی بھی تھیں۔ مگر وہ نہیں تھے وہ جیسے دنیا میں اس کا کوئی نہیں تھا۔

فلکی جیسے اپنے آپ سے بگڑ گئی۔ سارے زمانے سے خفا ہو گئی۔

میں کچھ نہیں کروں گی۔ کچھ بھی نہیں۔

وہ سکڑ کر ایک طرف بیٹھ گئی۔

اسی وقت ممی اپنا "منک" کا لمبا کوٹ پہنے' خوشبوؤں کے فوارے چھوڑتی اس کے پاس آ گئیں۔

"یہاں کیوں بیٹھی ہو ڈیئر' چلو اندر ہیٹر کے پاس چل کر بیٹھو۔"

"یوں ہی ممی... ابھی اندر چلی جاتی ہوں۔"

"آج یزدانی صاحب کے ہاں طنبولا پارٹی ہے اور ڈنر بھی ہے۔ چلو گی میرے ساتھ۔"

"ممی.... میں نے آپ سے کتنی بار کہا ہے۔ ان دعوتوں' پارٹیوں سے مجھے نفرت ہے۔"

"پھر کیا ہوا ہے تم کو فلکو؟" ممی تردد سے بولیں۔ "اچھی بھلی ایک دم بگڑ جاتی ہو؟"

"بس میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے' ممی۔"

"کیا ہوا طبیعت کو؟" ممی ایک دم ہراساں ہو گئیں اور بولیں "کہیں کہیں...."

"نہیں ممی۔" فلکی کو معلوم تھا ممی کیا پوچھنا چاہتی ہیں۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے ممی۔" اس نے ذو معنی انداز میں کہا۔

(اور ایسی کوئی بات شاید زندگی بھر نہ ہو۔)

"اچھا ہی ہے۔" ممی نے جلدی سے کہا "بے وقوف لڑکیوں کی طرح پھنس نہ جانا۔ ابھی تو نے دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے۔ بچہ جلدی ہو جائے تو زندگی ہی غارت ہو جاتی ہے۔ پہلے اپنی صحت اور موڈ ٹھیک کرو۔ وہاں تو آفاق مجھے کہہ رہا تھا کہ وہ چھ مہینے کی چھٹی لے کر تمہیں "اراؤنڈ دی ورلڈ" لے جائے گا مگر یہاں آ کر وہ تمہارے ڈیڈی کی طرح روپے بنانے کی مشین بن گیا ہے۔ ڈارلنگ تمہیں بھی بالآخر نازلی صدرالدین بننا پڑے گا۔ اپنے لیے فیصلے خود کرنے پڑیں گے۔"

فلکی شام کی پھیلتی تاریکی میں اداسی سے مسکرائی۔

میں نے اپنے لیے فیصلہ کرلیا ہے۔ گو وہ آپ کے فیصلوں سے مختلف ہے۔ میں نے خود ہی اپنے آپ کو بن باس کا حکم دے رکھا ہے کیوں کہ آپ کی طرح خوب صورت ملبوسات اور جواہرات کا بوجھ اٹھا کر میں دنیا میں چلنے کے قابل نہ تھی۔

فلکی کھڑی ہوگئی۔

"اپنا دھیان رکھا کرو ڈارلنگ..."

"اچھا ممی۔"

"اچھا اب میں چلتی ہوں۔ تمہارے ڈیڈی دفتر سے وہاں آجائیں گے۔ تم کھانے پر میرا انتظار نہ کرنا۔"

میں نے کھانے پر کبھی آپ کا انتظار نہیں کیا ممی۔ فلکی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آگئی۔ بچپن سے تنہا کھانا کھا رہی ہوں اور تنہا ہی کھانا کھاتی رہوں گی۔ میں صرف انتظار کرنے اور دکھ اٹھانے کو پیدا کی گئی ہوں۔

میری پیدائش کا مقصد صرف ایک مرد کو زندگی بھر کے لیے مشکور کرکے اپنا غلام بنانا تھا اسی لیے ہر مرد مجھے ٹھکرائے گا اور میں کہیں بھی چین نہ پاسکوں گی۔

موٹر اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔

ممی شاید جاچکی تھیں۔

ممی نے کبھی مڑ کر نہ دیکھا تھا۔ مبادا وہ پتھر میں بدل جائیں۔ وہ آگے دیکھا کرتی تھیں، پیچھے نہیں اس لیے جوان بھی تھیں اور امنگ بھری بھی۔

ممی تم کتنی خوش قسمت خاتون ہو مگر اتنی خوش قسمت خاتون کے بطن سے ایک بدبخت لڑکی نے کیوں جنم لیا۔ کس جرم کی پاداش میں۔ جالی والے ٹھنڈے ٹھنڈے دروازے سے فلکی نے اپنا رخسار لگالیا اور گرم گرم آنسو بہانے لگی۔ سردی میں گرم آنسو کتنے اچھے لگتے ہیں۔ زندگی کی حرارت کا احساس دلاتے ہیں۔ اپنے دل کی آگ ہی اپنے تن کو روشن کردیتی ہے۔ ٹھنڈے دروازے نے بے حس ماں کی یاد دلادی اور گرم گرم آنسو جابر شوہر کی سختیاں یاد دلانے لگے۔

رمضو چائے لے کر کمرے میں آگیا تھا۔

فلکی نے چائے بنائی اور ٹیپ آن کردیا۔

اداس اداس، خاموش خاموش فضا میں ایک گیت رینگنے لگا۔

ہم تیرا شہر چھوڑ جائیں گے
لَوٹ کر پھر کبھی نہ آئیں گے
زندگی کی اداس راہوں میں
ایک ساتھی بِلا تھا چھوٹ گیا
ایک پتھر تھا جس کو چاہا تھا
ایک شیشہ تھا گر کے ٹوٹ گیا
اشک پی پی کے مسکرائیں گے
ہم تیرا شہر چھوڑ جائیں گے

ہم تیرا شہر چھوڑ جائیں گے۔
ہم تیرا شہر چھوڑ جائیں گے

در و دیوار ہلنے لگے۔ سائے رونے لگے۔ کمرے کی ایک ایک شے فلکی کے گلے سے لگ گئی۔

بستر کے ٹھنڈے تکیے۔ رازدروں کی ساتھی رضائی... ڈریسنگ ٹیبل کے جگر میں لگا ہوا حیران حیران آئینہ۔

خوشبوئیں...

پاؤڈر، لپ اسٹک، کاجل۔

سب رو رو کر کہہ رہے تھے

ہم تیرا شہر چھوڑ جائیں گے
ہم تیرا شہر چھوڑ جائیں گے

اگلی صبح وہ قنوطیت کے مارے بستر سے نکل ہی نہ سکتی تھی۔ آج لاہور میں اس کا آخری دن تھا اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس سمندر سے ایک قطرہ ہمیشہ کے لیے نکل جائے گا۔ اس نے ناشتہ بھی کمرے ہی میں کیا... اور پھر ایک کتاب لے کر وراز ہو گئی۔

اسی وقت بالکل اچانک ڈیڈی کمرے میں آ گئے۔ یہ وقت تو ڈیڈی کے دفتر جانے کا ہوتا ہے۔ اس کا خیال تھا وہ جا چکے ہوں گے۔ انھیں کمرے میں دیکھ کر وہ بہت حیران ہوئی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

ڈیڈی جلدی جلدی پائپ کا دھواں چھوڑ رہے تھے۔ جب ڈیڈی نروس ہوتے تو ایسا ہی کرتے تھے۔

"کیا کر رہی ہے ہماری بیٹی..." انھوں نے جیسے یوں ہی بات بنانے کے لیے کہہ دیا۔

"کچھ نہیں ڈیڈی۔" فلکی نے رضائی پرے سرکائی.... بیٹھیے ڈیڈی۔"

ڈیڈی بیٹھے نہیں.... بے چینی سے اِدھر اُدھر ٹہلتے رہے... اور پھر رکتے رکتے بولے...."

بیٹا.... وہ.... وہ.... وہ آفاق نے تمھارا سامان بھجوایا ہے۔"

"جی....؟" فلکی اچھل پڑی۔

"وہ... وہ کہہ رہا تھا کہ... تم اس سے طلاق لینا چاہتی ہو۔"

فلکی کا رنگ اُڑ گیا... اور دل تیز تیز دھڑکنے لگا... آہ' امید کے تابوت میں یہ آخری کیل تھی۔ اس نے سوچا۔

"خیر... خیر...." ڈیڈی سامنے صوفے پر بیٹھ گئے۔

"اگر تم اس کے ساتھ خوش نہیں ہو تو سارا معاملہ تمھاری خوشی کا ہے... تمھاری زندگی کا ہے... ہم دخل نہیں دیں گے۔ اگر تم سمجھتی ہو یہی بہتر ہے... تو... تو... تمھاری مرضی.. تمھاری ممی کو میں سمجھا دوں گا۔"

فلکی نے سر جھکا لیا... اور ٹپ ٹپ آنسو اس کے انگوٹھے پر گرنے لگے۔

"رو نہیں میری بچی...." ڈیڈی اسے دلاسہ دیتے ہوئے بولے۔ "اگر تمھیں کوئی تکلیف تھی تو تم نے ہمیں کیوں نہیں بتایا... بہرحال تم نے جس صبر و ضبط کا مظاہرہ کیا ہے اس پر ہمیں فخر ہے... ہمیں اپنی بیٹی کی خوشیاں ہر قیمت پر عزیز ہیں۔ ہم نام نہاد عزت کا ڈھونگ نہیں رچاتے... اول تو وہ خود ہی طلاق دے دے گا... لیکن کچھ ایسی مشکلیں اس نے کھڑی کر دیں تو ہم عدالت سے رجوع کریں گے۔"

فلکی کے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ڈیڈی اٹھ کر اس کے قریب آئے اور اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر نہایت شفقت سے بولے "نہ رو میری بچی... نہ رو میرا دل ٹکڑے ہوتا ہے۔"

بس اتنی سی بات پر فلکی نے ایک دلخراش چیخ ماری اور ڈیڈی سے لپٹ گئی.. ڈیڈی کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

اس کا دل چاہنے لگا کہ آج اپنے دکھ درد کی داستان اپنے ڈیڈی کو سنا ہی دے' آج انھیں بتا دے کہ اس گھر میں اس پر کیا بیتی... اس ستم شعار نے اس کے ساتھ کیسا ناروا سلوک کیا۔ کتنی باتیں اس نے اپنے سینے میں دفن کر لیں۔ بتا دے اپنے ڈیڈی کو.... گزرے دنوں اور سوئی راتوں کی ایک ایک بات تاکہ اس کے ڈیڈی کو پتہ چل جائے کہ واقعی ان کی بیٹی نے صبر و ضبط کا کتنا زبردست مظاہرہ کیا مگر اسی وقت نوکر سامان اٹھائے اندر داخل ہوئے۔

فلکی نے ڈیڈی کا کندھا چھوڑ دیا اور پرے ہٹ کر بیٹھ گئی۔ ڈیڈی کا کالر فلکی کے آنسوؤں سے بھیگ گیا تھا۔ ان کی گردن پر فلکی کے آنسوؤں کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے اور وہ اس وقت بیمار اور متحمل سے دکھائی دے رہے تھے۔ فلکی کو ڈیڈی کی جھکی ہوئی کمر پر بہت ترس آیا۔

ایک صندوق آیا' دوسرا' پھر تیسرا... اسی طرح پورے سات صندوق آ گئے۔ نوکروں نے سارا سامان ایک دوسرے کے اوپر رکھ دیا اور باہر چلے گئے۔ کپڑے' زیور' جوتے' میک اپ... سب کچھ... سب کچھ... اب اس گھر میں اس کا کوئی نشان نہیں رہ گیا تھا۔

اس مغرور انسان نے ظلم کی انتہا کر دی تھی... اس کو حرفِ غلط کی طرح مٹانے کی کوشش کی تھی۔ اب ڈیڈی سے چھپانا فضول تھا۔ اس نے ڈیڈی کی طرف دیکھا تو ڈیڈی بولے۔

"ہمیں معلوم ہے۔ ہماری بچی بہت بہادر ہے اور ہر فیصلہ سوچ سمجھ کر کرتی ہے۔ ہم

تمہارے ہر فیصلے کو تسلیم کریں گے۔ ویسے تمہیں سوچنے کے لیے ایک مہینہ دیتا ہوں۔ جی میلا نہ کرو... دنیا میں تمہاری خوشی ہر قیمت پر خریدی جائے گی۔" ایک دَم فلکی نے ڈیڈی کے لیے اپنے دل میں ہمدردی محسوس کی اور کھڑے کھڑے بہادر بن گئی۔

بھلا میں اپنے ضعیف باپ کو اس کم ظرف انسان کے آگے کیوں جھکاؤں گی... کیوں گڑگڑائیں ڈیڈی... کیوں میرے لیے رحم کی بھیک مانگیں۔ بہتر ہے میں یہاں سے نکل جاؤں۔ یہ خود مقدمے بھگتتے رہیں۔ میں ان سب کا ایک حصہ کیوں بنوں۔ آواز صاف کرکے بولی "ڈیڈی... آپ میری فکر نہ کریں... کل میں کراچی جارہی ہوں۔ وہاں سے واپس آکر آپ سے مفصّل بات کروں گی۔" سوگواری سے بن کربولی "آپ کی بیٹی بزدل نہیں ہے۔"

"شاباش۔" کہتے ہوئے انھوں نے اسے گلے لگالیا۔ "جب تم کراچی سے واپس آؤ گی تو ہم تفصیل معلوم کرنا چاہیں گے۔"

"ٹھیک ہے... میں بھی آپ سے کھل کر بات کروں گی۔"

"ہماری بیٹی سفر کے قابل تو ہے نا؟" انھوں نے جاتے جاتے بے یقینی سے پوچھا۔

"اوہ... ڈیڈی میں صبح تک بالکل نارمل ہوجاؤں گی۔"

"وقار سے کچھ نہ کہنا۔"

"اُو' نو ڈیڈی... آپ مجھے کیا اتنا بے وقوف سمجھتے ہیں... گھر کی بات تو گھر میں رہنی چاہیے۔"

ڈیڈی اس طرح فلکی کے کمرے سے باہر گئے جیسے وہ فلکی کا سامنا نہ کرسکتے ہوں۔ ڈیڈی کے جانے کے بعد فلکی نے اپنے اردگرد بکھرے ہوئے سامان کو دیکھا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ پلیٹ فارم پر کھڑی ہے۔ اِردگرد سامان ہی سامان ہے۔

اسے کس ٹرین کا انتظار ہے... پتہ نہیں وہ کون سے پلیٹ فارم پر ہے... پتہ نہیں اس نے کس سٹیشن پر اترنا ہے... پتہ نہیں اس کی منزل کون سی ہے... منزل کا غم نہ کر' اٹھ اور اپنے آپ کو اس دنیا میں گم کردے! ایک نئے عزم سے اس نے اپنا سفری سامان ٹھیک کرنا شروع کردیا۔

ممی اور ڈیڈی نے باہر آکر فلکی کو خدا حافظ کہا۔ آج ڈیڈی نے بطور خاص اس کی پیشانی کو چوما تھا... مگر ڈیڈی کی آنکھیں بار بار اس کے اداس اور کھوئے ہوئے چہرے کا طواف کررہی تھیں' جیسے کہہ رہی ہوں' یہ زندگی کی ڈگر ہے بیٹی! کہیں ٹھوکر نہ کھاجانا... بوڑھے باپ کو اکلوتی بیٹی کا غم توڑ پھوڑ دیتا ہے مگر انھوں نے اپنی زبان سے کچھ نہیں کہا' بڑے انہماک سے پائپ پیتے رہے اور بڑے وقار سے خدا حافظ کہا۔

ممی بالکل نارمل تھیں... بس اتنا کہا۔ "وقار اور زبیدہ کو میرا سلام کہنا اور وہاں سے میرے لیے ساڑیاں لیتی آنا..."

ممی تم کیا جانو' میں کہاں جارہی ہو؟ فلکی نے دل ہی دل میں کہا... کس دیس جارہی ہوں۔ جانے وہاں سے کوئی واپس آتا بھی ہے یا نہیں... ممی جلدی سے اندر چلی گئیں... باہر بہت سردی تھی۔

موٹر گیٹ سے نکل گئی... ارے میری بچپن کی ہمجولی سڑک! میں جارہی ہوں... تو میرے ساتھ جوان ہوئی ہے۔ تیرے سینے پر میرے معصوم قدموں کے نشان ہیں... تو جانتی ہے۔ میں معصوم تھی۔ ناکردہ گناہوں کی پکڑ نے مجھے مجرموں کے کٹہرے میں لاکھڑا کیا... اے میرے شہر! اے میرے لاہور! میں جارہی ہوں... آج ان فضاؤں میں تیری خوشبو رچی ہے... یہ خوشبو چُرا کر لے جاؤں گی' کیونکہ دنیا کی کسی اور دھرتی پر تجھ جیسا شہر نہ ہوگا... تو میرے دل میں آباد رہے گا... بچپن کی یادوں کی طرح الوداع... الوداع!... اس کے تصورات میں سارا شہر اسے الوداع کہہ رہا تھا...!

میکہ تو اسی لیے ہوتا ہے کہ لڑکی کو ایک دن الوداع کہہ دے... میکہ تو واپس مڑکر دیکھنے کی اجازت نہیں دیتا... میرے بچپن کے گھر! اس ننھی بچی کو یاد رکھنا جسے تمنائی کی آگ نے بھسم کردیا تھا... لوگو! الوداع.. پیارو! الوداع... اے ہنستے بستے شہرو! تم میں سے کوئی نہ جانے گا...

کہ تم میں سے کون نکل گیا جو کسی کے دل میں نہ ہو... بھلا اس کے جانے کا رنج کسی کو کیوں ہو.... جب میرے جنم دینے والے نہیں جانتے کہ میں کہاں جا رہی ہوں تو اور کون جان سکتا ہے؟ کوکھ سے جنم دینے والی ماں کے کلیجے سے ہوک نہیں اٹھ رہی... کیسا اطمینان تھا اس کے چہرے پر... کل بیٹھ کے مجھ کو روئے گی... مگر کون روتا ہے جانے والوں کے لیے... دو دن غم کرتے ہیں... پھر دنیا کی دلکشی میں سب بھول جاتے ہیں... یہ دنیا اسے فرصت کہاں دیتی ہے... وہ خیالات کے طوفانوں میں ہچکولے کھاتی رہی۔

ہاں' اپنی آگ اپنے ساتھ لے جانی پڑتی ہے... ڈولی ہو یا کفن...

جانے فلکی کے دل کو کیا ہونے لگا... ایک دم جذباتی ہو گئی... اندر ہلچل مچ گئی.... ایک ضدی بچی اس کے اندر مچلنے لگی۔ دونوں ہاتھوں سے اسے دھکے دینے لگی... جیسے کہہ رہی ہو... واپس چلو...

واپس چلو!

واپس چلو!!

نہیں۔۔ اس نے اپنے کلیجے پر ہاتھ رکھ لیا۔

اتنا بڑا فیصلہ کر لینے کے بعد اب نہیں....

آوازوں کا بھونچال اس کے اِردگرد بگولہ بنا ناچنے لگا.. ایسے لگا جیسے وہ وسوسوں کے گرد باد میں پھنس گئی ہے۔ باہر جانے کا کوئی راستہ نہیں مل رہا۔

"ڈرائیور' ریڈیو لگا دو۔" اس نے خنجر بردار خیالوں کی چبھن سے بچنے کے لیے ڈرائیور سے کہا۔ ڈرائیور نے ریڈیو لگا دیا... ایک نغمہ دھیمے سُروں میں بج رہا تھا... موٹر کے اندر کا ماحول بدل گیا... جیسے دھواں باہر نکل گیا ہو... روشنی اندر آنے لگی ہو۔

موٹر سڑکوں پر رینگ رہی تھی۔

ڈرائیور ایئرپورٹ کی طرف جا رہا تھا۔

مگر ایئرپورٹ کو دو راستے جاتے تھے... ایک تو نہر کی طرف مال روڈ سے ہو کر اور دوسرا گلبرگ کی طرف سے۔

اگر ڈرائیور گلبرگ کی طرف سے جاتا تو ظاہر ہے کہ اسے "رازداں" کے آگے سے گزرنا پڑتا... عین چھاؤنی والے پُل کے ساتھ.... آفاق کا گھر تھا... اب وہ ڈرائیور کے ہاتھوں کی طرف دیکھ رہی تھی... کہ وہ کس طرف اسٹیئرنگ گھماتا ہے... اسی وقت اناؤنسر نے کہا۔

اب آپ حبیب ولی محمد کی آواز میں ایک خوب صورت نغمہ سنیں۔

گھنٹیاں بجاتی ہوئی آواز فضا میں رَس گھولنے لگی....

آشیاں جل گیا' گلستاں لُٹ گیا
اب چمن سے نکل کر کدھر جائیں گے
اتنے مانوس صیّاد سے ہو گئے
اب رہائی ملے گی تو مر جائیں گے

پہلے تو اس نے سمجھا کہ گانے والے کی جاں گداز آواز نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ درد ہی درد تھا' الفاظ میں۔ یا شاید اس کا دل آج ایک دکھا ہوا پھوڑا بنا ہوا تھا اس لیے ہر بات نشتر کی طرح لگ رہی تھی۔

مگر جوں جوں وہ یہ گیت سنتی جاتی... دل کا درد بڑھتا جاتا... اور پھر جیسے چاروں طرف سے ایک ہی پکار ہونے لگی....

اتنے مانوس صیّاد سے ہو گئے
اب رہائی ملے گی تو مر جائیں گے

ہاں... کئی بار اس نے یہ گیت سنا تھا مگر اس شعر کے اصلی معنی اسے آج ہی سمجھ آئے تھے۔

اب رہائی ملے گی تو مر جائیں گے

زن سے ایک موٹر پاس سے گزر گئی۔

اب رہائی ملے گی تو مر جائیں گے۔

اف... یہ نغمہ بند کیوں نہیں ہو جاتا۔ اس نے سوچا۔ ناحق ریڈیو لگایا... باہر کی طرف نظر کی تو دیکھا۔ ڈرائیور "رازداں" والی سڑک پر مڑ چکا تھا... جانے کیوں فلکی کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ ایک آخری نظر اس گھر پر بھی ڈالتی جاؤں جس نے میری دنیا بدل کر رکھ دی۔

"اب رہائی ملے گی تو مر جائیں گے۔"

اس کا بھی شکریہ ادا کرتی جاؤں۔

"اتنے مانوس صیّاد سے ہو گئے۔"

جانے کیوں ایک منّھی سی خواہش اس کے دل میں اُبھری۔ کاش آفاق باہر کھڑا ہوا اور وہ اس منظر کو دیکھ لے... مگر کیوں؟ جلدی سے اس نے اپنے دل کو ڈانٹا... کیوں... کیوں۔

"اتنے مانوس صیاد سے ہوگئے۔"

میں اس کی صورت بھی نہیں دیکھوں گی۔

"اب رہائی ملے گی تو مرجائیں گے۔"

کبھی یہاں لَوٹ کر نہیں آؤں گی۔ اس گھر کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھوں گی...

اتنے مانوس صیاد سے ہوگئے۔"

میرا اس کا اب کیا ناتا؟

ہاں.. ہاں... مرجائیں گے.. مرجائیں گے... مگر اس صیاد کے پاس نہیں جائیں گے۔ اس نے آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھ دیے اور سیٹ کی پشت پر سر ٹکالیا تاکہ جی بھر کر روئے۔

اسی وقت اسے احساس ہوا کہ گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی ہے۔ دل میں سوچا۔ ٹریفک کا سگنل ہوگا۔ آنکھیں صاف کرکے اِدھر اُدھر دیکھا تو فلکی طیش میں آگئی۔

"یہ کہاں آگئے ہو ڈرائیور؟" فلکی نے چلّا کر کہا۔ "ایئرپورٹ چلو۔ دیر ہو رہی ہے۔"

"سر آپ کے ڈیڈی نے یہاں لانے کو بولا تھا۔"

"مگر میں نے تو نہیں بولا تھا۔" فلکی چِلّائی "جلدی موڑو گاڑی۔" فلکی کو اختلاج ہونے لگا۔ کہیں اندر سے آفاق نہ نکل آئے۔ کیونکہ اس کی موٹر باہر کھڑی تھی اور یہ اُلو کا پٹھا ڈرائیور پتہ نہیں کس نشے میں تھا۔ موٹر کو "رازداں" کے اندر لے آیا تھا۔ کاش وہ آنکھیں کھول کر بیٹھتی۔

"سر' آپ کے ڈیڈی کا حکم تھا کہ میں آپ کو "رازداں" میں اتار کر آجاؤں۔"

"ڈیڈی یہ حکم نہیں دے سکتے۔" فلکی چِلّائی "اور ڈیڈی کی کیا مجال کہ مجھ سے مشورہ کیے بغیر ایسا کہہ دیں۔ جلدی چلاؤ' ورنہ موٹر میں سے اتر جاؤ۔ میں خود چلا کر لے جاؤں گی۔" فلکی پچھلا دروازہ کھول کر باہر آگئی... اور اتنی زور سے دروازہ بند کیا کہ عبدالکریم دوڑتا ہوا باہر آگیا۔ فلکی کو دیکھ کر اس کے چہرے پر ایسی روشنی نمودار ہوئی جو اچھے مالکوں کو دیکھ کر پیدا ہوتی ہے۔ اس نے ہاتھ میں ٹرانسسٹر ریڈیو پکڑا ہوا تھا اور ریڈیو بے اختیار چیخ رہا تھا۔

اتنے مانوس صیاد سے ہوگئے

اب رہائی ملے گی تو مر جائیں گے

اُفوہ! فلکی کا دل چاہا کہ وہ ریڈیو لے کر عبدالکریم کے سر میں دے مارے۔ اس پر ایک ہیجان سا طاری تھا۔ اس وقت وہ قیامت کھڑی کردینا چاہتی تھی۔ زندگی سے گزر جانا چاہتی تھی۔ کچھ

کر بیٹھنے کے موڈ میں تھی۔ جانے کیسی تکلیف میں گزر رہی تھی۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو پہچان نہیں پا رہی تھی۔

عبدالکریم... بے اختیار ڈکی کھول کر سامان اٹھانے کو آگے بڑھا تو وہ غصّے سے گرج کر بولی "صاحب کہاں ہیں؟" ایک دم اس نے آفاق سے دو بدو لڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے سوچا وہ چوروں کی طرح چھُپ کر نہیں جائے گی۔ وہ آج آفاق کا حساب بے باق کردے گی اور صاف صاف کہہ دے گی کہ....

"جی صاحب اپنے کمرے میں ہیں۔" عبدالکریم نے مودبانہ جواب دیا۔

وہ بے اختیار اندر کو دوڑی۔ رک کر گھڑی دیکھی۔ ابھی فلائٹ کے جانے میں ایک گھنٹہ تھا۔ وہ وقت سے پہلے نکل آئی تھی۔ دوڑ کر آفاق کے کمرے میں چلی گئی۔ مبادا اس کا اندر جانے کا ارادہ بدل جائے مگر آفاق اپنے کمرے میں نہیں تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ عبدالکریم اس کے پیچھے آرہا تھا۔ جلدی سے سر اُٹھا کر بولا۔

"جی اُس کمرے میں۔"

جس کمرے میں فلکی رہتی تھی۔ اس نے اُدھر اشارہ کیا۔

"صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں... کئی دنوں سے دفتر نہیں گئے۔ اس کمرے میں لیٹے ہیں۔"

فلکی نے یہ بکواس سنانے کے لیے نہیں کہا تھا' وہ خود ہی بولے جارہا تھا۔

فلکی کو غصّے میں اور چپ دیکھ کر وہ خود ہی باہر چلا گیا۔

فلکی بے اختیار دوڑتی ہوئی آئی۔ اس کمرے کا دروازہ بند تھا۔ غصّے سے اس نے لات ماری۔ دروازہ دَھڑ سے کھُل گیا۔

آفاق اس کے کمرے میں' اسی ڈبل بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر چونکا اور پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پاؤں پلنگ کے نیچے لٹکا لیے مگر کھڑا نہیں ہوا۔

عین دروازے کے بیچ میں فلکی رک گئی... جھجک گئی۔ اس نے دونوں چوکھٹوں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور صلیب بن کر کھڑی ہوگئی۔ اپنی اس جرات پر وہ خود ہی حیران و ششدر رہ گئی۔ جیسے وہ دروازے میں نہیں دوراہے پر کھڑی ہو۔ ایک جہان دروازے کے اندر تھا اور ایک جہان دروازے کے باہر تھا۔

باہر سے اُبال کھاتی' شعلے اگلتی وہ جو کچھ سوچ کر چلی تھی۔ اس پر عمل کرنا مشکل نظر آرہا تھا۔ اندر آفاق کی صورت دیکھ کر اس کے جذبے پھر ڈگمگانے لگے تھے۔ اسے یہ سب کرنا

چاہیے یا نہیں؟

آفاق اس کے سامنے بیٹھا اسے ایک ٹک دیکھے جا رہا تھا جیسے کوئی سادھو دھونی رمائے بیٹھا جاپ کر رہا ہو۔

(ظالم کس قدر معصوم لگ رہا تھا)۔

... اور وہ آفاق کی آنکھوں میں گھورتی ہوئی یوں کھڑی تھی جیسے اسے غیر مرئی طاقت نے باندھ دیا ہے۔ اسے سکتہ ہو گیا۔

آفاق کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ شیو بڑھی ہوئی تھی۔ کپڑے میلے تھے۔ بستر شکن آلود تھا۔ نرم تکیے کا تکیب بتا رہا تھا کہ اسے مسلسل کئی دنوں سے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس کے خوب صورت بال گھنگھلک تھے۔ سلیپنگ سوٹ کی بشرٹ کے اوپر والے دو بٹن ٹوٹے ہوئے تھے۔ گلا نیم وا تھا۔ بالوں سے بھرا ہوا سینہ نظر آ رہا تھا۔ سانس کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ چھاتی کے بال یوں ہل رہے تھے، جیسے ان پر کوئی ہولے ہولے پھونکیں مار رہا ہو۔ یہ منظر فلکی کے لیے جان لیوا تھا۔

... اور وہ گیان دھیان کے عالم میں فلکی کو تکے جا رہا تھا۔

گم صم... جیسے وہ آج زبان سے نہیں آنکھوں سے بول رہا ہو۔

اس کی آنکھوں کی زبان پر فلکی اعتبار نہیں کرتی تھی اس لیے اس کے چہرے سے نگاہ ہٹا کر سارے کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ کمرہ ویسا ہی تھا جیسا فلکی چھوڑ کر گئی تھی۔ فلکی کو گئے دو مہینے ہو چکے تھے مگر کوئی چیز اپنی جگہ سے نہیں ہلائی گئی تھی۔ چادریں تک نہیں بدلی گئی تھیں۔ ابھی تک پلنگ کے کٹہرے پر وہ سرخ بیڈ کور پڑا تھا جو فلکی روز بستر پر بچھایا کرتی تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل پر شیشیاں اسی طرح بکھری پڑی تھیں جس طرح جاتے وقت فلکی نے انھیں توڑا پھوڑا تھا۔ گلدان میں ابھی تک وہ سرخ شعلہ پھول پڑے تھے جو اس نے سجائے تھے، مگر اب مرجھا کر سیاہ ہو چکے تھے۔ اس کے جانے کے بعد کمرے کی کسی چیز کو چھیڑا تک نہیں گیا تھا۔ کمرے میں ویسے ہی خوشبو تھی۔ سگریٹ .... پرفیوم اور پھولوں کی ملی جلی خوشبو۔ جسے وہ آفاق کی خوشبو کہا کرتی تھی۔

اس خوشبو نے اسے ڈگمگانے پر مجبور کر دیا۔

آگے بڑھ ... اس کا دل جیسے پیچھے سے اسے دھکے دے رہا ہو۔ آگے بڑھ ... اور جو سوچ کر آئی تھی وہ کر۔

کیسے کروں؟ یہاں تو دنیا ہی بدلی ہوئی ہے۔ وہ کم بخت اس معصوم بچے کی مانند، جس کی بیدر

ماں نکاحِ ثانی کر کے چلی جاتی ہے، کیسا ویران، کیسا اُجڑا سا لگ رہا ہے۔

وہ کلف لگی گردن والا آدمی یوں مُرجھا جائے گا۔ مجھے کیا پتہ تھا۔ یہ روپ تو میں نے دیکھا ہی نہیں تھا۔ یوں سوالی بن کے تو اس نے مجھ سے میرا چہرہ مانگا نہیں تھا۔ اس کی نظریں چہرے سے ہٹیں تو میں کچھ کہوں۔

پھر کیوں کچھ اور سوچتی ہے۔ بڑھ کر اپنے روٹھے ہوئے محبوب کو سینے سے لگا لے۔

جھوٹی اکڑ اور بناوٹی غصّے کا خول تو بھی اتار دے۔ یہاں آ گئی ہے تو پھر کیوں جھجک رہی ہے۔ اپنے واہموں کی ساری کشتیاں جلا کر اس جہانِ نو میں قدم رکھ۔

فلکی نے اپنے دونوں ہاتھ چھوڑ دیے۔ پھر ایک قدم بڑھا کر اسی طرح کھڑے کھڑے اپنے دونوں ہاتھ پشت کی طرف کر کے دروازہ بند کر دیا۔ اب وہ اس جہاں میں تھی جو دروازے کے اندر تھا۔

پتہ نہیں تھوڑی دیر میں کیا ہونے والا ہے؟ وہ دل ہی دل میں ڈرنے لگی۔

پتہ نہیں اب اس کا کیا حشر ہونے والا ہے۔ اب تو جو بھی حشر ہو سو ہو۔ جذبے سچے ہوں تو اپنی سچائی کو منوا لیتے ہیں۔ بات کس طرح شروع کرنی چاہیے۔ وہ تو یوں بیٹھا ہے جیسے منہ میں زبان ہی نہ ہو۔

اس کا حال پوچھنا چاہیے۔

گھر کے بارے میں سوال کرنا چاہیے یا....

ہاں وہ کہہ دے گا کہ تم کون ہو اور یہاں کیا کرنے آئی ہو۔

کہہ دو کہ میں محبت کا حق استعمال کرنے آئی ہوں اور اس سے بڑا حق دنیا میں کوئی نہیں۔

کہہ دو کہ مجھے جذبہ دل کھینچ کر لایا ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی بلاوا نہیں۔

کہہ دو کہ دل کے رشتوں کے آگے نکاح کے بندھن کچھ نہیں ہیں۔ میں ایک نیا بندھن باندھنے آئی ہوں۔

اپنے پیچھے سب دروازے بند کر دو۔

صرف وفا کا دروازہ کُھلا رہنے دو۔

کہ عورت صرف وفا ہے... وفا اور وفا۔

آج آخری بار اپنی انا، خودداری، پندار و وقار کو کانچ کے برتن سمجھ کر ریزہ ریزہ کر دو اور پھر ان کرچیوں پر چل کر دکھاؤ۔

کرچیوں پر چلنا عشق کی شعبدہ بازی ہے۔

بے خطر اس آگ میں کود جاؤ اور تن من کو شعلوں کی لپیٹ میں دے دو۔

دل کو زبان بناؤ... بولو... بولو۔ اپنے دکھ ہی بتاؤ اس ظالم کو... اگر اظہارِ محبت نہیں کر سکتیں تو۔

فلکی کا دل دھڑ دھر بجنے لگا۔ ہونٹ بری طرح کانپنے لگے۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے۔

جسم کے سارے اعضا باغی ہو گئے۔

سر چکرانے لگا۔

دل' جگر' نگاہ سب نے اس کی آہ و بکا سننے سے انکار کر دیا۔

ایک لمحہ.....

فیصلے کا ایک لمحہ اس کی شاہ رگ کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

زندگی یا موت..

زندگی یا موت....

زندگی یا موت...

دل کی دھڑکن بس یہی کہے جا رہی تھی۔

ایک ہیجانی کیفیت میں فلکی دوڑی... اور دوڑ کر آفاق کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ اس نے اپنا رخسار اس کے گھٹنے پر ٹکا لیا اور ہذیانی انداز میں رونے لگی۔

"تم نے میرے ساتھ ظلم کیا ہے۔ ہاں' میں کہوں گی تم ظالم ہو... بیدرد ہو۔ سنگ دل ہو۔ پہلے تم نے مجھے زندہ رہنا سکھایا۔ مجھے حیوان سے انسان بنایا۔ چینی کی مورتی کو دھڑکنا سکھایا۔ کانچ میں جان ڈالی۔ مجھے زندگی کا شعور دیا۔ آگہی بخشی۔ دنیا اور زمانے کا ادراک بخشا۔ جینا سکھایا۔

بھیڑیوں کی نگری میں انسانوں کی طرح زندہ رہنے کا درس دیا۔

پھر مجھے بیچ منجدھار میں چھوڑ دیا۔

تنہا کر دیا...

ٹھکرا دیا...

روند ڈالا... پیس ڈالا...

ہاں... ہاں... پہلے میں تمہارے معیار کے مطابق نہ تھی۔ میں بری تھی.. کاہل تھی... انا

پرست تھی۔ مغرور تھی۔ طمع سازی و تصنع میرا اوڑھنا بچھونا تھا۔ پھر جب یہ سارے بُت تم نے پاش پاش کر دیے۔ مجھے اصولوں کی آبِ زم زم سے نہلا دیا تو کیا میں پاک نہ ہوئی؟

میں نے اپنی زندگی کا ہر راز اگل کر تمہارے سامنے رکھ دیا۔ میں نے اقبالِ جرم کیا۔

کیونکہ میں تمہاری پسلی سے نیا جنم لینا چاہتی تھی۔

میں تمہارے لیے ایک بار پھر پیدا ہونا چاہتی تھی۔

میں تمہاری ہو کے' تمہارے سائے میں جینا چاہتی تھی۔

میں نے تو محبت میں تمہیں ہی مسجود جانا تھا۔

کیا یہ کم تھا...؟

بولو... بتاؤ..."

فلکی ہیجانی انداز میں آفاق کی ٹانگوں کو بار بار جھنجھوڑ رہی تھی۔ اپنا آنسوؤں سے تر چہرہ بار بار اس کے گھٹنوں پر رگڑ رہی تھی۔ آفاق کا پاجامہ اس کے آنسوؤں سے باقاعدہ گیلا ہو رہا تھا اور اس کی ٹانگیں برابر لرز رہی تھیں۔

تھوڑی دیر اور رو کر فلکی نے پھر چہرہ اٹھایا۔

"بولو' مجھے جواب دو...

مجھے محبت سے آشنا کیوں کیا؟

مجھے عشق کے معنی کیوں سمجھائے؟

مجھے کسی اور کا ہو کے زندہ رہنے کا طریقہ کیوں بتایا؟

دل میں آگ روشن کی اور خود برف کا تودہ بن گئے۔

مجھے اپنی زندگی سے یوں نکال باہر کیا جیسے مکھن سے بال نکالتے ہیں...

میری کوئی ادا تمہیں پسند نہ آئی۔ میری کسی تپسیا نے تمہیں موم نہ کیا۔ میری دن رات کی محنت تمہاری اکڑی ہوئی گردن کو نہ جھکا سکی۔

سوچو ذرا..."

اس نے پھر آفاق کو جھنجھوڑا۔

"میں نے تمہارے لیے کیا نہیں کیا؟

اور اس پر بھی اگر تم کہتے کہ اپنے وجود کو میرے لیے قیمہ کر دو اور بوٹیاں فرش پر بچھا دو تو میں ایسا بھی کرتی۔ تمہارے قدموں تلے اپنی کھال بچھا دیتی۔ اپنا دل بچھا دیتی۔ ہاں' تم ان پر

قدم رکھنے کو آمادہ تو ہوتے۔

اے مغرور شہنشاہ!

تم نے تو بڑی رعونت سے کہہ دیا۔ میرے گھر سے نکل جاؤ!

یہ تمہاری تہذیب ہے۔

یہ تمہاری اعلیٰ تربیت ہے جس پر تمہیں اتنا گھمنڈ ہے اسی کو تم خاندانی نجابت کہتے ہو۔

تمہارے خاندان میں عورتوں سے یہ سلوک کیا جاتا ہے۔ کیا اسی کو شرافت کہتے ہیں کہ کسی کا ہاتھ پکڑ کر چھوڑ دو۔ کسی کے دونوں جہاں لُوٹ کر اسے ٹھکرا دینا۔ کیا یہی تمہارے جیسے عالی دماغ شرفا کا وطیرہ ہے۔

اگر چھوڑنا ہی تھا تو شروع میں کیوں نہ چھوڑ دیا۔

اس وقت میں مزے میں تھی۔

جس دنیا میں تھی۔ مگن تھی۔

بھلے برے کی تمیز نہ تھی۔

عشق و محبت کی حقیقت سے آگاہ نہ تھی۔

ایک مرد کی رفاقت کیا ہے؟ میں نے کبھی پرواہ نہ کی تھی۔

اپنا گھر کیا ہوتا ہے؟ میں اس جھنجھٹ سے بالاتر تھی۔

انجانے میں میری زندگی بھلی چنگی گزر جاتی۔

ممی کی طرح میں بھی کپڑے اور زیور کی دنیا میں خوش رہتی۔

مگر تم نے مجھے لُوٹ لیا۔

میرا اپنا پن چھین لیا۔

مجھے اپنے رنگ میں رنگ کے تباہ کر ڈالا۔

اب میں لَوٹ کر اس ماحول میں نہیں جا سکتی۔

وہ لوگ مجھے قبول نہیں کرتے۔

میں ان کو قبول نہیں کر سکتی۔

دن رات اپنے دل کی چیخ و پکار سنوں یا تم جیسے عظیم انسان کو دعائیں دوں؟

بتاؤ کیا کروں؟

کیا کروں میں؟"

اس نے اپنی آستین سے اپنے مسلسل بہتے ہوئے آنسو صاف کیے اور سر آفاق کے گھٹنے پر ٹیک دیا۔

آفاق کا عجیب عالم تھا جیسے جان آنکھوں میں آکر ٹھہر گئی ہو۔ فلکی نہ صرف اس کی ٹانگوں سے لپٹی ہوئی تھی بلکہ اپنے وجود کا سارا بوجھ بھی اس کے گھٹنوں پر ڈالا ہوا تھا۔ اس کے نرم و گداز سینے کے اندر دھک دھک کرتے دل کی ہر دھڑکن آفاق اپنی ٹانگوں پر محسوس کر رہا تھا۔

شدّتِ ضبط سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور زبان گنگ!

پھر ایک دَم فلکی نے اپنا سر اس کے گھٹنوں سے اٹھایا اور بپھر کر بولی۔

"میں تو بھول ہی گئی تھی۔ تم مرد ہو۔ اَنا کے ڈسے ہوئے ظالم اور خودغرض مرد!

میں تو تمہارا یہ روپ بھول ہی گئی اور تمہیں انسان سمجھ کر اندر آگئی تھی۔" اس نے ایک دم آفاق کی ٹانگیں چھوڑ دیں اور ہٹ کر دور جا بیٹھی۔

اب وہ قالین پر اس طرح بیٹھی ہوئی تھی جس طرح کوئی بھکارن آلتی پالتی بال بکھرائے فرش پر بیٹھی بَین کر رہی ہو۔

اس کے بال چہرے پر بکھر گئے تھے۔ رو رو کر خوب صورت آنکھیں سوج گئی تھیں۔ بھرے بھرے سرخ ہونٹوں پر رَس اتر آیا تھا۔ رخساروں پر سرخ دھبے پڑ گئے تھے اور نتھنے غصّے سے پھڑک رہے تھے۔

اس نے اپنے دوسرے بازو کی آستین سے اپنا چہرہ اور آنکھیں دوبارہ صاف کیں اور پھر شروع ہو گئی۔

"تم ہمیشہ یہ چاہتے رہے کہ میں عورت ہو کر جھکوں۔ میں تمہارے آگے سجدے کروں۔

میں نہ صرف اپنی شکست تسلیم کروں بلکہ بار بار ہاتھ جوڑوں اور محبت کی بھیک مانگتی رہوں۔

میں تم سے دست بستہ عرض کرتی رہوں کہ

جنابِ والا! میں آپ کے عشق میں مبتلا ہو چکی ہوں اگر آپ مجھ پر توجہ نہیں فرمائیں گے تو میں مرجاؤں گی۔ ازراہِ نوازش مجھے ٹھکرانے کا ظلم نہ کیجیے۔ میرے دونوں جہاں آپ سے وابستہ ہیں۔ میں ہجر کے صدمے نہیں سہہ سکتی۔ مجھے آپ کی ضرورت ہے۔ مجھے اپنی باندی بنا کے اپنے قدموں میں جگہ دیجیے۔ مجھے بے موت مرنے سے بچا لیجیے۔

مجھے سہارا دیجیے۔

آسرا دیجئے۔

تمہاری فطرت کا یہی تقاضا تھا۔ تم اپنی انا کو بانس پر چڑھانا چاہتے تھے۔

گو میں نے یہ سب اپنے افعال اور اعمال سے کیا تھا۔ میری ساری سمیں اور شامیں گواہ ہیں۔ میں نے خلوصِ دل سے تمہاری عبادت کی تھی۔

بندگی کی تھی۔

اور یہ سب اپنی Conviction سے کیا تھا۔

مگر صرف اپنی زبان سے اظہارِ محبت نہیں کیا تھا۔

میں سمجھتی رہی... تمہارے جیسے آدمی کے سامنے اعترافِ محبت ایک گھٹیا سی بات ہوگی۔"

یہ کہہ کر فلکی پھر زار و قطار رونے لگی۔

اس نے اپنا سر اَب کے اپنے ہی گھٹنوں پر رکھ لیا اور سسکتی رہی۔

آفاق ٹس سے مس نہیں ہوا۔ یوں بیٹھا رہا... جیسے کسی نے سمریزم کر دیا ہو۔

تو فلکی نے اپنا آنسوؤں سے تر چہرہ اٹھایا اور بولی۔

"لو۔ آج میں ان سب باتوں کا اعتراف کرتی ہوں۔ تم نے میرے پندار کو شکست دے لی ہے۔ ایک کمزور عورت کو اپنے آگے جھکا لیا ہے۔ تم ایک فاتح شہنشاہ ہو۔ تمہاری عظمت کا تقاضا یہ ہے کہ اب دھکّے دے کر مجھے اس گھر سے نکلوا دو۔ بس اس کے علاوہ اور کوئی سلوک نہیں رہ گیا ہے جو اس گھر میں میرے ساتھ نہ کیا گیا ہو... اور اب مجھے کسی بات کا کوئی غم نہیں ہوگا۔ یہی بتانے میں یہاں آئی تھی۔ تم اپنی باقی ماندہ حسرتیں نکال لو کہ اس کے بعد میں تمہیں نظر نہیں آؤں گی۔ ایسا نہ ہو مشقِ ستم کے لیے پھر تم کسی اور معصوم اور مجبور لڑکی کا لہو چنے لگو۔"

فلکی نے گھڑی دیکھی اور اپنا چکراتا ہوا سر دوبارہ اپنے گھٹنوں پر رکھ لیا۔

آفاق بڑے سکون کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھا۔ کھڑا ہوا... مسکرایا۔ پھر آگے بڑھ کر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے فلکی کے بازوؤں کو پکڑا اور اسے اپنے مقابل کھڑا کر لیا۔ جب وہ اس کے سامنے کھڑی ہو گئی تو اس نے اپنے بازو اس طرح اس کی کمر کے گرد ڈال لیے جس طرح زنجیر ڈالی جاتی ہے۔

پھر اس کے کھلے بالوں پر اپنا رخسار رکھ کر بڑی ہی آہستہ' بڑی ہی شائستہ آواز میں بولا۔

"میں نے تمہیں دل کا غبار نکالنے کا خود ہی موقع دیا ہے۔ اب بس کرو... اب مجھے کہنے

دو۔

تمہیں بھیج کر میں بھی سکھی نہیں رہا فلک!

میری حالت دیکھو۔ میرے کمرے کو دیکھو۔

میں دفتر نہ جا سکا۔ کوئی کام نہ کر سکا۔ حتیٰ کہ کھانا بھی نہ کھا سکا۔

مجھے ایسا لگا جیسے میں بیمار پڑ گیا ہوں۔ وہ بے وقوف سی' پاگل سی لڑکی میرے آس پاس بکھری رہی....

مجھے انداز نہیں تھا کہ مجھ جیسے لوہے کے مرد کو تم یوں توڑ پھوڑ جاؤ گی۔

جب تم چلی گئیں... تو مجھے پتہ چلا... تم مجھ سے میرا اپنا آپ لے گئی ہو... اب میرے پاس کچھ بھی نہیں رہا... کچھ بھی نہیں...."

فلکی نے حد درجہ حیرانی سے اپنا روتا ہوا چہرہ اٹھایا اور مشتبہ نظروں سے آفاق کی طرف دیکھا۔

"اس طرح بے یقینی سے میری جانب نہ دیکھو فلک..." آفاق نے اپنا چہرہ اور قریب کر لیا۔

"میری حالت اور میرے کمرے کی حالت دیکھو۔

"جب سے تم گئی ہو۔ میں گھر میں کھانا نہیں کھاتا۔

میں اس میز پر تنہا بیٹھ کر کیسے کھانا کھا سکتا ہوں جہاں ایک خوب صورت سی لڑکی ہمہ وقت میری طرف دیکھتی رہتی تھی۔ سالن ختم ہوتا تو پلیٹ میں سالن ڈال دیتی' پھلکا ختم ہوتا تو پھلکا آگے بڑھا دیتی' پانی ختم ہوتا تو گلاس میں پانی ڈال دیتی... وہ میری صورت دیکھتی رہتی اور میں کھانا کھاتا رہتا...

مگر اس کو کیا معلوم کہ میں اس کی صورت کا چاند دل میں اتار کر گھر سے نکل جاتا تھا۔

تم مجھے یہ بتاؤ یہ خوشی مجھے کہاں سے مل سکتی تھی؟

میں اس لڑکی کو کیسے دل سے نکال سکتا تھا جو میرے انتظار میں سایہ بنی دروازے کے ساتھ لگ کر باہر دیکھتی تھی... اور پھر میری موٹر کی آواز سن کر یوں باہر آجاتی تھی جیسے کلی چٹک کر پھول بن جاتی ہے۔

میں دفتر سے گھر آنے کے لیے بیتاب رہا کرتا تھا۔

اور جب گھر آتا تو رات مجھے بکل رکھتی تھی... میں صبح کا انتظار کرتا تھا... دن اور رات میں تم کیا جانو میں تمہیں کتنی بار اپنے دل کے اندر محسوس کرتا تھا۔

اور پھر جب تم چلی گئیں تو میں اس کمرے میں سو نہیں سکتا تھا۔ نرم بستر مجھے کانٹوں کا بچھونا لگتا تھا۔ مجھے وہ من موہنی لڑکی یاد آتی تھی جو دور اپنے بستر پر بیٹھی مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھتی رہتی تھی۔ میں نے اس پر حد بندی کی قید لگائی تھی۔ وہ اس قید کو توڑتی نہیں تھی مگر ہر رات اس کی آنکھیں مجھ سے کہتی تھیں۔

"مجھے اپنے بازوؤں میں لے کر سو جاؤ... تمہیں اپنی چوڑی چھاتی کا واسطہ.... میں زندگی بھر تم پر نثار ہوتی رہوں گی۔"

(فلکی کے آنسو بہنے لگے)

"میرے اشاروں کی منتظر... میری آنکھوں میں کھو جنے والی لڑکی اچانک چلی گئی تو میرے لیے ساری دنیا خالی ہو گئی...."

آفاق نے آہستہ سے اس کا سر اپنے کاندھے پر یوں ٹکا لیا جیسے بچے کو سُلاتے ہیں اور اس کے معطّر بالوں میں اپنی مضبوط انگلیاں پھیرتا ہوا بولا۔

"فلک! ہر مرد چاہا جانا اور پوجا جانا پسند کرتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ عورت کو جھکانا چاہتا ہے۔ سجدے کروانا چاہتا ہے۔ خود پسند تو عورت بھی ہے مگر مرد سے زیادہ نہیں۔ اس پوری کائنات میں سب سے زیادہ خود پسند اور حاسد چیز مرد ہی ہے۔

عورت سے محبت کی جائے تو اپنا آپ وار دیتی ہے۔

شادی ہو جائے تو مطمئن ہو جاتی ہے۔

بچے ہو جائیں تو ساری دنیا کو بھول جاتی ہے۔

مگر مرد نہ تو محبت کر کے مطمئن ہوتا ہے نہ شادی کے بعد اسے قرار آتا ہے۔ نہ بچوں کی پیدائش اسے سکون دیتی ہے۔

مرد ایک پارہ ہے۔

وہ زندگی کے ہر موڑ پر ایک والہانہ چاہت کا منتظر رہتا ہے۔ اس کی اس حرص نے اسے ہرجائی بنا دیا ہے۔

وہ چاہتا ہے زندگی بھر اس کے آگے سجدے کیے جائیں مگر ہر بار نئے انداز اور نئے جذبوں کے ساتھ...

ہر رات پیار کرنے کا نیا انداز ہو۔

رات عورت نیا روپ دھارے۔

ہر صبح عورت نیا جنم لے۔

مرد حریص ہے۔ لالچی ہے۔ حاسد ہے۔

اس لیے یہ نئی صورت کی طرف بھاگتا ہے۔

اصل میں وہ خود اپنے عشق میں جتلا رہتا ہے... اس واسطے اس کی طلب کے پیمانے کی کوئی حد میں ہے۔

مرد جب کسی عورت سے محبت کرتا ہے یا اس پر مرتا ہے تو حقیقت میں وہ اسے یہ سکھانے کی کوشش کرتا ہے کہ اب زندگی بھر تمہیں اسی انداز میں مجھ پر مرنا ہوگا اور اپنے آپ کو فنا کرنا ہوگا اسی لیے میں نے تمہیں نکاح کے بندھن میں باندھ کر تمہاری سات پشتوں پر احسان کیا ہے!"

آفاق رکا... پھر ہنسا۔

"میں بھی مرد ہوں مگر فرق صرف اتنا ہے کہ میں سچ بولتا ہوں۔

سچ بولنے والے مرد کڑوے تو ہوتے ہیں مگر اچھے ہوتے ہیں.. ہیں نا؟" اس نے فلکی کے کان میں سرگوشی کی۔

"میرا بھی سجدے کروانے کو دل چاہتا ہے۔ محبت کروانے کو دل چاہتا ہے۔ میں نے تم سے کہا تھا نا؟ کہ مرد خاک ہو جانے والی عورت کو پسند کرتا ہے تو کچھ غلط تو نہیں کہا تھا۔

یہ ضرور ہے کہ میں تمہارا گھائل ہو چکا ہوں۔

مگر انداز تو ہمیشہ وہی چلے گا جو میں نے تمہیں سکھایا ہے۔"

"انداز تو تمہارا ابھی نہیں بدلا ابھی تک۔" فلکی نے اپنا چہرہ ذرا پرے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"قسم خدا کی میں بدل گیا ہوں۔" آفاق کے بازوؤں کا گھیرا تنگ ہونے لگا۔

"میں نے نوکروں سے کہہ دیا تھا' وہ میرے کمرے میں نہ آئیں۔ میری چادریں نہ بدلیں۔ میرے بستر کو ہاتھ نہ لگائیں... میرا کوئی کام نہ کریں۔ ان سب چیزوں سے تمہاری خوشبو آتی تھی۔ میں انھیں بدلنا نہیں چاہتا تھا۔

مجھے وہ ہاتھ یاد آجاتے تھے' جن پر میری وجہ سے چھالے پڑے تھے۔ وہ خوشبو یاد آجاتی تھی جو میں نے دور دور سے سونگھی اور دل پر ضبط کرتا رہا۔ وہ زلفیں یاد آتی تھیں' جنھیں خواہش کے باوجود پریشان نہ کر سکا۔

تمہاری قسم فلک... تمہاری قسم!" آفاق کی آواز سرگوشی بن گئی۔ اس نے اپنا چہرہ فلکی کے

بالوں میں چھپالیا اور بولا " تمہارے بغیر میں جہنم میں پڑا ہوا تھا۔
اگر آج تم نہ آتیں تو میں اپنا ہر بھرم توڑ دیتا۔"

"میرا خیال تھا تم مجھے لینے آؤ گے۔ مجھے ضرور بُلاؤ گے مگر.." فلکی نے محبت بھرے انداز میں شکوہ کیا۔

"یوں آنا اور بُلوانا پروگرام میں شامل نہیں تھا.." بے اختیار آفاق کے منہ سے نکل گیا۔

"پروگرام..." فلکی نے چونک کر سر اٹھایا اور ناگواری سے آفاق کی گرفت سے اپنا آپ چھڑانے لگی۔

"اب نہیں۔"

آفاق نے ہنس کر اپنی گرفت اور مضبوط کرلی۔

"پھر مجھے صاف صاف بتاؤ' یہ کیا چکر ہے جو میرے ساتھ چلایا جارہا ہے؟"

"آؤ میرے ساتھ یہاں پلنگ پر بیٹھو.." آفاق اسے بازو سے پکڑ کر ادھر لے گیا۔ "میں نے تو کئی دنوں سے کچھ کھایا بھی نہیں۔ کھڑے کھڑے تھک گیا ہوں۔ یہاں بیٹھو۔ میں تمہیں سب بتاتا ہوں۔"

مگر فلکی پلنگ پر بیٹھنے کی بجائے اٹھ کر دور صوفے پر بیٹھ گئی اور یوں جیسے ابھی اٹھ کر بھاگ جائے گی۔

"جلدی بتاؤ۔ مجھے بے وقوف کیوں بنا رہے تھے؟"

"کوئی خاص بات نہیں۔ تمہارے ڈیڈی کے ساتھ معاملہ ہی ایسے طے ہوا تھا' تو پھر میں پروگرام سے پہلے تمہیں کس طرح بلا سکتا تھا؟"

"میں جارہی ہوں۔" فلکی اٹھ کھڑی ہوئی۔ "احمق تھی جو خود ہی بے وقوف بننے چلی آئی۔ تم نے ہمیشہ میرے ہر جذبے کا مذاق اڑایا ہے۔ تم کیا ہو اور کیا نہیں۔ مجھے یہ جاننے کی ضرورت ہرگز نہیں ہے اور میں تمہیں بتادوں کہ آج میں تمہاری دنیا سے نکل کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جارہی ہوں۔ تم کیا' دنیا کی کوئی طاقت مجھے نہیں روک سکتی۔ (اس نے گھڑی دیکھی) ابھی فلائٹ کا وقت ہے... اور اب میں خوش ہوں کہ میں نے تمہاری دنیا سے نکل جانے کا صحیح فیصلہ کیا تھا۔"

"فلک!"

آفاق نے اپنے اسی کرخت اور کھردرے لہجے میں پکارا۔

فلکی نے اپنی آنکھوں کا زاویہ بدل لیا۔

...سے میں اور تمہارے ڈیڈی اکٹھے سوار ہوئے۔ لانگ فلائٹ تھی۔ سیٹ بھی ایک تھی۔ اس لیے باتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ تمہارے ڈیڈی اور میرے ابا کسی زمانے میں عزیز دوست تھے۔ خدا جانے تمہارے ڈیڈی مجھ سے متاثر ہوئے یا... مجھے تمہارے ڈیڈی پسند آگئے۔ ذرا سی ہمسفری میں ہم دونوں ایک دوسرے کے اس قدر قریب ہوگئے کہ انھوں نے اپنے گھرانے کے بارے میں مجھے سب کچھ بتادیا۔

اور یہ بھی بتادیا کہ میری اکلوتی بیٹی ہے لیکن ماں کی غلط تربیت نے اسے تباہ کردیا ہے۔ میں ...ہوں کسی شریف آدمی سے اس کی شادی کردوں مگر کھوٹا سکہ کسی کی جھولی میں ڈالتے سے ...تا ہے۔

...ے تمہارے ڈیڈی کی اس بات نے جیسے خرید لیا۔ میں نے کسی باپ کے منہ سے اتنی سچی کھری بات نہیں سنی تھی۔ مجھے تمہارے ڈیڈی بہت ہی مظلوم مگر عظیم انسان نظر آنے لگے۔

...نے ان سے وعدہ کرلیا کہ پاکستان آکر ان کے گھر ضرور آؤں گا اور اگر اس ضمن میں ان کی کوئی مدد کرسکا تو ضرور کروں گا۔

لاہور آکر میں ان سے ملنے ان کے گھر گیا... اتفاق سے میں نے بھی تمہیں دیکھ لیا تھا۔ اس کا شاید تمہیں پتہ نہ ہو۔

اسے قدرت کی ستم ظریفی ہی کہہ لو۔ اس بگڑی بچی نے مجھے پہلی ہی نظر میں لوٹ لیا مگر مجھے تمہارے ڈیڈی کے الفاظ یاد تھے۔

بہرحال... یہ میری خوش قسمتی تھی کہ تم بھی میرے جال میں پھنسنے پر آمادہ نظر آئیں۔

میں نے جب اپنا عندیہ ڈیڈی پر ظاہر کیا تو انھوں نے بڑے خلوص سے مجھے باز رکھنے کی کوشش کی اور بولے۔

"بیٹا! تم انتہائی نفیس لڑکے ہو اور تمہیں مغالطے میں رکھنا نہیں چاہتا۔ صاف صاف کہے دیتا ہوں کہ میری بیٹی' تمہیں خوش نہ رکھ سکے گی۔"

میں نے انھیں آمادہ کرلیا اور ان سے وعدہ کرلیا کہ اگر وہ جلدی شادی کردیں... اور میری ہدایات پر عمل کریں.... تو میں اس لڑکی کو راہِ راست پر لے آؤں گا۔"

"اس لیے..."

آفاق دلیری سے مسکرایا۔

"آناً" فاناً" شادی ہو گئی تھی اور..."

"اور... اور....." فلکی جیسے خواب سے چونکی۔

"بعد میں جو کچھ ہوتا رہا کیا وہ تمھاری اسکیم کے مطابق تھا؟"

"جی ہاں۔" آفاق نے فلکی کا لرزتا ہوا ہاتھ تھام لیا۔

"اور ڈیڈی کا اتنے طویل عرصے کے لیے باہر جانا؟"

"بالکل... میں نے ہی ان سے کہا تھا' کم از کم وہ چھ ماہ کے لیے یہ ملک چھوڑ دیں۔"

"اور ممی؟"

"ہاں' اللہ کے فضل سے تمھاری ممی کا عقل والا خانہ خالی ہے۔ وہ اس منصوبے میں شامل نہیں تھیں۔ میں نے تو انھیں ویسے بھی شادی کے فوراً" بعد شیشے میں اتار لیا تھا لیکن پھر بھی ان کی حماقتوں سے بڑا خطرہ لاحق تھا اور میں نے ڈیڈی سے کہا تھا کہ فلکی پر ممی کی پرچھائیں بھی نہ پڑے... تبھی تو ڈیڈی اتنا خرچہ کر کے انھیں ساتھ لے گئے تھے۔"

"تم مجھے فلکی مت کہو۔"

فلکی نے ایک دَم اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"تو کیا کہوں؟"

"جب تم فلک کہتے ہو تو میں آسمانوں پر اُڑنے لگتی ہوں۔ اس طرح مجھے پہلے کبھی کسی نے نہیں بُلایا تھا۔"

"اس بات کا اظہار تم نے پہلے کیوں نہ کیا؟"

"کس کس بات کا اظہار کرتی اور کیسے کرتی..؟ ہر وقت تو تم "ہوا" بنے رہتے تھے۔

فلکی کھڑی ہو گئی....

آفاق بھی کھڑا ہو گیا۔

شدّتِ جذبات سے فلکی لرز رہی تھی۔ آفاق کی نگاہیں اس کے چہرے سے ہٹتی نہ تھیں۔

وہ اپنے لرزتے ہونٹوں پر قابو پا کر بولی۔

"میں نے تو چاہنے کے باوجود تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ جو امریکا سے تم میرے لیے دل کی شکل کا ڈائمنڈ سیٹ لائے تھے' وہ مجھے کیوں نہ دیا۔"

"آج کے دن کے لیے رکھا ہوا تھا۔"

آفاق نے اپنا چہرہ فلکی کے اتنا قریب کر لیا کہ اس کی گرم سانس فلکی کے ہونٹوں کو چھونے لگی۔

"اور بہت اُدھار ہیں مجھ پر.... جو میں نے اس دن کے لیے رکھ چھوڑے تھے۔"

آفاق کی آواز سرگوشی بن گئی۔ اس کے چہرے پر ایک نئی اور خوب صورت روشنی تھی۔

فلکی جھجک کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

وہ دو قدم آگے آگیا۔

"تم ذرا اس آدمی کی حالت کا اندازہ کرو جس نے محبت سے شادی کی ہو مگر اپنی بات نبھائی و۔ اپنی سہاگ رات اپنے ہاتھوں برباد کی ہو۔ ہر پَل' ہر گھڑی اپنی خواہشوں کا گلا گھونٹا ہو۔ پنے اندر کے مرد کو تازیانے مار مار کر سلایا ہو۔ آخر مرد اور عورت کے جذبات میں فرق ہوتا ۔ تمہیں اب اندازہ ہوا کہ تمھارے ساتھ ساتھ میں بھی کتنی بڑی آزمائش سے گزرا ۔ ایسے ایسے موڑ بھی آئے تھے جب تمھارے اس توبہ شکن حُسن نے مجھے راستہ میں لُوٹ لیا... مگر میں اپنے لازوال جذبے کی سچائی کو دیکھنے کے لیے اپنے اوپر جبر کرتا رہا۔ کم و بیش' ت دونوں طرف رنگ لاتی ہے یا نہیں۔

اگر محبت ضرورت یا مجبوری بن جائے تو اس میں سوز نہیں رہتا۔ میں محبت کو ہمیشہ رہنے والی ے سمجھتا ہوں۔ یہ چاند نہیں کہ پہلے چودہ دن چڑھے اور آخری پندرہ دن ڈوب جائے۔

فلک' میں تم سے ہمیشہ محبت کرنا چاہتا ہوں۔ ہمیشہ... اس طرح..." اس نے آگے بڑھ کے ں کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ "تمھاری اور میری قربانیوں کا یہ صلہ ہے کہ آج میں اپنی محبوبہ کو ں صورت میں دیکھ رہا ہوں جس صورت میں دیکھنے کی تمنّا تھی۔ تم ہی بتاؤ تم پہلے سے کتنی دہ حسین اور خوب صورت بن گئی ہو۔

کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

ہیں' نا؟" اس نے جب والہانہ پن سے فلکی کی ٹھوڑی اوپر اٹھانی چاہی تو فلکی رو رہی تھی مگر ، ان آنسوؤں میں درد نہیں تھا۔ یہ خوشی کے آنسو تھے۔ فتح اور کامرانی کے آنسو تھے۔ تشکّر آنسو تھے۔

لکی نے ایک دَم اپنا آپ چھڑایا اور آفاق کے قدموں میں جُھک گئی۔ وہ اپنا سر اس کے ں میں رکھ دینے کو تھی آفاق نے لپک کر اسے پکڑ لیا بلکہ بازوؤں میں جکڑ لیا۔

"اب تمھاری جگہ قدموں میں نہیں فلک' اس دل میں ہے۔" اس نے اسے اپنے دل سے

اور قریب کرلیا۔ "میں یہاں رکھوں گا اس دل میں تمہیں... مگر اب سزا کے طور پر نہیں بلکہ پچھلی محبتوں کا ادھار چکانے کے لیے.. پچھلی ایک ایک گھڑی کا حساب بے باق کروں گا۔ ساری دنیا کے کام چھوڑ دوں گا... اور تمہارا ایک بال بھی کسی کو دیکھنے نہیں دوں گا۔ تمہیں پتہ ہے کہ میں انتہا پسند ہوں۔"

اس کے بازوؤں کا حلقہ تنگ ہونے لگا۔

"جتنی شدت سے تشدد کرتا ہوں۔ اتنی ہی وارفتگی سے محبت بھی کرتا ہوں۔ تم میری محبت کی شدت سے گھبرا تو نہ جاؤ گی۔" اس نے فلکی کا چہرہ اپنی طرف موڑا۔

"کچھ تو... کچھ تو کہو..."

"اوہ... آفو..." وہ اس کے بازوؤں کے تنگ حلقے میں کسمسائی۔ "تم سب نے مل کر کتنی خوب صورت سازش کی تھی میرے ساتھ.... کہ میرے تو دونوں جہاں..."

لیکن پھر اس کے بعد آفاق نے اسے بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔